بسم اللہ الرحمن الرحیم

ص

صَاحِبُ الْحُوْتِ

حضرت یونس^ع کا لقب ہے۔ (٦٨/٤٨)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان "یونس^ع"۔

صالح علیہ السلام

امم سامیہ میں سے جن قبائل نے اندرونِ عرب میں حکومتیں قائم کیں ان میں سب سے مشہور قبیلہ (بلکہ قوم) ثمود کا تھا۔ ان کی ترقی کا زمانہ عادِ اولیٰ کے بعد کا ہے (دیکھئے عنوان ھود^ع)۔ یہ قوم عرب کے شمال مغربی حصہ پر حکمران تھی جسے وادیٔ قریٰ کہتے تھے۔ حجر ان کا دار الحکومت تھا جو اس قدیم شاہراہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا تھا۔ ان کا علاقہ بڑا پرفضا اور زرخیز تھا (٢٦/١٤١-١٤٧)۔ یہ لوگ میدانوں میں رفیع و وسیع محلات تعمیر کرتے اور پہاڑوں کے گوشوں میں مستحکم قلعے بناتے تھے جو فن سنگ تراشی کے نمونے تھے (٧/٧٤)۔

اس قوم کی طرف، انہی کے بھائی بند، حضرت صالح^ع مبعوث ہوئے (٧/٧٣)۔ انہوں نے ان تک وہی پیغام پہنچایا جو اس سے پہلے حضرت نوح^ع اور حضرت ھود^ع اپنی اپنی قوم تک پہنچا چکے تھے (دیکھئے عنوانات نوح اور ھود)۔ یعنی یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ (٧/٧٣)۔ "اے میری قوم! تم اللہ کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں"۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ (٧/٧٤)۔ "ملک میں سرکشی کرتے ہوئے فساد نہ پھیلاتے پھرو"۔ حسب معمول مترفین کے طبقہ (سردارانِ قوم) نے اس دعوت کی مخالفت کی (٧/٧٥)۔

اس زمانے میں مویشی اور چراگاہیں ، چشمے اور کھیت سب سے بڑی دولت ہوتے تھے ۔ ارباب اقتدار کی حالت یہ تھی کہ وہ چراگاہوں اور چشموں کو اپنے مویشیوں کے لئے مختص کرلیتے اور کمزور انسانوں کے جانور بھوکوں مر جاتے ۔ حضرت صالحؑ نے سرداران قوم سے کہا کہ رزق کے یہ سرچشمے تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں ۔ یہ بات ایسی معقول تھی کہ ان سے اس کا جواب نہیں بن پڑسکتا تھا ۔ چنانچہ انہوں نے اس کا اقرار کیا کہ ایسا ہی ہوگا ۔ حضرت صالحؑ نے کہا کہ اس کا عملی طریق یہ ہے کہ مختلف لوگوں کے جانوروں کی باریاں باندھ دی جائیں تاکہ کسی پر زیادتی نہ ہو ۔ وہ اس پر بھی راضی ہوگئے تو آپ نے کہا کہ یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یوں سمجھو کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں ۔ خدا کی زمین اور خدا کی اونٹنی ۔ اسے میں اس کی باری کے لئے چھوڑ دیتا ہوں ۔ تم نے اگر اسے آزاد چرنے اور اس کی باری پر پانی پینے دیا تو سمجھ لیا جائیگا کہ تم اپنے معاہدے میں سچے ہو ۔ اگر تم نے اسے ایذا پہنچائی تو یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ تم اپنی روشِ کہن پر قائم ہو ۔ (۲۶/۱۵۶) ۔ انہوں نے اس اونٹنی کو ہلاک کر دیا (۲۶/۱۵۷) ۔ اور خدا کے عذاب نے (جو کڑک اور زلزلہ کی شکل میں نمودار ہؤا) انہیں تباہ کر دیا (۲۶/۱۵۸) ۔

(طبعی حوادث ، مثلاً طوفانِ آب ۔ آندھی ۔ زلزلہ وغیرہ) ''خدا کا عذاب'' کس طرح بنتے ہیں ، اس کے لئے میری کتاب ''جوئے نور'' میں باب حضرت نوحؑ ملاحظہ کیجئے) ۔

ص ب أ

صَبَأَ ۔ يَصْبَأُ ۔ ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونا۔ اس کے بنیادی معنی نکلنے اور ظاہر ہونے کے ہوتے ہیں ۔ صَبَأَ نَابُ الْبَعِيْرِ ۔ اونٹ کی کچلی نکل آئی (ابن فارس)۔ نیز کسی کے خلاف بغاوت کرنے اور دشمنی کرنے کے لئے صَبَأَ عَلَيْهِ کہتے ہیں* ۔ صَبَأَ النَّجْمُ ۔ ستارہ نکل آیا* ۔

اَلصَّابِئُوْنَ ۔ ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونے والے* ۔ صاحب محیط کے نزدیک یہ نصاریٰ کا ایک فرقہ تھا جو ستاروں کی اس طرح تعظیم کرتا تھا جس طرح مسلمان کعبہ کی تعظیم کرتے ہیں ۔ بعض کا

*تاج ۔

خیال ہے کہ یہ ستارہ پرست یعنی مشرک قوم تھی* ۔ صاحب المنار کا بھی یہی خیال ہے ، اگرچہ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ایک مستقل ملت ہیں جو مشہور انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے عقائد بڑے مبہم ہیں** ۔ قرآن کریم میں صَابِئِیْنَ کا ذکر (۲/۶۲) میں آیا ہے ۔ راغب نے یہ بھی لکھا ہے کہ الصابِئُوْنَ ، حضرت نوحؑ کے دین کی پیروی کرنے والی قوم تھی ۔

ہیسٹنگز کے انسائیکلو پیڈیا اوف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کے مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ در حقیقت الکیسائی (Elkesaites) فرقہ کا دوسرا نام ہے ۔ یہ یہودیوں سے نکلا ہؤا ایک فرقہ تھا جسے پہلی صدی عیسوی کے قریب فروغ حاصل ہؤا ۔ گناہوں کو دھونے کے لئے پانی میں بپتسمہ لینا یا غسل کرنا ان کا امتیازی نشان تھا ۔ اس جہت سے عرب انہیں ''مغتسلہ'' کہتے تھے۔ یہودیوں کے ایسینی فرقہ نے اس جدید مذہب کو زیادہ قبول کیا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ (Sampsenes) یا (Sampsites) فرقہ جو چوتھی صدی عیسوی میں بحر میت کے قرب و جوار میں پایا جاتا تھا ، الکیسائی ہی تھا ۔ یہ لوگ خدائے واحد پر ایمان رکھتے تھے اور ہاتھ منہ دھوکر یا غسل کرکے اس کی پرستش کرتے تھے ۔ اس لفظ کے لغوی معنی ، ''سورج کی مانند'' ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ الکیسائی علم نجوم جانتا تھا اس لئے اس کے فرقہ کو ستاروں سے خاص دلچسپی تھی ۔ ظاہر ہے کہ نزول قرآن کے وقت ، عرب اس فرقہ سے اچھی طرح واقف تھے اور انہیں ''صابئین'' کے نام سے پکارتے تھے۔ شاید اس لئے کہ یہ مشہور تھا کہ الکیسائی نے اپنی الہامی کتاب کو اپنے جس جانشین کے سپرد کیا تھا اس کا نام (Sobiai) تھا ۔ ممکن ہے اسی سے انہیں (Sabians) کہا جاتا ہو ۔ یا ان کے ،پانی میں بپتسمہ لینے کی وجہ سے ۔ ارامی زبان میں اس سے یہی مفہوم تھا ۔

ص ب ب

صَبَّ الْمَاءَ ۔ اسنے اوپر سے پانی گرا دیا ۔ فَتَصَبَّ ۔ چنانچہ پانی گر گیا (لازم و متعدی) ۔ اَلصُّبَابَۃُ تھوڑی سی پینے کی چیز جو برتن میں باقی رہ جائے ۔ اَلصَّبَبُ ۔ نہر یا راستہ کا ڈھلوان اور نیچے کی طرف جانے والا حصہ ۔ ڈھلوان زمین ۔ اَصَبُّوْا ۔ لوگ ڈھلوان اور نشیبی زمین پر چلے ۔ صُبَّ الرَّجُلُ ۔ آدمی مٹا دیا گیا*** ۔

*محیط ۔ **تفسیر المنار ۔ *** تاج و راغب ۔

سورۃ عبس میں ہے اَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا (۸۰/۲۵) ہم نے اوپر سے پانی برسایا۔ سورۃ فجر میں ہے فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ (۸۹/۱۳)۔ تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ سورۃ حج میں ہے۔ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ (۲۲/۱۹)۔ انکے سروں کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی گرایا جائیگا۔ انکے اکڑے ہوئے سروں کو جھکا کر انکی قوتوں کو پراگندہ کر دیا جائیگا۔

ص ب ح

اَلصُّبْحُ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رنگوں میں سے ایک رنگ کے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ دراصل یہ سرخ رنگ کو کہتے ہیں اور صبح کو صُبْحٌ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ سرخ ہوتی ہے۔ اور مِصْبَاحٌ (چراغ کو) اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی سرخ ہوتا ہے۔ اَلصُّبْحُ۔ فجر یا دن کا ابتدائی حصہ*۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ اس وقت کو کہتے ہیں جب افق طلوع آفتاب کی وجہ سے سرخ ہو۔ صَبَاحٌ۔ اِصْبَاحٌ کے بھی یہی معنی ہیں*۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ صَبَاحٌ دن کی روشنی کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ تینوں الفاظ آئے ہیں (۸۱/۱۸ ؛ ۳۷/۱۷۷ ؛ ۶/۹۷)۔ مُصْبِحٌ۔ وہ جو صبح کے وقت میں داخل ہو*۔ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ (۱۵/۸۳)۔ صبح ہوتے ہی انہیں سخت آواز نے آلیا۔ اَلْمِصْبَاحُ۔ چراغ، نیز بتی کی لو* - (۲۴/۳۵)۔ جمع مَصَابِيْحُ۔ ستارے (۴۱/۱۲)۔ صَبَّحَ۔ کسی کے پاس صبح کے وقت پہنچنا* (۵۴/۳۸)۔ اَصْبَحَ۔ ہو گیا (یعنی کَانَ اور صَارَ کے معنوں میں)۔ اَصْبَحَ فُلَانٌ عَالِمًا۔ فلاں آدمی عالم ہو گیا*۔ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ (۵/۳۰) وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گیا۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا (۳/۱۰۲)۔ تم خدا کی نعمت (قرآن کریم) کے ذریعے بھائی بھائی بن گئے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اَصْبَحَ کے عام معنی تو "ہو گیا" ہی ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبح کی نسبت سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ آغاز کار ہی سے ایسا ہو گیا۔ وہ شروع ہی میں ایسا ہو گیا۔

ص ب ر

صَبْرٌ کے معنے ہیں کسی شخص کا کسی مطلوبہ شے کے حصول کے لئے برابر مصروف کار رہنا*۔ لہذا اسکے بنیادی معنوں میں استقامت، ثابت قدمی،

* تاج۔

اور مسلسل کوشش داخل ہیں ۔ اسی بنا پر وہ بادل جو چوبیس گھنٹے ایک ہی جگہ کھڑا رہے اور ادھر اُدھر نہ ہو اَلصَّبِيْرُ کہلاتا ہے ۔ اور پہاڑ کوبھی الصَّبِيْرُ کہتے ہیں* ۔ اَلْاَصْبِرَةُ ۔ ان اونٹوں یا بکریوں کو کہتے ہیں جو صبح شام باقاعدہ اپنے مالکوں کے پاس واپس آجائیں اور ان سے دور نہ رہیں*** ۔ اَلصَّبَارَةُ ۔ (ص کی تینوں حرکات کے ساتھ) لوہے یا پتھر کے ٹکڑے کو کہتے ہیں (جوایک مقام پر جم کر پڑا رہتا ہے) ۔ اَلصَّابُوْرَةُ ۔ اس مٹی وغیرہ کوکہتے ہیں جواس لئے کشتی میں رکھدی جاتی ہے کہ اس سے کشتی جھکولے نہ کھائے** ۔ جس سے اس کا توازن قائم رہے ۔ ان الفاظ سے صَبْرٌ کا صحیح مفہوم سامنے آجاتا ہے ۔ چونکہ اس قسم کی سعی و کاوش کا نتیجہ بہت عمدہ نکلتا ہے اسلئے اَلصُّبْرَةُ ۔ غلہ کے ڈھیر کو کہتے ہیں* جس کی ناپ اور تول نہ کی گئی ہو* ۔ غور کیجئے کہ یہ کسقدر مسلسل محنت اور استقامت کا نتیجہ ہوتا ہے ۔

جم کر ایک جگہ قائم رہنے کی جہت سے یہ لفظ کسی کو روکنے کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا ۔ اسلئے صَبْرٌ کے معنے قید کرنے کے بھی ہیں (ابن فارس) ۔ یا کسی کو باندھ کر تیروں کا نشانہ بنانا ۔ یَمِيْنُ الصَّبْرِ ۔ اس قَسَمْ کو کہتے ہیں جو کسی کو زبردستی (مجبور کرکے) کھلائی جائے* ۔

سورۃ بقرہ میں ہے فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَی النَّارِ ($\frac{2}{175}$) ۔ اس کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ان میں آگ کے مقابلہ کی تاب کسقدر ہے ۔ اور یہ بھی کہ وہ کونسی چیز ہے جس نے انہیں آگ کے عذاب کو جم کر برداشت کرنے پر آمادہ کر دیا ۔ ظاہر ہے کہ ان معانی میں جرأت کا مفہوم آجاتا ہے ۔

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ انہوں نے حضرت موسٰی؏ سے کہا لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ ($\frac{2}{61}$) ۔ ہم ایک ہی کھانے پر ہمیشہ کیلئے نہیں رہ سکتے ۔ اسی سورۃ (بقرۃ) میں ہے رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا ($\frac{2}{250}$) ۔ یہاں ”ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا“ نے صبر کے معنوں کی وضاحت کر دی ہے ۔ یعنی ثابت قدم رہنا ۔ سورۃ آل عمران میں صَابِرِيْنَ کی تعریف ان الفاظ سے کی گئی ہے فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ($\frac{3}{145}$) ۔ انہیں

*تاج ۔ **محیط ۔ ***لین و تاج ۔

خدا کی راہ میں جسقدر بھی مشکلات کا سامنا ہوا ان سے وہ نہ تو سست گام ہوئے، نہ ان میں کمزوری آئی، اور نہ ہی وہ مغلوب ہوئے۔ اگلی آیت میں اسی کو پھر ”ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا“ سے تعبیر کیا گیا ہے (۳/۱۴۶)۔ سورۃ الفرقان میں ہے کہ کفار کہتے تھے کہ یہ (رسولؐ) ہمیں ہمارے معبودوں سے بھکا دیتا لَوْلَا اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا (۲۵/۴۲)۔ اگر ایسا نہ ہوتا کہ ہم مستقل مزاجی سے ان کی پرستش پر قائم رہتے۔ یہی معنے سورۃ صٓ میں وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ (۳۸/۶) کے ہیں۔ (۱۴/۲۱) میں صَبَرْنَا بمقابلہ جَزِعْنَا آیا ہے۔ جَزْعٌ کے معنے ہیں رسی کو درمیان سے کاٹ دینا۔ لہذا صَبْرٌ معنے کسی کام کو مسلسل کئے جانا ہونگے۔ سورۃ کہف و حجرات میں صبر کا لفظ ان معنوں میں بھی آیا ہے جسکے لئے ہم کہتے ہیں کہ بے صبرے کیوں ہوئے ہو؟ (Dont Be Impatient)۔ ذرا ٹھہرو۔ یونہی بے چین مت ہو۔ (۱۸/۶۸ ; ۴۹/۵)۔ سورۃ انفال میں ہے کہ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (۸/۶۵) اگر تم میں سے بیس مجاہد بھی ایسے ہوں جو جم کر مقابلہ کریں تو فریق مخالف کے دو سو پر غالب آ جائیںگے۔ انہی کو اَلصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ (۲/۱۷۷) کہا گیا ہے۔ سورۃ مریم میں ہے وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ (۱۹/۶۵) خدا کی عبادت نہایت استقامت اور ثابت قدمی سے اختیار کرو۔

یہ ہے وہ صَبْرٌ جسکے متعلق کہا گیا ہے کہ اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (۲/۱۵۳)۔ اپنی قوتوں کی پوری نشو و نما اور اعتدال و تناسب کے لئے صبر اور صلوٰۃ کی راہ اختیار کرو۔ اور اسکے بعد ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۔ اللہ کی نصرت ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اپنے نصب العین کے حصول کے لئے استقامت اور ثابت قدمی سے کام لیتے ہیں اور ہر مشکل کا مقابلہ جم کر کرتے ہیں، اور مسلسل ایسا کرتے رہتے ہیں۔ یہی ہیں وہ صابر جن کے متعلق کہا کہ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ (۲/۱۵۷)۔

یہ ہے صَبْرٌ کا قرآنی مفہوم۔ اسکے برعکس صبر کے جو معنے ہمارے ہاں مروج ہیں وہ بالکل اس کی ضد ہیں۔ ہمارے ہاں صبر کے معنے یہ ہیں کہ انسان بے کس اور بے بس، مجبور بن کر بیٹھا رہے اور زبردست اور ظالم کے ظلم و زیادتی کو آنسو بہا بہا کر خاموشی سے جھیلتا چلا جائے۔ چنانچہ ہم اپنی انتہائی بیچارگی میں کہتے ہیں کہ۔ ”اچھا۔ جو تمہارے جی میں آئے کر لو۔ میں صبر کے سوا کیا کر سکتا ہوں“۔ اور اسی صبر کی تلقین یہ کہکر کی جاتی ہے کہ ”میاں! صبر کرو۔ صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے“۔

یعنے صبر انتہائی بیچارگی کا نام ہے۔ غور کیجئے کہ نگاہوں کا زاویہ بدل جانے سے الفاظ کا مفہوم کیا سے کیا ہو جاتا ہے؟ قرآنی صبر کا مفہوم تھا ڈٹ کر مقابلہ کرنا۔ اور ہمارے صبر کا مفہوم ہے انتہائی بے چارگی میں سپر ڈالدینا۔

مختصراً یہ کہ صَبْرٌ کے معنے ہیں اپنے پروگرام پر استقامت اور استقلال سے کار بند رہنا اور اسکے راستہ میں جو مشکلات آئیں ان کا ہمت اور استقلال سے اسطرح مقابلہ کرنا کہ پاؤں میں ذرا لغزش نہ آنے پائے۔ قرآن کریم میں مومنین سے کہا گیا ہے کہ اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا (۳/۱۹۹)۔ اِصْبِرُوْا کے معنے ہیں ہمت اور استقلال سے اپنے موقف پرقائم رہنا، اور صَابِرُوْا کے معنے ہیں اس استقلال اور استقامت میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرنا۔ یا دوسروں کے مقابلہ میں استقامت دکھانا یا ایک دوسرے کی استقامت کا موجب بننا۔

دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی، نہ آگے بڑھ سکتی ہے، جبتک وہ (قرآنی مفہوم میں) اَلصَّابِرُ نہ ہو۔ اور جو قوم ہمارے مفہوم میں ''صابر و شاکر'' ہو اسے کبھی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی۔

ص ب ع

اِصْبَعٌ کے معنے ہیں انگلی۔ نیز انگلی کے بالائی پور کو بھی کہتے ہیں۔ اس کی جمع اَصَابِعُ آتی ہے*۔ (جیسے قرآن کریم میں ہے ۲/۱۹)۔ صَبَعَ فُلَانًا عَلٰی فُلَانٍ کے معنے ہیں اس نے انگلی کے اشارے سے اس کی راہنمائی اُس دوسرے شخص کی طرف کر دی*۔

ص ب غ

اَلصَّبْغُ کے بنیادی معنی تغیر و تبدل، یعنے تبدیلی پیدا کر دینے کے ہیں۔ اسی سے اَلصَّبْغُ اور اَلصِّبَاغُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کپڑا وغیرہ رنگا جائے۔ صَبَغَ الثَّوْبَ کے معنے ہیں کپڑا رنگنا۔ اَلصَّبَّاغُ۔ رنگریز کو کہتے ہیں۔ (نیز کذّاب کو جو باتوں میں رنگ آمیزی کرے)۔ اَلصِّبْغَةُ۔ رنگنے کے طریقے کو کہتے ہیں۔ نیز دین و ملت کو بھی**۔

چونکہ رنگنے کے لئے کپڑے کو پانی میں ڈبویا جاتا ہے، اس لئے صَبَغَ يَدَهٗ بِالْمَاءِ کے معنے ہیں اس نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈبولیا۔ صَبَغَ فُلَانًا فِی النَّعِیْمِ۔ فلاں شخص کو نعمتوں میں ڈبو دیا۔ اسی نہج سے سالن کو

*تاج و محیط۔ **تاج

صِبْغٌ کہتے ھیں ، کیونکہ اس میں روٹی ڈبو کر کھائی جاتی ھے* ۔ (۲۳/۲۰) ۔
عیسائی اپنے بچوں کو بپتسمہ دینے کے لئے پانی میں غوطہ دیتے ھیں (یا رنگ چھڑکتے ھیں تو) اسے صِبْغَۃٌ یا اصْطِبَاغٌ کہا جاتا ھے* ۔

قرآن کریم میں ھے صِبْغَۃَ اللّٰہِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً (۲/۱۳۸) ۔ اللہ کا رنگ ۔ اس رنگ سے زیادہ حسن و زیبائی پیدا کرنے والا رنگ اور کون سا ھو سکتا ھے! سوال یہ ھے کہ صِبْغَۃَ اللّٰہِ سے مراد کیا ھے؟ اس کا جواب آیت کے باقی حصے نے خود ھی دے دیا ۔ وَ نَحْنُ لَہٗ عٰبِدُوْنَ (۲/۱۳۸) یعنے قوانین خداوندی کی پوری اطاعت اختیار کر لینا ۔ ایسی اطاعت جس طرح رنگ کپڑے کے رگ و ریشے میں سرایت کر جاتا ھے اور اس میں یکسر تبدیلی پیدا کر دیتا ھے ۔ لہذا قوانین خداوندی کی ھم آھنگی سے انسان کے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا ھو جاتی ھے جو اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ھے اور وہ ایک بالکل ''دوسرا'' انسان بن جاتا ھے ۔ یعنے اس کی مضمر صلاحیتیں نشو و نما پا لیتی ھیں اور اس میں صفاتِ خداوندی کا رنگ منعکس ھوتا چلا جاتا ھے ۔ اور جس طرح اللہ کی ذات میں مختلف اور متضاد قسم کی صفات (مثلاً غفور و رحیم اور جبار و قہار) اس طرح متوازن طور پر جمع ھیں کہ ان میں کبھی ٹکراؤ پیدا نہیں ھوتا ۔ (انہی کو الاسماء الحسنی کہتے ھیں ۔ یعنے مختلف صفات کا حسن کارانہ انداز سے یکجا ھونا) ۔ اسی طرح اس انسان کے اندر بھی متضاد صفات پورے توازن کے ساتھ یک جا رھتی ھیں اور ان میں کبھی کشمکش نہیں ھوتی۔ لیکن یہ چیز صرف معاشرہ کے اندر ممکن ھے ۔ اس لئے صِبْغَۃَ اللّٰہِ سے مراد کوئی ایسی ''روحانیت'' نہیں جسے خانقاھوں میں چلہ کشی سے حاصل کیا جائے یا اس میں کسی باطنی طریق سے ترقی کی جائے ۔ یہ نام ھے قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جو قرآنی معاشرہ کے اندر ممکن ھے ۔ نَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ ۔ اور نَحْنُ لَہٗ عٰبِدُوْنَ (۲/۱۳۸) کے یہی معنے ھیں اور انہی کے نتیجہ کا نام صِبْغَۃَ اللّٰہِ ھے ۔ ابن قتیبہ نے اس کے معنی دِیْنُ اللّٰہِ کئے ھیں** ۔

ص ب و

اَلصَّبْوَۃُ ۔ ابتدائے شباب کی نادانی ۔ عشقبازی ۔ صَبَتِ النَّخْلَۃُ ۔ کھجور کا مادہ درخت ، دور کے نر کھجور کے درخت کی طرف جھکا ۔ اَصْبَتْہُ الْمَرْاَۃُ ۔ عورت نے اس مرد کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور اپنی طرف مائل کیا۔

*تاج ۔ **القرطین ۔ ج/۱ صفحہ ۶۳ ۔

اَلصَّبِیُّ۔ وہ بچہ جس کا دودھ نہ چھڑایا گیا ہو۔ یا جو ابھی بالغ نہ ہوا ہو صَبَا فُلَانٌ یَصْبُوْ ۔ فلاں آدمی کسی چیز کی طرف مائل ہو کر بچوں کے سے کام کرنے لگ گیا* ۔ سورۃ یوسف میں ہے اَصْبُ اِلَیْهِنَّ (۱۲/۳۳) ۔میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں اور لڑکوں کی سی نا سمجھی کی باتیں کرنے لگ جاؤں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) مائل کرنا ۔ جھکانا۔ جھکنا۔ اور (۲) کم عمری۔ مطلب اس سے ہوگا عقل و فکر کی رو سے نہیں بلکہ محض جذبات کے تابع، بچوں کی طرح، کسی چیز کی طرف مائل ہوجانا ۔

ص ح ب

صَحِبَ کے معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ لگ جانا ۔ اَصْحَبْتُهُ الشَّیْءَ ۔ میں نے اسے اس چیز کے ساتھ لگا دیا ۔ صَحِبَهُ ۔ وہ اس کے ساتھ رہا ۔ لیکن اس میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جب کم مرتبہ آدمی کسی بڑے مرتبہ والے کے ساتھ رہے تو اس وقت ''اِنَّهُ صَاحَبَ الْاَعْلٰی'' بولتے ہیں ۔ اس کے برعکس بڑا آدمی چھوٹے کا مُصَاحِبٌ نہیں کہلائیگا ، حالانکہ یہ دونوں ایک دوسرے کےساتھ رہتے ہیں۔ اَلصُّحْبَةُ والمُصَاحَبَةُ کےمعنےہیں ساتھ رہنا ۔ اس میں یہ تخصیص ہے کہ یہ ساتھ رہنا لمبےعرصہ کے لئے ہونا چاہئے ۔ اگر لمبا عرصہ نہیں تو اسے اِجْتِمَاعٌ کہینگے* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ساتھ رہنے یا قریب رہنے کے ہوتے ہیں ۔

اَصْحَبَ الرَّجُلَ وَلَهُ کے معنے ہیں وہ اس آدمی کامطیع و فرمانبردار ہو گیا ۔ اَلْمُصَاحِبُ ۔ ہمیشہ ساتھ رہنے والا ۔ مطیع و فرمانبردار ساتھی* ۔ اَصْحَبَ فُلَانًا کے معنے ہیں ، اس کی حفاظت کی ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے وَلَا هُمْ مِنَّا یُصْحَبُوْنَ (۲۱/۴۳) ۔ ہمارے عذاب سے ان کی کوئی حفاظت نہیں کر سکے گا ۔ اَلصَّاحِبُ (جمع اَصْحَابٌ) ۔کسی کے ساتھ مسلسل رہنے والا، چیز کا مالک ۔ وہ شخص جو اس میں تصرف کا مالک ہو**۔ ساتھ رہنے (معاشرت) کے اعتبار سے بیوی کو صَاحِبَةٌ (۶/۱۰۲) کہا گیا ہے ۔

قرآن کریم میں اَصْحَابُ النَّارِ اور اَصْحَابُ الْجَنَّةِ آیا ہے ۔ اَصْحَابٌ کا لفظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جنت اور دوزخ مادی مقامات کا نام نہیں جن میں رہنا ہوگا ۔ یہ کیفیات کا نام ہے جو انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں ، اور لگی رہیں گی ۔ یہی صَحِبَ کے بنیادی معنی ہیں ۔

---

*تاج و راغب ۔ **تاج و محیط و راغب

انہی کو اَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ (۵۶/۸) اور اَصْحَابُ الْمَشْئَمَةِ (۵۶/۹) کہا گیا ہے۔ یعنی یمن و سعادت کے مالک اور شامت زدہ لوگ۔ سورۃ ذاریات میں اَصْحَابِهِمْ (۵۱/۵۹) سے مراد ہیں انہی جیسے لوگ۔ راغب نے کہا ہے کہ صَاحِبٌ ہراُس ساتھ رہنے والے کو کہدیا جاتا ہے جو مستقلاً کسی انسان یا حیوان یامکان یا زمان کے ساتھ رہے۔ خواہ یہ ساتھ رہنا جسمانی طور پر ہو یا فکری طورپر۔ صَاحِبُ الْحُوْتِ (۶۸/۴۸)۔ "مچھلی والا"۔ یعنی جسکے ساتھ مچھلی کا واقعہ گزرا تھا۔ یعنی ذَاالنُّوْنِ (۲۱/۸۷)۔

قرآن کریم میں اَصْحَابُ الْفِيْلِ۔ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ۔ اَصْحَابُ الْاَيْكَةِ۔ اَصْحَابُ الْحِجْرِ۔ مختلف پارٹیوں اور قوموں کے لئے آیا ہے جن کی تفصیل قرآن کریم کے متعلقہ مقامات میں ملے گی۔ علاوہ ازیں اَصْحَابُ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ کا قصہ سورۃ کہف میں آیا ہے۔ (ان سب کے تشریحی مفہوم کے لئے متعلقہ عنوانات دیکھئے)۔

سورۃ توبہ میں اُس واقعہ کا ذکر ہے جب نبی اکرمؐ (ہجرت کے وقت) ایک غار میں تھے اور آپ کے ہمراہ ایک "ساتھی" تھا۔ اس "ساتھی" کے متعلق کہا گیا ہے اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (۹/۴۰)۔ "جب (رسول اللہؐ نے) اپنے ساتھی سے کہا کہ مت گھبراؤ۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ساتھی حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔ اسی بنا پر حضورؐ کے باقی ساتھیوں کو بھی صحابہؓ کہا جاتا ہے۔

ص ح ف

اَلصَّحِيْفُ۔ روئے زمین۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی کشادگی اور وسعت بتائے ہیں۔ اَلصِّحَافُ۔ چھوٹے چھوٹے حوض جو پانی جمع کرنے کے لئے بنائے جائیں۔ اَلصَّحْفَةُ بڑا پیالہ۔ پھیلا ہوا چوڑا پیالہ جس سے پانچ آدمی سیر ہو کر دودھ یا پانی پی سکیں*۔ اَلصَّحِيْفَةُ۔ (جمع اَلصَّحَائِفُ والصُّحُفُ)۔ لکھا ہوا کاغذ۔ یہ لفظ عرف عام میں چہرہ اور کتاب کے ورق کے لئے بھی بولا جاتا ہے**۔ یہ دراصل ہر پھیلی ہوئی چیز کو کہتے ہیں***۔ اَلْمُصْحَفُ (میم کی تینوں حرکات کے ساتھ**)۔ متعدد صحیفوں (لکھے ہوئے اوراق) کا مجموعہ***۔ اَلتَّصْحِيْفُ۔ قرآن کریم کو اشتباہ حروف کی وجہ سے اسطرح پڑھنا یا روایت کرنا جسطرح وہ قرآن کریم میں نہیں***۔ قرآن کریم میں صِحَافٌ (واحد صَحْفَةٌ)

* تاج۔ ** محیط۔ *** راغب۔

بڑے بڑے طباق یا پیالوں کے لئے آیا ہے ۔ (۴۳/۷۱) ۔ رسول اللہ کے متعلق ہے یَتْلُوْا صُحُفاً مُّطَهَّرَةً (۹۸/۲)۔ جو پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرتا ہے ۔ ان لکھی ہوئی آیات قرآنی کی تلاوت کرتا ہے جو ہر قسم کے اسقام و نقائص سے پاک اور ذہن انسانی کی آمیزش سے منزہ ہیں ۔ غور کیجئے ۔ قرآنی آیات کو صحف کہکر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ شروع ہی سے لکھی جاتی تھیں ۔ اسکی تفسیر (۸۰/۱۳-۱۵) میں کر دی ، جہاں فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍ کہکر بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ کِرَامٍ بَرَرَةٍ سے اسکی تشریح کر دی کہ وہ ، واجب العزت والتکریم کاتبوں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرمؐ پورے قرآن کریم کو لکھا کر اُمت کو دیکر گئے تھے ۔ یہ صحیح نہیں کہ اسے بعد میں صحابہؓ نے جمع کیا تھا ۔ قرآن کریم کے علاوہ حضرت موسےٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی کتابوں کو صُحُفِ اِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰی ۔ (۸۷/۱۹) کہا گیا ہے ۔ اور عام لکھی ہوئی چیزوں کے لئے یہ لفظ (۸۱/۱۰) اور (۷۴/۵۲) میں آیا ہے ۔

ص خ خ

اَلصَّخُّ ۔ لوہے کو لوہے پر یا کسی اور سخت چیز کو سخت چیز پر زور سے مارنا ۔ (جیسے کارخانوں میں ہوتا ہے)۔ نیز اس طرح دو سخت چیزوں کے لگنے سے پیدا ہونے والی آواز اسی سے اَلصَّاخَّةُ سخت اور کرخت آواز کو کہتے ہیں جو کانوں کو بہرہ کر دے ۔ سخت مصیبت کو بھی کہتے ہیں ۔ چنانچہ صَخَّنِیْ فُلَانٌ بِعَظِیْمَةٍ کے معنے ہیں اس نے مجھ پر بہت بڑا اتہام لگایا * ۔

قرآن کریم میں انقلاب عظیم کیلئے آیا ہے فَاِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ (۸۰/۳۳) ۔ مبہوت کر دینے والی مصیبت ۔ اور اگر اس میں جنگ کی طرف بھی اشارہ ہے تو پھر ہتھیاروں کی جھنکار کا پہلو بھی اس میں مضمر ہے (اور ہماری Machine Age ۔ مشینی دور ، تو ہے ہی صَاخَّةٌ)۔

ص خ ر

اَلصَّخْرَةُ ۔ (جمع صَخْرٌ) بڑا سخت پتھر یا چٹان کا ٹکڑا ۔ اَلصَّاخِرُ ۔ لوہے پر لوہا مارنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے ** ۔ (یہ صَاخَّةٌ کے ہم معنی ہے ۔ دیکھئے عنوان ص ۔ خ ۔ خ)

---

* تاج ۔ نیز ابن فارس ۔ ** تاج و محیط و راغب ۔

سورۃ کہف میں ہے اِذْ اَوَیْنَا اِلَی الصَّخْرَۃِ (۱۸/۶۳) - جب ہم نے بڑے پتھر (یا چٹان) کے ٹکڑے کی پناہ لی تھی -

سورۃ فجر میں قوم ثمود کے متعلق ہے جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (۸۹/۹) انہوں نے وادی میں بڑی بڑی چٹانیں تراش کر (مکان بنائے) - صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ صَخْرَۃٌ ہر پتھر کو نہیں کہتے ، صرف بڑی چٹان کو کہتے ہیں - ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے -

ص د د

صَدَّ عَنْہُ - یَصُدُّ - صُدُوْداً - کسی سے رو گردانی کرنا - اعراض برتنا * - رَاَیْتَ الْمُنَافِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْکَ صُدُوْدًا (۴/۶۱) - تو منافقین کو دیکھے گا کہ وہ تجھ سے پورا پورا اعراض کرتے ہیں - منہ پھیر لیتے ہیں - صَدَّہٗ عَنْہُ - یَصُدُّہٗ - صَدًّا - اسے کسی چیز سے باز رکھا ، ہٹایا ، پھیر دیا ، روک دیا * - وَصَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (۲/۲۱۷) - اللہ کی راہ سے روکنا -

صَدَّ - یَصِدُّ صَدِیْدًا - اس نے شور و غوغا کیا - چیخ پکار کی * - اِذَا قَوْمُکَ مِنْہُ یَصِدُّوْنَ (۴۳/۵۷) تیری قوم اس پر چلا اٹھتی ہے -

صَدِیْدٌ - کھولتا ہوا گرم پانی - زخم سے رسنے والا خون آلود پانی - جہنمیوں کی کھالوں سے ٹپکنے والا پانی - نیز پیپ کو بھی کہتے ہیں * - جہنم کے پانی کو مَآءِ صَدِیْدٍ (۱۴/۱۶) کہا گیا ہے - کھیتیوں کی نشو و نما ہمیشہ ٹھنڈے پانی سے ہوتی ہے - کھولتا ہوا گرم پانی پودوں کو جلا دیتا ہے اور ان کی نشو و نما ختم ہو جاتی ہے - اسلئے جہنم کی زندگی میں انسانوں کو جو کچھ ملتا ہے اس سے ان کی جسمانی زندگی تو قائم رہتی ہے لیکن کشت انسانیت یکسر جھلس کر رہ جاتی ہے - اسی کو دوسری جگہ مَآءً حَمِیْمًا (۴۷/۱۵) کہا گیا ہے - انسانیت کی نشو و نما رک جانے کا نام جہنم ہے (دیکھئے عنوان ج - ح - م)

ص د ر

اَلصَّدْرُ - سینے کو کہتے ہیں (جمع صُدُوْرٌ ہے) - پھر ہر چیز کے اعلیٰ ، مقدم اور اگلے حصہ کو کہنے لگ گئے - صَدْرُ الْقَوْمِ - قوم کا رئیس ** -

---

* تاج و محیط - ** تاج

صَدَرَ ۔ یَصْدُرُ ۔ لوٹنا ۔ واپس ہونا ۔ یہ درحقیقت جانوروں کے پانی پی کر واپس آنے کیلئے بولا جاتا ہے ۔ وُرُوْدٌ ۔ پانی پینے کیلئے گھاٹ پر جانا ، اور صُدُوْرٌ ۔ واپس آنا ۔ اَلصَّادِرُ ۔ لوٹنے والا * ۔

لہذا اس لفظ کے معنے آگے جانا ۔ نکلنا اور لوٹنا ہیں ۔ نکل پڑنے کے معنوں میں یہ لفظ (۹۹/۶) میں آیا ہے ۔ اَصْدَرَ ۔ واپس لے جانا ، لوٹانا ۔ جانوروں کو پانی پلا کر واپس لے جانے کے معنوں میں یہ لفظ (۲۸/۲۳) میں آیا ہے ۔

صَدْرٌ (جمع صُدُوْرٌ) کا لفظ قرآن کریم میں دل کے معنوں میں آیا ہے ۔ اِنْ تُخْفُوْا مَافِیْ صُدُوْرِکُمْ (۳/۲۸) ۔ راغب نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں اللہ نے اَلْقَلْبُ کہا ہے تو اس سے مراد علم و عقل ہے اور جہاں صَدْرٌ کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس میں علم و عقل اور جذبات سب شامل ہیں ** ۔ لیکن یہ کُلیّہ نہیں ۔

قرآن کریم نے اپنے آپ کو شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (۱۰/۵۷) کہا ہے ۔ یعنی تمام ذہنی اور نفسیاتی امراض کے لئے شفا ۔ صاحب محیط نے بَنَاتُ الصَّدْرِ کے معنے تفکرات لکھے ہیں *** ۔

(شَرْحِ صَدْرِ کے لئے دیکھئے عنوان ش ۔ ر ۔ ح)

ص د ع

اَلصَّدْعُ ۔ کسی سخت چیز میں شگاف ڈالنا **** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز میں ''تریڑ'' پڑ جانا ، کسی چیز کا کھل جانا اور اس میں پھٹن پیدا ہو جانا یا بال آ جانا ہیں ۔ اَلصِّدْعُ ۔ لوگوں کی جماعت ۔ چیز کا ایک ٹکڑا ۔ پھاڑی ہوئی چیز کا آدھا حصہ ۔ صَدَعَہٗ صَدْعًا ۔ اس نے اسے پھاڑ دیا ۔ آدھا آدھا کر دیا ۔ اَلْمُتَصَادِعُ سخت زمین میں نرم راستے ۔ تیروں کی انیاں ۔ اَلصُّدَاعُ ۔ دردِ سر ۔ وہ درد جس سے سر پھٹا جا رہا ہو ۔ تَصَدَّعَ الْقَوْمُ وَاصَّدَعُوْا ۔ قوم متفرق ہو گئی ۔ صُدِّعَ الرَّجُلُ ۔ اس کے سر میں درد ہوا * ۔

سورۃ حجر میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ (۱۵/۹۴) ۔ آیت کا دوسرا ٹکڑا پہلے کی تشریح کررہا ہے ۔ یعنے اب ان مشرکین عرب سے اعراض برتو ۔ ان سے کنارہ کشی کرلو ۔ اور اپنی الگ جماعتی تنظیم کرو ۔ بعض نے اس کے معنے یہ بھی

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط ۔ ****تاج و راغب ۔

لکھے ھیں کہ جو کچھ تم سے کہا جاتا ھے اسے کھول کر بیان کرو۔ (لیکن ھمارے نزدیک پہلا مفہوم زیادہ موزوں ھے) ۔ سورۃ روم میں ھے یَوْمَئِذٍ یَصَّدَّعُوْنَ (۳۰/۴۳) ۔ جس دن وہ الگ الگ ھو جائینگے ۔ سورۃ واقعہ میں ھے لَا یُصَدَّعُوْنَ عَنْھَا (۵۶/۱۹) ۔ اس سے درد سر نہیں ھوگا ۔ دماغی خلل نہیں ھوگا ۔ سورۃ حشر میں ھے خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا (۵۹/۲۱) ٹکڑے ٹکڑے ھوجانے والا ۔ پھٹا ھوا۔ سورۃ طارق میں ھے وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ (۸۶/۱۲)۔ ”زمین جو پودوں کے اگنے کے وقت پھٹ جاتی ھے“۔ قرآن کریم نے بتایا ھے کہ کائنات میں ھر شے تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کی گئی ھے ۔ (بِالْحَقِّ) ۔ لیکن ھم دیکھتے ھیں کہ اس میں بعض عمل تخریبی بھی ھوتے ھیں ۔ وہ کہتا ھے کہ یہ تخریب در حقیقت تعمیرھی کی تمہید ھوتی ھے۔ مثلاً ھم زمین میں تخم ریزی کرتے ھیں تو اس کے بعد دانہ پھٹ جاتا ھے اور اس کے ساتھ زمین بھی شق ھوجاتی ھے ۔ بظاھر یہ تخریبی عمل ھے ۔ لیکن اس سے فصل کی ابتداء ھوتی ھے جو یکسر تعمیری نتائج کی حامل ھوتی ھے۔ اسی طرح ھر تعمیر سے پہلے تخریبی عمل ھوتا ھے ۔ اِلَّا اللّٰہُ سے پہلے لَا اِلٰہَ ضروری ھے ۔ لیکن اگر کسی پروگرام میں صرف لا ھی لا ھو تو وہ تخریب ھی تخریب پیدا کرتا ھے ۔ اسلئے

لَا و اِلَّا سازو برگِ امتاں   نفی بے اثبات مرگِ امتاں

لہذا ، ارض کا ذَاتُ الصَّدْعِ ھونا، انسانی نشو و نما کے لئے ھے۔

ص د ف

اَلصَّدَفُ ۔ سیپی ۔ ھربلند عمارت یا دیوار یا پہاڑ* ۔ ابن فارس نے الصَّدَف کے معنے پہاڑ کا کنارہ یا جانب کئے ھیں کیونکہ وہ ایک طرف کو جھکا ھوتا ھے ۔ قرآن کریم میں ھے اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ (۱۸/۹۶) ۔ یہاں صَدَفَیْنِ کے معنے دو بلند پہاڑ ھیں ۔ اَلصَّدَفُ ۔ گھوڑے یا اونٹ کی ٹانگوں کی کجی* ۔ ٹیڑھے پن کے اعتبار سے صَدَفَ عَنْہُ کے معنے کسی سے اعراض برتنا ۔ منہ موڑ لینا ھوتے ھیں ** ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی میلان اور جھکاؤ کے ھیں ۔ اور جب اس کے ساتھ عَنْ آئیگا تو اس کے معنی منہ پھیر لینے کے ھوجائینگے (۶/۱۵۸) ۔ بغیر عَنْ کے بھی یہ معنی آجاتے ھیں ۔ صَدَفَ فُلَانٌ وہ جھکا نیز اس نے منہ پھیرلیا۔ جیسے قرآن کریم میں ھے ثُمَّ ھُمْ یَصْدِفُوْنَ (۶/۴۶) ۔ یہ لوگ اس پر بھی اعراض برتتے اور منہ پھیر لیتے ھیں ۔ اَلصَّدُوْفُ ۔ اس عورت کو کہتے ھیں جو اپنا رخ دکھائے اور پھر منہ پھیر لے * ۔

---

* تاج ** راغب۔

ص د ق

صِدْقٌ۔ کِذْبٌ کی ضد ہے ۔ جیسا کہ کِذْبٌ کے عنوان میں لکھا گیا ہے ، جب انسان کا دل اور اسکی زبان ہم آہنگ نہ ہوں تو اسے کِذْبٌ کہتے ہیں ، خواہ وہ بات جسے وہ بیان کر رہا ہے ، سچی ہی ہو۔ اس لئے صِدْقٌ کے معنے ہونگے ، دل و زبان کی ہم آہنگی کے ساتھ بات کا نفس واقعہ کے مطابق ہونا ۔ اسی کو سچ کہتے ہیں ۔ لیکن اس کی ایک شکل اور بھی ہے ۔ ایک شخص کو کسی واقعہ کے متعلق جو کچھ معلوم ہے وہ غلط ہے ، لیکن اسے جو کچھ معلوم ہے اسے وہ ٹھیک ٹھیک بیان کر رہا ہے ۔ اس صورت میں اس کے دل اور زبان میں تو ہم آہنگی ہوگی ، لیکن اسکی بات غلط ہو گی۔ اس شخص کو ہم جھوٹا نہیں کہینگے ، البتہ اس کی بات کو غلط کہینگے ۔ نیز صِدْقٌ کے معنے قوت اور شدت کے بھی آتے ہیں *۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہی قوت کے ہیں اور سچ کو الصِّدْقُ اسی لئے کہتے ہیں کہ سچ میں فی نفسہ قوت ہوتی ہے ، اور جھوٹ بودا اور کمزور ہوتا ہے ۔ شَیْءٌ صَدْقٌ ۔ ٹھوس اور سخت چیز کو ، اور رُمْحٌ صَدْقٌ مضبوط نیزہ کو کہتے ہیں ۔ لہذا اس مادہ سے جتنے الفاظ آئینگے ان میں ان بنیادی معانی کا پہلو مضمر ہوگا۔ اسے ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے ۔

اَلصِّدِّیْقُ ۔ دوست کو کہتے ہیں ۔ اَلصِّدِّیْقُ ۔ بہت سچ بولنے والا ۔ جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو ۔ سچ کا اس قدر خوگر کہ اس سے جھوٹ کا امکان ہی نہ ہو۔ نیز صِدِّیْقٌ وہ ہے جو اپنے قول و اعتقاد میں سچا ہو اور اس کی سچائی کی تصدیق اپنے عمل سے بھی کر دکھائے ۔ اس لئے کہ صَدَّقَ کے معنے ہیں سچ کرکے دکھا دینا ۔ (تفصیل اس کی آگے چل کر آتی ہے) ، اَلصَّدَقَةُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو خدا کی راہ میں دی جائے * ۔ بعض کا خیال ہے کہ صَدَقَةٌ وہ ہے جو واجب نہ ہو بلکہ محض بطور خیرات دیا جائے ، اور زَکٰوۃٌ وہ ہے جس کا دینا واجب ہو۔ جیسا کہ زکٰوۃٌ کے عنوان (ز ۔ ک ۔ و) میں بیان ہو چکا ہے ، جب قرآنی نظام اپنی تکمیل تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں جو کچھ افراد کی ضروریات سے زائد ہو سب کا سب معاشرہ (یا نوع انسانی) کی فلاح و بہبود کے لئے وقف ہو جاتا ہے ۔ لیکن عبوری دور میں اسلامی معاشرہ ایک معین رقم افراد پر واجب قرار دیتا ہے ،

* تاج و راغب ۔

جو عام حالات میں وصول کر لی جاتی ھے - (اس کے لئیے زکٰوۃ کا لفظ بطور اصطلاح استعمال کر لیا گیا ھے) - لیکن ھنگامی حالات (Emergency) میں افراد سے اپیل کی جاتی ھے - جو کچھ وہ اس طرح دیتے ھیں وہ صَدَقَةٌ ھے - لیکن یہ بھی اجتماعی طور پر وصول اور اجتماعی طور پر خرچ کیا جاتا ھے (۹/۶۰ ; ۹/۱۰۳) -

صَدَقَ کے معنے ھیں اس نے جو کچھ کہا اس پر عمل کرکے اسے سچ کر دکھایا* - سورۃ احزاب میں ھے مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (۳۳/۲۳) - مومنوں میں سے وہ لوگ ھیں جنھوں نے اپنے اللہ سے کئیے ھوئے عہد کو اپنے عمل سے سچ کر دکھایا - اسی طرح سورۃ آل عمران میں ھے وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ (۳/۱۵۰) - "یقیناً اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اسے سچ کر دکھایا" - سورۃ زمر میں ھے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ (۳۹/۹۴) - "حمد، اللہ کیلئے ھے جس نے اس وعدہ کو جو اس نے ھم سے کیا تھا سچ کر دکھایا" - سورۃ بقرہ میں ھے کہ نیکی اور کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ھو یا مغرب کی طرف - کشاد کی راہ یہ ھے کہ تم صحیح تصوراتِ حیات کے بعد، اپنے اعمال و کردار سے انھیں سچ کرکے دکھا دو - ایسے لوگوں کے متعلق کہا گیا ھے، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا (۲/۱۷۷) - یہ وہ لوگ ھیں جنھوں نے اپنے ایمان کو اپنے عمل سے سچ کر دکھایا - عمل سے سچ کر دکھانے کے علاوہ، اعتقادات و تصورات حیات کے معاملہ میں صادق وہ ھے جو اپنے دعوی کی تائید میں دلیل و برھان پیش کر سکے (۲/۱۱۱) - اسی میں اس دعویٰ کی تقویت کا راز ھے -

کسی واجب کام کے نہ کر سکنے کی وجہ سے جو کچھ بطور کفارہ دیا جاتا ھے اسے بھی صَدَقَةٌ کہا گیا ھے (۲/۱۹۶) - سورۃ بقرہ میں صَدَقَاتٌ کا لفظ الرِّبٰوا (سود) کے مقابلہ میں آیا ھے (۲/۲۷۶) - یعنی رِبٰوا تو یہ ھے کہ جو کچھ تمہارا واجب ھے اس سے زیادہ لو، اور صَدَقَة یہ ھے کہ جو کچھ تم پر واجب ھے (نوع انسانی کی ربوبیت کے لئیے) اس سے بھی زیادہ دو - اسی لئیے کہا ھے کہ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِی الصَّدَقَاتِ (۲/۲۷۶) ربوا (جسے تم بزعمِ خویش سمجھتے ھو کہ ھم نے زیادہ وصول کر لیا) تباہ و برباد ھو کر رھتا ھے - اور صَدَقَاتٌ (جسے یہ لوگ سمجھتے ھیں کہ انھوں نے خواہ مخواہ دیدیا) بہت بڑھتے ھیں - اور تَصَدَّقَ واصَّدَّقَ کے معنے ھیں جو کچھ کسی پر تمہارا واجب ھے اسے بھی چھوڑ دینا، بطیب خاطر دیدینا،

*محیط و راغب -

صدقہ کر دینا ۔ مثلاً اگر قرضدار غریب ہو گیا ہے تو اسے قرض معاف کر دیا جائے (۲/۲۸۰) نیز (۴/۹۲ ؛ ۵/۴۵) ۔ عورتوں کا مہر بھی صَدُقَۃ ہے (۴/۴) لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ دال کے ضمہ (پیش) سے آیا ہے ۔ یعنی صَدُقَۃ ۔ واضح رہے کہ مہر کوئی متعین رقم نہیں جس کے عوض عورت کو خریدا جاتا ہے ۔ یہ محض ایک تحفہ (Gift) ہے جسے بطیب خاطر دیا جاتا ہے ۔ لیکن اس کا دینا ضروری ہے ۔ (مہر کا لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا)۔ صَدُقَۃ میں اخلاص (صدق) اور حق و دوستی اور رفاقت (صداقت) کا مفہوم مضمر ہے ۔

صَدِیْق ۔ دوست کو کہتے ہیں (۲۶/۱۰۱) (یہ واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے)۔ سورۃ یونس میں ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو مُبَوَّاَ صِدْقٍ عطا کیا (۱۰/۹۳) ۔ اس کے معنے ہیں ایسی سرزمین جو قوتوں اور توانائیوں، خوشگواریوں اور صلاحیتوں (Potentialities) سے بھری ہوئی تھی ۔ (صاحب تاج العروس نے اسکے معنے مَنْزِلاً صَالِحاً لکھے ہیں)۔

قرآن کریم میں صَدَقَ اور صَدَّقَ دونوں الفاظ ”سچ کر دکھادینے“ کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں ۔(صَدَقَ کی مثالیں ہم پہلے دے چکے ہیں ۔ نیز سورۃ الفتح میں ہے) لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ .... (۴۸/۲۷) ”یقیناً اللہ اپنے رسول کے خواب کو عنقریب سچا کر دکھائیگا“ *۔ اور سورۃ صافات میں حضرت ابراھیم کے تذکرہ کے ضمن میں ہے قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا (۳۷/۱۰۵) ”تو نے خواب کو سچ کر دکھایا“۔ اسی صَدَّقَ سے مُصَدِّق ہے جس کے معنے ہیں سچ کرکے دکھا دینے والا (۳/۳۸) ۔ اللہ تعالٰی نے قرآن کریم کے متعلق بار بار کہا ہے کہ یہ مُصَدِّقاً لِّمَا مَعَکُمْ (۲/۴۱) ہے ۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ قرآن کریم اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ اھل کتاب کے پاس ان کی مزعومہ کتابیں بالکل سچی ہیں ۔ یہ معنے اس لئے غلط ہیں کہ خود قرآن کریم میں ان کتابوں کی بابت واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ان میں تحریف والحاق ہو چکا ہے ۔ لہذا جن کتابوں کو قرآن کریم خود محرّف قرار دے رہا ہو وہ ان کے سچا ہونے کی تصدیق کس طرح کر سکتا ہے ؟ دراصل (مُصَدِّقاً لِّمَا مَعَکُمْ) میں ایک بہت بڑی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے ۔ عام اخلاقی اصول دنیا کی ہر قوم کے پاس بالعموم موجود ہیں ۔ سب کی تعلیم یہ ہے کہ سچ بولو ۔ جھوٹ نہ بولو ۔

*صَدَقَ بمعنی صَدَّقَ یعنی تصدیق کی، بھی آتا ہے ۔ آیت (۴۸/۲۷) میں اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے رسول کے دیکھے ہوئے خواب کی تصدیق کی اور اسے بتایا کہ تمہارا یہ خواب سچ ہو کر رہے گا ۔ (راغب و کشاف)

چوری نہ کرو۔ حرام نہ کھاؤ۔ کسی کو نہ ستاؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کے ہاں یہ تعلیم محض نظری حیثیت سے موجود ہے۔ کوئی عملی نظام ایسا نہیں جو اس تعلیم کو سچا کرکے دکھائے۔ قرآن کریم کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ یہ صرف اس تعلیم کو بیان نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک ایسا عملی نظام بھی دیتا ہے جس میں یہ تعلیم سچ بنکر سامنے آجاتی ہے۔ ساری دنیا کہتی ہے کہ ظالم کبھی پنپ نہیں سکتا ، لیکن اس کے باوجود ہم ظالموں کو پنپتا دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ قرآن کریم بھی یہی کہتا ہے کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۱۳۶) لیکن وہ اس کے ساتھ ایک عملی نظام ایسا دیتا ہے جس میں یہ اہم حقیقت (کہ ظالم کی کھیتی کبھی بارآور نہیں ہو سکتی) عملاً سچ بنکر سامنے آجاتی ہے۔ اسے کہتے ہیں مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ۔ یعنی وہ اخلاقی اصول جو دنیا میں محض نظری تعلیم بن کر رہ چکے ہیں قرآنی نظام میں ایک ٹھوس حقیقت بنکر سامنے آجائینگے ، اور اس طرح دنیا دیکھ لے گی کہ وہ اصول فی الواقعہ صداقت پر مبنی ہیں۔ اس طرح قرآن کریم ان اصولوں کو سچ کرکے دکھا دینے والا ہے۔ جو اقوام عالم کے ہاں موجود ہیں اور ان اصولوں کو بھی جو ان کے علاوہ ، قرآن کریم میں آئے ہیں اور جن سے آسمانی ہدایت عالمگیر اور مکمل ہوئی ہے نیز اس اعتبار سے بھی کہ کتب سابقہ (توراۃ و انجیل) میں ایک آنے والے نبیؐ کے متعلق جس قدر نشانات مذکور تھے قرآن کریم نے ان سب کو نبی اکرمؐ کے ظہور میں سچا ثابت کر دیا۔ علامہ حمید الدین فراہیؒ نے (اپنی کتاب مفردات القرآن میں) اس سلسلہ میں بڑی مفید بحث کی ہے جسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :—

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۔ یہ دو کلمے ہیں جن کا مفہوم اکثر لوگوں نے نہیں سمجھا۔ انہوں نے خیال کر لیا کہ قرآن کریم نے تحریف و تبدیل شدہ کتابوں کی شہادت دی ہے۔ مُصَدِّقًا کا لفظ شبہ کا موجب ہو سکتا تھا کیونکہ تَصْدِيْق کا لفظ اس مفہوم کے لئے مشترک ہو سکتا ہے۔ اور بَيْنَ يَدَيْهِ کے مفہوم کو لوگوں نے اس لئے نہیں سمجھا کہ اس زمانہ میں خصوصیت کے ساتھ لوگ عربیت سے واقف نہیں رہے۔

واضح رہے کہ صَدَّقَهٗ کے دو معنی ہوتے ہیں ، ایک تو یہ کہ کسی آدمی یا بات کی سچائی کی شہادت دینا ، اور دوسرے معنی یہ کہ اس نے اسے اسکی توقعات میں سچا بنا دیا۔ حماسہ میں ہے :-

فَدَتْ نَفْسِيْ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنِيْ
فَوَارِسَ صَدَّقَتْ فِيْهِمْ ظُنُوْنِيْ

میری جان اور وہ تمام چیزیں جو میرے قبضہ میں ہیں ان شہسواروں پر قربان جن کے متعلق میرے تمام خیالات (توقعات) سچ ثابت ہو گئے۔

اسی معنے میں قرآن کریم میں آیا ہے وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ (۲۰/۳۴) اور ابلیس نے ان کے بارے میں اپنا ظن سچ کر دکھایا۔ سو انہوں نے اس کی پیروی کی''۔

اگر آپ اس لفظ کے مواقع استعمال پر غور کرینگے تو معلوم ہو جائیگا کہ یہاں یہ دوسرے معنے ہی مراد ہیں، کیونکہ نبی اکرمؐ اور قرآن کریم بالکل اسی طرح آئے جس طرح تورات نے خبر دی تھی۔ لہذا آپ کی اور قرآن کریم کی آمد نے تورات کو سچ کر دکھایا۔ اس کے بعد اگر وہ لوگ قرآن کریم اور نبی اکرمؐ کی تکذیب کرتے ہیں تو انکی طرف سے یہ خود ان کی اپنی کتابوں کی تکذیب ہوگی [اس کے بعد علامہ فراہیؒ نے بتایا ہے کہ امام رازی وغیرہ نے ان آیات کے مفہوم میں کس طرح غلطی کھائی ہے، اور صحیح پوزیشن کیا ہے۔ ہم بحث کے اس حصے کو چھوڑتے ہیں۔ جو حضرات اس سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ اس بحث کو ان کی مذکورہ بالا کتاب کے صفحات ۶۴ تا ۶۷ پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں]

علاوہ ان کے جنکا پہلے ذکر آچکا ہے، صَدَقَ کی مختلف شکلیں قرآن کریم میں اس طرح آئی ہیں۔ سچ کہنا۔ تصدیق کرنا۔ صَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (۳۶/۵۲)۔ سچ کر دکھانا۔ اولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا (۲/۱۷۷)۔ نیز لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا (۴۸/۲۷)۔ قَدَمَ صِدْقٍ (۱۰/۲) ایسی سبقت جو شرف و فضیلت کو لئے ہو۔ مُدْخَلَ صِدْقٍ اور مُخْرَجَ صِدْقٍ (۱۷/۸۰)۔ شرف وفضلیت کے ساتھ آگے بڑھنا اور شرف وفضیلت کے ساتھ مناسب وقت پر پیچھے ہٹنا۔ یا سچائی کے ساتھ کسی معاملہ وغیرہ میں داخل ہونا اور سچائی کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہونا اور نکلنا۔ لِسَانَ صِدْقٍ (۲۶/۸۴) شرف وفضیلت کی بناء پر حقیقی شہرت۔ مَقْعَدِ صِدْقٍ (۵۴/۵۵) ٹھہرنے کا ایسا مقام جس میں زندگی کی تمام خوشگواریاں موجود ہوں۔ صَادِقٌ (۱۹/۵۴) سچا۔ مخلص۔ اَصْدَقُ۔ صادق تر، زیادہ سچا (۴/۸۷)۔ تَصْدِيْقٌ۔ سچ کرکے دکھانا (۱۲/۱۱۱) مُتَصَدِّقٌ کسی کو کچھ بطور بخشش دیدینے والا یا جو کچھ اس کا کسی پر واجب (Due) ہو اسے چھوڑ دینے والا (۱۲/۸۸)۔ سورۃ حدید میں صدقہ دینے والوں کو مُتَصَدِّقٌ کہا گیا ہے (۵۷/۱۸) یعنی جو کچھ واجب ہے اس کے علاوہ اور بھی دینے والے۔ یہ سب اس لئے کہ وہ اپنے اس دعوٰی کو سچا کر

دکھائیں کہ ان کا فریضہ زندگی دوسروں کی نشو و نما کرنا ہے۔ کَذَّبَ کے مقابلہ میں صَدَّقَ (۳۲ : ۷۵) میں آیا ہے۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ صِدْقٌ کسی شکل میں بھی استعمال ہو، اس میں دل کی ہم آہنگی اوررضامندی کا پہلو ضرور شامل ہوتا ہے۔ یعنی جو کچھ کیا جائے یا دیا جائے وہ بھی دل کی رضامندی اور خوشنودی لئے ہو اور جو کچھ مانا اور تسلیم کیا جائے وہ بھی بطیب خاطر ہو۔ اس میں جبور و اکراہ کا شائبہ تک نہ ہو۔ قرآنی تعلیم کا بنیادی نقطہ ہی یہ ہے کہ انسان کی ہر بات اور ہر عمل دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ یہی وہ عمل ہے جو وجہ تقویت ہو سکتا ہے، خود اس کام کے کرنے والے کے لئے بھی اور نوع انسانی کے لئے بھی۔ اس لئے اس کی رو سے صِدْقٌ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

ص د ی

اَلصَّدَیٰ ۔ کے بہت سے معنے ہیں، جن میں سے ایک معنے ہیں صدائے باز گشت (جو کسی مکان یا پہاڑ سے ٹکرا کر واپس آئے)۔ اَصْدَیَ الْجَبَلُ ۔ پہاڑ نے صدا کا جواب دیا۔ اَلصَّدَیٰ ۔ مطلق آواز کو بھی کہتے ہیں۔ اَلتَّصْدِیَۃُ ۔ تالیاں پیٹنا*۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلتَّصْدِیَۃ ہر اس آواز کو کہتے ہیں جو صدی کی طرح ہو، یعنی جس سے کوئی مفہوم نہ نکلتا ہو یا جس میں غنا و خوش الحانی نہ ہو**۔ قرآن کریم میں ہے کہ (عہد جاہلیہ کے عربوں کی صَلٰوۃ) مُکَاءً وَّ تَصْدِیَۃً (۸ : ۳۵) کے سوا کچھ نہیں رہ گئی تھی۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے مفہوم ہے بے معنے آواز اور حرکت**۔ (اس آیت کے مفہوم کے لئے عنوان م ۔ ک ۔ و دیکھئے)۔ صَادَاہُ ۔ سامنے آنا۔ تَصَدّٰی لَہٗ ۔ سر اٹھائے ہوئے کسی کے سامنے آنا۔ بار بار کسی کے سامنے آنا۔ صدائے باز گشت کی طرح کسی کی طرف پلٹنا، درپے ہو جانا۔ متوجہ ہونا***۔ فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی (۸۰ : ۶)۔ تو اس کی طرف بڑی شدت سے متوجہ ہوتا ہے۔

ص ر ح

اَلصَّرْحُ ۔ ہر چیز میں سے خالص۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اس خالص چیز کو کہتے ہیں جو سفید ہو۔ کَاْسٌ صُرَاحٌ ۔ وہ پیالہ (شراب وغیرہ کا)

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔

جو خالص ہو اور اس میں کسی چیز کی ملاوٹ نہ ہو۔ اَلتَّصْرِیْحُ ۔ (لازم اور متعدی) معاملہ کو واضح کر دینا ۔ معاملہ کا کھل جانا ۔ صاف اور خالص ہو جانا* ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ظاہر ہونے اور کھل جانے کے لکھے ہیں ۔ لَبَنٌ صَرِیْحٌ ۔ خالص دودھ جس کے جھاگ بیٹھ چکے ہوں ۔ اَلصُّرَاحِیَۃُ ۔ خالص شراب ۔ اَلصُّرَاحِیَّۃُ ۔ شراب کا برتن ۔ اَلصَّرْحَۃُ ۔ زمین کا اوپر کا حصہ ۔ پشتِ زمین جو ہموار ہو ۔ اَلصَّرْحُ ۔ بلند ، منقش و مزین شاندار مکان جو دوسرے گھروں سے منفرد اور الگ ہو ۔ بلند عمارت ۔ اس کے بعد یہ لفظ محل کے لئے استعمال ہونے لگا* ۔

سورۃ نمل میں ہے اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ (۲۷/۴۴)۔ یہاں اس کے معنے محل کے ہیں ۔ اور سورۃ مومن میں صَرْحًا (۴۰/۳۶) ۔ بلند عمارت کے لئے آیا ہے ۔

ص ر خ

اَلصُّرَاخُ ۔ سخت آواز یا فریاد کو کہتے ہیں ۔ اَلصَّرْخَۃُ ۔ مصیبت یا فریاد کے وقت سخت چیخ مارنا ۔ اَلصَّارِخُ ۔ فریاد کرنے والا ۔ نیز فریادی کی مدد کے لئے پہنچنے والا ۔ (فریاد رس) ۔ اَلصَّرِیْخُ کے بھی یہی معنی ہیں** ۔ قرآن کریم میں ہے فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ (۳۶/۴۳) ۔ ان کا کوئی فریاد رس نہ ہوگا ۔ صَرِیْخٌ مصدر بھی ہے یعنی اس کے معنے فریاد رسی، چیخ و پکار بھی ہیں ۔ اَلْمُصْرِخُ ۔ فریاد رس ، پکار پر مدد کے لئے پہنچنے والا ۔ وَمَا اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ (۱۴/۲۲)۔

اِصْطَرَخَ ۔ چیخنا ۔ چلانا (مدد کے لئے) ۔ وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا (۳۵/۳۷) ۔ وہ اس میں مدد کے لئے چیخیں چلائینگے ۔ دہائی دینگے ۔ فریاد اور واویلا کرینگے ۔

اِسْتَصْرَخَ ۔ کسی سے مدد مانگنا ۔ مدد کے لئے چلانا (۲۸/۱۸) ۔

ص ر ر

اَلصِّرَّۃُ ۔ اَلصِّرُّ سردی یاسردی کی شدت**** ۔ وہ سردی (پالا) جس سے کھیتیاں تباہ ہو جاتی ہیں*** ۔ زجاج نے کہا ہے کہ اَلصِّرَّۃُ ۔ سخت چیخنے اور چلانے کو کہتے ہیں ۔ رِیْحٌ صِرٌّ وَ صَرْصَرٌ ۔ سخت آواز والی

*تاج و راغب ۔ **تاج و محیط نیز ابن فارس ۔ ***لین ۔ ****تاج ۔

تیز ہوا۔ ابن عباس نے کہا ہے کہ سخت گرم ہوا کو بھی کہتے ہیں*۔ لیکن صَرٌّ کے بنیادی معنے باندھنے کے ہیں۔ (راغب نے کہا ہے کہ) صَرْصَرٌ کا لفظ بھی اسی صَرٌّ سے نکلا ہے اس لئے کہ ٹھنڈ سے بھی چیزیں بندھ کر جم جاتی ہیں**۔ اسی سے اِصْرَارٌ ہے جس کے معنے ہیں کسی بات پر سختی سے جم جانا۔ اَلصُّرَّةُ۔ اس تھیلی کو کہتے ہیں جس میں نقدی باندھی جاتی ہے**۔ اور اس طرح باندھی ہوئی نقدی کو اَلصَّرِیْرَۃُ کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے ان معانی کے علاوہ، اس کے معنی بلند اور اونچا ہونا بھی لکھے ہیں۔ چنانچہ اَلصِّیَارُ ان اونچے مکانوں کو کہتے ہیں جن تک سیلاب کا پانی نہ پہنچ سکے۔

قرآن کریم میں سخت سردی کے لئے یہ لفظ ($\frac{3}{116}$) میں آیا ہے۔ ($\frac{53}{19}$) میں رِیْحًا صَرْصَرًا آیا ہے۔ سورۃ الذّٰرِیٰت میں فِیْ صَرَّةٍ ($\frac{51}{29}$) کے معنے ہیں تعجب سے کچھ بولتی ہوئی۔ لیکن اس میں شدت کے معنے ہونگے۔ اس کے معنی منہ بسورنے کے بھی آتے ہیں*۔ اس کے معنے چیخ و پکار، شور و غل، تکلیف کی شدت بھی ہیں*۔ نیز کسی چیز کی بھی شدت۔ مثلاً حیرت کی شدت، فرط تعجب۔

سورۃ آل عمران میں ہے وَلَمْ یُصِرُّوْا ($\frac{3}{135}$)۔ وہ اصرار نہیں کرتے۔ جم کر نہیں بیٹھ جاتے۔ غلطی کا احساس ہوجانے پر اس کام سے فوراً ہٹ جاتے ہیں۔

ص ر ط

صِرَاطٌ۔ عام عرب اسے سِرَاطٌ پڑھتے ہیں۔ صاد کے ساتھ (صِرَاطٌ) قریش کا لغت ہے۔ سَرَطَ کے معنے ہیں کسی چیز کو بغیر چبائے نگل جانا۔ چنانچہ سِرَاطٌ (اور صِرَاطٌ) اس لمبی تلوار کو کہتے ہیں جو بہت کاٹنے والی ہو۔ گویا وہ جس چیز پر پڑتی ہے اسے نگل جاتی ہے۔ اسی نہج سے کھلے اور واضح راستہ کو بھی صِرَاطٌ کہتے ہیں۔ (یا تو تلوار کے سیدھے اور لمبے ہونے کی وجہ سے۔ اور یا اس لئے کہ چلنے والا اسے نگلتا چلا جاتا ہے۔ یا وہ راستہ ہزارہا راہرووں کو نگلتا چلا جاتا ہے)***۔

قرآن کریم نے اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ($\frac{1}{5}$) کو دوسرے مقام پر طَرِیْقٌ مُسْتَقِیْمٌ ($\frac{46}{30}$) کہہ کر صِرَاطٌ کے معنے طَرِیْقٌ (راستہ) بتا دئیے ہیں۔ (مُسْتَقِیْمٌ کے معنوں کیلئے دیکھئے عنوان ق۔ و۔ م)۔

(قرآن کریم میں ''پل صراط'' کا کوئی ذکر نہیں)۔

---

*تاج۔ **راغب۔ ***تاج۔ دیکھئے عنوان سرط و صرط۔

ص ر ع

اَلصَّرْعُ ۔ اَلتَّصْرِيْعُ ۔ زمین پر پٹک دینا ۔ پچھاڑ دینا ۔ اَلصُّرَعَةُ ۔ وہ شخص جو لوگوں کو بہت زیادہ پچھاڑتا ہو ۔ اَلصَّرِيْعُ ۔ پچھاڑا ہوا ۔ اس کی جمع صَرْعیٰ آتی ہے* ۔

قرآن کریم میں ہے فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى (۶۹/۷) یعنی تم دیکھوگے کہ لوگ اس میں پچھڑے پڑے ہیں ۔ اَلصَّرْعُ ۔ مرگی کی بیماری کو کہتے ہیں ۔ اَلصَّرْعُ ۔ اَلصِّرْعُ ۔ مثل ۔ برابر کا ۔ هُمَا صِرْعَانِ ۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے مثل اور برابر کے ہیں ۔ اَلْمِصْرَاعَانِ مِنَ الْبَابِ ۔ دروازے کے دونوں پٹ ۔ اَلْمِصْرَاعَانِ مِنَ الشِّعْرِ ۔ شعر کے دونوں مصرعے* ۔

ص ر ف

اَلصَّرْفُ کے معنے ہیں کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیر دینا یا اسے کسی دوسری چیز کے ساتھ تبدیل کر دینا ۔ یعنی یا تو خود اسکی حالت میں تبدیلی پیدا کردینا یا اسے کسی اور چیز سے بدل دینا** ۔ نیز لوٹا دینا ۔ رخ پھیر دینا ۔ ہٹا دینا *** ۔ صَرَفَ الصِّبْيَانَ مِنَ الْمَكْتَبِ ۔ بچوں کو مکتب سے لوٹا دیا ۔ واپس کر دیا ۔ صَرَفَ الرَّسُوْلَ ۔ قاصد کو جہاں سے وہ آیا تھا وہیں واپس کر دیا **** ۔ تَصَارِيْفُ الْاُمُوْرِ ۔ معاملات کا الٹ پھیر اور انکو ایک دوسرے کی جگہ رکھنا ۔ اَلْمُنْصَرَفُ ۔ پلٹنے کی جگہ ۔ ہٹنے کی جگہ ۔ تَصْرِيْفُ الرِّيَاحِ ۔ ہواؤں کے رخ کو ایک طرف سے دوسری طرف موڑ دینا ۔ اِنْصَرَفَ رک گیا ۔ پلٹ گیا ۔ صَرْفُ الْخَمْرِ اور تَصْرِيْفُ الْخَمْرِ ۔ خالص شراب (کچھ ملائے بغیر) پی جانا ۔ اسی سے اَلصَّرِيْفُ ۔ خالص چاندی کو کہتے ہیں اور اَلصَّرَّافُ وَالصَّيْرَفِيُّ ۔ سکے پرکھنے والے ، یا سکوں کے تبادلہ کرنے والے کو ۔ قرآن کریم میں تَصْرِيْفِ الرِّيَاحِ (۱۶۴/۲) متعدد مقامات میں آیا ہے ۔ یعنی ہواؤں کو مختلف سمتوں میں چلانا ۔ یا ان کی حالت بدل دینا ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ (۴۱/۱۷ نیز ۸۹/۱۷ ؛ ۵۴/۱۸) ۔ ہمنے اس قرآن کریم میں حقائق و قوانین کے مختلف پہلوؤں کو لوٹا لوٹا کر بیان کیا ہے ۔ لِيَذَّكَّرُوْا (۴۱/۱۷) تا کہ لوگ انہیں اچھی طرح سے سمجھ

*تاج و محیط و راغب ۔ **راغب ۔ ***تاج ۔ ****محیط ۔

سکیں - تاکہ ان کے تمام پہلو لوگوں کی نگاہ کے سامنے آجائیں - قرآن کریم نے اپنے مطالب کو واضح کرنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا ہے - یعنی ایک چیز کو بار بار پھرا کر لانا تاکہ اسکے متعدد گوشے سامنے آجائیں - یہ چیز ہے جسے سطح بین نگاہیں " تکرار " ٹھہراتی ہیں -

سورۃ الفرقان میں ہے کہ جن لوگوں کی تم پرستش کرتے ہو وہی تمہیں جھٹلائینگے کہ ہم نے تمہیں اپنی پرستش کیلئے نہیں کہا تھا فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا (۲۵/۱۹) سو تم میں اسکی قدرت نہیں ہوگی کہ ان کی بات کا رد کر سکو - یا ہمارے عذاب کو دوسری طرف پھیر دو - یا اپنے آپ کو اس پوزیشن سے ہٹا سکو - سورۃ کہف میں ہے وَلَمْ یَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا (۱۸/۵۳) - کوئی ایسی جگہ نہیں ہوگی جہاں وہ اس عذاب سے ہٹ کر پناہ لے سکیں -

سورۃ یوسف میں ہے فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ (۱۲/۳۴) - تو خدا نے اس (یوسف) سے ان عورتوں کی سازش کو ہٹا دیا ، اس کا رخ پھیر دیا - یعنی اسے انکی سازشوں کے نقصان سے محفوظ رکھا - سورۃ احقاف میں ہے اِذْ صَرَفْنَا اِلَيْكَ ..... (۴۶/۲۹) ہمنے انکا رخ تیری طرف پھیر دیا - ان دونوں آیتوں سے صَرَفَ عَنْ اور صَرَفَ اِلٰی کے معنے واضح ہو جاتے ہیں - سورۃ ہود میں عذاب کے متعلق ہے - لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ (۱۱/۸) - وہ ان سے دوسری طرف نہیں پھریگا - ان سے ٹلیگا نہیں - سورۃ توبہ میں اِنْصَرَفَ آیا ہے (۹/۱۲۷) - یعنی پھر جانا - اور صَرَفَ پھیر دینا -

ص ر م

صَرَمَ - يَصْرِمُ - اسنے (رسی یا پھلوں کے خوشہ وغیرہ کو) کاٹ کر الگ کر دیا - صَرَمَ النَّخْلَ - اسنے کھجور کے پھل کاٹ لئے - صَرَمَ الْحَبْلُ - رسی ٹوٹ گئی - اَصْرَمَ النَّخْلُ - کھجوروں کے پھل کاٹنے کا وقت آگیا - اَلصَّرِيْمَةُ - وہ زمین جس کی کھیتی کاٹ لی گئی ہو - الصَّرِيْمُ - کاٹا ہوا ، مقطوع - کالی زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہو - رات اور دن کو بھی صَرِيْمٌ کہتے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے کٹ جاتا ہے - اَلصَّارِمُ - کاٹنے والا - نیز شیر کو بھی کہتے ہیں - اِنْصِرَامٌ - منقطع ہونا * - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے قطع کرنا ہی لکھے ہیں -

قرآن کریم میں ہے کہ انہوں نے قسمیں کھائیں کہ لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ (۶۸/۱۷) - وہ صبح ہوتے ہی اس کی فصل کاٹینگے - ذرا آگے چل

* تاج -

کر ہے اِنْ کُنْتُمْ صَارِمِیْنَ (۶۸/۲۲) ۔ فصل کاٹنے والے ۔ اور دو آیتیں پیچھے ہے ۔ فَاَصْبَحَتْ کَالصَّرِیْمِ (۶۸/۲۰) وہ باغ ایسا ہو گیا جیسے اس کے پھل کاٹ لئے گئے ہوں ۔ اسی کو سورۃ انبیاء میں حَصِیْدًا سے تعبیر کیا گیا ہے (۲۱/۱۵) ۔ (عموماً کھیتی کے لئے حصاد اور باغ کے لئے صرم آتا ہے) ۔ ویسے اَلصَّرِیْمُ رات کو بھی کہتے ہیں*، اور بالعموم وہ سیاہ ہوتی ہے لہذا سوختہ بختی کی نشانی ہے ۔ آیت (۶۸/۲۰) میں اگر اس جہت سے معنے لئے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ وہ باغ جل کر رات کی طرح سیاہ ہو گیا ۔

ص ط ر

دیکھئے س ۔ ط ۔ ر

ص ع د

صَعِدَ (فِیْ السُّلَّمِ اَوِالْجَبَلِ) وَ صَعَّدَ عَلَیْہِ وَفِیْہِ ۔ وہ (سیڑھی یا پہاڑ وغیرہ) کے اوپر چڑھا ۔ لیکن صرف چلے جانے کیلئے بھی بولتے ہیں ۔ اَصْعَدَ فِی الْاَرْضِ ۔ وہ دور تک چلا، یا گھوما** ۔ قرآن کریم میں ہے اِذْ تُصْعِدُوْنَ (۳/۱۵۲) ۔ جب تم دور نکلے جا رہے تھے ۔ اَلصَّعِیْدُ زمین کو کہتے ہیں ۔ (۳/۴۳ ؛ ۱۸/۴۰) ۔ مٹی اور غبار کو بھی کہتے ہیں ۔ نیز زمین کے بالائی حصہ کو ۔ اوپر چڑھنے میں چونکہ سانس پھول جاتی ہے اسلئے امرِ دشوار اور گراں کیلئے صَعُوْدٌ بولتے ہیں ۔ تَصَعَّدَ نِیْ ذَالِکَ الشَّیْئُ ۔ مجھ پر یہ شے بہت ہی مشکل اور گراں ہو گئی** ۔ صَعَدٌ ۔ شدید ۔ سخت** ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بلندی اور مشقت کے ہیں ۔

سورۃ جن میں ہے یَسْلُکْہُ عَذَابًا صَعَدًا (۷۲/۱۷) اسے سخت عذاب میں داخل کرتا ہے ۔ یہی معنے صَعُوْدًا کے ہیں (۷۴/۱۷) ۔ سورۃ انعام میں ہے کہ اسلام، سینے کی کشاد سے حاصل ہوتا ہے ۔ تنگ نظر اور تنگ خیال جب اسلام کا تصور کرتا ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ (۶/۱۲۶) گویا وہ بڑا زور لگا کر بلندی پر چڑھ رہا ہے ۔ ایسی چڑھائی جس کے متعلق پتہ ہی نہیں کہ کہاں جا کر ختم ہو ۔

سورۃ فاطر میں ہے اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ ۔ خوشگوار نظریۂ حیات، خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق، بلند ہوتا چلا جاتا ہے ۔ لیکن اسطرح اسکی رفتار انسانی حساب کے مطابق بہت سست ہوتی ہے ۔ وَالْعَمَلُ

*راغب ۔ ابن فارس نے بھی یہی معانی لکھے ہیں ۔ **تاج و محیط ۔

الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (۳۵/۱۰) - عمل صالح اسے بلند کرتا ہے - یعنی خدا کے مقرر کردہ صحیح نظریاتِ زندگی میں اسکی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بلند ہوتے جائیں۔ اور عام حالات میں وہ خدا کے کائناتی قانون کے مطابق بلند ہوتے رہتے ہیں - لیکن اگر ان کے ساتھ انسانوں کے اعمال صالحہ شامل ہو جائیں تو ان کے ذریعے وہ بہت تیزی سے پروان چڑھ جاتے ہیں - (تدبیر امور کے سلسلہ میں ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ آیا ہے - ۵/۳۲)۔

ص ع ر

اَلصَّعَرُ - اونٹوں میں ایک بیماری ہوتی ہے جس سے ان کی گردن ٹیڑھی ہو جاتی ہے اور منہ ایک طرف کو مڑ جاتا ہے - نیز تکبر اور اکڑ - صَعِرَ (وَجْهُهٗ) - یَصْعَرُ - صَعَرًا - چہرہ کا ٹیڑھا ہوجانا، ایک طرف کو مڑ جانا۔ اَلصَّعَّارُ - مغرور و متکبر کو کہتے ہیں اس لئے کہ وہ تکبر کی وجہ سے گردن کو ٹیڑھا اور رخسار کو جھکائے رکھتا ہے اور لوگوں سے رخ پھیرتا ہے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مڑ جانے اور ٹیڑھے ہونے کے ہیں -

قرآن کریم میں ہے لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ (۳۱/۱۸) - تکبر کی بنا پر لوگوں سے اعراض اور روگردانی نہ کرو - لوگوں سے بے رخی نہ برتو -

ص ع ق

صَاعِقَةٌ* - بجلی کی کڑک** - جمع صَوَاعِقُ - صرف سخت آواز کو بھی کہتے ہیں** - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ حِمَارٌ صَعِقٌ* - اس گدھے کو کہتے ہیں جو نہایت سخت آواز کے ساتھ رینکے - بیہوش ہوکر گر جانے کو بھی صَعِقَ کہتے ہیں** - اور عقل و خرد کے جاتے رہنے کو بھی** - سورۃ بقرۃ میں جہاں بنی اسرائیل کے متعلق کہا گیا ہے کہ فَاَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ (۲/۵۵) تو وہاں اس سے مراد بے ہوش ہوکر گر جانا ہیں (نیز دیکھئے عنوان ب - ع - ث اور م - و - ت) صَعِقَتِ الرَّكِيَّةُ - اس وقت کہتے ہیں جب کنواں ڈھ جائے اور چاروں طرف سے مٹی اس میں گرنے لگے** -

*تاج نیز راغب و محیط - **تاج و محیط -

هر مہلک عذاب کو بھی صَاعِقَۃٌ کہتے ہیں - اور موت کو بھی* - بجلی کی کڑک کے معنوں میں یہ لفظ (۲/۱۹) میں آیا ہے - اور ہلاکت کے معنوں میں سورۃ الطور میں جہاں کہا ہے کہ فَذَرْهُمْ حَتّٰی یُلٰقُوْا یَوْمَهُمُ الَّذِیْ فِیْهِ یُصْعَقُوْنَ (۵۲/۴۵) - اس میں ان کی اجتماعی بربادی اور قومی تباہی کا مفہوم پایا جاتا ہے - سورۃ زمر میں جہاں نفخۂ صور کا ذکر ہے وہاں کہا ہے فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ (۳۹/۶۸) - صاحب تاج العروس نے اس کے معنے عقل و شعور سے محروم ہو جانے کے بھی لکھے ہیں** - (نفخ صور کے لئے ن - ف - خ اور ص - و - ر کے عنوانات دیکھئیے) - سورۃ اعراف میں ہے وَ خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا (۷/۱۴۳) - اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا -

ص غ ر

اَلصِّغَرُ - الصَّغَارَۃُ - کِبَرٌ اور عِظَمٌ کی ضد ہے - چھوٹا ہونا*** - (عمر و جسامت میں یا قدر و منزلت میں) - الصَّغَارُ ذلت و رسوائی - محکومی*** - سورۃ اعراف میں ہے فَاخْرُجْ اِنَّکَ مِنَ الصّٰغِرِیْنَ (۷/۱۳) - نکل جا - تیرے حصے میں کبریائی (بڑائی) نہیں آئے گی - کبریائی قانون خداوندی کی اطاعت سے نصیب ہوتی ہے - اس سے سرکشی برتنے کا نتیجہ ذلت و رسوائی ہے - سورۃ انعام میں مجرمین کے متعلق ہے صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ (۶/۱۲۵) - انہیں قانون خداوندی کے سامنے جھکنا پڑیگا - چھوٹا بننا ہوگا - اس کا محکوم ہونا ہوگا - (واضح رہے کہ یہ جھکنا اور محکومی بطیب خاطر نہیں ہوگی بلکہ بے بسی کی وجہ سے مجبوراً ہوگی - مجرم قانون کے سامنے مجبوراً جھکتا ہے) - نیز (۹/۲۹) اور (۲۷/۳۷) -

ان مقامات سے واضح ہے کہ صٰغِرُوْنَ کے معنے ہیں سرکشی چھوڑ کر، کسی مملکت میں امن پسند شہری کی حیثیت سے محکوم (یا رعایا) بن کر رہنا - یہ مفہوم سورۃ توبہ سے بھی واضح ہو جاتا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ اھل کتاب میں سے جو لوگ سرکشی برتیں اور جنگ پر اتر آئیں*****- انکے

*تاج و محیط - **لین بحوالہ تاج - ***تاج -

*****یہ چیز کہ قرآن کریم ان لوگوں کے خلاف جنگ کی اجازت دیتا ہے جو سرکشی اختیار کرکے جنگ پر اتر آئیں، قرآن کریم کے متعدد مقامات سے واضح ہے - قرآن کریم کی رو سے جنگ سے مقصود سرکش اور ظالم کو حق و انصاف کے سامنے جھکانا ہے اور بس -

خلاف جنگ کرو - حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ
(۹/۲۹) - تاآنکہ وہ اُس امن و آسائش کے بدلے میں جو اسلامی مملکت میں رہنے سے انہیں نصیب ہوگی، شہری ٹیکس دینا اور پر امن رعایا کی حیثیت سے رہنا قبول کرلیں - ان کا اسلامی مملکت میں برابر کی حیثیت سے نہیں بلکہ محکوم کی حیثیت سے رہنا ان کے لئے چھوٹا ہو جانا ہے - لیکن یہ چھوٹا ہونا سیاسی نقطۂ نگاہ سے ہوگا، ورنہ انہیں وہ تمام حقوق انسانیت حاصل ہونگے جنہیں قرآن کریم ہر فرزند آدم کو عطا کرتا ہے - لیکن وہ امور مملکت میں دخیل نہیں ہوسکینگے -

سورۃ بقرہ میں ہے صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا (۲/۲۸۲) - اس کے معنی ہیں تھوڑا یا بہت - اَصْغَرُ - زیادہ چھوٹا (۱۰/۶۱) -

ص غ و (ی)

صَغَا يَصْغُوْ و صَغَى يَصْغَى - مائل ہونا - جھکنا - صَغَتِ الشَّمْسُ سورج مائل بغروب ہوا - صَاغِيَةُ الرَّجُلِ - آدمی کے طرف دار اور حمایتی - صِغْوُهٗ مَعَكَ - اس کا میلان و رجحان تیری طرف ہے - اَصْغٰى حَقَّهٗ - اس نے اپنا حق کم کر دیا* -

قرآن کریم میں ہے وَلِتَصْغٰى اِلَيْهِ اَفْئِدَةُ ..... (۶/۱۱۳) تاکہ ان کے دل اس کی طرف مائل رہیں - (نیز ۶۶/۴) -

ص ف ح

اَلصَّفْحُ - ہر چیز کا چوڑا پہلو - اس کی چوڑی سطح - جانب اور پہلو - اَلصَّفْحُ مِنَ السَّيْفِ - تلوار کی چوڑائی - (دھار نہیں بلکہ چوڑا حصہ) - اَلْمُصَفَّحُ - چوڑی چیز - اَلصَّفْحَةُ - چوڑائی کے اعتبار سے کاغذ کی سطح کو کہتے ہیں - اَلْمُصَافَحَةُ - ہاتھ ملانا** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی چوڑائی کے ہیں -

صَفَحَ - اپنے منہ کو موڑ کر چہرے کا چوڑا حصہ (ایک جانب) دوسرے کے سامنے کرنا - یعنے اس سے اعراض برتنا - پہلو تہی کرنا - صَفَحَ عَنْهُ - اسے چھوڑ دیا - معاف کر دیا - یہ عَفْوٌ سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے کیونکہ عَفْوٌ میں کسی کو مجرم قرار دے کر معاف کرنا ہوتا ہے اور صَفْحٌ میں اسے مجرم گردانا ہی نہیں جاتا ہے** - سورۃ بقرہ میں یہ دونوں الفاظ اکٹھے آئے ہیں - (۲/۱۰۹) -

---

*تاج - **تاج - محیط - راغب -

سورۃ زخرف میں ہے أَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا (۴۳/۵)۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم تم سے اعراض برتتے ہوئے ان تاریخی حقائق کو تم سے پھیر دینگے؟ سورۃ حجر میں ہے فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ (۱۵/۸۵)۔ ان سے نہایت جمال آفریں انداز سے کنارہ کش ہو کر (اپنی جداگانہ تنظیم کرتے جاؤ)۔ (۱۵/۹۴)۔ یعنی وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا (۷۳/۱۰)۔ قرآن کریم کا انداز معاشرت ملاحظہ کیجئے۔۔ وہ کہتا ہے کہ کسی سے بنا کر رکھنا تو ایک طرف، اگر کسی سے کنارہ کش ہونا ہو تو بھی نہایت حسن کارانہ انداز سے، بڑی خوبصورتی سے، جمال آفرینی کے اسلوب سے الگ ہو۔ جو ضابطہ حیات کسی سے کنارہ کشی کی صورت میں اس انداز کی تلقین کرتا ہو، غور کیجئے کہ وہ دوستداری اور رفاقت کے تعلقات کو کن بلندیوں تک لے جاتا ہوگا اور ان میں کس قدر حسن پیدا کرنے کی تلقین کرتا ہوگا؟

ص ف د

صَفَدٌ۔ صِفَادٌ (جمع أَصْفَادٌ)۔ چمڑے کا تسمہ یا لوہے کی زنجیر جس سے قیدی کو باندھا جائے۔ بندھن۔ بندش۔ نیز گلے کا طوق یا پٹہ جو چمڑے کا بنا ہوتا تھا۔ صَفَدَهُ۔ يَصْفِدُهُ۔ کسی کو زنجیر وغیرہ سے باندھنا۔ جکڑنا۔ اَلصَّفَدُ۔ عطیہ کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس سے انسان معطی کا زیر بار احسان ہو کر مروت کی زنجیر میں بندھ جاتا ہے*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) باندھنا (۲) عطا کرنا لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں مجرمین کے متعلق ہے۔ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ (۱۴/۴۹)۔ وہ زنجیروں میں ایک دوسرے کے ساتھ جکڑے ہونگے۔

ص ف ر

اَلصُّفْرَةُ۔ زردی۔ پیلا پن۔ اَلصَّفْرَاءُ۔ سونا**۔ یہ أَصْفَرُ کا مونث بھی ہے۔ اس صورت میں اس کے معنی "پیلے رنگ والی" ہونگے۔

اَلصِّفْرُ۔ خالی چیز**۔ صَفِرَ إِنَاؤُهُ۔ اس کا برتن خالی ہوگیا۔ محاورہ میں اس کے معنی ہوتے ہیں۔ "اس کے مویشی ہلاک ہوگئے"۔ (ابن فارس)

اَلصَّافِرُ۔ ہر آواز نکالنے والا پرندہ۔ اَلصَّفِيرُ۔ مویشیوں کو پانی کے لئے بلانے کی آواز**۔ سیٹی کی آواز۔

---

*۔ تاج۔ محیط۔ راغب۔ ** تاج

سورۃ بقرۃ میں، بنی اسرائیل کی گائے (یا سانڈ) کے متعلق ہے کہ وہ صفراء تھی یعنی اس کا رنگ زرد تھا (۲/۶۹)۔ اور سورۃ مرسلٰت میں جہنم کے شعلوں کو جِمٰلَتٌ صُفْرٌ۔ زرد اونٹوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ سیاہ اونٹوں کو کہا گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کوئی بھی سیاہ اونٹ ایسا نہیں ہوتا جسکی سیاہی زردی میں ڈوبی ہوئی نہ ہو۔ ایسی ہی زردی کے لئے یہاں صُفْرٌ کہا گیا ہے * (۷۷/۳۳)۔ سورۃ زمر میں زرد کے لئے مُصْفَرًّا آیا ہے (۳۹/۲۱)۔

ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی پانچ چھ لکھے ہیں لیکن قرآن کریم میں یہ مندرجہ بالامعنوں ہی میں آیا ہے۔

ص ف ف

اَلصَّفُّ۔ اَلتَّصْفِیْفُ۔ صف بندی کرنا۔ صف بنانا۔ اَلصَّفُّ۔ صف (قطار) میں کھڑا ہونا۔ اَلصَّفُّ۔ وہ لوگ جو لائن لگا کر کھڑے ہوں **۔ راغب نے کہا ہے کہ ایک سیدھی لکیر پر آدمیوں کو کھڑا کرنا یا درختوں وغیرہ کو لگانا صَفٌّ کہلاتا ہے۔ سورۃ کہف میں ہے وَعُرِضُوْا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا (۱۸/۴۸)۔ وہ تیرے رب کے سامنے صف باندھ کر پیش کئے جائینگے۔

اَلصَّفُّ۔ پرندوں کا فضا میں اپنے بازو پھیلا دینا اور انہیں حرکت نہ دینا۔ صَآفَّاتٌ۔ بازو پھیلائے ہوئے **۔ سورۃ نور میں ہے وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ (۲۴/۴۱)۔ پرندے جو فضا میں پر پھیلائے ہوں (صَآفَّاتٌ کا واحد صَآفَّۃٌ ہے)۔ اَلصّٰٓفّٰتُ۔ صف بستہ جماعتیں (۳۷/۱)۔ صَوَآفَّ (صَوَافِفُ) صف میں کھڑے ہوئے اونٹ (۲۲/۳۶)۔ یہ بھی صَآفَّۃٌ کی جمع ہے۔ مَصْفُوْفَۃٍ۔ صف میں لگائے ہوئے (۵۲/۲۰)۔ اَلصَّفْصَفُ۔ سپاٹ اور ہموار زمین جس کا گھاس وغیرہ سب صاف کردیا گیا ہو **۔ قرآن کریم میں ہے قَاعًا صَفْصَفًا (۲۰/۱۰۶) ہموار میدان۔

صُفَّۃُ الدَّارِ۔ گھر کا برآمدہ *۔

ص ف ن

اَلصَّفْنُ۔ دو چیزوں کو اسطرح اکٹھا کر دینا کہ ان کے بعض حصے دوسرے حصوں کے ساتھ مل جائیں ***۔ صَفَنَ الرَّجُلُ۔ آدمی نے اپنے دونوں پاؤں ایک لائن میں رکھے ****۔ صَفَنَ الْفَرَسُ یَصْفِنُ۔ صُفُوْنًا۔ گھوڑے کا اس طرح کھڑا ہونا کہ اسکے تین پاؤں زمین پر ہوں اور چوتھے

* تاج۔ ** تاج و راغب۔ *** راغب **** محیط

پاؤں کا سُم اسطرح اٹھا ہو کہ اس کا اگلا حصہ (کنارہ) زمین کو مس کرتا رہے*۔ اس طرح کھڑا ہونے والا گھوڑا صَافِنٌ کہلاتا ہے، جمع صَوَافِنُ و صَافِنَاتٌ۔ عربوں کے ہاں اس قسم کے گھوڑے اعلیٰ درجہ کے شمار ہوتے تھے۔ قرآن کریم میں اَلصّٰفِنٰتُ الْجِیَادُ (۳۸/۳۱) ۔ ایسے ہی اصیل گھوڑوں کے لئے آیا ہے۔

ص ف و

اَلصَّفْوُ۔ اَلصَّفَاءُ۔ کسی چیز کا صاف اور خالص حصہ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلصَّفَاءُ کے معنے ہیں کسی چیز کا ہر قسم کی آمیزش سے پاک اور صاف ہونا یہی اس کے بنیادی معنی ہیں (ابن فارس)۔ صَفْوَۃُ کُلِّ شَیْئٍ۔ ہر چیز کا خالص حصہ۔

یَوْمٌ صَافٍ وَ صَفْوَانٌ۔ وہ خنک دن جس میں نہ بادل ہوں اور نہ ہی فضا غبارآلودہ ہو۔ اِصْطِفَاءٌ۔ صاف اور خالص چیز کا لے لینا۔ انتخاب کر لینا۔ اِسْتَصْفَاہُ۔ اسے مخلص سمجھا۔ اسے چنا۔ انتخاب کیا۔ اَلصَّفِیَّۃُ (جمع صَفَایَا) مال غنیمت کی وہ چیز جسے امیر اپنے لئے منتخب کرلے**۔

اَلصَّفَاۃُ (جمع صَفَوَاتٌ وَ صَفًا) بڑا صاف، چکنا پتھر جس پر کچھ نہ اگ سکے۔ اَلصَّفْوَانَۃُ (جمع صَفْوَانٌ) کے بھی یہی معنی ہیں*۔ (۲/۲۶۴)۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ اسم جمع ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الصَّفْوَان کے معنی بڑی چٹان ہوں اور اس کے ایک ٹکڑے کو صَفْوَانَۃٌ کہا جاتا ہو۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا (۲/۱۳۰) ہم نے اسے دنیا میں آمیزشوں سے پاک کرکے ایک عظیم مقصد کے لئے منتخب کر لیا۔ مختلف انبیائے کرام کے متعلق فرمایا وَاِنَّھُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَیْنَ الْاَخْیَارِ (۳۸/۴۷)۔ یہ لوگ ہمارے ہاں منتخب افرادِ انسانیہ ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے اَصْفٰکُمْ (۱۷/۴۰)۔ یعنی چن لینا۔ دوسروں سے الگ کرکے مختص کر لینا اور ترجیح و فضیلت دینا۔

سورۃ بقرۃ میں اَلصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ کو مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ کہا گیا ہے۔ (۲/۱۵۸)۔ یہ مکہ کے قریب دو پہاڑیاں ہیں۔

سورۃ محمد میں ہے عَسَلٍ مُّصَفًّی (۴۷/۱۵) صاف کیا ہوا شہد۔

---

* تاج ** تاج و محیط

ص ک ک

صَکّ ۔ کسی چیز، بالخصوص چوڑی چیز کے ذریعے زور سے مارنا ۔ صَکَّ الْبَابَ ۔ اس نے دروازہ بند کر دیا ۔ صَکَّهٗ ۔ صَکَّا ۔ اسنے اسے دھکا دیا *۔

قرآن کریم میں حضرت ابراهیم ؑ کی بیوی کے متعلق هے فَصَکَّتْ وَجْهَهَا (۵۱/۲۹) ۔ اسنے اپنے چہرہ پر هاتھ مارا ۔ لیکن یه عمل از رہِ تعجب تھا ۔ جیسا که آیت (۱۱/۷۲) سے ظاهر هوتا هے ۔

ص ل ب

اَلصُّلْبُ ۔ اَلصَّلِیْبُ ۔ مضبوط اور سخت ۔ هُوَ صُلْبٌ فِیْ دِیْنِهٖ ۔ وہ اپنے دین میں سخت اور مضبوط هے ۔ صَلَّبَ ۔ اس نے اسے سخت اور مضبوط بنا دیا ۔ اَلصُّلْبُ ۔ ریڑھ کی هڈی * ۔ (جمع اَصْلَابٌ) ابن فارس نے کہا هے که پشت کو بھی اس کی قوت اور سختی کی وجه سے صُلْبٌ کہتے هیں ۔ قرآن کریم میں هے ۔ اَبْنَائِکُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ (۴/۲۳) ۔ تمہارے وہ بیٹے جو تمہاری اپنی ''پیٹھ'' (صلب) سے هوں ۔

اَلصَّلْبُ ۔ آدمی کو مار دینے کے لئے لٹکانا ۔ سولی چڑھا دینا ۔ راغب نے لکھا هے که یه اس لئے کہتے هیں که اس میں اس شخص کی پیٹھ لکڑی کے ساتھ باندھ دی جاتی تھی ۔ بعض نے کہا هے که اَلصَّلِیْبُ ۔ مردے کے ناک یا منه میں سے جو پانی سا نکلتا هے اسے کہتے هیں ۔ نیز وہ چکنائی جو هڈیوں سے نکالی جائے * ۔ ابن فارس نے مَصْلُوْبٌ کی توجیه کرتے هوئے لکھا هے که سولی پر چڑھائے هوئے کو اس لئے مَصْلُوْبٌ کہتے هیں که اس کے چہرے پر چکنائی آ جاتی هے ۔ پھر سولی کو بھی صَلِیْبٌ کہتے هیں ۔ لیکن راغب کی توجیه بہتر نظر آتی هے ۔ اس لئے که (عیسائیوں کے بتائے هوئے نقشے کے مطابق) صلیب کی شکل یوں هوتی تھی ۔

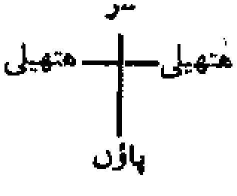

مجرم کو اس تختے پر لٹکا کر اس کے دونوں هاتھوں اور پاؤں میں میخیں گاڑ دیتے تھے اور اسے اسی حالت میں رہتے دیا جاتا تھا ۔ تاآنکه وہ درد و کرب اور ضعف و نقاهت سے دم توڑ دے ۔

یہودیوں کے نزدیک صلیب پر مرنا لعنتی کی موت تھی ۔ ان کا دعویٰ تھا که انہوں نے (حضرت) عیسےٰ ؑ کو صلیب پر لٹکا کر (معاذ الله) لعنتی

---

* تاج و محیط ۔

کی موت مار دیا ۔ عیسائی اگرچہ (صلیب کی موت کو لعنتی کی موت نہیں کہتے لیکن) اس کے قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے صلیب پر جان دی ۔ قرآن کریم نے یہودیوں اور عیسائیوں، دونوں کی تردید میں کہا کہ یہ قصہ ہی سراسر غلط ہے ۔ وَمَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۴/۱۵۷) ۔ ''اور انہوں نے نہ اسے قتل کیا ۔ اور نہ ہی صلیب پر لٹکایا ۔ اصل حقیقت ان پر مشتبہ ہوگئی''۔ حضرت عیسیٰؑ وہاں سے پہلے ہی تشریف لے جا چکے تھے اور انہوں نے جس شخص کو گرفتار کیا تھا وہ کوئی اور تھا ۔ (تفصیل میری کتاب ''شعلہ مستور'' میں ملیگی) ۔

قرآن کریم میں اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت اور فساد فی الارض کی مختلف سزائیں (حسبِ نوعیت جرم) بتائی گئی ہیں ۔ ان میں ایک یُصَلَّبُوْا (۵/۳۳) بھی ہے ۔ یعنی صلیب پر لٹکوا دینا ۔ سولی دیدینا ۔

صَلَبَ ۔ ایک آدمی کو سولی دینے کے لئے ۔ اور صَلَّبَ ۔ زیادہ آدمیوں کو سولی دینے کے لئے بولا جاتا ہے ۔

ص ل ح

اَصْلَحَ اللَّيْهِ کے معنے ہیں اَحْسَنَ اِلَيْهِ ۔ یعنے اس نے ایسا کام کیا جس سے اس (دوسرے آدمی) کی خرابی، نقص یا کمی دور ہوگئی ۔ حسن کارانہ توازن پیدا کرنے والے کام کرنا ۔ اسی لئے اَلصُّلْحُ باہمی امن و سلامتی اور مسالمت کو کہتے ہیں، کیونکہ زمانۂ جنگ کی بہ نسبت، صلح و امن میں معاملات کے اندر توازن قائم رہتا ہے* ۔ الصَّلَاحُ کے معنے ہیں حالات کا عقل و شرع کے تقاضہ کے مطابق معتدل و مستقیم ہو جانا** ۔ جس چیز کو جس حال میں ہونا چاہئے اس کا ٹھیک اسی حالت میں ہونا ۔ بالکل مناسب، درست، با ترتیب، ٹھیک حالت میں رہنا***۔

سورۂ اعراف میں صحیح و سالم اور تندرست بچے کے لئے صَالِحًا کا لفظ آیا ہے (۷/۱۹۰)۔ یعنی ایسا بچہ جو ہر لحاظ سے متناسب اور درست ہو۔ سورۂ انبیاء میں، جہاں حضرت زکریا کے ہاں بڑھاپے کے زمانے میں اولاد پیدا ہونے کا ذکر ہے، وہاں کہا ہے وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (۲۱/۹۰) ۔ ہم نے اس کی بیوی سے اس نقص کو دور کردیا جو اولاد پیدا کرنے سے مانع تھا ۔ سورۂ نور میں وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَائِكُمْ (۲۴/۳۲) کے معنے ہیں وہ

*تاج ۔ **محیط ۔ ***لین ۔

غلام اور لونڈیاں جو نکاح کی صلاحیت رکھتے ہوں ۔ سورۃ یوسف میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس وقت ہمارے باپ کی ساری توجہ یوسفؑ (اور اس کے بھائی) کی طرف ہے۔اگر یوسفؑ کو قتل کر دیا جائے یا ملک بدر کردیا جائے تو پھر موجودہ نا ہمواری دور ہوجائیگی۔ وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ (۱۲/۹) ۔ اور بعد میں ہم ایسا گروہ باقی رہ جائینگے جن میں کوئی نا ہمواری نہیں رہے گی ، اور ہمارے کام سنور جائینگے ۔ یہاں صالحین کے لفظ نے اس کے مفہوم کو واضح کر دیا ہے ۔ یعنی نا ہمواریاں دور ہو جانا ۔ معاملات کا سنور جانا ۔

قرآن کریم میں حَسَنَات کے مقابلہ میں سَيِّئَات کا لفظ اکثر آیا ہے ۔ اور (۲/۸۱-۸۲) میں سَيِّئَة کے مقابل میں عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ آیا ہے ۔ لہذا اعمال صالحہ اورحسنات ہم معنی ہیں ۔ اس لئے دوسرے مقام پر مَنْ عَمِلَ صَالِحًا کے مقابل میں مَنْ أَسَاءَ آیا ہے (۴۱/۴۶) ۔ (س ۔ و ۔ ا اورح ۔ س ۔ ن کے عنوانات میں ان الفاظ کے معنے سامنے آجائینگے) ۔ لہذا اعمالِ صالحہ کے معنے ہیں ایسے کام جن سے انسان کی مضمر صلاحیتیں بیدار ہو جائیں اوراس طرح اس میں زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے ۔ نیز جن سے معاشرہ کا حسن و توازن قائم رہے اور نا ہمواریاں دور ہوجائیں ۔ جو زندگی کی خوشگواریوں کو اپنے ساتھ لائیں ۔ ٹھیک وہ کام کرنا جو اُس وقت کےحالات کے عین مطابق اور قوانین خداوندی سے ہم آہنگ ہو ۔ فساد اس کی ضد ہے (اس کے لئے عنوان ف ۔ س ۔ د دیکھئے) ۔

قرآن کریم نے فَسَاد اور صَلَاح کو ٹھیک ایک دوسرے کے مقابل میں استعمال کیا ہے ۔ (۷/۱۴۲) ۔ سورۃ قصص میں مُصْلِحِيْنَ کے مقابلہ میں جَبَّارًا فِى الْاَرْضِ آیا ہے (۲۸/۱۹) ۔ اسی سورت میں ذرا آگے ، یہ مادہ خوش معاملگی کے معنوں میں آیا ہے (۲۸/۲۷) ۔

قرآن کریم میں آپ شروع سے اخیر تک دیکھینگے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ آیا ہے ۔ یعنی قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین رکھنا اوراس کے ساتھ ہی صلاحیت بخش کام کرنا ۔ اس سے واضح ہے کہ ایمان اور عمل لازم و ملزوم ہیں ۔ وہ اعمال جن کا سر چشمہ دل کا یقین نہ ہو محض رسم یا عادت کا نتیجہ ہوتے ہیں ، جو میکانکی طور پر (Mechanically) سرزد ہوتے رہتے ہیں ۔ ان سے صحیح نتائج مرتب نہیں ہو سکتے ۔ اسی طرح وہ ایمان جو اعمال صالحہ کا محرک نہیں بنتا ، دل کا یقین نہیں بلکہ محض زبان کے رسمی اقرار کا نام ہے ، جو اُسی طرح بے نتیجہ ہوتا ہے جس طرح اعمال

بلا ایمان بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ سورۃ روم میں قرآن کریم نے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا کے مقابلہ میں مَنْ کَفَرَ لا کر (۳۰/۴۴) ۔ اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اگر اعمال صالحہ ساتھ نہ ہوں تو ایمان ، ایمان نہیں ہوتا ۔

نیز اعمال بھی وہی اعمالِ صالحہ ہیں جنہیں قرآن کریم نے صالح قرار دیا ہے، نہ کہ وہ جنہیں ہم اپنی دانست میں اعمال صالحہ سمجھیں۔ ان اعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد کی صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں، معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں ، اور نوع انسانی کے معاملات سنور جاتے ہیں ۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے اعمال صالحہ کی کوئی جامع اور مانع فہرست مرتب کر کے نہیں دیدی ۔ اعمال صالحہ سے اس کی مراد تمام ایسے کام ہیں جو مذکورہ خصوصیات کے حامل ہوں ۔ یعنی جو کام زمانے کے تقاضوں کے عین مناسب ہوں بشرطیکہ وہ قرآنی اصولوں سے نہ ٹکرائیں، کیونکہ اعمال صالحہ کے ساتھ ایمان لاینفک شرط ہے۔ اگر ہم ایمان کے متعلق یہ کہیں کہ یہ ان بلند اقدار کی صداقت پر یقین محکم کا نام ہے جنہیں قرآن کریم نے انسانی ذات کی نشو و نما کے کے لئے متعین کیا ہے اور اعمال صالحہ، ان اقدار کے تحفظ کو کہتے ہیں ، تو یہ چیز حقیقت کے مطابق ہوگی ۔ اسی کو بالفاظ دیگر کیریکٹر کہا جائیگا ۔ لہذا کیریکٹر پیدا نہیں ہوسکتا جب تک زندگی کی بلند اقدار کی صداقت پر یقین نہ ہو ۔ یہ یقین علم و بصیرت کی بنا پر حاصل ہوتا ہے ۔

ص ل د

اَلصَّلْدُ ۔ اَلصَّلِدُ۔ ٹھوس چکنا پتھر* ۔ (۲/۲۶۴) ۔ اَلصَّلْدَاءُ سخت ٹھوس زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہوسکے* ۔ صَلُوْدٌ ۔ بخیل آدمی ۔ رَأْسٌ صَلْدٌ ۔ وہ سر جس پر بالکل بال نہ ہوں* ۔ لہذا اَلصَّلْدُ وہ چٹان ہوگی جس پر ذرا سی مٹی بھی باقی نہ رہے ۔ سورۃ بقرۃ کی محولہ بالا آیت میں یہ معانی واضح ہیں ۔

ص ل ص ل

اَلصَّلْصَالُ ۔ خالص گیلی مٹی جس میں ریت مل جائے اور پھر خشک ہونے پر اس میں سے آواز آنے لگ جائے ۔ جب اسے آگ میں پکا لیا جائے تو اسے فَخَّارٌ کہتے ہیں ۔ یعنے خشک کچی ٹھیکری صَلْصَالٌ ہوگی ۔ اور پختہ ٹھیکری فَخَّارٌ** ۔

*تاج ۔ **تاج و راغب ۔

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے ابتدائی مراحل کے متعلق ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ (۱۵/۲۶)۔ ہم نے انسان کو کھنکنے والی خشک مٹی سے پیدا کیا۔ (تفصیل اس اجمال کی میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں ملیگی)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں تری اور تھوڑا سا پانی شامل ہوتا ہے۔ زندگی کے ابتدائی جرثومے (Life Cells) محسوس طور پر، پانی اور مٹی کے اسی امتزاج سے سامنے آتے ہیں۔ اسی کو قرآن کریم نے کہیں طِیْنٌ (۳۲/۷) اور کہیں طین لازب (۳۷/۱۱) سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی انسان کی حیاتِ طبعی کا محسوس نقطہ آغاز۔

ص ل و (ی)

اگرچہ صلٰوۃ اور اس کے جملہ مشتقات کا تعلق (ص۔ل۔و) ہی سے ہے لیکن علمائے لغت نے اس ضمن میں بعض ایسے مشتقات بھی بیان کئے ہیں جو (ص۔ل۔ی) سے متعلق ہیں اور ان سے بھی صلٰوۃ کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، اس لئے اس عنوان میں مادہ کے آخر کا ''واو'' اور ''ی'' دونوں ہی آگئے ہیں۔ ویسے ہم نے (ص۔ل۔ی) کا ایک جداگانہ عنوان بھی رکھا ہے جو آگے آتا ہے۔ چونکہ ''صلٰوۃ'' دین کا ایک بنیادی گوشہ ہے اور قرآن کریم میں یہ اصطلاح اور اس کے متعلقات بڑی کثرت سے آئے ہیں اس لئے یہ عنوان بڑا اہم، اور اس کے مباحث خاص غور و فکر کے محتاج ہیں۔ ہم انہیں نسبتاً تفصیل سے بیان کرینگے۔

(۱) اَلصَّلَا۔ پشت کا درمیانی حصہ۔ کولھے کا ڈھلوان یا وہ حصہ جس پر جانور کی دم لگے۔ دم کے دونوں جانب کے حصے صَلَوَانِ کہلاتے ہیں۔ اس کی جمع صَلَوَاتٌ یا اَصْلَاءٌ آتی ہے*۔ صَلَا۔ یَصْلُوْ۔ صَلْوًا کے معنی ہیں صَلَا (مذکورہ صدر حصہ) پر مارنا۔ صَلَوْتُہٗ۔ میں نے اس کے صَلَا پر مارا۔

(۲) اَلصَّلَا کی نسبت سے، صَلَّی الْفَرَسُ تَصْلِیَۃً اس وقت کہتے ہیں جب گھوڑ دوڑ میں، دوسرے نمبر کا گھوڑا، پہلے نمبر کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے اس طرح دوڑ رہا ہو کہ پچھلے کی کنوتیاں، پہلے کی سرین سے مل رہی ہوں۔ اس گھوڑے کو جو آگے جا رہا ہو، سَابِقٌ کہتے ہیں اور دوسرے نمبر والے گھوڑے کو اَلْمُصَلِّیْ۔ اس سے صَلّٰی کے معنے ہیں

*تاج۔

اگلے کے ساتھ ملے ہوئے پیچھے پیچھے آنا - چنانچہ حضرت علیؓ کی ایک روایت میں ہے سَبَقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ - وَ صَلّٰی اَبُوْبَکْرٍ وَ ثَلَّثَ عُمَرُ وَ خَبَطَتْنَا فِتْنَۃٌ - ''رسول اللہ ؐ پہلے تشریف لے گئے - اور آپ کے پیچھے پیچھے ابوبکرؓ اور ان کے پیچھے عمرؓ بھی چلے گئے - اور ہمیں فتنوں نے بد حواس کر دیا*'' -

(۳) تاج میں ہے کہ صَلِیَ و اصْطَلٰی کے معنی لزوم یعنی وابستگی کے ہیں - یعنی کسی کے ساتھ لگے رہنا اور چمٹے رہنا - اسی بنا پر راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں جو ہے لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ (۷۴/۴۳) - ''ہم مصلین میں سے نہیں تھے'' - تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ''ہم انبیاء کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے نہیں تھے'' - قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس جہت سے صلٰوۃ کے معنی ہونگے احکام الٰہی سے وابستگی - حدود اللہ کے اندر رہنا اور کتاب اللہ سے چمٹے رہنا - لہذا تَصْلِیَۃٌ کے معنی ہیں اگلے کے پیچھے اس طرح چلنا کہ ان دونوں میں فاصلہ نہ ہو لیکن پیچھے چلنے والا آگے جانے والے سے آگے نہ بڑھے بلکہ وابستگی سے اس کا اتباع کرے -

(۴) ان تصریحات سے صَلٰوۃٌ کا بنیادی مفہوم واضح ہوجاتا ہے - لیکن اس کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک مختصر سی تمہید کا سمجھ لینا ضروری ہے - سوال یہ ہے کہ خدا اور بندے کا تعلق کیا ہے؟ خدا ، اس ذات (Personality) کا نام ہے جو بلند ترین ، مکمل ترین ، مستحکم ترین ، اور حسین ترین ہے - اس نے انسان کو بھی ذات (Personality) عطا کی ہے (اور اسے ''روحنا'' کہکر پکارا ہے - دیکھئے عنوان روح) - یہ ذات ، ذات خداوندی کے مقابلہ میں محدود اور پست درجہ کی ہے - اسے اپنی نشو و نما کے لئے صفات خداوندی کو اپنے سامنے بطور نصب العین رکھنا ہوتا ہے - ہم خدا کی ذات کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتے البتہ اس نے اپنی جو صفات وحی کے ذریعہ (قرآن کریم میں) بیان کی ہیں ان صفات کا اپنے اندر اجاگر کرتے جانا انسانی ذات کی نشو و نما کا موجب بنتا ہے - قرآن کریم نے صفات خداوندی کو ''الاسماء الحسنٰی'' سے تعبیر کیا ہے - لہذا انسان کا فریضہ یہ ہے کہ ان اسماء (صفات) خداوندی کو اپنے سامنے بطور معیار رکھ کر ، ان کے پیچھے پیچھے چلتا جائے -

قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت میں ہمیں جو دعا سکھائی گئی ہے (یعنی جس نصب العین کے حصول کو ہمارے لئے مقصد زندگی تجویز کیا گیا ہے)

---

*تاج -

وہ یہ ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (١/٥) ۔ یعنی اس توازن بدوش راستے کی طرف راہنمائی کی تمنا جو ہمیں انسانیت کی منزلِ مقصود تک لے جائے ۔ اور سورۃ ھود میں ہے اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (١١/٥٦) ۔ ''میرا رب صراط مستقیم پر ہے'' ۔ یعنی جس صراط مستقیم پر چلنے کے لئے مومنین سے کہا گیا ہے وہ وہی راستہ ہے جس پر خدا کائنات کو چلا رہا ہے ۔ ہم اس راستے پر کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہنے سے چل سکتے ہیں ۔ لہذا صلٰوۃ کا بنیادی مفہوم ہے کتاب اللہ کے ساتھ پوری وابستگی سے اپنے اندر (علی حد بشریت) صفات خداوندی کا منعکس کئے جانا ۔

(٥) سورۃ نور میں ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ ۔ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ (٢٤/٤١) ۔ ''کیا تو نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ وہ ہے کہ اسی کی تسبیح کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمینوں میں ہیں ۔ اور پر پھیلائے ہوئے پرند بھی ۔ ہر ایک اپنی اپنی صلٰوۃ اور تسبیح کو جانتا ہے'' ۔ یعنی کائنات کی ہر شے اپنی صلٰوۃ اور تسبیح کو اچھی طرح جانتی ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ کائنات کی ہر شے (اپنی فطری جبلت کی رو سے) جانتی ہے کہ اس کے فرائض منصبی کیا ہیں ۔ اسے کس راستے پر چلنا اور کس منزل تک پہنچنا ہے ۔ اسکی جد و جہد کے دوائر کونسے ہیں ۔ اسی چیز کو انکی صلٰوۃ اور تسبیح سے تعبیر کیا گیا ہے (تَسْبِیْحٌ کے لئے دیکھئے عنوان س ۔ ب ۔ ح) ۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کو ان چیزوں کا علم (حیوانات کی طرح) جبلّی طور پر نہیں دیا گیا ۔ اسے یہ سب کچھ وحی کے ذریعے بتایا گیا ہے ۔ جہانتک اسکی طبعی ضروریات کا تعلق ہے ، انسان ان چیزوں کا علم، عقل و فکر اور تجربہ و مشاھدہ سے حاصل کرسکتا ہے لیکن جہانتک اس کی ''انسانیت'' کے تقاضوں کا تعلق ہے یہ چیزیں وحی کے ذریعے ہی معلوم ہو سکتی ہیں ۔ لہذا انسان کو یہ جاننے کے لئے کہ اسکی ''صلوۃ و تسبیح'' کیا ہے ، وحی کا ماننا اور جاننا ضروری ہے ۔ اور اس مقصد کی تکمیل کیلئے وحی کے دیے ہوئے پروگرام پر عمل کرنا لازمی ہے ۔ اسے قرآن کریم نے اِقَامَتِ صَلٰوۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے ۔ (وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ ٢/٣) ۔ یعنی قوانین خداوندی کا اتباع کرنا ۔

لیکن وحی کے دیے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا ہونا (اِقَامَتِ صلٰوۃ) انفرادی طور پر ممکن نہیں ۔ یہ صرف اجتماعی نظام کے ماتحت ہو سکتا ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اسکے لئے جمع کے صیغے استعمال کئے ہیں - حتیٰ کہ ایک اسلامی مملکت کا فریضہ ہی یہ بتایا ہے اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (۲۲/۴۱) - یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامت صلٰوۃ اور ایتائے زکٰوۃ کرینگے (زَکٰوۃ کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ز ک و) - اور معروف کا حکم دینگے اور منکر سے روکینگے ،، - انہی کو دوسری جگہ اَلرَّاکِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ (۹/۱۱۲) کہا ہے - یعنی رکوع کرنے والے - سجدہ کرنے والے - (رُکُوْع اور سَجْدَۃ کیلئے دیکھئے عنوانات - ر- ک - ع اور س - ج - د) - اور یہی وجہ ہے کہ دوسری جگہ اقامت صلٰوۃ اور امور مملکت کیلئے باہمی مشاورت کا اکھٹا ذکر کیا گیا ہے- اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (۴۲/۳۸) - ،، وہ اقامت صلٰوۃ کرتے ہیں اور ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں ،، - اور چونکہ جماعت مومنین کی زندگی کے تمام امور قوانین خداوندی (کتاب اللہ) کے مطابق سر انجام پاتے ہیں اسلئے سورۃ اعراف میں تَمَسُّکْ بِالْکِتَابِ اور اِقَامَتِ صَلٰوۃ کو ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے (۷/۱۷۰)- لہذا اقامت صلٰوۃ سے مفہوم ہے ایسا نظام (یا معاشرہ) قائم کرنا جسمیں تمام افراد ، قرآن کریم کے قوانین کا اتباع کرتے چلے جائیں ، اور یوں کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہیں - اس مقصد کی مزید وضاحت کیلئے قرآن کریم میں صَلّٰی کے مقابلہ میں تَوَلّٰی کا لفظ آیا ہے (۷۵/۳۱-۳۲)- تَوَلّٰی کے معنے ہیں صحیح راستہ سے روگردانی کرنا - گریز کی راہیں نکالنا - پھر جانا - منہ موڑ لینا - اس لئے صَلّٰی کے معنے ہوئے قوانین خداوندی کے مطابق صحیح راستہ پر چلتے جانا - نظام خداوندی کے متعین کردہ فرائض منصبی کو ادا کرتے جانا - علامہ حمیدالدین فراہی ؒ نے اسی اعتبار سے کہا ہے کہ صلٰوۃ کے ایک معنی کسی کی طرف بڑھنے ، رخ کرنے اور متوجہ ہونے کے ہیں (مفردات القرآن) - سورۃ علق میں ہے - اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی (۹۶/۹-۱۰) - یعنے جب خدا کا بندہ اپنے فرائض منصبی کو ادا کرنا چاہتا ہے تو یہ (مخالف) اسکے راستے میں رکاوٹیں ڈالتا ہے -

ان فرائض منصبی کا دائرہ بہت وسیع ہے اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جسکو یہ محیط نہ ہو- چنانچہ سورۃ ھود میں ہے کہ حضرت شعیب ؑ سے ان کی قوم نے کہا کہ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۱۱/۸۷) ،، کیا تیری صلٰوۃ تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں جس کی عبادت ہمارے باپ

دادا اختیار کئے چلے آرہے ہیں - یا ہم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہ کریں "؟ یعنی ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ یہ کیسی صلٰوۃ ہے جو معاشیات تک کو بھی اپنے دائرے کے اندر لے لیتی ہے - اس سے بھی صلٰوۃ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - یعنی زندگی کے ہر شعبے میں ، قوانین خداوندی کے مطابق عمل کرنے کا نام صلٰوۃ ہے - حقیقت یہ ہے کہ (تفصیل اس اجمال کی کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو) بات سمٹ سمٹا کر یہاں آجاتی ہے کہ انسان اپنے معاملات کا فیصلہ اپنی مرضی (خواہشات اور جذبات) کے مطابق کرنا چاہتا ہے یا وحی خداوندی کے مطابق ؟ اپنے تمام معاملات کو وحی خداوندی کے تابع رکھنے کا نام " اقامت صلٰوۃ " ہے - چنانچہ سورۃ مریم میں " اقامت صلٰوۃ " اور " اتباع جذبات " کو ایک دوسرے کے مقابل لا کر اس مفہوم کو واضح کر دیا گیا ہے - ارشاد ہے فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوالصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ .... ($\frac{19}{59}$) - (انبیائے کرام کے بعد)،،ایسے نا خلف پیدا ہو گئے کہ انہوں نے صلٰوۃ کو ضائع کر دیا اور اپنے جذبات و خیالات (اپنی خواہشات) کے پیچھے چلنے لگ گئے،، گویا انسان کا اپنی خواہشات کے پیچھے چلنا صلٰوۃ کو ضائع کر دینا ہے اور قوانین خداوندی کے پیچھے چلنا صلٰوۃ کا قائم رکھنا ہے - سورۃ انعام میں " محافظت صلٰوۃ " کو آخرت اور کتاب اللہ پر ایمان رکھنے کے مرادف قرار دیا گیا ہے - ($\frac{6}{92}$) - اسی بنا پر ابن قتیبہ نے اَلصَّلٰوة کے معنی اَلدِّیْنُ کئے ہیں * - یعنی اقامت صلٰوۃ درحقیقت اقامت دین ہے -

(۶) اَلصَّلْیُ کے معنی آگ اور ایندھن کے ہیں - اس سے صَلَّی عَصَاهُ عَلَی النَّارِ کے معنے ہیں ، اس نے اپنی لکڑی (لاٹھی) کو آگ دکھا کر نرم اور سیدھا کیا - سلب ماخذ کے اعتبار سے صَلَّی کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ اس نے آگ کو ہٹایا اور دور کیا - (روح المعانی) -

اس اعتبار سے دیکھئے تو صلٰوۃ کے معنی ہونگے اپنی خامیوں کو رفع کرنا - صاحب المنار نے کہا ہے کہ صلٰوۃ قَولاً و عملاً اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ہم اپنی خامیوں کو رفع کرنے کے لئے ، نقائص سے بالاتر ایک ذات (کی راھنمائی) کے محتاج ہیں - اسی جہت سے قرطبی نے کہا ہے کہ صلٰوۃ در حقیقت خدا کی محکومیت اور اطاعت کو کہتے ہیں -

* القرطین - جلد اول - صفحہ ۱۳ ، یہ معنی محیط اور اقرب الموارد نے بھی دئے ہیں -

(۷) صلٰوۃ کے ایک معنی جھکانا اور کسی کو اپنی طرف مائل کرنا بھی ہیں*۔ اس جہت سے صلٰوۃ کا مفہوم ہوگا ۔ کائنات کو مسخر کرنا اور اسے اپنے تابع فرمان بنانا ۔

(۸) الصلٰوۃ کے ایک معنی تعظیم کے بھی ہیں**۔ یعنی اپنے عملی پروگرام سے کائنات کو نشو و نما دینے والے (رب العالمین) کی عظمت کو ثابت کرنا ۔ اس سے اقامتِ صلٰوۃ اور ایتائے زکٰوۃ کا باہمی تعلق واضح ہوجاتا ہے ۔ یعنی قوانین خداوندی کے مطابق ایسا پروگرام مرتب کرنا اور اس پر عملاً چلنا جس سے تمام نوع انسان کی نشو و نما ہوتی جائے ۔

(۹) صلٰوۃ کے جو مختلف مفاہیم اوپر بیان ہوئے ہیں ، ان سے ظاہر ہے کہ ایک عبد مومن ، زندگی کے جس گوشے میں بھی قوانین خداوندی کے مطابق اپنے فرائض منصبی ادا کرتا ہے ، وہ فریضۂ صلٰوۃ ہی کو ادا کر رہا ہوتا ہے ۔ اس کے لئے وقت ، مقام یا شکل کا تعیّن ضروری نہیں ۔ لیکن قرآن کریم میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں صلٰوۃ کا لفظ ایک خاص قسم کے عمل کے لئے استعمال کیا گیا ہے ۔ مثلاً

(۱) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَی الْكَعْبَیْنِ ۔ (۵/۶)

"اے ایمان والو! جب تم صلٰوۃ کے لئے کھڑے ہو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو ۔ اور اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو ۔ اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو ۔ "اس کے بعد ہے کہ اگر تمہیں پانی نہ ملے تو تیمم کر لیا کرو ۔

(ب) سورۃ نساء میں ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (۴/۴۳) ۔

"اے ایمان والو ۔ تم صلٰوۃ کے قریب نہ جاؤ درآنحالیکہ تم حالتِ سکر (نشہ یا نیند) میں ہو ۔ تاآنکہ تم جو کچھ منہ سے کہو اسے سمجھو (کہ کیا کہہ رہے ہو)" ۔ اس کے بعد پھر تیمم کا ذکر ہے ۔ (بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں مساجد میں جانے کا ذکر ہے ۔ لیکن یہ بحث الگ ہے) ۔

(ج) نبی اکرمؐ سے ارشاد ہے کہ اِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ

---

* محیط ۔ **تاج

وَ لْيَأْخُذُوْا أَسْلِحَتَهُمْ ۔ فَإِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَرَائِكُمْ ۔ وَلْتَأْتِ طَائِفَةٌ أُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ أَسْلِحَتَهُمْ .... (۴/۱۰۲) ۔ ''اور جب تو ان کے درمیان ہو۔ پھر ان کے لئے قیام صلٰوۃ کرے ۔ تو چاہئے کہ ان میں سے ایک گروہ تیرے ساتھ کھڑا ہو، اور چاہئے کہ وہ اپنے ہتھیار لےلیں ۔ پھر جب وہ سجدہ کرچکیں تو وہ تمہارے پیچھے ہو جائیں، اور چاہئے کہ دوسرا گروہ جنھوں نے صلٰوۃ ادا نہیں کی وہ تیرے ساتھ صلٰوۃ ادا کریں۔ اور وہ اپنے بچاؤ (کا سامان) اور اپنے ہتھیار لئے رہیں''۔ اس کے بعد ہے فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۔ فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ .... (۴/۱۰۳) ۔ ''پھر جب تم صلٰوۃ ادا کر چکو تو کھڑے ۔ بیٹھے ۔ لیٹے جس طرح جی چاہے اللہ کا ذکر کرو ۔ پھر جب تم اطمینان کی حالت میں ہو تو قیام صلٰوۃ کرو''۔

اس سے پہلی آیت یہ ہے فَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا .... (۴/۱۰۱) ۔ ''اور جب تم زمین میں سفر کرو تو اس میں تمہارے لئے ہرج کی بات نہیں کہ تم صلٰوۃ کو کم کر لو اگر تمہیں ڈر ہو کہ کفار (مخالفین) تمہیں تکلیف پہنچائینگے''۔ اس ضمن میں (۲/۲۳۹) بھی دیکھئے ۔

صلٰوۃ کے کم کرنے کا طریق (۴/۱۰۲) میں بیان ہوچکا ہے ۔

(د) سورۃ مائدۃ میں ہے وَ إِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا .... (۵/۵۸) ۔ ''اور جب تم صلٰوۃ کے لئے آواز دیتے ہو تو (مخالفین) اسے ہنسی اور مذاق (کھیل) بنا لیتے ہیں'' ۔ سورۃ الجمعۃ میں ہے إِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ .... (۶۲/۹-۱۰) ۔ ''جب جمعہ کے دن (یا اجتماع کے وقت) صلٰوۃ کے لئے بلایا جائے تو ''اللہ کے ذکر'' کی طرف جلدی آ جایا کرو اور کاروبار کو چھوڑ دیا کرو ۔ اگر تمہیں (اس کی اہمیت کا) علم ہو (تو تم اس حقیقت کو محسوس کر لوگے کہ) یہ تمہارے لئے (کسقدر) بہتر ہے ۔ پھر جب صلٰوۃ ختم ہو جائے تو تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کو تلاش کرو ۔ اور

''اللہ کا بہت ذکر کرو'' ۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ''۔ اس کے بعد ہے کہ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ انہیں جب کاروبار یا کھیل تماشا نظر آجاتا ہے تو اس کی طرف بھاگ جاتے ہیں اور تجھے کھڑا چھوڑ جاتے ہیں ۔ ان سے کہو کہ جو کچھ اللہ کے ہاں سے تمہیں مل سکتا ہے وہ کھیل اور کاروبار سے کہیں بہتر ہے ۔ اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے ۔ ($\frac{62}{11}$) ۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں صلٰوۃ کا لفظ ان اجتماعات کے لئے بھی آیا ہے جنہیں عام طور پر نماز کے اجتماعات کہا جاتا ہے ۔ (نماز کا لفظ عربی زبان کا نہیں ۔ پہلوی زبان کا ہے) ۔ ان اجتماعات کے سلسلہ میں ایک بات خاص طور پر سمجھنے کے قابل ہے ۔ جیسا کہ (ع ۔ ب ۔ د) کے عنوان میں وضاحت سے بتایا جائیگا ، قرآن کریم کی رو سے ''خدا کی عبادت'' سے مفہوم اس قسم کی ''پرستش'' یا ''پوجا پاٹ'' نہیں جو عام طور پر اہل مذاہب کے ہاں پائی جاتی ہے ۔ قرآن کریم کی رو سے ''عبادت'' کا مفہوم خدا کے قوانین و احکام کی اطاعت ۔ یا ''اللہ کی محکومیت اختیار کرنا ہے''۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی یہ محکومیت ، زندگی کے ہر سانس اور کاروبار حیات کے ہر شعبہ میں اختیار کی جائے گی ۔ اس کی عملی شکل وہ نظام مملکت ہے جو قرآنی اصولوں کے مطابق متشکل کیا جاتا ہے ۔ اسی نظام کے حاملین کے متعلق فرمایا وَ الَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ($\frac{42}{38}$) ۔ ''یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے نشو و نما دینے والے کی اطاعت کرتے ہیں ۔ اور اقامتِ صلٰوۃ کرتے ہیں ۔ اور ان کا معاملہ باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے ۔ اور جو کچھ ہم انہیں دیتے ہیں وہ اسے (نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے) کھلا رکھتے ہیں''۔ ان آیات میں ، اطاعت خداوندی ۔ اقامتِ صلٰوۃ اور امور مملکت کے طے کرنے کے لئے باہمی مشاورت کا ارتباط غور طلب ہے ۔ ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی کے نفاذ کے متعلق ضروری امور کا فیصلہ کرنے کے لئے باہمی مشاورت کی ضرورت ہوگی، اور مشاورت کے لئے اجتماعات بھی ضروری ہونگے ۔ وسیع معنوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ اجتماعات بجائے خویش ''اقامت صلٰوۃ'' ہی کا ایک حصہ ہونگے ۔ لیکن ان اجتماعات میں ایک اور حقیقت کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ جیسا کہ (ر ۔ ک ۔ ع) اور (س ۔ ج ۔ د) کے عنوانات میں لکھا جا چکا ہے،انسان اپنے جذبات کا اظہار جسم کے اعضا کی محسوس حرکات سے بھی کرتا ہے ، اور یہ چیز اس میں ایسی راسخ ہو چکی ہے کہ اس سے یہ حرکات خود بخود سرزد ہوتی رہتی ہیں ۔ غم و غصہ ، خوشی ، تعجب ، عزم و ارادہ ، ہاں اور نہ ،

وغیرہ قسم کے جذبات اور فیصلوں کا اظہار، انسان کی طبعی حرکات سے بلا ساختہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت جذباتِ عزت و احترام اور اطاعت و انقیاد کے اظہار کی ہے۔ تعظیم کے لئے انسان کا سر بلا اختیار نیچے جھک جاتا ہے۔ اطاعت کے لئے "سر تسلیم خم" ہوجاتا ہے۔ اگرچہ قرآن کریم عمل کی روح اور حقیقت پر نگاہ رکھتا ہے، اور محض (Formalism) کو کوئی وزن نہیں دیتا، لیکن جہاں کسی جذبہ کی روح اور حقیقت کے اظہار کے لئے (Form) کی ضرورت ہو، اس سے روکتا بھی نہیں، بشرطیکہ اس (Form) ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لیا جائے۔ صلٰوۃ کے سلسلہ میں قیام و سجدہ وغیرہ کی جو عملی شکل ہمارے سامنے آتی ہے، وہ اسی مقصد کے لئے ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ان جذبات کا اظہار، اجتماعی شکل میں ہو، تو اظہار جذبات کی محسوس حرکات میں ہم آہنگی کا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے، ورنہ اجتماع میں انتشار ابھرتا دکھائی دیگا۔ احترام و عظمت، انقیاد و اطاعت، اور فرماں پذیری و خود سپردگی کے والہانہ جذبات کے اظہار میں نظم و ضبط کا ملحوظ رکھنا، بجائے خویش بہت بڑی تربیتِ نفس ہے۔ یہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ

بے قراری ہے کس قرار کے ساتھ
جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

یہ ہے جذبات اطاعت و تسلیم کے اظہار کی وہ منضبط شکل (صلٰوۃ) جسے قرآن کریم، جماعتِ مومنین کی مجالس و مشاورت کا ضروری حصہ قرار دیتا ہے۔ (جسطرح آجکل ہمارے ہاں جلسوں کی کاروائی کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے کیا جاتا ہے اگرچہ یہ چیز محض رسمًا ادا کر دی جاتی ہے)۔ (وَ الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۔ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ) ان اجتماعات کی اہمیت کے پیش نظر، قرآن کریم نے انہیں كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (۴/۱۰۳) کہا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں "خاص طور پر مقرر کردہ فریضہ"۔ اور دوسرے معنی ہیں "ایسا فریضہ جو وقت پر ادا کیا جاتا ہے"۔ اجتماعات کے لئے وقت کی پابندی جس قدر ضروری ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی لئے سورۃ الجمعہ کی جو آیت پہلے درج کی جا چکی ہے، اس میں خاص طور پر کہا گیا ہے کہ جب اس اجتماع کے لئے بلایا جائے، تو اسے تمام دیگر مصروفیات پر ترجیح دو۔ تمام کاروبار چھوڑ کر فوراً اس طرف آجاؤ اور جب تک اس سے فارغ نہ ہوجاؤ کسی اور کام کی طرف دھیان مت دو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا امیر، تمہارے سامنے ضروری معاملات پیش کر رہا ہو، ان کی اہمیت سمجھا رہا ہو، اور تم کاروبار کے لئے باہر نکل جاؤ۔ (وَ تَرَكُوْكَ قَآئِمًا)۔

یوں تو جماعتِ مومنین کی ساری زندگی—دن رات—صبح شام—قوانین خداوندی کی اطاعت اور انکے نفاذ کی تگ و تاز میں گذرتی ہے، لیکن اجتماعات کے لئے خاص اوقات کا تعین ضروری ہوتا ہے—خواہ یہ اجتماعات معمولاً منعقد ہوں یا ہنگامی طور پر بلائے جائیں—ذہن انسانی کی توہم پرستیوں نے، جہاں زندگی کے اور گوشوں میں ''سعد و نحس'' کے افسانے تراشے تھے وہاں دن اور رات کے بعض اوقات کے لئے بھی اسی قسم کے تصور قائم کر رکھے تھے - سورج نکلتے وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہئے - زوال کے وقت یوں نہیں کرنا چاہئے - دن اور رات کے ملتے وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہئے - وغیرہ وغیرہ - قرآن کریم نے جہاں اور توہم پرستیوں کا خاتمہ کر دیا وہاں اوقات کے سلسلہ میں بھی یہ کہہکر بات واضح کر دی ہے کہ دن اور رات میں نہ کوئی ساعت نحس ہے نہ سعد - اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فلاں وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہئے - جہاں تک اجتماعات صلٰوۃ کا تعلق ہے - أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَ قُرْآنَ الْفَجْرِ . . . . (۱۷/۷۸) تم ''دلوک الشمس'' سے رات کی تاریکی تک اقامتِ صلٰوۃ کر سکتے ہو - اور صبح کے وقت کا قرآن بھی—(د - ل - ک) کے عنوان میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ ''دلوک'' میں، صبح سے شام تک کا سارا وقت آجاتا ہے ؛ بالخصوص جب سورج کے بلند ہونے - نصف النہار تک پہنچنے، مائل بہ زوال ہونے اور غروب ہوجانے کی مختلف منازل کو (خاص طور پر) اس میں شامل کرنا مقصود ہو - ان مختلف منازل کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود، ان توہم پرستیوں کی تردید تھا جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے - انہی کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ وَ أَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ (۱۱/۱۱۴) - ''دن کے دونوں اطراف اور رات کے حصوں میں اقامت صلٰوۃ کرو'' -

ان اوقات کا ذکر تو خصوصیت سے لفظ صلٰوۃ کے ساتھ کیا گیا ہے، ویسے اقامت دین کے سلسلہ میں جماعت مومنین کی تگ و تاز کے سلسلہ میں (جسے قرآن کریم تسبیح ، تحمید و تذکیر کے اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے) دن، رات کے تمام اوقات کا ذکر آیا ہے - دیکھئے (۳/۱۹۰) و (۲۰/۱۳۰) و (۵۰/۳۹) و (۵۲/۴۹) وغیرہ -

سورۃ نور میں صلٰوۃ الفجر اور صلٰوۃ العشاء کا ذکر (ضمناً) آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ تمہارے گھر کے ملازمین کو چاہئے کہ وہ تمہاری (Privacy)

کے اوقات میں ، اجازت لیکر کمرے کے اندر آیا کریں - یعنی مِنْ قَبْلِ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ وَحِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَکُمْ مِّنَ الظَّھِیْرَۃِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوۃِ الْعِشَاءِ (۲۴/۵۸) ''صلٰوۃ الفجر سے پہلے- اور جب تم دوپہر کو کپڑے اتار دیدیتے ہو- اور صلٰوۃ العشاء کے بعد'' - اس سے واضح ہے کہ رسول اللہ کے زمانہ میں اجتماعات صلٰوۃ کے لئے (کم از کم) یہ دو اوقات متعین تھے - جبھی تو قرآن کریم نے ان کا ذکر نام لیکر کیا ہے -

جہاں تک صلٰوۃ میں کچھ پڑھنے کا تعلق ہے ، یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئیے کہ تم کیا پڑھ رہے ہو(۴/۴۳)- دوسرے مقام میں ہے وَلَا تَجْھَرْ بِصَلَاتِکَ وَلَا تُخَافِتْ بِھَا وَابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا (۱۷/۱۱۰)-''اور اپنی صلٰوۃ کو نہ تو بلند آواز سے ادا کر اور نہ خاموشی سے - ان دونوں کے درمیان راستہ اختیار کر'' بعض لوگوں کا خیال ہے اس آیت میں صلٰوۃ سے مراد عام دعا یا ذکر ہے - نماز نہیں - لیکن یہ خیال صحیح نظر نہیں آتا - ''ذکر'' کے متعلق قرآن کریم میں بہ صراحت موجود ہے (۷/۲۰۵) کہ اسے خاموشی سے دل میں کرنا چاہئے - بہ آواز بلند نہیں - (ذکر سے مراد ، قانون خداوندی کی یاد ہے) - اسلئے مندرجہ بالا آیت میں صلٰوۃ سے مراد '' نماز'' ہی ہوسکتی ہے - قرطبی نے اس کے معنی قرأت لکھے ہیں -

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ ان مقامات میں صلٰوۃ سے مراد اجتماعات صلٰوۃ ہیں - (اس کے لئے فعل صَلّٰی - یُصَلِّیْ آتا ہے) - اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں '' اقیمو الصلٰوۃ'' کہا ہے وہاں ، بہ ہیئتِ مجموعی ، اس سے مراد ہے ، اقامت دین - (یعنی نظام خداوندی کی تشکیل و استحکام)- قوانین و احکام خداوندی کا اتباع - ان فرائض منصبی کی ادائگی جو ایک عبد مومن پر عائد ہوتے ہیں - لیکن بعض مقامات پر اس سے مراد ہیں اجتماعاتِ صلٰوۃ جو خود دین کے نظام کا جزو ہیں - متعلقہ مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ وہاں اقامت صلٰوۃ سے مقصود کیا ہے - اسی طرح جہاں جہاں '' مصلین '' آیا ہے وہاں بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ اس سے مراد جماعت مومنین (بہ ہیئتِ مجموعی) ہے یا صرف اجتماعاتِ صلٰوۃ میں شرکت کرنے والے، اس لئے کہ قرآن کریم نے ان ''مصلّین'' کا بھی ذکر کیا ہے جو شرف انسانیت کی بلندیوں پر ہیں (دیکھئے ۷۰/۲۳-۳۴) - اور ان کا بھی جن کے لئے تباہی ہے (۱۰۷/۴) -

(۱۰) صَلَّى عَلَيْهِ - راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں تعظیم کرنا - دعا دینا - حوصلہ افزائی کرنا - پروان چڑھانا - نشو و نما دینا - کسی قسم کی خرابی یا فساد پیدا نہ ہونے دینا *۔

ان معانی کو سامنے رکھنے سے قرآن کریم کے ان مقامات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جن میں یہ مادہ علیٰ کے صلہ کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً سورۂ احزاب میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ ..... (۳۳/۴۳) - "خدا اور اس کے ملائکہ (کائناتی قوتیں) تمہاری حوصلہ افزائی کرتے ہیں - تمہاری نشو و نما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں - تمہاری کوششوں کو پروان چڑھاتے ہیں" - یہ ان مومنین کے متعلق ہے جن کی بابت دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ جب انہیں اقامت دین کے سلسلہ میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ ان سے گھبراتے نہیں - حوصلہ نہیں ہارتے، بلکہ ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں - أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ (۲/۱۵۷) - یہ لوگ خدا کے نزدیک مستحق تبریک و تہنیت ہیں - انہیں خدائی تائید و نصرت حاصل ہے - خدا ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے - ان کی کوششوں کو کامیاب بناتا ہے - ان کی نشو و نما کرتا ہے -

یہ تو رہا عام جماعت مومنین کے متعلق - خود نبی اکرم کے متعلق ہے کہ إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ...... (۳۳/۵۶) - خدا اور اس کے ملائکہ نبی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں - اس کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچاتے ہیں - اس کے بعد ہے - يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا - (۳۳/۵۶) - "اے جماعت مومنین! تم بھی اپنے نبی کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں اس کا ساتھ دو - اس کی کوششوں کو پروان چڑھانے میں اسکی مدد کرو - اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ اس کی پوری پوری اطاعت کرو" - (۴/۶۵) - وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ (۴۸/۹) - (تاکہ) تم اسکی مدد کرو - اسکی عزت و توقیر کرو - مومنین کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ (۷/۱۵۷) - "جنہوں نے اسکی تائید و تعظیم کی - اس کی مدد کی" - اسطرح کہ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ (۷/۱۵۷) "جو روشن (کتاب) ہم نے اس کے ساتھ نازل کی ہے اس کا اتباع کیا" - یہ ہے مومنین کی طرف سے صَلُّوا عَلَيْهِ کے فریضہ کی ادائیگی کا طریق -

یہ ہے خدا اور اس کے ملائکہ کے صَلَوَاتٌ جماعت مومنین پر اور خود نبی اکرم پر - اور یہ ہے جماعت مومنین کا صلوٰۃ و سلام نبی اکرم پر -

* راغب و تاج -

آپ نے غور فرمایا کہ صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا کا حکم کتنے عظیم عملی پروگرام کا متقاضی ہے - یعنی قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت سے اس دین کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کرنا جسے نبی اکرمؑ لیکر تشریف لائے تھے - دوسری طرف نبی اکرمؑ سے کہا گیا ہے کہ جب جماعت مومنین کے افراد، انفاق فی سبیل اللہ کے لئے تیرے پاس اپنی کمائی لیکر آئیں تو اسے قبول کر، وَصَلِّ عَلَيْهِمْ - اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (۹/۱۰۳) - اوران کی حوصلہ افزائی کر - اس لئے کہ تیری طرف سے حوصلہ افزائی (Encouragement)، تحسین و تبریک (Appreciation)، ان کے لئے موجب تسکین ہوتی ہے - وہ اس انفاق فی سبیل اللہ کو قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ (۹/۹۹) کا موجب سمجھتے ہیں - یعنی قرب خداوندی کا باعث اور رسول کی طرف سے تحسین و تبریک اور حوصلہ افزائی کا موجب - ("قرب خداوندی" کے لئے ق - ر - ب کا عنوان دیکھئے) -

(۱۱) لغت عبرانی میں صَلَوٰتٌ یہودیوں کی عبادت گاہوں کو بھی کہتے ہیں - (۲۲/۴۰) میں یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے -

ص ل ی

صَلَى اللَّحْمَ يَصْلِيْهِ بِالنَّارِ صَلْيًا - اسنے گوشت کو بھون لیا - اسنے گوشت کو بھوننے کیلئے اسے آگ میں ڈال دیا * -

اَلصَّلْىُ کے اصل معنے آگ جلانے کے ہیں - صَلِيَ بِالنَّارِ - اس نے آگ کی تکلیف برداشت کی - وہ آگ میں جلا - صَلَيْتُ الشَّاةَ - میں نے بکری کو بھون لیا ** - اَصْلَاهُ النَّارَ وَصَلَّاهُ - اس نے اسے جلنے کیلئے آگ میں داخل کر دیا - اسکا ٹھکانہ آگ میں بنا دیا *** -

اَلصِّلَاءُ - بھنی ہوئی چیز - آگ جلانے کیلئے ایندھن * -

صَالِ - وہ جو آگ میں بھنے - جو جہنم کی طرف جائے - مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ (۳۷/۱۶۳) - الصَّلِيُّ : جانا ، آگ کی تکلیف برداشت کرنا (۱۹/۷۰) -

سورۃ اعلیٰ میں ہے اَلَّذِیْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى (۸۷/۱۲) جو بہت بڑی آگ میں داخل ہوتا (یا بھنتا) ہے -

سورۃ حاقۃ میں ہے ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ (۶۹/۳۱) - پھر اسے جہنم میں داخل کرو - سورۃ مدثر میں ہے سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ (۷۴/۲۶) - میں اسے دوزخ میں

* تاج - ** راغب - *** محیط -

داخل کرونگا۔ سورۂ واقعہ میں ہے تَصْلِيَةُ جَحِيمٍ (۵۶/۹۴) جہنم میں جلانا۔ اِصْطَلٰی (اِصْتَلٰی) آگ تاپنا اور اس سے گرمی حاصل کرنا۔ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ (۲۷/۷)۔

ص م ت

اَلصَّمْتُ۔ اَلصُّمُوْتُ۔ اَلصُّمَاتُ۔ خاموش ہونا۔ (سَكَتَ اور صَمَتَ کے فرق کیلئے دیکھئے عنوان س۔ک۔ت) ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ابہام اور اغلاق کے ہوتے ہیں۔ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ (۷/۱۹۳) تم چپکے رہو۔ اَلصَّامِتُ۔ سونے چاندی (یعنی نہ بولنے والی دولت) کو کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف اَلنَّاطِقُ۔ وہ دولت جو جانوروں کی شکل میں ہو۔ الصُّمُوْت۔ گڑ جانے والی تلوار۔ حَائِطٌ مُصْمَتٌ۔ وہ دیوار جس میں کوئی روشن دان، دروازہ یا شگاف نہ ہو*۔

ص م د

اَلصَّمْدُ۔ بلند جگہ جو، سخت ہو لیکن اتنی اونچی نہ ہو کہ پہاڑ کی حد تک پہنچ جائے۔ اَلصَّمْدَةُ۔ پتھر کی محکم چٹان۔ اَلصَّمَدُ۔ وہ سردار جسکی اطاعت کی جائے اور جسکے بغیر کسی معاملہ کا فیصلہ نہ کیا جائے۔ وہ ہستی جس کی طرف ضروریات کیلئے رجوع کیا جائے۔ وہ ہستی جس سے کوئی مستغنی نہ ہو سکے۔ وہ شخص جسے جنگ میں نہ بھوک ستاتی ہو نہ پیاس۔ نَاقَةٌ مِصْمَادٌ۔ وہ اونٹنی جو سردی کی شدت اور چارہ کے کم ہونے کے باوجود برابر دودھ دیتی رہے*۔ صِمْدُ الْمِحْرَاثِ۔ ہل کی وہ لکڑی جسے ہل چلاتے وقت ہالی ہاتھ سے پکڑتا ہے*۔ اَلصَّمْدُ۔ قصد اور ارادہ کرنا*۔

قرآن کریم میں اللہ کیلئے اَلصَّمَدُ آیا ہے۔ اللّٰهُ الصَّمَدُ (۱۱۲/۲)۔ "اللہ ہی صمد ہے"۔ اَلصَّمَدُ کے ان معانی پر غور کیجئے جو اوپر بیان ہوئے ہیں اور پھر دیکھئے کہ قرآن کریم نے اس ایک لفظ سے خدا کے متعلق کیسا وسیع اور بلند تصور پیش کیا ہے۔ یعنے ایسی بلند اور محکم چٹان کہ جب ہر طرف سے سیلاب کا پانی گھیر لے اور کہیں پناہ کی جگہ نہ ملے تو لوگ اسکی طرف رجوع کریں اور انہیں وہاں پناہ مل جائے۔ نیز وہ ذات جو دوسروں کی تمام ضروریات کو تو پورا کرے لیکن خود ان سب سے مستغنی ہو۔ نیز، اسکی نوازشات غیر منقطع ہوں اور اسکی ربوبیت مسلسل جاری رہے۔

---

* تاج۔ محیط۔

جو قوم اپنے اندر اس خصوصیت کو پیدا کر لے اسکے مقام بلند کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ اپنے مقصد کے حصول میں بھوک اور پیاس کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہو اور دوسروں کی نشوو نما میں سردی اور قحط بھی اس کے راستے میں حائل نہ ہو سکیں ۔ چٹان کی طرح محکم اور سب بے آسروں کا آخری سہارا ۔ اور قابل اعتماد آسرا ۔ لیکن دوسروں کے سہاروں سے مستغنی ۔

خدا کے متعلق قرآن کریم نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ (۱۱۲:۱-۲) کہکر ایک اور بلند حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے ۔ اَحَدٌ کے معنے ہیں منفرد ۔ یگانہ (Unique) ۔ اس انفرادیت میں مخلوق سے بے ہمگی (Transcendence) کا پہلو مضمر ہے ۔ لیکن صمدیت کے معنے یہ ہیں کہ مخلوق کی ایک ایک سانس اسکی ربوبیت سے وابستہ ہے ۔ اس سے اسکی باہمگی (Immanence) کا پہلو نمایاں ہے ۔ لہذا وہ ذات باھمہ بھی ہے اور بے ھمہ بھی ۔ یہی صفت مومن کی ہونی چاہیئے ۔ اقبال کے الفاظ میں ۔

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است
اے کہ در قافلهٔ بے همه شوبا همه رو

یعنے اَحَدِیَّت اور صَمَدِیَّت دونوں ۔

اللہ تعالےٰ کی ذات مکمل ترین اور بلند ترین ہے ۔ یعنی (The Most Developed, Complete, and Perfect Personality) اس نے انسان کو بھی ذات (Personality) عطا کی ہے ، لیکن غیر نشوو نما یافتہ شکل (Un-Developed Form) میں ۔ صفات خداوندی (الاسماء الحسنیٰ) جو قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں ، ذات خداوندی کے مختلف گوشے (Facets) ھیں ۔ ان میں بعض تو ایسے ھیں جو صرف خدا کی ذات سے مخصوص ہیں ۔ (مثلاً هُوَ اَلاَوَّلُ) ۔ لیکن دوسری صفات ایسی ھیں جو (حدود بشریت کے اندر) انسانی ذات میں منعکس ھوسکتی ھیں ۔ ان میں صمدیت بھی شامل ہے ۔ یعنی جوں جوں انسانی ذات کی نشوونما ھوتی جائیگی وہ خارجی سہاروں سے مستغنی ھوتی جائیگی اور دوسروں کو سہارا دینے کا موجب بنتی جائیگی ۔ حریت اور استغناء (Freedom and Independance) ذات کے بنیادی خصائص (Basic Characteristics) ھیں (مزید تفصیل ر ۔ و ۔ ح اور ن ۔ ف ۔ س کے عنوانات میں دیکھئے) ۔

ص م ع

اَلاَصْمَعُ ۔ چھوٹے کانوں والا آدمی ۔ ظَبْیٌ مُصَمَّعٌ ۔ ھرن جس کے سینگ اوپر سے پتلے اور باریک ھوں ۔ اَلصَّقُوْمَعَۃٌ ۔ عقاب ، کیونکہ وہ بلندی

پر اُڑتا ھے - صَوْمَعَۃٌ - خانقاہ ، چونکہ اسکا منارا اوپر سے لمبا اور نوکدار بنایا جاتا تھا - (جیسے گرجا یا مندر کا منارہ) - یا اسکی تنگی کی وجہ سے ، جس طرح اس آدمی کا سر ھوتا ھے جسکے کان چھوٹے چھوٹے ھوں - لیکن بلندی کی جہت سے یہ مفہوم زیادہ مناسب نظر آتا ھے، کیونکہ کہتے ھیں صَوْمَعَ بِنَاءَہٗ - اسنے اپنی عمارت کو بلند کیا - اَصْمَعُ - معزز ترین مقام پر ترق کرنے والا - صَمَعَ - وہ اپنی دھن میں سر اٹھائے بے پروائی کے ساتھ گزر گیا * - صَوْمَعَۃٌ کی جمع صَوَامِعُ آتی ھے (۲۲/۴۰) - خانقاھیں، یعنی راھبوں کی کوٹھڑیاں ** - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں باریکی اور لطافت اور اتصال پایا جاتا ھے - یعنی کسی شے کا باریک ھونا اور ساتھ ھی اس کے اجزا کا باھمدگر پیوست ھونا -

ص م م

صَمَمٌ کے معنے ھیں کان کا بند ھو جانا اور ثقلِ سماعت - صِمَامُ الْقَارُوْرَۃِ - شیشی کے ڈاٹ کو کہتے ھیں جس سے اس کا منہ بند کیا جاتا ھے - صَخْرَۃٌ صَمَّاءُ - ٹھوس اور سخت چٹان جس میں کوئی شگاف نہ ھو - اَلْاَصَمُّ - بہرہ - اس کی جمع صُمٌّ ھے - نیز ایسے آدمی کو کہتے ھیں جو اپنی مرضی کرے اور کسی کی نہ سنے اور جس سے یہ توقع نہ رھے کہ اسے اس کی خواھشات سے باز رکھا جاسکے گا *** -

اَلْمُصْمَئِمُّ - وہ اونٹ جو بڑبڑائے نہیں اور نہایت استقامت سے چلتا جائے *** -

قرآن کریم میں صُمٌّ کا لفظ بہروں کے لئیے آیا ھے ، نیز ان لوگوں کے لئیے بھی جو حق کی آواز نہ سنیں اور اپنی مرضی کرتے چلے جائیں - وہ لوگ جو جانوروں کی طرح ھوں اور عقل و فکر سے کام نہ لیں (۸/۲۲) - قرآن کریم اندھے ، بہرے ، گونگے ، حتکہ مُردے ، ان لوگوں کو کہتا ھے جو عقل و بصیرت اور دلائل و براھین سے کام نہ لیں اور جذبات سے مغلوب ھوکر ، یا تقلیدی طور پر ، غلط راھوں پر چلتے جائیں۔

اَصَمَّ - بہرہ کر دینا (۴۷/۲۳) -

ص ن ع

صَنْعٌ کے معنے کسی کام کو (قاعدے اور قانون کے مطابق نیز فن کے اعتبار سے) اچھی طرح کرنے کے ھیں - اس لئیے یہ لفظ فِعْلٌ (کام کرنے) سے خاص ھے اور حیوانات کے لئیے نہیں بولا جاتا ***** -

*تاج - محیط و راغب - **لطائف اللغہ - ***تاج و محیط - *****راغب -

صُنْعٌ - بہت اچھی کاریگری کو کہتے ہیں* - صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْ آتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ (۲۷/۸۸) - خدا کی (کیسی عجیب و غریب) صنعت کاری ہے جس نے ہر شے کو نہایت کمال و مہارت سے محکم طور پر بنایا ہے -

صَنْعَۃٌ - کسی چیز کا عمدگی سے بنانا (۲۱/۸۰) - اَلْمَصَانِعُ - عمارات - حوض یا تالاب جن میں بارش کا پانی جمع کر لیا جائے - محلات - قلعہ - پختہ آبادیاں نیز صنعت گاہیں اور کارخانے - ابن فارس نے لکھا ہے کہ آبپاشی کے لئے جو کنواں وغیرہ بنایا جائے یہ اس کے لئے بولا جاتا ہے - راغب نے اسکے معنے بلند اور معزز و پرجلال مقامات کئے ہیں - (۲۶/۱۲۹) - صَنَعَ الْفَرَسَ - گھوڑے کی عمدہ طریقہ سے دیکھ بھال ، نگرانی اور تربیت کرنا - ھُوَصَنِیْعِیْ - وہ میرا پروردہ و تربیت یافتہ ہے* - سورۃ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ ہم نے تجھے فرعون کے محلات میں پہنچا دیا تاکہ وہاں ہماری زیر نگرانی تمہاری تربیت ہو اور تم سلطنت کے امور اور مملکت کے انداز سیکھ سکو - لِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ (۲۰/۳۹) - اس سے ظاہر ہے کہ ، ہونے والے رسول کی پیدائش خدا کے پروگرام کے مطابق ہوتی تھی اور شروع ہی سے اس کی تربیت اس انداز سے کی جاتی تھی کہ وہ آگے چل کر نبوت جیسی عظیم القدر ذمہ داری کا اہل بن سکے - اسی لئے حضرت موسیٰؑ کی قبل از نبوت زندگی کے مختلف مراحل کا ذکر کرنے کے بعد کہا - ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی (۲۰/۴۰) - اتنی کٹھالیوں میں تاؤ کھانے - فُتُوْنًا (۲۰/۴۰) کے بعد تب کہیں جا کر تم نبوت کے پیمانے پر پورے اترے - لہذا یہ سمجھنا محض ''شاعری'' ہے کہ - آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے - اس سے آگے ہے وَاصْطَنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ (۲۰/۴۱) اَلْاِصْطِنَاعُ کے معنے ہیں کسی چیز کے سدھارنے میں انتہائی زور اور توجہ صرف کرنا - بہت زیادہ غور اور احتیاط سے اصلاح و تربیت کرنا** - لہذا آیت کے معنے یہ ہیں کہ تمہاری تربیت خاص پروگرام کے مطابق کی گئی ہے - اس لئے کہ ہمیں تجھ سے ''اپنا کام'' لینا تھا - یہ سب کچھ ہم نے اپنے ایک مقصد کے لئے کیا ہے - وہ مقصد کیا ہے؟ اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی (۲۰/۴۳) - فرعون کی طرف جاؤ - اس نے حد اعتدال سے نکل کر بڑی سرکشی اختیار کر رکھی ہے - یعنے استبداد و سرکشی کی قوتوں کو مغلوب کرکے مظلوم انسانیت کو ان کے آہنی پنجہ سے چھڑانا ، اور پھر ان کی ایسی تربیت کرنا کہ وہ شرف انسانیت کے اہل بن جائیں - یہ ہے وہ مقصد عظیم جس کے لئے ایک نبی کی تربیت کی جاتی تھی -

*تاج - **راغب -

اور جسے خدا نے خود ''اپنا کام'' کہا ہے۔ (واضح رہے کہ نبی کو اس دوران میں کچھ علم نہیں ہوتا تھا کہ اسے نبوت کے لئے تیار کیا جارہا ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ انسان اپنی سعی و عمل سے مقام نبوت تک پہنچ سکتا ہے مقام نبوت سے ناواقفیت کی دلیل ہے)۔

ص ن م

اَلصَّنَمُ (جمع اَصْنَامٌ)۔ بت۔ صَنَمَ الصُّوْرَۃَ کے معنے ہیں تصویر کوخوشنما اور جاذب بنا دینا** ۔ نیز کسی چیز کی بُو کے خراب ہو جانے کو بھی کہتے ہیں* ۔ راغب نے بعض حکماء کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو خدا سے بیگانہ بنا دے اور اس کی توجہ کو کسی دوسری طرف پھیر دے، صَنَمٌ کہلاتی ہے*** ۔ لہذا اَصْنَامٌ وہ تمام جاذبیتیں اور مفاد پرستیاں ہیں جو انسان کو قانون خداوندی سے بیگانہ بنا دیتی ہیں ۔ چنانچہ راغب نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو دعا مانگی تھی کہ وَاجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (۱۴/۳۵) ۔ اے اللہ مجھے اور میری اولاد کو اس سے محفوظ رکھنا کہ ہم اصنام کی عبودیت اختیار کرلیں تو اس سے مراد ایسی ہی چیزوں کے پیچھے لگ جانا تھا، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کو اس کا اندیشہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اور انکی اولاد بت پرستی شروع کر دے گی*** ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (۱۲/۱۰۶) ۔ ان میں سے اکثر کی یہ حالت ہے کہ وہ خدا پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ مشرک کے مشرک بھی رہتے ہیں ۔ ہم اس آیت کو پڑھ کر آگے گزر جاتے ہیں کہ یہ ہمارے متعلق نہیں ۔ ہم تو کسی بت کی پرستش نہیں کرتے ۔ یعنی ہماری نگاہ مٹی اور پتھر کے بتوں کی طرف رہتی ہے اور ان بتوں کو کبھی نہیں دیکھتی جو ہر آن ہمارے قلب و دماغ کے صنمکدوں میں ڈھلتے رہتے ہیں اور جنہیں ہم اپنی آستینوں میں لئے لئے مسجدوں میں سجدے اور حرم کعبہ میں طواف کرتے رہتے ہیں۔ اس سے بڑی اصنام پرستی اور اس سے سنگین ترشرک اور کیا ہوسکتا ہے؟ یہی وہ بت پرستی تھی جس کا خدشہ حضرت ابراہیمؑ کے دل میں (اپنی اولاد کی طرف سے) پیدا ہوا تھا اور ہم (ملت ابراہیمی کے مدعی) ان کے اس خدشہ کو سچا کرکے دکھلا رہے ہیں!

---

*تاج ۔ **کتاب الاشتقاق ۔ ***راغب ۔

ص ن و

اَلصِّنْوُ - کھجور وغیرہ کی جڑ سے جو مختلف شاخیں پھوٹتی ھیں ان میں سے ھر ایک کو صِنْوٌ کہتے ھیں - اس کی جمع صِنْوَانٌ ھے* - لہٰذا نَخِیْلٌ صِنْوَانٌ (۱۳/۴) ایسی کھجوروں کو کہینگے جن میں ایک ھی اصل سے دو دو یا زیادہ تنے پھوٹتے ھوں اور غَیْرُ صِنْوَانٍ (۱۳/۴) انھیں جو الگ الگ جڑوں سے تنہا نکلتی ھوں - اَلصِّنْوَۃُ - حقیقی بہن ، بیٹی ، یا پھوپھی کو کہتے ھیں اور اَلصِّنْوُ حقیقی بھائی ، بیٹے اور چچا کو - کیونکہ یہ سب ایک ھی اصل کی شاخیں ھوتے ھیں* -

ص ھ ر

اَلصَّھْرُ - گرم - شَیْئٌ صَھْرٌ - گرم چیز - اَلصَّھْرُ - چربی وغیرہ کو گرم کرکے پگھلانا - صَھَرَتْہُ الشَّمْسُ تَصْھَرُ - دھوپ کی سخت تپش نے اس کے دماغ کو کھولا دیا ، یا اس کی چربی پگھلادی - صَھَرْتُہٗ بِالنَّار میں نے اسے آگ پر پکا کر گلا دیا - اَلصُّھَارَۃُ - پگھلائی ھوئی چربی* - سورۃ حج میں ھے یُصْھَرُ بِہٖ مَا فِیْ بُطُوْنِھِمْ (۲۲/۲۰) اس کے ذریعے جو کچھ ان کے اندر ھے اسے گلایا اور پکادیا جائیگا - ان کی شدت اور سختی پگھلا دی جائیگی -

اَلصِّھْرُ - قرابت - اس کے متعین مفہوم کے لئے بہت سے اقوال آئے ھیں لیکن اکثریت کا خیال اسی طرف ھے کہ بیوی کے خاندان والے اَصْھَارٌ کہلاتے ھیں اور شوھر کے خاندان والے اَخْتَانٌ - قرآن کریم میں ھے فَجَعَلَہٗ نَسَبًا وَّ صِھْرًا (۲۵/۵۴) - نسب سے مراد وہ رشتہ داری ھے جو اپنے آباؤ اجداد کی طرف سے ھو اور صِھْرٌ سے مراد وہ رشتہ داری ھے جو شادی کی وجہ سے پیدا ھو جائے* - قرآن کریم عائلی زندگی کو بڑی اھمیت دیتا ھے - اس اعتبار سے وہ میاں بیوی دونوں کے رشتہ داروں کو مشترکہ رشتہ دار قرار دیتا ھے -

ص و ب

صَابَ - یَصُوْبُ - صَوْبًا کے معنے ھیں گرنا - اوپر سے نیچے آنا - نیز قصد و ارادہ کرنا بارش کا گرنا - صَوْبٌ وصَوَابٌ - خطا کی ضد بھی ھے - یعنے صحیح بات - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی

*تاج و محیط و راغب -

چیز کے اترنے اور اتر کر اپنے مستقر تک جا پہنچنے کے ہیں ۔ اس اعتبار سے وہ بات یا کام جو اپنی صحیح جگہ پر پہنچ کر ٹھہر جائے صَوَاب کہلائیگا۔ سَہْمٌ صَائِبٌ اس تیر کو کہتے ہیں جو ٹھیک نشانہ پر جالگے ۔ نیز صَوْبٌ کے معنے بہانے (گرانے)اور اوپر سے اترنے کے بھی آتے ہیں ۔ آسمان سے بارش ہونے کے معنوں میں بھی یہ لفظ آتا ہے ۔ مُصِیْبَۃٌ اس تیر کو کہتے ہیں جو نشانہ پر جا کر بیٹھ جائے ۔ اس کے بعد ہر حادثہ اور واقعہ کو مُصِیْبَۃٌ کہنے لگے ۔ تَصْوِیْبٌ کے معنے ہیں کسی بات کی تصدیق کرنا کہ وہ ٹھیک ہے ۔ اَلصَّیِّبُ بارش کو کہتے ہیں *۔ لسان العرب میں ہے کہ صَیِّبٌ دراصل اس بادل کو کہتے ہیں جو بارش برسائے ۔ اسکی تائید ابن فارس نے بھی کی ہے۔ اَصَابَ مِنَ الْمَرْاَۃِ کے معنے ہیں عورت کو چوما اور اس سے مجامعت کی۔ یعنے اپنی حاجت اس سے پوری کر لی **۔

قرآن کریم میں صَیِّبٌ ۔ بارش (یا بادل) کے معنوں میں (۱۸/۲) میں آیا ہے ۔ سورۃ نحل میں ہے فَاَصَابَہُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِہِمْ مَا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَہْزِءُوْنَ (۳۴/۱۶) ۔ جو کچھ بد عملیاں وہ لوگ کرتے تھے ان کے نتائج ان تک آپہنچے اور جن آنے والے واقعات کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے انہوں نے انہیں آ کر گھیر لیا ۔ یہاں اَصَابَ کے معنے ہیں کسی بات کا واقع ہونا ۔ اَصَابَہُ الْکِبَرُ (۲۶۶/۲) کے معنے ہیں اس پر بڑھاپا آگیا ۔ سورۃ ص میں حَیْثُ اَصَابَ (۳۶/۳۸) کے معنے ہیں جسطرف کا وہ قصد کرتا تھا۔ اور سورۃ نبا میں قَالَ صَوَابًا (۳۸/۷۸) کے معنے ہیں وہ درست اور ٹھیک بات کہے ۔

سورۃ نساء میں مُصِیْبَۃٌ کے مقابلہ میں فَضْلٌ کا لفظ آیا ہے (۴/۷۲-۷۳) لہذا مُصِیْبَۃٌ کے معنے معاشی بدحالی یا ناکامی کے ہوئے ۔ اور (۵۰/۹) میں مُصِیْبَۃٌ کے مقابلہ میں حَسَنَۃٌ کا لفظ آیا ہے ۔ اس سے اسکے معنے ہوئے زندگی کی ناہمواریاں اور ناخوشگواریاں ۔ سورۃ تغابن میں ہے مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ (۱۱/۶۴) یعنے کائنات میں جو حوادث و واقعات ظہور میں آتے ہیں وہ سب خدا کے قانون کی رو سے رونما ہوتے ہیں ۔ اس میں مُصِیْبَۃٌ کے معنے حادثہ یا واقعہ (Event) کے ہیں ۔ (اذن بمعنی قانون کے لئے عنوان ا ۔ ذ ۔ ن دیکھئے)

سورۃ یوسف میں ہے نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ (۵۶/۱۲) ۔ ہم اپنی رحمت اپنے قانون مشیت کے مطابق جسے چاہتے ہیں پہنچاتے ہیں ۔ اس کے

* تاج ۔ ** محیط ۔

بعد وَلَا نُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ (۱۲/۵۶) کہکر بات واضح کر دی کہ خدا کی یہ رحمت، حضرت یوسف[ؑ] کی حسن کارانہ زندگی اور کردار کا نتیجہ تھی۔ البتہ نبوت، انسان کے کسی عمل کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ مُصِیۡبٌ (اسم فاعل) واقع ہونے والا۔ پہنچنے والا۔ (۱۱/۸۱)۔

ص و ت

اَلصَّوۡتُ۔ آواز (جمع اَصۡوَاتٌ)۔ یہ لفظ انسان اور غیر انسان دونوں کی آواز کیلئے بولا جاتا ہے۔ اَلصَّائِتُ۔ چیخنے والا۔ رَجُلٌ صَاتٌ۔ سخت آواز والا آدمی *۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ جو کچھ منہ سے نکلے اگر وہ کسی حرف پر مشتمل نہ ہو تو اسے صَوۡتٌ کہتے ہیں **۔ راغب نے کہا ہے کہ دو جسموں کے ٹکرانے سے دب جانے والی (منضغط) ہوا کو صَوۡتٌ کہتے ہیں ***۔ (لیکن راغب کا مفہوم واضح نہیں)۔

قرآن کریم میں ابلیسی قوتوں کے لئے بھی صَوۡتٌ کا لفظ آیا ہے (۱۷/۶۴)۔ اسکے معنے ہر قسم کا غلط پراپگنڈا ہوگا۔ انسان کی آواز کے لئے بھی (۳۱/۱۹) اور گدھے کی آواز کیلئے بھی (۳۱/۱۹) جہاں اسے اَنۡکَرَ الۡاَصۡوَاتِ کہا گیا ہے، یہ لفظ آیا ہے۔

سورۃ حجرات میں ہے لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَکُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ (۴۹/۲)۔ اپنی آواز کو نبی[ؐ] کی آواز سے بلند نہ کرو۔ اگر اس میں صَوۡتٌ کے حقیقی معنی لئے جائیں تو یہ حکم آداب معاشرت سے متعلق ہوگا۔ اور اگر مجازی معنی لئے جائیں تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ اپنے فیصلے کو رسول[ؐ] کے فیصلے پر فائق نہ سمجھو۔ مشورہ میں رائے دو لیکن اطاعت اُس کے فیصلے کی کرو۔ (۳۳/۳۶ ؛ ۴/۶۵)۔

ص و ر

اَلصُّوۡرَۃُ۔ شکل۔ ہیئت۔ کسی شے کی حقیقت۔ صفت۔ نوع۔ وہ خد و خال جس سے انسان کو پہچانا جائے اور دوسروں سے اس کا امتیاز کیا جائے ****۔ (۸۲/۸)۔ صَوَّرَ۔ صورت بنانا۔ (۳/۵)۔ اَلۡمُصَوِّرُ۔ صورت بنانے والا۔ خدا کی صفت ہے (۵۹/۲۴)۔ کوئی شے، صورت (Form) کے بغیر محسوس و مرئی ہو نہیں سکتی۔ اسلئے اللہ تعالےٰ کے تخلیقی پروگرام میں مصوریت کا مقام وہ ہے جہاں غیر مرئی و غیر محسوس قوتوں کو ایک خاص ترتیب دیکر (خلق) محسوس و مرئی بنا دیا جائے۔

---

* تاج۔ ** محیط۔ *** راغب۔ **** تاج و راغب و محیط

صُوْرَةٌ ۔ کی جمع صُوَرٌ بھی آتی ہے اور صُوْرٌ بھی**۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں نُفِخَ فِی الصُّوْرِ کا ذکر آیا ہے (مثلاً یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ ۲۰/۱۰۲) ۔ تو اسکے معنے ہونگے جب صورتوں میں روح پھونکی جائیگی*۔ جب اقوام کے مردہ پیکروں میں قانون خداوندی کے مطابق تازہ قوتیں پیدا ہو جائینگی۔ جب انہیں (نظام خداوندی کی رو سے) حیات تازہ مل جائیگی۔ اس دنیا میں حیات تازہ بھی اور مرنے کے بعد حیات نو بھی۔ نیز صُوْرٌ اس نرسنگھے کو کہتے ہیں جو لڑائی کے وقت بجایا جاتا ہے*۔ اور جس سے مراد اعلان جنگ ہوتا ہے۔ ان معانی کے اعتبار سے جب نُفِخَ فِی الصُّوْرِ (۶۹/۱۳) کا تعلق اس دنیا کے حوادث سے ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب نظامِ خداوندی کے انقلاب کیلئے باطل کی قوتوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جائیگا۔

صَارَ الشَّیْئَ یَصُوْرُہٗ ۔ کے معنے ہیں چیز کو مائل کر دینا ۔ ایک طرف جھکا دینا ۔ صَوِرَ یَصْوَرُ ۔ مائل ہونا ۔ صُرْتُ اِلَی الشَّیْئِ ۔ میں اس چیز کی طرف مائل ہوا ۔ صُرْ اِلَیَّ ۔ میری طرف متوجہ ہو ۔ اسی لئے عُصْفُوْرٌ صَوَّارٌ اس چڑیا کو کہتے ہیں جو بلانے والے کی آواز پر آجائے ۔ اور اَلصِّوَارُ گایوں کے گلہ کو کہتے ہیں (جو چرواہے کی آواز پر چلتا ہے)۔ سورہ بقرہ میں حضرت ابراهیمؑ سے کہا گیا کہ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْکَ (۲/۲۶۰)۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ ان پرندوں کو اپنے ساتھ مانوس کر لے ۔ اپنے سے ھلالے ۔ اپنی طرف ایسا مائل کرلے کہ وہ تیری آواز پر چلتے آئیں*۔

ابن فارس نے ان تمام معنی کو لکھنے کے بعد کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی اسقدر ایک دوسرے سے مختلف ہیں کہ ان میں قیاس نہیں چلتا۔

ص و ع

اَلصَّاعُ ۔ اَلصِّوَاعُ ۔ اَلصُّوَاعُ ۔ ایک پیمانہ ہے جس سے غلہ ناپا جاتا ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلصِّوَاعُ سے غلہ نہیں ناپا جاتا بلکہ یہ اس برتن کو کہتے ہیں جس سے پیا جاتا ہے*۔ قرآن کریم میں صُوَاعَ الْمَلِکِ (۱۲/۷۲) آیا ہے ۔ یعنے شاہی پیمانہ جس سے پانی بھرنے کا کام بھی لیا جاتا تھا ۔ اس مادہ کے دوسرے بنیادی معنی پھٹ جانے اور جدا ہو جانے کے بھی ہیں (ابن فارس)

*تاج ۔ راغب و محیط ۔ ** ابن قتیبہ (القرطین ج/۱ صفحہ ۱۶۵)

ص و ف

اَلصُّوْفُ۔ اون۔ (جمع اَصْوَافٌ ۱۶/۸۰)۔ صُوْفٌ۔ بھیڑ کی اون کو کہتے ہیں۔ شَعْرٌ۔ بکری کی اون کو۔ اور وَبَرٌ۔ اونٹ کی اون کو*۔ سورۃ نحل (۱۶/۸۰) میں ان تینوں کا ذکر ہے۔ (بعض کے نزدیک اَلصُّوْفِیُّ۔ صُوْفٌ۔ کی طرف منسوب ہے**۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ (صوفی) کہیں نہیں آیا۔ تصوف کا تصور ہی غیر قرآنی ہے اور دوسروں سے مستعار لیا گیا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ''سلیم کے نام خطوط''۔ جلد سوم)۔

ص و م

صَامَ۔ رک جانا۔ ٹھہرجانا، باز رہنا۔ کہتے ہیں۔ صَامَ عَنِ الْکَلَامِ۔ بات کرنے سے رکا، خاموش رہا۔ صَامَ عَنِ النِّکَاحِ۔ نکاح سے باز رہا۔ صَامَ عَنِ السَّیْرِ۔ چلنے سے رکا۔ صَامَ الْمَاءُ۔ پانی کھڑا ہو گیا۔ مَصَامٌ کھڑے ہونے کی جگہ*۔

قرآن کریم میں صِیَامٌ کو فرض قرار دیا گیا ہے (۲/۱۸۳)۔ اس کے لئے بتا دیا کہ یہ صبح سے رات تک کھانے پینے اور جنسی اعمال سے مجتنب رہنے کا نام ہے (۲/۱۸۷)۔ یہ رمضان کے مہینے کے روزے ہیں جس میں قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا تھا (۲/۱۸۵)۔ جو شخص مقیم ہو۔ (سفر میں نہ ہو) اور تندرست ہو (مریض نہ ہو) اور اس کی طبعی حالت ایسی ہو کہ اسے روزہ رکھنے میں مشقت نہ اٹھانی پڑے (۲/۱۸۴) تو اس پر روزہ فرض ہے۔ مسافر سفر سے واپسی پر اور مریض شفایاب ہونے کے بعد گنتی کو پورا کرے (۲/۱۸۴) لیکن جو بمشقت روزہ رکھ سکتا ہو وہ اس کے بدلے کسی مسکین کو کھانا کھلا دے (۲/۱۸۴)۔

روزے درحقیقت جماعت مومنین کو جہاد کی مشقت انگیز زندگی کا خوگر بنانے کے لئے سالانہ عسکری ٹریننگ کے مرادف ہیں۔ ان کا مقصد قرآن کریم نے خود واضح کر دیا جہاں کہا کہ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (۲/۱۸۳) تاکہ تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کے قابل ہو جاؤ۔ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدَاکُمْ (۲/۱۸۵) تاکہ تم قرآن کریم کی روشنی میں قوانین خداوندی کو انسانوں کے خود ساختہ قوانین و نظام ہائے حیات پر غالب کر سکو۔ وَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (۲/۱۸۵) تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر سکیں۔

---

* تاج۔ ** محیط۔

صَائِمٌ (۳۳/۳۵) روزہ رکھنے والا یا اپنے آپ کو غلط راستوں سے روک لینے والا ۔ اپنے آپ پر کنٹرول (ضبط نفس) رکھنے والا ۔ حدود اللہ کے اندر رہنے والا ۔

ص ی ح

اَلصَّیْحَۃُ ۔ پورے زور سے نکالی ہوئی سخت آواز ۔ صَاحَ ۔ یَصِیْحُ ۔ چیخنا ۔ اونچی آواز نکالنا ۔ صِیْحَ بِھِمْ ۔ ان پر گھبراہٹ طاری ہوگئی ۔ صِیْحَ فِیْھِمْ ۔ وہ سب ہلاک ہو گئے ۔ اَلصَّیْحَۃُ ۔ لوٹ مار جبکہ وہ کسی قبیلہ پر یکبارگی ڈال دی جائے*۔ راغب نے کہا ہے کہ صَیْحٌ دراصل آواز پھاڑنے کو کہتے ہیں ۔ اسی سے اِنْصَاحَ الخَشَبُ اَوِالثَّوْبُ ۔ ہے ۔ یعنی لکڑی یا کپڑا پھٹا اور اس سے آواز نکلی** ۔ اَلصَّائِحَۃُ ۔ نوحہ کی چیخ و پکار کو کہتے ہیں* ۔ قرآن کریم میں اَلصَّیْحَۃُ کا لفظ عذاب کے لئے آیا ہے ، یا اس آواز کےلئے جو زلزلہ کے وقت آتی ہے ، یا کوہ آتش فشاں کے پھٹنے کے وقت آتی ہے ۔ چنانچہ سورۃ ھود میں اَلصَّیْحَۃُ آیا ہے (۱۱/۹۷) ۔ اور اسی کو سورۃ اعراف میں اَلرَّجْفَۃُ (۷/۷۸) کہا گیا ہے ۔ یعنی زلزلہ ۔ سورۃ یٰسٓ میں یہ لفظ ایسی تباہی اور عذاب کے لئے آیا ہے جو یک لخت آجائے (۳۶/۲۹) ۔ کیونکہ ایسے مواقع پر چیخ و پکار مچ جاتی ہے ۔

ص ی د

صَادَہٗ ۔ یَصِیْدُہٗ وَ یَصَادُہٗ ۔ اِصْطَادَہٗ ۔ کسی کو چال اورحیلہ یا جال کے ذریعہ پکڑ لینا ۔ شکار کر لینا ۔ اَلصَّیْدُ ۔ شکار کرنا ۔ نیز ہر وحشی جانور کو کہتے ہیں خواہ وہ شکار کرلیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو ۔ نیز شکار کئے ہوئے جانور کو بھی کہتے ہیں ***۔ قرآن کریم میں صَیْدُ الْبَحْرِ اور صَیْدُ الْبَرِّ (۵/۹۶) آیا ہے ۔ یعنی زبان میں اَلصَّیْدُ مچھلی کو کہتے ہیں*** ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ صَیْدٌ وہ چیزیں ہیں جو اپنی آپ حفاظت کریں اور ان کا کوئی مالک نہ ہو ۔ راغب نے کہا ہے کہ صَیْدٌ ان حیوانات کے پکڑنے کو کہتے ہیں جو اپنی حفاظت کریں اور کسی کی ملکیت نہ ہوں***۔ صِدْنَا مَاءَ السَّمَاءِ ۔ ہم نے بارش کا پانی لے لیا*** ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا بغیر ادھر اُدھر التفات کئے اپنی مرضی سے سیدھے چلے جانا ۔ شکار کو بھی صَیْدٌ

*تاج ۔ **راغب ۔ *** تاج و محیط

اس لئے کہتے ہیں کہ وہ جانور ادھر اُدھر نہیں دیکھتا ۔ سیدھا بھاگتا چلا جاتا ہے ۔

ص ی ر

صَارَ ۔ کسی شے کا کسی خاص حالت تک پہنچ جانا ۔ یا کسی خاص مقام تک پہنچ جانا ۔ کسی شے کا ایک متعین شکل اختیار کر لینا ۔ اَلْمَصِیْرُ وہ مقام جہاں سب اطراف کے پانی آکر مل جائیں* ۔ جمع ہونے کی جگہ* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مآل اور مرجع کے ہیں ۔ یعنی لوٹنا اور انجام پذیر ہونا ۔ اَلصِّیْرُ ۔ منتہائے امر ۔ انجام ۔ مآل ۔ اَلصَّیُّوْرُ ۔ آخر شے ۔ منتہائے شے ۔ کسی چیز کا انجام ، مرجع و مآل ۔ یہی معنی اَلْمَصِیْرُ کے بھی ہیں ۔ مَصِیْرُ الْاَمْرِ ۔ معاملہ کا انجام ۔ آخری مقام ۔ اسی سے صَارَہٗ ۔ یَصِیْرُہٗ ۔ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کو قطع کر دینا* ۔

راغب نے کہا ہے کہ صَارَ سے مراد ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونا ہے ۔ اسی سے الْمَصِیْرُ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز انتقال و حرکت کے بعد پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے** ۔

قرآن کریم میں اِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ ($\frac{3}{28}$) متعدد مقامات پر آیا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شرف انسانیت کی تکمیل صرف اس راستے پر چلنے سے ہو سکتی ہے جو خدا کی طرف جانے والا ہے ۔ انسان کی آخری منزل ، منتہائے سفر ، یہ ہے کہ وہ صفات خداوندی کے رنگ میں رنگ جائے ۔ اسی میں اس کی تکمیل کا راز ہے ۔ اس مقام اور منزل کے علاوہ ، اور جو مقام اور حالت ہے وہ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ($\frac{2}{126}$) نہایت بری منزل اور بڑی خراب حالت ہے ۔ اسی کو جہنم کہا گیا ہے ۔ یعنی اگر انسانی زندگی کا مآل اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو وہ کیفیت جہنمی ہے ۔ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر کے صفات خداوندی کا اپنے اندر منعکس کرتے چلے جانا ، اور اس طرح اپنی تکمیل ذات کر لینا ، یہ ہے اِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ ۔ اس کے متعلق سورۃ شوریٰ میں ہے اِلَی اللّٰہِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ ($\frac{42}{53}$)۔ تمام معاملات کا مآل بالآخر قانون خداوندی کے مطابق ہوتا ہے ۔ اہل جنت کے متعلق ہے کَانَتْ لَهُمْ جَزَاءً وَّ مَصِیْرًا ($\frac{25}{15}$)۔ جنت انکے اعمال کی جزا اور وہ مقام ہے جہاں ان کی ذات کی تکمیل ہوگی ۔ اور یہی انسانی تگ و تاز کا منتہیٰ ہے ۔

---

* تاج و محیط ۔ **راغب ۔

ص ی ص

اَلصِّیْصَۃُ وَ الصِّیْصِیَۃُ۔ گائے اور ہرن کا سینگ (جس سے وہ اپنی حفاظت کرتے ہیں)۔ اس سے ہر اس چیز کو صِیْصِیَۃٌ کہتے ہیں جس کے ذریعہ انسان اپنے آپ کو محفوظ کرے۔ مثلاً حفاظت گاہ، قلعہ۔ اس کی جمع اَلصَّیَاصِیْ آتی ہے*۔ قرآن کریم میں ہے مِنْ صَیَاصِیْھِمْ (۳۳/۲۶)۔ یعنی ان کے قلعوں سے جن میں وہ محفوظ ہو گئے ہیں۔

ص ی ف

اَلصَّیْفُ۔ گرمی کا موسم*۔ (یہ شِتَآءٌ یعنی سردی کے بالمقابل ہے)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان "ش۔ ت۔ و"۔ قرآن کریم میں رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیْفِ (۱۰۶/۲) آیا ہے۔ یعنی قریش کے سردی اور گرمی کے زمانے کے سفر۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے دو بنیادی معنی ہیں۔ (۱) زمانہ اور موسم (گرما)۔ اور (۲) جھکنا اور ہٹ جانا۔ صَافَ عَنِ الْھَدَفِ کے معنی ہیں تیر نشانہ سے ایک طرف ہٹ گیا۔ یَوْمٌ صَائِفٌ۔ گرم دن۔

---

*تاج و راغب۔

ض

ض أ ن

ضَائِین* (جمع ضَأْن*) - بھیڑ (۶/۱۴۴)- ضعیف اور کمزور کو بھی ضَائِین کہتے ہیں*- جیسے بُز دل ، (بکری جیسے دل والا) ڈرپوک کو کہتے ہیں -

ض ب ح

ضَبَحَتِ الْخَیْلُ ضَبْحًا - تیزی سے بھاگنے والے گھوڑے ہانپے - ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ ضَبْح* اور ضَبْع* گھوڑے کا اپنے بازوؤں کو پوری طرح پھیلا کر دوڑنے کو کہتے ہیں، حتکہ ایسا محسوس ہو کہ اس کی ٹانگیں اس کے جسم کی سیدھ میں آ گئی ہیں - سرپٹ دوڑنا - لیکن سہیلی نے کہا ہے کہ ضَبْح* گھوڑے یا اونٹ کے تھکنے کے بعد ہانپنے کی آواز کو کہتے ہیں**- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) آواز اور (۲) آگ کے اثر سے رنگ کا بدل جانا - نیز یہ بھی کہ یہ دراصل ضَبَعَ تھا (جس کے معنی اوپر دئے جاچکے ہیں)- قرآن کریم میں ہے وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا (۱۰۰/۱)- اس سے تیز رفتار گھوڑے مراد ہیں جو میدان جنگ میں دشمن کے مقابلہ کے لئے نکلیں -

ض ج ع

ضَجَعَ وَاضْطَجَعَ - اس نے اپنا پہلو زمین پر رکھ دیا (لیٹ گیا)- اَلْمَضْطَجَعُ - پہلو رکھنے یا لیٹنے کی جگہ* - یہی معنے اَلْمَضْجَعُ کے بھی ہیں - اس کی جمع اَلْمَضَاجِعُ ہے (۳۲/۱۶) - سورۃ آل عمران میں مَضَاجِعِهِمْ (۳/۱۵۳) سے مراد ان کی قتل گاہیں ہے - یعنے وہ مقام جہاں قتل

---

*تاج - **تاج و راغب -

کر کے لٹا دیا جائے ۔ اَلْمُضَاجَعَةُ سے مراد مجامعت بھی ہوتی ہے* ۔ یعنے ہم بستر ہونا ۔ سورۃ نساء میں جہاں وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ آیا ہے (۴/۳۴) تو اس سے مراد زنا شوئی کے تعلقات منقطع کرنا ہے ۔

ض ح ک

ضَحِکَ ۔ یَضْحَکُ ۔ ضَحِکًا ۔ خوشی کی وجہ سے چہرہ کا انبساط ، اور دانتوں کا کھل جانا ۔ ہنسنا ۔ ضَحِکٌ (ہنسی) ، کا پہلا درجہ تبسم ہوتا ہے ۔ ضَحِکَ کے معنے تعجب کرنے یا تعجب سے ہنسنے کے بھی ہیں* ۔ ضَحِکَ الرَّجُلُ ۔ اس آدمی کو تعجب ہوا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کھلنے اور ظاہر ہونے کے ہیں ۔

سورۃ توبہ میں ہے فَلْیَضْحَکُوْا قَلِیْلًا (۹/۸۲) انہیں چاہئے کہ تھوڑا ہنسیں ۔ تھوڑی خوشیاں منائیں ۔ اس کے مقابل وَلْیَبْکُوْا کَثِیْرًا (۹/۸۲) ہے ۔ یعنی بہت زیادہ روئیں ۔ ضَاحِکًا (۲۷/۱۹) خوش ہو کر ۔ سورۃ تطفیف میں ہے کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ (۸۳/۲۹) ۔ وہ ایمان والوں پر ہنسا کرتے تھے ۔ اِمْرَاَۃٌ ضَاحِکٌ ۔ وہ عورت جسے حیض آ رہا ہو** ۔ سورۃ ھود میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کی عمر رسیدہ بیوی کو لڑکے کی بشارت ملی فَضَحِکَتْ (۱۱/۷۱) ۔ بعض نے اس کے معنے یہ کئے ہیں کہ انہیں حیض جاری ہو گیا * اور اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ ان میں ہنوز اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت ہے ۔ لیکن راغب نے لکھا ہے کہ جس مفسر نے ضَحِکَتْ کے معنے حَاضَتْ (حائضہ ہو گئی) کئے ہیں تو یہ اس لفظ کی تفسیر نہیں ہے بلکہ اس سے حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کی حالت کا بیان مقصود ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی از رہ تعجب ہنسی تھیں ، جس کی تائید اس سے اگلی آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے ۔ اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ*** (۱۱/۷۳) ۔ ان لوگوں کا حیض کی طرف (غالباً) اس لئے خیال گیا ہے کہ انہی حالات میں جب حضرت زکریاؑ کو بیٹے کی خوشخبری دی گئی تو وہاں آیا ہے وَاَصْلَحْنَا لَہٗ زَوْجَہٗ (۲۱/۹۰) ۔ ہم نے اس کے لئے اسکی بیوی کو درست کر دیا ۔ جو نقص تھا اسے رفع کر دیا ۔ اور بیشتر یہ نقص حیض کا رک جانا ہی ہوتا ہے ، اس لئے ایسے موقع پر جو لفظ بھی آیا اس سے مفہوم حیض جاری ہونا لے لیا گیا ۔ یہ صحیح نہیں ۔

*تاج ۔ ** محیط ۔ *** راغب ۔

ض ح و (ی)

اَلضَّحْوُ - اَلضَّحْوَةُ - اَلضَّحِیَّةُ - اَلضُّحٰی - دن چڑھے کا وقت ، طلوع آفتاب کے بعد کا وقت - بعض کا قول ہے کہ اَلضُّحٰی طلوع آفتاب سے لیکر دن چڑھنے تک کے وقفہ کو کہتے ہیں* - راغب نے کہا ہے کہ الضُّحٰی دھوپ کے پھیل جانے اور دن کے چڑھ جانے کو کہتے ہیں* - نیز اس وقت کو بھی ضُحًی کہتے ہیں - اَلضَّحَاءُ - نصف النہار سے پہلے پہلے کا وقت - یا جب سورج طلوع کے بعد رُبع سماء بھر ہو - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنے دن چڑھے کا وقت ہیں جب دھوپ کھل جائے اور ہر چیز واضح ہو جائے - وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا (۷۹/۲۹) - "اور اس کی روشنی نکالی" - دن کو روشن کیا - ضَحِیَ - دھوپ لگنا ، دھوپ کے سامنے آنا ، دھوپ سے تکلیف اٹھانا - وَ لَا تَضْحٰی (۲۰/۱۱۹) - "نہ دھوپ کی تکلیف اٹھائیگا" - فَعَلَهٗ ضَاحِیَةً - اس نے اسے کھلم کھلا کیا - ضَحَا الطَّرِیْقُ ضُحُوًّا - راستہ واضح اور ظاہر ہو گیا* -

لَیْلَةٌ ضَحْیَاءُ - روشن رات جس میں بادل نہ ہوں یا جس میں شروع سے آخر تک چاندنی رہے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ظاہر اور واضح ہونے کے ہیں -

ض د د

اَلضِّدُّ - ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کے برعکس ہو - یعنی جو دونوں بیک وقت ایک ہی جگہ میں اکٹھی نہ ہو سکیں - جیسے سیاہی اور سفیدی - موت اور حیات - بعض کے نزدیک ضِدٌّ ایک دوسرے کی ٹکر کی چیزوں کو بھی کہتے ہیں - اَلضِّدُّ - مخالف - اَلْقَوْمُ عَلَیْهِ ضِدٌّ وَاحِدٌ - لوگ اسکے خلاف متفق ہو کر جمع ہو گئے - هُمَا مُتَضَادَّانِ - وہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہیں** -

سورۃ مریم میں ہے وَ یَکُوْنُوْنَ عَلَیْهِمْ ضِدًّا (۱۹/۸۲) - وہ ان کے مخالف ہونگے -

ض ر ب

ضَرْبٌ کے بہت سے معانی آتے ہیں جن میں سے مشہور معنی مارنے کے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ڈھالنے کے بھی ہیں - اسی اعتبار

*تاج - **تاج و محیط و راغب -

سے اَلضَّرْبُ اور اَلضَّرِیْبُ - مثل اورمشابہ کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں ایک بات دوسری بات کے قالب میں ڈھالی جاتی ہے۔ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا (۳۶/۱۳) کے معنے ہیں انکے لئے ایک مثال بیان کرو۔ یعنے اس بات کو مثال دیکر واضح کرو۔ اور یَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ (۱۳/۱۷) کے معنے بھی یہی ہیں - یعنے خدا حق اور باطل کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتا ہے - اگرچہ اس کے معنی باھمی ٹکرانے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ ضَرَبَ الطَّيْرُ - پرند تلاش رزق میں کہیں چلے گئے - ضَرَبَ فِی الْاَرْضِ - اُس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص تلاش معاش میں سفر پر چلا جائے - اَضْرَبَ الرَّجُلُ فِی الْبَيْتِ کے معنے ہیں اس شخص نے گھر میں قیام کیا - ضَرَبَ عَنِ الشَّيْئِ کے معنے ہیں وہ اس شے سے باز رہا - اعراض کیا - یہی اَضْرَبَ عَنْهُ کے معنی بھی ہیں، نیزضَرَبَ عَنْهُ الذِّكْرَ وَاَضْرَبَ عَنْهُ کے، یعنی اس سے ذکر کو پھیر دیا، ھٹا دیا، روک دیا - (اسی سے جدید لغت میں اِضْرَاب کے معنی ہیں اسٹرائک کرنا) ضَرَبْنَا عَلٰى اٰذَانِهِمْ - ہم نے انہیں آواز سننے سے روک دیا - ضَرَبَ اِلَيْهِ - وہ اسکی طرف مائل ھوا - اِضْطَرَبَ کے معنی ہیں کسی چیز کے ایک حصہ کا دوسرے حصہ کے ساتھ ٹکرانا - نیز اسکے معنے کمانے اور حاصل کرنے کے بھی آتے ہیں- اِضْطَرَبَ اَمْرُهُ کے معنے ہیں اس کا کام خراب ہو گیا *- مُضْطَرِبٌ - متحرک کو کہتے ہیں *- سورۃ انفال میں ہے فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ (۸/۱۲) - اسکے معنے مارنے کے ہیں، اور ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ (۲/۶۱) کے معنے ذلت وخواری کی مار مارنے کے ہیں - سورۃ نساء میں ہے اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ (۴/۱۰۱) - اسکے معنے سفر کرنے کے ہیں - سورۃ نحل میں ہے وَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ (۱۶/۷۴) - اللہ کی مثل اور مانند کسی کو قرار نہ دو - اس کی ذات کے متعلق اپنے ذھن میں تصورات پیدا نہ کرو کہ وہ ایسا ہے اور ویسا ہے -

ضَرَبَ عَنْهُ - روک لینا - بند کرنا - اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ (۴۳/۵) - کیا ہم اس ضابطہ ھدایت کو تم سے روک لینگے؟ کیا ہم قرآن کریم کے قوانین (مکافات عمل) کو تم پر لاگو (نافذ) نہیں کرینگے اور تمہیں کھلی چھٹی دیدینگے کہ تم جو جی میں آئے کرتے رھو اور جس روش پر جی چاہے چلتے رہو! ایسا نہیں ہوگا۔

---

* تاج - محیط - لین -

ضَرَبَ مَثَلاً کے معنے ہیں مثال کے ذریعہ بات کو واضح کرنا ۔ لیکن بعض مقامات پر صرف ضَرَبَ کے بھی یہی معنے آتے ہیں ۔ مثلاً کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰہُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ (۱۳/۱۷) ۔ اسطرح اللہ حق و باطل کی وضاحت کرتا ہے ۔ یا بات کو سمجھاتا ہے ۔ اگرچہ (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) اس کے معنی حق و باطل کی کشمکش کے بھی ہیں ۔ اسی طرح سورۃ زخرف میں ہے مَاضَرَبُوْہُ لَکَ اِلَّا جَدَلاً (۴۳/۵۸) ۔ یہ لوگ تجھے بات نہیں سمجھاتے (مثال پیش نہیں کرتے) بلکہ محض جھگڑا کرتے ہیں ۔ اسی سے (بعض لوگوں کا خیال ہے کہ) سورۃ نساء میں جو عورتوں کے متعلق ہے کہ وَاضْرِبُوْھُنَّ (۴/۳۴) تو اسکے معنے ہیں مختلف طریقوں سے مثالیں دیکر انہیں سمجھاؤ ۔ یعنے وَاضْرِبُوْا لَھُنَّ مَثَلاً ۔ لیکن یہ معنے اس لئے کمزور ہیں کہ سمجھانے کے لئے اس سے پہلے فَعِظُوْھُنَّ آچکا ہے ۔ لہذا فَاضْرِبُوْھُنَّ سے مراد وہ بدنی سزا (Corporal Punishment) ہے جو عدالت کیطرف سے بعض جرائم کی سزا میں دی جاتی ہے ۔ عورتوں کا بلاعذر اپنے فطری وظائف زندگی (اولاد پیدا کرنے) سے سرکشی برتنا اور مرد بننے کی خواہش کرنا (جیسا کہ یورپ میں ہو رہا ہے) ایک معاشرتی جرم ہے جس کا بذریعہ عدالت روکا جانا ضروری ہے ۔

سورۃ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا ہے فَاضْرِبْ لَھُمْ طَرِیْقاً فِی الْبَحْرِ یَبَساً (۲۰/۷۷) ۔ انہیں سمندر میں خشک راستے سے لے جا ۔ اسی کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اضْرِبْ بِعَصَاکَ الْبَحْرَ (۲۶/۶۳) ۔ (نیز ۴۴/۲۴) ۔ اپنی جماعت (عَصَا ۔ دیکھئے عنوان ع ۔ ص ۔ و) کو سمندر سے پار لے جا ۔ یا، تو عصا ٹیکتا ہوا پایاب چلے جا ۔ اسی طرح دوسری جگہ ہے اضْرِبْ بِعَصَاکَ الْحَجَرَ (۲/۶۰ ؛ ۷/۱۶۰) جس کے معنے یا تو یہ ہیں کہ اپنی جماعت کو پہاڑ کیطرف لے جا ۔ وہاں انہیں پانی کے چشمے مل جائینگے ۔ اور یا یہ کہ اپنے عصا کو چٹان پر مار ، اس سے مٹی اور پتھر وغیرہ میں شگاف ہوجائیگا اور اندر کا پانی باہر نکل آئیگا ۔

ض ر ر

ضَرَّ ۔ یَضُرُّ ۔ نقصان پہنچانا ۔ اَلضَّرُّ ۔ اَلضُّرُّ ۔ نقصان ۔ اَلضَّرُّ ۔ عام طور پر مالی نقصان یا خارجی مصیبت کو کہتے ہیں اور اَلضُّرُّ ۔ اس مصیبت یا بدحالی کو کہتے ہیں جو انسان کی ذات سے متعلق ہو ۔ اَلضَّرَّاءُ ۔ قحط ۔ نقصان کی شدت ۔ بدحالی ۔ اَلضُّرُّ ۔ لاغری ۔ معذوری ۔ اَلضَّرَّاءُ ۔ معذور ہونا ۔

لنگڑا ہونا - نیز اس کے معنی تنگی - سختی - بدحالی کے بھی ہیں - اَلضَّرِیْرُ - نابینا - مریض - لاغر - مصیبت زدہ* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلضَّرِیْرُ - قوت نفس اور صبر کو کہتے ہیں -

اَلضَّرَرُ - تنگی - اَلضَّرُوْرَۃُ - حاجت - اَلْاِضْطِرَارُ - شدت احتیاج سے مجبور ہونا* - اَلضَّرَّتَانِ - چکی کے دونوں پاٹ - ایک مرد کی دو بیویاں* - اَلْاِضْرَارُ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی (یعنی اس کی سوت) لانا - تَزَوَّجْتُ الْمَرْاَۃَ عَلٰی ضِرٍّ - میں نے اس عورت سے پہلی بیوی کی موجودگی میں شادی کی - اس سے ظاہر ہے کہ خود عربوں کو بھی ایک سے زیادہ بیویوں کی مضرت رسانی کا احساس تھا -

اَلْمُضِرُّ - قریب ہونے والا* -

قرآن کریم میں یہ لفظ نَفْعٌ کے مقابلہ میں (۲/۱۰۲) میں آیا ہے - خَیْرٌ کے مقابلہ میں (۶/۱۷) میں اور نِعْمَتٌ کے مقابلہ میں (۱۶/۵۳) میں - جسمانی تکلیف کے لئے (۲۱/۸۳) میں - اُضْطُرَّ (۲/۱۷۳) میں - جس کے معنے اضطراری حالت میں پہنچنے کے ہیں - سورۃ بقرہ میں ہے - وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ (۲/۲۸۲) - کاتب کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے - (اس باب کا خاصہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کا ہے - اس لئے اس سے مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نہ تم میں سے کوئی اس کاتب (اور گواہ) کو تکلیف پہنچائے اور نہ ہی وہ کاتب (اور گواہ) تمہارے لئے کسی تکلیف کا باعث بنیں) - سورۃ نساء میں ہے غَیْرَ اُولِی الضَّرَرِ (۴/۹۵) جنہیں کوئی جسمانی تکلیف (بیماری) نہ ہو - سورۃ توبہ میں ضِرَارًا آیا ہے (۹/۱۰۷) - یعنی باہم نقصان پہنچانے کی خاطر - یہ نقصان اجتماعی ہے - سورۃ نساء میں ہے غَیْرَ مُضَآرٍّ (۴/۱۲) جو ایک دوسرے کو تکلیف پہنچانے والا نہ ہو -

سورۃ بقرہ میں ہے ثُمَّ اَضْطَرُّہٗٓ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ (۲/۱۲۶) میں انہیں بے بس کرکے جہنم کے عذاب کی طرف لیجاؤنگا - دوسری جگہ ہے فَمَنِ اضْطُرَّ - (۲/۱۷۳) - جو مجبور ہوجائے - مُضْطَرٌّ (۲۷/۶۲) بے بس مجبور -

ض ر ع

اَلضَّرْعُ - گائے بکری وغیرہ کا تھن - (اونٹنی کے تھن کو خِلْفٌ کہتے ہیں)** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی نرمی کے ہیں

*تاج و محیط - **تاج

اور تھن کو ضَرْعٌ اس کی نرمی کی وجہ سے کہتے ھیں - ضَرَعَ الْبَھْمُ کے معنے ھیں چوپاؤں کے بچوں نے اپنی ماں کے تھن کو منہ میں لے لیا** - اس سے تَضَرَّعَ اِلَی اللّٰہِ کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ھے - یعنی اپنی نشو و نما کے لئے ربوبیت کے حقیقی سرچشمہ کی طرف رجوع کرنا - اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَۃً (۷/۵۵) - یعنے اپنی نشو و نما کے لئے خدا کے قانون ربوبیت کی طرف رجوع کرو (اس کی مزید تشریح کے لئے ع - و - ذ کے عنوان میں تَعَوَّذَ بھی دیکھئے) - اس سے آگے ھے اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (۷/۵۵) - وہ حدود فراموش کرنے والے سرکشوں کو پسند نہیں کرتا - اس سے ظاھر ھے کہ تَضَرُّعًا کے اندر اطاعت خداوندی کا بنیادی تصور شامل ھے - سورۂ انعام میں ھے لَوْلَا اِذْ جَآءَھُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا (۶/۴۳) جب ان پر (ان کے اعمال کی وجہ سے) ھمارے قانون مکافات کے مطابق سختی آئی تو انہوں نے اس وقت ھمارے قانون کی اطاعت کیوں نہ اختیار کرلی -

اَلضَّرِیْعُ - حجاز میں کانٹوں والا پودا ھوتا ھے - چوپائے اس کے پاس نہیں پھٹکتے - اگر اسے کھا لیتے ھیں تو اس سے کمزور ھو جاتے ھیں - یا ایک قسم کی بد بودار گھاس کو کہتے ھیں جو ٹھہرے ھوئے پانی میں پیدا ھوتی ھے اور مویشی اسے نہیں کھاتے* - بعض اوقات سمندر اس قسم کے گھاس کو باھر پھینک دیتا ھے اور جو مویشی اسے کھاتا ھے وہ لاغر اور کمزور ھو جاتا ھے** - سورۃ غاشیہ میں اھل جہنم کی غذا کو ضَرِیْعٌ کہا گیا ھے (۸۸/۶) - یعنے دوسروں کے ردی سمجھکر پھینکے ھوئے ٹکڑے جن سے نشو و نما ھونے کی بجائے انسانی صلاحیتیں اور بھی پژمردہ ھوجائیں - محکوم اور کمزور اقوام کو اسی طرح کی غذا ملتی ھے - (نشو و نما رک جانے کے اعتبار سے لفظ جَحِیْمٌ عنوان ج - ح - م میں دیکھئے) -

کمزوری اور لاغری کے اعتبار سے اَلضَّارِعُ وَ الضَّرِعُ - ھر نحیف اور کمزور چیز کو کہتے ھیں* - ضَرِعَ لَہٗ وَ ضَرَعَ - اس سے کچھ مانگا اور مانگنے کے ساتھ اپنے عجز و تذلل کا اظہار کیا - اَلضَّرُوْعُ - لاغر ھونا - مَا لَہٗ زَرْعٌ وَّ لَا ضَرْعٌ - اس کے پاس کچھ نہیں* - اَضْرَعَ لِفُلَانٍ مَالًا کے معنے ھیں اس کے لئے مال خرچ کیا*** -

بہر حال ، انسان کا خدا کی طرف تَضَرُّعًا جانے کا مطلب یہ ھے کہ انسان اپنی نشو و نما کے لئے خدا کے قانون ربوبیت کی طرف رجوع کرے اور

*تاج - **لین - ***محیط -

دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ اس کے قوانین کی اطاعت کرے۔ اگر ایسا نہ کریگا تو اسے ضَرِیْع کھانے کو ملیگا۔ یعنی وہ ذلت کی روٹی جس سے شرف انسانیت کی تمام توانائیاں ختم ہو جائیں۔

ض ع ف

اَلضَّعْفُ۔ اَلضُّعْفُ۔ اَلضَّعَفُ۔ کمزوری*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ ضَعْفٌ۔ رائے کی کمزوری کو کہتے ہیں اور ضُعْفٌ۔ بدن کی کمزوری کو**۔ سورۃ الروم میں قُوَّۃٌ کے مقابلہ میں ضُعْفٌ آیا ہے (۵۴/۳۰)۔ اور سورۃ انفال میں فوجی کمزوری کے لئے ضَعْفٌ (۸/۶۶)۔ سورۃ ابراہیم میں مُسْتَکْبِرِیْنَ کے مقابلہ میں ضُعَفَاءُ آیا ہے (۱۴/۲۱)۔ ضِعَافٌ (جس کا واحد ضَعِیْفٌ ہے)۔ کمزور (۴/۹)۔ ضَعِیْفٌ (جمع ضُعَفَاءُ اور ضِعَافٌ) کمزور (۴/۲۸) اس مقام پر یہ لفظ جذبات سے مغلوب ہو جانے کے معنوں میں آیا ہے۔ اِسْتَضْعَفَہٗ۔ اسے کمزور سمجھا۔ حقیر جانا۔ (۷/۱۵۰)۔ مُسْتَضْعَفٌ۔ جسے کمزور سمجھا جائے (۸/۲۶)۔ ظاہر ہے جسے کمزور خیال کیا جاتا ہے اس کے حقوق بھی غصب کئے جاتے ہیں اور اس کی کمزوری سے ناجائز فائدے بھی اٹھائے جاتے ہیں۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں (۱) کمزوری اور (۲) کسی چیز کو دگنا کر دینا۔ اس اعتبار سے ضِعْفٌ (جمع اَضْعَافٌ) کے معنی ہیں کسی چیز کے مانند اور اس کا مثل۔ برابر کا حصہ۔ اتنا ہی اور۔ اس طرح دگنا ہو جانا۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد صرف دگنا نہیں بلکہ دگنے سے زیادہ تگنا چوگنا۔ نیز غیر محدود طور پر زیادہ ہونے کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے*۔ چنانچہ سورۃ بقرۃ میں ہے فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً (۲/۲۴۵)۔ اس کے معنے کئی گنا ہیں۔ سورۃ اعراف میں ضِعْفٌ دگنے کے معنوں میں آیا ہے (۷/۳۸)۔ ضِعْفَيْنِ۔ دو چند (۲/۲۶۵)۔

سورۃ آل عمران میں ہے۔ لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (۳/۱۲۹)۔ اس کے عام معنے کئے جاتے ہیں بڑھا بڑھا کر سود (در سود) نہ کھاؤ۔ لیکن راغب کا کہنا ہے کہ مُضَاعَفَۃٌ در اصل ضَعْفٌ سے ہے۔ ضِعْفٌ سے نہیں۔ اس لئے آیت کے معنے یہ ہیں کہ ربٰو، جسے تم سمجھ رہے ہو کہ وہ اپنے روپیے کو بڑھانا ہے۔ بڑھانا نہیں بلکہ درحقیقت ضَعْفٌ (یعنے) کم کرنا ہے***۔ سود سے معاشرہ کی دولت کم ہوتی ہے اور سود خوار

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔

کی انسانی صلاحیتوں میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ ربٰو سے قومی دولت گھٹتی ہے اور کمزوریوں پر کمزوریاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔

ض غ ث

ضَغَثَ الْحَدِیْثَ۔ بات کو خلط ملط کر دینا۔ مجازاً اَلضِّغْثُ کسی چیز کے اجزاء کے باہمدگر ملتبس اور گڈ مڈ ہونے کے لئے بولا جاتا ہے۔ اصل میں ضَغَثَ السَّنَامَ۔ اس وقت بولتے ہیں جب اونٹنی کے متعلق واضح نہ ہو کہ وہ کمزور ہے یا موٹی اور اس کے کوہان کو مٹھی بھر کر دیکھا جائے کہ اس میں چربی ہے یا نہیں۔ اس لئے، غیرواضح اور ملتبس بات کو کَلَامٌ ضِغْثٌ کہتے ہیں* ۔ (جمع اَضْغَاثٌ) ۔ قرآن کریم میں اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ (۱۲/۴۴) آیا ہے۔ یعنی ایسے خواب جن کا مطلب واضح نہ ہو۔ پریشان خواب۔

ضِغْثٌ۔ اتنی گھاس، گلدستہ یا شاخیں جو آدمی کی مٹھی میں آ جائیں۔ مٹھی بھر چیز*۔ سورۃ صٓ میں حضرت ایوب کے تذکرہ میں ہے خُذْ بِیَدِکَ ضِغْثًا (۳۸/۴۴) مٹھی بھر گھاس لے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلضِّغْثُ۔ تنکوں یا شاخوں کے مٹھے کو کہتے ہیں۔ طب قدیم میں، (اور آجکل بھی) کئی جسمانی تکالیف کا علاج جڑی بوٹیوں اور درختوں کے پتوں سے کیا جاتا ہے۔ لسان العرب میں ہے کہ اس کے معنے تھوڑی سی متاع دینا بھی ہے۔ یونہی مٹھی بھر۔

ض غ ن

اَلضِّغْنُ**۔ شدید کینہ۔ سخت عداوت۔ انتہائی بغض۔ ضَغَنَ عَلَیْہِ۔ اس نے اس سے شدید بغض رکھا۔ سخت کینہ رکھا۔ فَرَسٌ ضَاغِنٌ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو بغیر مار کھائے اپنی چال ہی نہ نکالے۔ اِضْطَغَنَہٗ۔ اس نے اس چیز کو بغل کے نیچے دبا لیا۔ یا گود میں لے لیا*۔

قرآن کریم میں ہے یُخْرِجَ اللّٰہُ اَضْغَانَھُمْ (۴۷/۲۹؛ ۴۷/۳۷)[1]۔ اللہ ان کے کینوں کو باہر نکالیگا۔ یا جو کچھ بغل کے نیچے دبائے ہوئے ہیں اُسے باہر نکالیگا۔ یعنی ان کی مخالفانہ سازشیں اور پوشیدہ ارادے طشت از بام کر دیگا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کجی یا ٹیڑھ پن کے ساتھ کسی چیز کو ڈھانپ دینا ہوتے ہیں۔ چنانچہ قَنَاۃٌ ضَغِنَۃٌ۔ ٹیڑھے نیزے کو کہتے ہیں۔ ٹیڑھ پن اور ڈھانپے ہوئے (مستور) ہونے کی جہت سے اَلضِّغْنُ۔ کینہ اور عداوت کو کہتے ہیں۔

---

* تاج۔ راغب۔ محیط۔ ** اَلضِّغْنُ کے معنی گود اور اونٹ کی بغل کے بھی ہیں۔ نیز شوق اور میلان کے بھی۔

[1] ۴۷/۳۷ میں یُخْرِجْ اَضْغَانَکُمْ ہے۔

ض ف د ع

اَلضِّفْدَعُ - اَلضِّفْدِعُ - (جمع ضَفَادِعُ ۱۳۳/۷) - مینڈک * -

ض ل ل

اَلضَّلَّةُ - حیرت - متحیر ہونا - سرگردان پھرنا - (Perplexed; Confused) کسی چیز کا پوشیدہ اور غائب ہونا، مختلف چیزوں کا اسطرح مل جانا کہ پھرانہیں الگ الگ نہ کیا جا سکے - مثلاً ضَلَّ الْمَاءُ فِي اللَّبَنِ - پانی دودھ میں گھل مل کر غائب ہو گیا - دلیل نہ سوجھنے، نیز کسی بات کے بھول جانے اور حافظہ سے گم ہو جانے کے لئے بھی یہ فعل بولا جاتا ہے **- ضَلَالَةٌ - سیدھی راہ سے ہٹ جانا - (عمداً ہو یا سہواً - تھوڑا ہو یا بہت)- چونکہ صحرا میں راستہ کھو جانے والا اپنی تمام تگ و دو کے باوجود منزل کے قریب نہیں ہونے پاتا اس لئے کوشش کے ناکام و نامراد رہ جانے کو ضَلَّ سَعْيُهُ کہتے ہیں - اور چونکہ ریگستان میں اسطرح پھرنے کا نتیجہ ہلاکت و تباہی ہوتا ہےاس لئےاسے ان معنوں میں بھیاستعمال کرنے لگے ***- نیز ضائع ہونا - رائگاں جانا - مثلاً ذَهَبَ دَمُهُ ضِلَّةً - اسکا خون یونہی رائگاں گیا - کیونکہ اسکا قصاص یا انتقام نہیں لیا جا سکا * - ضَلَّنِي فُلَانٌ - وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا اور میں اس پر قادر نہ رہا * - اَلضَّلَلُ - وہ پانی جو کسی چٹان یا درختوں کے نیچے بہ رہا ہو اور اس پر دھوپ نہ پڑے - اَلْمَضَلُّ - اَلْمُضِلُّ - سراب جو ریگستان میں پانی کی طرح دکھائی دیتا ہے * -

جب رسول اللہؐ نبوت سے پہلے تلاش حقیقت میں حیران و سرگردان پھرتے تھے تو قرآن کریم نے اس کیفیت کو وَوَجَدَكَ ضَالًّا (۷/۹۳) سے تعبیر کیا ہے - ایک ہونے والا نبی، نبوت سے پہلے بھی، غلط تصورات زندگی سے غیر مطمئن ہوتا ہے لیکن چونکہ صحیح تصورات اس کے سامنے نہیں ہوتے اس لئے وہ ان کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے - اس کے بعد اسے خدا کی طرف سے راہ نمائی مل جاتی ہے تو یہ سرگردانی ختم ہو جاتی ہے -

سورۃ بقرہ میں ضَلَالَةٌ - هُدًى کے مقابلہ میں آیا ہے (۲/۱۶) - اس نے "راہ گم کردن" کے مفہوم کو واضح کر دیا ہے - سورۃ ابراہیم میں کوششوں کے ناکام اور اعمال کے بے نتیجہ رہ جانے کو ضَلَالٌ سے تعبیر

---

* تاج- **تاج نیز ابن قتیبہ - القرطین ج/۱ صفحہ ۵ *** لین -

کیا گیا ہے (۱۸/۱۴) - سورۃ کہف میں ضَلَّ سَعۡیُہُمۡ (۱۰۴/۱۸) سے بھی اس مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے - سورۃ ابراھیم میں اسے ثَبَاتٌ کے مقابل میں لا کر بتایا گیا ہے کہ اسکے معنے ھلاکت و بربادی ھیں (۲۴/۱۴) - سورۃ حجر میں ضَلَالَتٌ کا نتیجہ نعمائے خداوندی سے محرومی و مایوسی بتایا گیا ہے (۵۶/۱۵) - سورۃ اعراف میں ضَلُّوۡا عَنَّا (۳۷/۷) کے معنے ھیں وہ ھم سے جاتے رہے یا غائب ہو گئے - اور سورۃ السجدہ میں جہاں کفار کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ءَاِذَا ضَلَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ (۱۰/۳۲) تو اس کے معنے ھیں کہ کیا جب ھم مرنے کے بعد مٹی میں مل کر ضائع ھو جائینگے (ختم ھو جائینگے) ؟ - تَضۡلِیۡلٌ - ضائع کر دینا - ناکام بنا دینا ، بھٹکا دینا اور غلط راہ پر لگا دینا (۲/۱۰۵) - لہذا ضَآلِّیۡنَ (۷/۱) سے مراد ایسے لوگ ھیں جو وحی کی راہنمائی کے بجائے اپنے ذھنی قیاسات کی تجربہ گاھوں یا توھم پرستانہ عقیدتمندیوں کی بھول بھلیوں میں اس طرح مارے مارے پھرتے ھیں جسطرح لق و دق صحرا میں ایک راہ گم کردہ مسافر حیران و پریشان پھرتا ہے - وہ دن بھر چلتا رہتا ہے لیکن شام کے وقت اسکی منزل اس سے اور دور ھو چکی ھوتی ہے - اسطرح اسکی تمام کوششیں رائگاں چلی جاتی ھیں اور وہ انجام کار ھلاک ھو جاتا ہے - اس کے مقابلہ میں منعم علیہ ھیں (۱/۶) جن کی کیفیت ان لوگوں کے برعکس ھوتی ہے -

سورۃ بقرہ میں ہے (۲۸۲/۲) کہ لین دین کے معاملہ میں دو مرد بطور گواہ ھونے چاھئیں اور اگر دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں - دو عورتیں اس لئے کہ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰىہُمَا فَتُذَکِّرَ اِحۡدٰىہُمَا الۡاُخۡرٰی (۲۸۲/۲) - اگر ان میں سے ایک کسی تفصیل میں (Confused) ھوجائے تو دوسری اسے یاد دلا دے - وہ اُس بات کو سامنے لے آئے - اس سے حافظہ کی کمزوری (بھول جانا) مراد نہیں بلکہ (عورت کے زیادہ جذباتی اورحیاذار ھونے کی وجہ سے) گھبراھٹ میں (Confused) ھو جانا مقصود ہے - اسی کے لئے قرآن کریم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ وَہُوَ فِی الۡخِصَامِ غَیۡرُ مُبِیۡنٍ (۱۸/۴۳) - وہ جھگڑے (متنازعہ فیہ معاملہ) میں واضح طور پر مافی الضمیر کو بیان کرنے والی نہیں ھوتی ہے - جھگڑے میں جذبات کی شدت ھوتی ہے جس سے وہ اپنے معاملہ (Case) کو بھی اچھی طرح بیان نہیں کر سکتی - واضح رہے کہ لطیف جذبات کی زیادتی عورت کے فطری وظائف زندگی (اولاد کی پرورش) کے لئے ضروری ہے - اس لئے یہ عورت کا نقص نہیں - البتہ مناسب تعلیم و تربیت سے اس کے یہ جذبات بھی باقی رہتے ھیں اور وہ فصیح البیان بھی ھو سکتی ہے (۱۸/۴۳ - دیکھئے عنوان ع - ر - ب)

ض م ر

آلضُّمْرُ - آلضُّمُرُ - لاغر ہونا - پیٹ کا کمر کے ساتھ لگ جانا - ضَمَرَ الْفَرَسُ - گھوڑے کا لاغر ہونا اور اسکے پیٹ کا کمر سے لگنا - قَضِیْبٌ ضَامِرٌ - مرجھائی ہوئی شاخ جسکی تروتازگی جاتی رہی ہو* - قرآن کریم میں ہے عَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ (۲۲/۲۷) - پتلی دبلی سواریوں پر - راغب نے کہا ہے کہ الضَّامِرُ مِنَ الْفَرَسِ - اس چھریرے گھوڑے کو کہتے ہیں جسکا دبلا پن لاغری کی وجہ سے نہ ہو بلکہ اسے سدھانے کے لئے جو مشقت کرائی جاتی ہے اس کی وجہ سے ہو** -

آلضَّمِیْرُ - مرجھایا ہوا انگور - ہر وہ بات جسے تم اپنے دل میں چھپاؤ - اَضْمَرَہٗ - اس نے اسے چھپا لیا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) پتلا پن اور باریک ہونا اور (۲) کسی چیز کا چھپ جانا -

ض م م

آلضَّمُّ - ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا - اِضْطَمَّ الشَّیْئَ - کسی چیز کو اپنے لیے اکھٹا کیا - ضَمَمْتُہٗ اِلٰی صَدْرِیْ - میں نے اسے اپنے گلے سے لگایا* - ضَمَّ عَلَی الْمَالِ - اس نے سارے مال پر قبضہ کر لیا** - ضُمَّ جَنَاحَکَ عَنِ النَّاسِ - لوگوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ اور اپنا پہلو ، ان کے لئے نرم رکھو* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو چیزوں میں موافقت اور مناسبت کے ہیں -

سورۃ طٰہٰ میں ہے وَاضْمُمْ یَدَکَ اِلٰی جَنَاحِکَ تَخْرُجْ بَیْضَاءَ مِنْ غَیْرِ سُوْءٍ (۲۰/۲۲) - اور سورۃ القصص میں ہے اُسْلُکْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ تَخْرُجْ بَیْضَاءَ مِنْ غَیْرِ سُوْءٍ وَاضْمُمْ اِلَیْکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّھْبِ (۲۸/۳۲) -[''یَدٌ بَیْضَاءُ'' کے مفہوم کیلئے عنوان ی - د - ی دیکھئے - نیز ۷/۱۰۸ ؛ ۲۶/۳۳ - اور جَنَاحٌ کیلئے دیکھئے عنوان ج - ن - ح] (۲۸/۳۲) کا مفہوم یہ ہے کہ خوف کی حالت میں مضطرب و متردد مت ہو (پھڑ پھڑاؤ نہیں) بلکہ اسطرح اطمینان سے رہو جسطرح پرندہ حالت امن میں اپنے بازو سمیٹ کر بیٹھتا ہے - اور (۲۰/۲۲) کا مجازی مفہوم بھی یہ ہے کہ اس آنے والے معرکہ میں ضبط و تحمل

---

* تاج - ** راغب -

سے کام لو۔ پریشان مت ہو۔ اور بشارتیں دینے والے درخشندہ اصول زندگی کو (جو وحی کے ذریعے تمہیں دیئے گئے ہیں) پیش کرتے جاؤ۔ تم ہر مشکل و مصیبت سے محفوظ باہر نکل آؤ گے۔ دشمن کا شر تمہیں کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا سکیگا۔ ویسے، آیت (۲۸/۳۲) کے لفظی معنی یہ ہیں۔ "تم اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈالو۔ وہ بغیر کسی خرابی کے سفید نکل آئے گا۔ اور تم خوف سے اپنے بازؤں کو سمٹائے رکھو"۔

ض ن ک

اَلضَّنْکُ۔ تنگ (جو کشادہ نہ ہو)۔ اَلضَّنِیْکُ۔ وہ شخص جو جسم، عقل، رائے وغیرہ میں کمزور ہو۔ وہ خادم جو محض روٹی کے معاوضہ میں کام کرتا ہو۔ رَجُلٌ مُّتَضَنِّکٌ۔ لاغر آدمی*۔

قرآن کریم میں ہے جو شخص (یا قوم) قوانین خداوندی سے اعراض برتیگی۔ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا (۲۰/۱۲۴) ان کی معیشت تنگ ہو جائیگی۔ ظاہر ہے کہ جن اقوام کی معیشت تنگ ہے (اور مسلمانوں کا نمبر ان میں اسوقت سب سے آگے ہے) وہ قوانین خداوندی سے اعراض برت رہی ہیں۔ یہ ایک ایسا محسوس اور واضح معیار ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

ض ن ن

ضَنَّ بِالشَّیْءِ یَضَنُّ۔ کسی پسندیدہ اور مرغوب شے سے بخل کرنا۔ اَلضَّنِیْنُ۔ وہ بخیل آدمی جو نفیس چیزوں کے ساتھ بخل کرے۔ اَلضِّنُّ۔ نفیس شے جسکے ساتھ بخل کیا جائے**۔ جسے بچا کر رکھا جائے۔

قرآن کریم میں نبی اکرم کے متعلق ہے کہ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ (۸۱/۲۴)۔ اسے خدا کیطرف سے جو وحی ملتی ہے وہ اسکے عام کرنے میں بخل نہیں برتتا۔ وہ اسے ہر اس شخص کو دیتا ہے جو لینا چاہے۔

ض ھ ی (أ)

اَلضَّهْيَاءُ۔ وہ عورت جسے نہ حیض آتا ہو نہ بچے پیدا ہوتے ہوں۔ یا جس کی چھاتیوں میں ابھار نہ ہو اور اسطرح وہ مردوں سے مشابہ ہو۔ اسی

* تاج۔ محیط۔ راغب۔ ** تاج۔

سے ضَاھَاہٗ مُضَاھَاۃً ۔ وضَاھَاءٗ ۔ مُضَاھَئَۃً کے معنے ھیں وہ اس کے مشابہ اور ھمشکل ھوا ۔ ھُوَ ضَھِیئُکَ ۔ وہ تیرا ھمشکل اور تجھ سے مشابہ ھے*۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز کے مشابہ ھونا ھیں ۔

قرآن کریم میں ھے یُضَاھِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ (۹/۳۰) ۔ یہ انھی جیسی بات کرتے ھیں (انھی کے ھم رنگ بنتے ھیں) جنھوں نے ان سے پہلے کفر کی روش اختیار کی تھی ۔ یہ سب ھم رنگ ھیں ۔

بعض لوگوں نے اسے ناقص یائی مانا ھے اور بعض نے مہموز* ۔ چنانچہ لین نے اسے ضھی اور ضھاٗ دونوں عنوانوں کے تحت لکھا ھے ۔ راغب نے اسکی اصل ھمزہ بھی بتائی ھے ۔

ض و أ

ضَوْءٌ یا ضُوْءٌ ۔ نور اور روشنی کو کہتے ھیں ۔ (جیسا کہ ن ۔ و ۔ ر کے عنوان میں بھی بتایا گیا ھے) ۔ زمخشری نے لکھا ھے کہ ضَوْءٌ کا لفظ نُوْرٌ سے زیادہ شدت اور قوت رکھتا ھے ۔ نیز ضَوْءٌ کسی کی ذاتی روشنی کو کہتے ھیں اور نُوْرٌ اس روشنی کو جو دوسرے سے اکتساب کی گئی ھو**۔ غالباً اسی جہت سے شَمْسٌ کو ضِیَاءٌ اور قَمَرٌ کو نُوْرٌ کہا گیا ھے (۱۰/۵) ۔ کیونکہ چاند کی روشنی اپنی نہیں ھوتی ، سورج سے مستعارلی ھوئی ھوتی ھے ۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ھوئے ھیں ۔ مثلاً ایک جگہ تَوْرَاتٌ کو نُوْرٌ کہا گیا ھے (۵/۴۴) اور دوسری جگہ اسے ضِیَاءٌ کہا گیا ھے (۲۱/۴۸) ۔

أضَاءَ کے معنے روشن کرنا ھیں ۔ فَلَمَّا اَضَاءَتْ مَاحَوْلَہٗ (۲/۱۷) ۔ ''جب اس نے اس کے گرد و پیش کو روشن کردیا'' ۔ نیز اس کے معنی روشن ھونے کے بھی ھیں ۔ یَکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْیءُ (۲۴/۳۵) ۔ ''قریب ھے اس کا تیل کہ وہ روشن ھو جائے'' ۔

ض و ز (ضیز)

ضَازَ فُلَانًا حَقَّہٗ ۔ اس نے اسکا حق کم کردیا ۔ قِسْمَۃٌ ضِیْزیٰ ۔ وہ ظالمانہ تقسیم جس میں کسی کو نقصان میں رکھا جائے ۔ وہ تقسیم جو عدل پر مبنی نہ ھو ۔ اَلضُّوَازَۃُ ۔ مسواک کے اس ریشہ کو کہتے ھیں جو دانتوں

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔

میں رہ جائے*۔ (گویا اتنی سی کمی بھی ظلم ہو جاتی ہے)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) کجی اور (۲) کمی اور نقصان کے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى (۵۳/۲۲)۔ یہ تقسیم تو پھر بڑی ہی بے انصافی کی تقسیم ہوئی۔

ض ی ر

اَلضَّيْرُ۔ مضرت۔ گزند، ضَارَہٗ وَضَرَّہٗ کے ایک ہی معنے ہیں۔ یعنی کسی کو تکلیف اور نقصان پہنچانا*۔ قرآن کریم میں ہے لَا ضَيْرَ۔ (۲۶/۵۰)۔ کچھ ہرج نہیں۔ قطعاً کوئی تکلیف یا مضرت کی بات نہیں۔

ض ی ع

ضَاعَ۔ یَضِيْعُ۔ ضَيْعًا۔ ہلاک اور تلف ہو جانا۔ ضَاعَ الشَّيْءُ۔ چیز بے کار چھوڑ دی گئی اور اس کی خبر گیری نہ ہوئی۔ ضَاعَ الْعِيَالُ۔ اہل و عیال کی نگرانی خبر گیری اور تربیت نہ کی گئی اور انہیں ویسا ہی چھوڑ دیا گیا۔ تَرَكْتُهٗ بِضَيْعَةٍ۔ میں نے اسے بلا خبر گیری کے چھوڑ دیا۔ اَلضِّيَاعُ (ضَائِعٌ کی جمع ہے) وہ چیزیں جنکی خبر گیری نہ کی جائے اور وہ اس طرح ضائع ہو جائیں***۔ اَلضَّيْعَةُ۔ جائداد کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اگر اسے ربوبیت عامہ کے لئے کھلا نہ رکھا جائے تو وہ مآل کار ضائع ہو جاتی ہے۔

سورۃ بقرۃ میں ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ (۲/۱۴۳)۔ اللہ ایسا نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمانوں کو ویسے ہی چھوڑ دے، ان کا خیال ہی نہ رکھے اور وہ اس طرح بغیر کوئی نتیجہ مرتب کئے برباد ہو جائیں۔ سورۃ مریم میں ہے کہ انبیا کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ (۱۹/۵۹)۔ انہوں نے نظام صلٰوۃ کی کوئی پرواہ ہی نہ کی۔ اسے ویسے ہی چھوڑ دیا اور اپنے اپنے خیالات و مفاد کے پیچھے پڑ گئے۔

ض ی ف

اَلضَّيْفُ۔ مہمان۔ جمع اور واحد دونوں کے لئے آتا ہے***۔ سورۃ ہود میں ہے لَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ (۱۱/۷۸)۔ یہاں ضَيْفٌ جمع کے لئے آیا ہے۔

*تاج ** تاج و محیط و راغب۔ *** تاج و محیط

ضَافَ اِلَیْہِ ۔ وہ اس کی طرف مائل ہوا ۔ جھکا ۔ قریب ہوا ۔ ضَیَّفَ ۔ مہمان بنانا ۔ مہمان نوازی کرنا* ۔

سورۃ کہف میں ہے فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْھُمَا (۱۸/۷۷) ۔ انہوں نے ان کی مہمان نوازی کرنے سے انکار کردیا۔ اَلْمُضَافُ ۔ جائے پناہ ۔ جس کو کسی کی طرف مائل کیا جائے، جھکایا جائے۔ نیز وہ شخص جس کو جنگ میں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہو* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی مائل ہونے کے ہیں ۔

ض ی ق

ضَاقَ ۔ یَضِیْقُ ۔ ضِیْقًا ۔ تنگ ہو جانا ۔ ضَیَّقَ ۔ تنگ کرنا ۔ اَلضِّیْقُ و الضَّیْقُ ۔ تنگی ۔ یہ اَلشَّرْحُ کی ضد ہے ۔ لہذا اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے ش ۔ ر ۔ ح کا عنوان دیکھئے ۔ یہ دونوں مادے (۶/۱۲۶) میں ایک دوسرے کے بالمقابل آئے ہیں۔ ضَیِّقٌ (۶/۱۲۶) تنگ ۔ ضَیْقٌ (۱۶/۱۲۷) تنگی۔ ضَائِقٌ۔ وہ جو تنگ ہو (۱۱/۱۲) ۔ ان میں حزن ، غم اور ملال کا مفہوم آجاتا ہے ۔ ضَاقَ بِھِمْ ذَرْعًا (۱۱/۷۷) اس نے ان کی حفاظت کے لئے اپنی طاقت کو تنگ (کم) پایا ۔ کوتاہ دست ہو گیا ۔ ضَاقَتْ عَلَیْھِمُ الْاَرْضُ (۹/۱۱۸) ان پر زمین تنگ ہو گئی ۔ وَ ضَاقَتْ عَلَیْھِمْ اَنْفُسُھُمْ (۹/۱۱۸) وہ خود اپنے آپ سے تنگ آ گئے۔ سورۃ طلاق میں ہے وَلَا تُضَآرُّوْھُنَّ لِتُضَیِّقُوْا عَلَیْھِنَّ (۶۵/۶) ۔ انہیں تنگ کرنے کے لئے تکلیف نہ دو ۔

---

*تاج و محیط ۔

ط

طَالُوْتُ

طَالُوْتُ - انہیں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اُن افواج کا کمانڈر مقرر کیا تھا جو جالوت کے مقابلہ کے لئے جا رہی تھیں - ان میں علم بھی تھا اور جسمانی توانائی بھی - اور یہی چیزیں ایک کمانڈر کے لئے ضروری ہوتی ہیں - ان کے اس تقرر کے خلاف بنی اسرائیل نے یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ دولتمند نہیں - یعنی وہ (Aristocrat) طبقہ میں سے نہیں - اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ کمانڈر کی صفات، فنونِ حرب کا علم اور توانائی ہیں، نہ کہ مال و دولت کی فراوانی - ($\frac{۲}{۲۴۷}$)-

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ عجمی لفظ ہے، عربی نہیں* - راغب نے بھی اسکی تائید کی ہے -

ط ب ع

اَلطَّبْعُ - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کو تمثیلاً کسی چیز کی انتہا کے لئے استعمال کرتے ہیں، یعنی جہاں پہنچ کر وہ چیز ختم ہو جائے اور پوری ہو جائے - پیمانے کے لبالب بھر جانے کو طَبْعٌ کہتے ہیں - تَطَبَّعَ النَّهْرُ - نہر بھر گئی - اس اعتبار سے اَلطَّبْعُ مہر لگانے کو کہتے ہیں- ابو اسحق نے کہا ہے کہ طَبْعٌ اور خَتْمٌ ہم معنی ہیں - یعنی کسی چیز کو بند کر دینا اور ڈھانپ دینا اور اس کا یقین اور اطمینان کر لینا کہ اب اس میں کوئی چیز داخل نہ ہو سکے گی - مثلاً کہتے ہیں طَبَعْتُ الْمِكْيَالَ - میں نے پیمانے کو لبالب بھر دیا اور اس میں اب کوئی اور چیز نہیں آسکتی** - لیکن راغب نے کہا ہے کہ طَبْعٌ - خَتْمٌ سے زیادہ عام ہے اور نَقْشٌ سے زیادہ خاص** - اَلطَّابِعُ والطَّابَعُ اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے بکریوں وغیرہ کے پہلو پر داغ دیکر نشان کیا جائے -

* محیط - ** تاج -

اَلطِّبَاعَۃُ ۔ ڈھلائی ، چھپائی کا کام ۔ اَلطَّبَّاعُ ۔ ڈھلائی کا کام کرنے والا*۔ اصل میں جب کسی چیز کو ڈھال کر یا گھڑ کر پہلی شکل دی جائے تو اسے اَلطَّبْعُ کہتے ہیں ۔

مہر لگانے کے اعتبار سے قرآن کریم میں ہے ۔ فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (۶۳/۳) ۔ ان کے دلوں پر مہر لگ گئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہیں رہی ۔ اسی کو خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ (۲/۷) کہا گیا ہے (دیکھئے عنوان خ ۔ ت ۔ م) ۔ جب انسان ضد اور ہٹ ، نفرت اور تعصب کی روش اختیار کر لیتا ہے تو پھر اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اس میں کسی بات کے صحیح طور پر سمجھنے اور ٹھیک نتیجہ تک پہنچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی ۔ اسی کو دل و دماغ پر مہریں لگ جانے سے تعبیر کیا گیا ہے اور صاف الفاظ میں بتا دیا ہے کہ یہ انسان کی اپنی روش کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ بلکہ یہ روش خود ہی مہر بن جاتی ہے ۔ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۸۳/۱۴) ۔ '' ان کے اعمال ان کے دلوں پر زنگ بنکر بیٹھ گئے '' ۔ وہ غلط اعمال جو برضا و رغبت اور بلا جور و اکراہ کئے جائیں (۱۶/۱۰۶-۱۰۸) وہ زنگ بن جاتے ہیں ۔

ط ب ق

اَلطَّبَقُ ۔ ہر چیز کا ڈھکنا جو اس پر فٹ آجائے ۔ طَبَّقَهٗ تَطْبِيْقًا ۔ اس نے اسے ڈھانپ دیا ۔ فَانْطَبَقَ ۔ پس وہ ڈھک گیا ۔ اَلطَّبَقُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۔ ہر وہ چیز جو کسی چیز کے برابر اور مطابق ہو ۔ طَابَقَهٗ مُطَابَقَةً وَطِبَاقًا ۔ وہ اس کے موافق اور مساوی ہو گیا ۔ اَلطَّبَقُ ۔ روئے زمین ۔ تھالی یا طباق جس پر کھانا رکھا جائے ۔ زمانہ کی ایک صدی یا قرن ۔ حالت ۔ اَلْمُطَابَقَةُ ۔ موافق و مطابق ہونا ۔ گھوڑے کا اسطرح چلنا کہ جہاں اگلا پاؤں پڑا تھا وہیں پچھلا پاؤں پڑے ۔ اُس آدمی کا چلنا جسکے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں ۔ اُس کے قدم بالکل برابر برابر اٹھتے ہیں ۔ اَلْمُطَابَقَةُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ ۔ دو چیزوں کو ایک دوسرے کے مطابق بنانا یا اوپر تلے رکھنا *۔

قرآن کریم میں ہے اَلَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (۶۷/۳) اس کے معنی ہیں ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہوئے ۔ سورۃ انشقاق میں انسان کی ارتقائی منازل کے متعلق ہے ۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴/۱۹) ۔

---

* تاج ۔

"تم ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بلند ہوتے چلے جاؤ گے"۔ تم مختلف طبقات میں سے گذرتے ہوئے اوپر چڑھتے چلے جاؤ گے۔ یا خود انسانیت (Humanity) تہ در تہ اوپر کو اٹھتی چلی جائیگی۔ تاریخ انہی تہوں کے ریکارڈ کا نام ہے (نیز دیکھئے عنوان ر۔ک۔ب)

ط ح ی (و)

طَحٰی۔ یَطْحٰی۔ طَحْیاً۔ کسی چیز کو پھیلانا۔ بچھانا۔ نیز پھیل جانا۔ بچھ جانا۔ (لازم ومتعدی) اَلطَّاحِیْ۔ زمین پر پھیلی ہوئی چیز۔ وہ شے جو ہر چیز کو اپنی کثرت سے پُر کر دے۔ چنانچہ مِظَلَّةٌ طَاحِیَةٌ۔ بڑے پھیلاؤ والے سائبان کو کہتے ہیں۔ اور اَلْقَمَرُ الطَّاحِیْ۔ بلند چاند کو، جس کی روشنی پھیل رہی ہو*۔ قرآن کریم میں ہے وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا (۹۱/۶)۔ زمین اور وہ چیز جس نے اسے پھیلا دیا۔ یعنی وہ مختلف ادوار و مراحل جن سے گذر کر زمین کا آتشیں گولہ رہائش کے قابل ہوا۔

ط ر ح

طَرَحَ۔ یَطْرَحُ۔ طَرْحاً۔ پھینک دینا۔ دور کر دینا۔ اَلطِّرْحُ۔ پھینکی ہوئی چیز (جسکی کسی کو ضرورت نہ ہو)۔ دِیَارٌ طَوَارِحُ۔ دور دراز شہر۔ اَلطَّرَحُ۔ دوری۔ دور کی جگہ۔ قَوْسٌ طَرُوْحٌ۔ وہ کمان جو تیر کو بہت دور تک پھینکے۔ طَرْفٌ مِطْرَحٌ۔ دور تک دیکھنے والی نگاہ**۔

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ یوسفؑ کو قتل کر دو اَوِاطْرَحُوْهُ اَرْضاً (۱۲/۹)۔ یا اسے کسی دور دراز ملک کی طرف نکال دو۔

ط ر د

اَلطَّرْدُ۔ کسی کو حقیر سمجھ کر دور کر دینا۔ نکال دینا۔ ہٹا دینا۔ طَرَدْتُهٗ۔ میں نے اسے نکال دیا۔ اَلطَّرِیْدَةُ۔ وہ اونٹ جنہیں کوئی حملہ کر کے ہنکا لے جائے۔ یا چرائے ہوئے اونٹ۔ وہ شکار وغیرہ جس کا تعاقب کیا جائے۔ اَطْرَدَهُ السُّلْطَانُ۔ بادشاہ نے اسے شہر بدر کر دیا۔ اِسْتَطْرَدَ لَهٗ۔ وہ پیچھے اس لئے ہٹا کہ فریق مخالف پر پھر سے حملہ کرے لیکن ظاہر ایسا کیا گویا وہ شکست کھا کر بھاگ گیا ہے***۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ نصاریٰ کی اصطلاح میں مذہب کی بنا پر کسی کو سزا دینے کو اَلطَّرْدُ کہتے ہیں****۔

---

*تاج نیز کتاب الاشتقاق۔ **تاج و محیط و راغب ***تاج و راغب۔ ****محیط۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ (۶/۵۲) ۔ جو لوگ اپنے نشوونما دینے والے کو پکارتے ہیں انہیں حقیر و ذلیل سمجھ کر اپنے سے دور نہ رکھو۔ انہی کے متعلق حضرت نوحؑ کی زبان سے کہلوایا گیا کہ وَمَا اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۲۶/۱۱۴) ۔ میں ان مومنین کو حقیر سمجھ کر اپنے پاس سے نہیں نکالوں گا ۔

غیر قرآنی نظام حیات میں قرب و بعد کا معیار، دولت اور وجاہت ہے ۔ لیکن قرآنی معاشرہ میں قرب و یگانگت کا معیار قلب و نگاہ کی ہم آہنگی (آئیڈیالوجی کا اشتراک) ہے ۔ اس میں امیر اور غریب کا کوئی امتیاز نہیں ۔ یہی بات ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی جنہیں اس نظام کی طرف دعوت دی جاتی تھی ۔ وہ کہتے کہ کیا ہم اس نظام میں آکر ان لوگوں کے ساتھ بیٹھیں جنہیں ہم اپنے معاشرہ میں ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں ؟ چنانچہ ان کا مطالبہ تھا کہ آپؐ ان لوگوں کو اپنے ہاں سے الگ کر دیجئے ، پھر ہم آئینگے ۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ یہاں معیار ہی کچھ اور ہے ۔ میں تمہاری خاطر ان لوگوں کو حقیر سمجھ کر الگ نہیں کر سکتا جن کے دل متاع ایمان سے بھرپور ہیں ۔ اس نظام میں اقدار بدل جاتی ہیں ۔ یہاں زندگی کی بلند اقدار کی صداقت پر یقین ، خلوص اور حسن عمل سب سے زیادہ گراں بہا متاع ہیں ۔

ط ر ف

اَلطَّرْفُ ۔ آنکھ ۔ نگاہ *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) کسی چیز کا کنارہ اور (۲) کسی عضو کا حرکت کرنا ۔ دراصل یہ آنکھ جھپکنے کے لئے آتا ہے ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلطَّرْفُ درحقیقت پلکیں جھپکنے کو کہتے ہیں ۔ اسی سے دیکھنے کو بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے * ۔ سورۃ النمل میں ہے ۔ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ (۲۷/۴۰) ۔ تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے ۔ یعنی بہت جلد ۔ سورہ شوری میں ہے یَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِیٍّ (۴۲/۴۵) ۔ کنکھیوں سے دیکھنا ۔ اَلطَّرَفُ ۔ ہر چیز کا وہ سرا جہاں وہ ختم ہو جاتی ہو ۔ آخری کنارا * ۔ قرآن کریم میں طَرَفَیِ النَّهَارِ (۱۱/۱۱۴) اور اَطْرَافَ النَّهَارِ (۲۰/۱۳۰) آیا ہے ۔

اَطْرَافُ الْاَرْضِ ۔ ملک کے سردار اور اشراف ** ۔ اَلطِّرْفُ ۔ شریف آدمی ۔ عمدہ نسل کا گھوڑا ۔ اعلیٰ نسب کا انسان ۔ سردار شریف * ۔

* تاج ۔ ** (تاج و صحاح و البستان)

سورہ رعد میں ہے۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُھَا مِنْ اَطْرَافِھَا (۱۳/۴۱)۔ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم کسطرح (آہستہ آہستہ) زمین (معاشی وسائل۔ رزق کے سرچشموں) کو ان بڑے بڑے لوگوں کے پاس سے کم کرتے جارہے ہیں جو انہیں اپنے قبضے میں لئے بیٹھے ہیں۔ قرآن کریم نے تیرہ سو برس ہوئے جب یہ بتا دیا تھا کہ دنیا کا وہ معاشی نظام جس میں رزق کے سر چشمے بڑے بڑے لوگوں کے قبضہ میں رہتے ہیں باقی نہیں رہے گا۔ یہ چیزیں آہستہ آہستہ ان کے ہاتھوں سے نکلتی جائیں گی اور اسطرح کم ہوتی ہوتی ایک دن ان کی ذاتی ملکیت سے نکل کر معاشرہ کی تحویل میں چلی جائیں گی۔ اور قرآنی معاشرہ ان سے حاصل شدہ رزق کو ربوبیت عامہ کیلئے صرف کریگا۔ (۲۱/۴۴) میں اس حقیقت کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

نیز طَرَفٌ کے معنی گروہ اور جماعت کے بھی ہیں (قاموس)۔ نیز کسی چیز کا ایک حصہ (اقرب الموارد)۔ الطَّرَفُ۔ منتخب چیز کو بھی کہتے ہیں*۔ سورہ آل عمران میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے۔ طَرَفًا مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (۳/۱۲۶)۔ ان کا ایک حصہ۔ یا ایک گروہ۔ نیز اس کے معنی کفار کے بڑے بڑے لیڈر اور منتخب افراد بھی ہو سکتے ہیں (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے)۔

ط ر ق

اَلطَّرْقُ۔ کے اصل معنے مارنے کے ہیں۔ ہتوڑے سے مارنا۔ چٹاخ سے مارنا۔ اَلطَّرْقُ۔ کاہن کا اپنی کہانت کے لئے کنکریاں مارنا۔ اَلْمِطْرَقُ۔ اَلْمِطْرَقَۃُ۔ وہ لکڑی جس سے اون کو مار مار کر دھنا جائے۔ نیز ہتھوڑا۔ اَلطَّرْقُ۔ اَلطُّرُوْقُ۔ رات کو آنا۔ اَلطَّارِقُ۔ رات کو آنے والا۔ اسے طَارِقٌ اس لئے کہتے ہیں کہ اسے بالخصوص دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ طَارِقٌ راستہ چلنے والے کو کہتے ہیں، بالخصوص اس مسافر کو جو رات کو آئے۔ ستارے کو بھی اَلطَّارِقُ کہتے ہیں کیونکہ وہ رات میں آتا ہے**۔ قرآن کریم میں ہے وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ (۸۶/۱)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے چار بنیادی معنی ہیں (۱) شام کو آنا۔ (۲) مارنا۔ (۳) کسی چیز کا ڈھیلا ہونا۔ اور (۴) کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ سی دینا۔

اَلطَّرِیْقَۃُ۔ کسی چیز کی طرف پہنچنے کا راستہ۔ طریقہ۔ عادت۔ چلن۔ نیز اَلطَّرِیْقُ۔ اَلطَّرِیْقَۃُ جسکی جمع اَلطَّرَائِقُ آئیگی۔ سورہ طٰہٰ میں

* تاج۔ ** تاج و راغب و محیط۔

ہے فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا (۲۰/۷۷) - پھر تو انہیں سمندر میں خشک راستہ سے لے جا - یہاں طریق کے معنی راستہ ہیں - نیز اس کے معنی قوم کے رؤساء اور معزز لوگ ہیں جو دوسروں کے لئے نمونہ بنیں - هٰؤُلَاءِ طَرِيقَةُ قَوْمِهِمْ وَطَرَائِقُ قَوْمِهِمْ - یہ قوم کے اشراف ہیں - مِطْرَاقُ الشَّيْئِ - چیز کا مثل اور نمونہ* - سورۃ طٰهٰ میں ہے کہ سرداران قوم فرعون نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے متعلق کہا کہ يَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ (۲۰/۶۳) - یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے مسلک و مذہب کو جو بہترین ہے ختم کر دیں - یا تمہاری قوم کے بہترین رؤسا و اشراف کو ختم کر دیں - اسی سورۃ میں آگے چل کر ہے أَمْثَلُهُمْ طَرِيقَةً (۲۰/۱۰۴) - بہترین طریقے پر چلنے والا - سورہ جن میں ہے لَوِ اسْتَقَامُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ (۷۲/۱۶) - اگر وہ (صحیح) راستے پر قائم رہتے - ذرا پہلے ہے كُنَّا طَرَائِقَ قِدَدًا (۷۲/۱۱) - ہم متفرق راستوں پر تھے - مختلف مسلک رکھتے تھے -

اَلطَّرِيقَةُ - وہ چیز جو ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہو - اَلْمُطَارِيقُ ان اونٹوں کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے ہوں - اِطَّرَقَتِ الْإِبِلُ - اونٹ ایک دوسرے کے پیچھے چلے - اِطَّرَقَتِ الْأَرْضُ - زمین میں مٹی کے اوپر مٹی چڑھ گئی - اَلطِّرَاقُ - جوتے کا پرتلہ جو ایک کے اوپر دوسرا رکھ کر سی لیا جائے* - قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ (۲۳/۱۷) - یہاں طَرَائِقُ کے معنی اوپر تلے مختلف طبقات بھی ہو سکتے ہیں - یعنی اجرام فلکی جو ایک دوسرے کے اوپر ہیں - یا وہ اجرام سماوی جو ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے ہیں -

ط ر ی (و)

اَلطَّرِيُّ - نیا، نرم اور تروتازہ - طَرِيَ اللَّحْمُ وَطَرُوَ طَرَاوَةً - گوشت کا نرم اور ترو تازہ ہونا** - قرآن کریم میں سمندر کے متعلق ہے کہ اس میں سے لَحْمًا طَرِيًّا (۱۶/۱۴) حاصل ہوتا ہے - ترو تازہ گوشت یعنی مچھلی وغیرہ -

ط ع م

اَلطَّعَامُ - اہل عرب جب اسے مطلقاً بولتے ہیں تو اس سے مراد گیہوں یا کھجور ہوتی ہے - ورنہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کھائی جائے اور جس

---

* تاج - ** تاج و راغب

سے انسان کے جسم کی پرورش ہو سکے ۔ اَلطُّعْمَۃُ ۔ کھانے کی چیز ۔ رزق ۔ ذریعہ معاش ۔ طَعْمُ الشَّیْئِ ۔ چیز کا مزہ ۔ اس لئے طَعِمَ اور تَطَعَّمَ کے معنی چکھنا بھی ہوتے ہیں * ۔ نیز طَعِمَ کے معنی ہیں اس نے پیٹ بھرا ۔ طَاعِمٌ کے معنی ہیں جس کا پیٹ بھرا ہوا ہو ۔ نیز مستغنی * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں ۔

نیز اَلطُّعْمُ ۔ قدرت اور اختیار کو بھی کہتے ہیں ۔ طَعِمَ عَلَیْہِ ۔ وہ اس پر قادر ہوا * ۔ قرآن کریم میں طَعَامٌ ($\frac{۲}{۶۱}$) کھانے کی چیز کے لئے آیا ہے ۔ اور ($\frac{۲}{۲۴۹}$) میں پینے یا چکھنے کے معنوں میں ۔ اَطْعَمَ ($\frac{۱۰۶}{۴}$) اس نے کھانا کھلایا ۔ اِسْتَطْعَمَ ($\frac{۱۸}{۷۷}$) اس نے کھانا مانگا ۔

اس کے عمومی معنی ہر قسم کے سامان پرورش کے ہیں ۔ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ($\frac{۱۰۷}{۳}$) کے معنی صرف روٹیاں کھلانے کے نہیں ۔ اس کے معنی ہیں ان لوگوں کی پرورش کا سامان بہم پہنچانا یا ضروریات سے مستغنی کر دینا جو نقل و حرکت سے معذور ہو جائیں یا جن کی زندگی کی گاڑی رک جائے ۔

سورۃ مائدہ میں ہے کہ اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُہٗ ($\frac{۵}{۹۶}$) ۔ اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ پانی کے وہ جانور جن کا تم شکار کرو یا وہ جنہیں پانی ازخود اچھال کر باہر پھینک دے، حلال ہیں ۔ (ابن جریر) صاحب البستان نے بھی یہی لکھا ہے ۔ تاج نے کہا ہے کہ جس جگہ سے سمندر کا پانی ہٹ جائے، وہاں جو کچھ رہ جائے اور بغیر شکار کئے مل جائے وہ طَعَامُ الْبَحْرِ ہے ۔ لسان العرب میں ہے کہ طعام البحر ہے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جنکی زندگی کا دارومدار سمندر پر ہو ۔

ط ع ن

طَعَنَہٗ بِالرُّمْحِ یَطْعَنُ ۔ اسکے نیزہ مارا ، چبھو دیا ۔ گھونپ دیا * ۔ طَعَنَ فِیْہِ ۔ کسی میں عیب نکالنا ۔ طنز کرنا * ۔ طَعْنًا فِی الدِّیْنِ ($\frac{۴}{۴۶}$) ۔ دین میں عیب نکالتے ہوئے ۔ طعن کرتے ہوئے ۔ طنز کرتے ہوئے ۔

ط غ ی (و)

طَغٰی ۔ حد اور پیمانے سے باہر ہو جانے کو کہتے ہیں ۔ اسی لئے دریا وغیرہ کے پانی کا بڑھکر مقررہ اندازہ سے زیادہ بلند ہو جانے یا ساحل سے باہر آجانے کو طُغْیَانٌ کہا جاتا ہے ۔ اَلطَّغْوٰی ۔ اسے حد سے متجاوز اور حدود شکن

* تاج ۔

بنایا۔ اسے طغیان و سرکشی پر ابھارا۔ الطَّاغِیْ۔ حد سے متجاوز اور قانون شکن آدمی کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع الطَّاغُوْنَ اور الطَّاغِیْنَ ہے۔ طَغْیَۃٌ اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر چڑھنا دشوار ہو۔ طَاغِیَۃٌ۔ جبّار و متکبر اور احمق و سخت گیر، نیز معاند انسان کو کہتے ہیں۔ بجلی کی شدید کڑک اور مہیب طوفان کو بھی۔ طَغْوٰی کے معنی سرکشی اور حدود شکنی کے ہیں*۔ یہیں سے لفظ طَاغُوْتٌ ہے جو (صاحب مفردات کے نزدیک) ہر حدود شکن، نیز اللہ کے سوا ہر باطل معبود کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ نیز اس کے لئے جو کسی کو سیدھی راہ سے بھٹکا کر غلط راستے پر لگا دے**۔ جوہری کے نزدیک سرکشوں کے ہر سرغنہ کو طَاغُوْتٌ کہا جاتا ہے*۔ زجاج نے کہا ہے کہ خدا کے سوا جس کسی کی بھی اطاعت اختیار کی جائے وہ طَاغُوْتٌ ہے۔ یعنی ہر غیر خداوندی طاقت*۔

قرآن کریم میں فرعون کے متعلق ہے اِنَّهٗ طَغٰی (۲۰/۲۴)۔ یعنی وہ بے حد سرکش ہو چکا ہے۔ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ (۲/۱۵) میں طُغْیَانٌ کے معنی سرکشی ہیں۔ اور (۷۸/۲۲) میں لِلطَّاغِیْنَ سرکشوں کے لئے آیا ہے۔

قرآن کریم کے متعدد مقامات میں اللہ کے مقابلہ میں اَلطَّاغُوْتُ کا لفظ آیا ہے جس سے اس کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی ہر غیر خدائی قانون اور نظام، ہر وہ قوت جو خدا کے قانون سے سرکشی اختیار کر جائے۔ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰهِ (۲/۲۵۶) میں یہ مفہوم واضح ہے۔ یعنی جو خدا پر ایمان لائے اور ہر غیر خدائی قوت (نظام۔ قانون) سے انکار کر دے۔ لَا اِلٰهَ۔ اِلَّا اللّٰهُ کے یہی معنی ہیں۔ اسی کو دوسری جگہ اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (۱۶/۳۶) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیز (۴/۷۶) میں ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ۔ یہاں سبیل اللہ اور سبیل الطاغوت نے بتا دیا کہ طاغوت کے معنی ہر غیر خدائی اقتدار و نظام ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کو جو سبیل الطاغوت (غیر خدائی نظام کی خاطر) جنگ کرتے ہیں، اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ (۴/۷۶) کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ طَاغُوْتٌ اور شَیْطَانٌ مرادف المعنیٰ ہیں۔ اس کی تشریح میں، یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ (۴/۶۰) "یعنی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں" کہہ کر یہ بھی واضح کر دیا کہ طاغوت یا شیطان محض ذہنی تصورات نہیں بلکہ طاغوت کے معنی ہیں تمام

*تاج و محیط و لسان۔ **راغب۔

وہ حاکم ، وہ عدالتیں ، وہ حکومتیں ، وہ نظام ، جو خدا کے قانون (قرآن) کے علاوہ دوسرے قوانین کی رو سے معاملات کے فیصلے کریں ۔ ان کی طرف رجوع کرنا خدا سے انکار اور طاغوت کی عبادت ہے ۔ جو لوگ اس قسم کے نظام کی تقویت کے لئے کوشش کرتے ہیں وہ اَوْلِیَاءُ الشَّیْطٰنِ (یعنی غیر خدائی اقتدار کے رفقائے کار) ہیں ۔

سورۃ حاقہ میں ہے لَمَّا طَغَی الْمَاءُ (۶۹/۱۱) جب سیلاب آگیا ۔ (۶۹/۵) میں اَلطَّاغِیَۃُ بجلی کی شدید کڑک کے لئے آیا ہے جس سے قوم ثمود کی ہلاکت ہوئی تھی۔ لیکن یہ عذاب خود ان کی سرکشی کی وجہ سے تھا۔ چنانچہ سورۃ شمس میں ان کے متعلق ہے ۔ کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَا (۹۱/۱۱) ۔ ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر حق کی تکذیب کی ۔ سورۃ النجم میں رسول اللہ ؐ کے متعلق ہے ۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (۵۳/۱۷) ۔ اس کی آنکھ نہ تو صحیح مقام سے ادھر ادھر ہٹی اور نہ ہی اپنی حد سے بڑھی ۔ یعنی نبی بذریعہ وحی، حقیقت کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کرتا ہے لیکن اسی حد تک جس حد تک خدا اسے لے جاتا ہے ۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا ۔ دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں نبی کا علم (وحی) بہت وسیع ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ وحی کا سرچشمہ سرحدِ ادراک سے ماوراء ہوتا ہے ۔ لیکن علم خداوندی کے مقابلہ میں وہ محدود ہوتا ہے ۔ خدا نبی کو بھی اتنا ہی علم دیتا ہے جتنا علم دیا جانا مقصود ہو ۔ نبی اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا ۔

ط ف أ

طَفِئَتِ النَّارُ ۔ وَانْطَفَأَتْ ۔ آگ کا شعلہ بیٹھ گیا اور وہ سرد ہو گئی ۔ اَطْفَأَ النَّارَ ۔ اس نے آگ کو بجھا دیا ۔ اَطْفَأَ نَارَ الْحَرْبِ ۔ اس نے جنگ کی آگ کو بجھا دیا* ۔ قرآن کریم میں ہے كُلَّمَا اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (۵/۶۴) ۔ '' جب بھی وہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں خدا اسے بجھا دیتا ہے '' ۔ استعارةً اَطْفَأَ الْفِتْنَةَ فتنہ فرو کرنے کو کہتے ہیں ** ۔ علمائے لغت نے کہا ہے کہ جب آگ کے شعلے اٹھنا بند ہوجائیں مگر اس کے انگارے روشن ہوں تو اس آگ کو خَامِدَۃٌ کہتے ہیں ۔ لیکن جب آگ کے شعلے ساکن ہو جائیں اور اس کے انگارے بھی ٹھنڈے پڑ جائیں تو اسے هَامِدَۃٌ اور طَافِئَۃٌ کہتے ہیں * ۔

* تاج ۔ ** محیط ۔

راغب نے کہا ہے کہ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ (۹/۳۲) کے معنے یہ ہیں کہ وہ خدا کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں - اور یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ (۶۱/۸) کے معنے یہ ہیں کہ وہ کوئی ایسی تدبیر کرنا چاہتے ہیں جس کے ذریعہ وہ خدا کے نور کو بجھا سکیں * - لیکن اللہ اپنے نور کو پورا (مکمل) کر کے رہے گا اور یہ اس طرح ہوگا کہ اس کا بھیجا ہوا نظام، باقی تمام نظامہائے عالم پر غالب آجائے۔ لِیُظْہِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ (۹/۳۳ ; ۶۱/۹) -

ط ف ف

اَلطَّفِیْفُ - تھوڑی چیز - نامکمل و ناقص چیز - اَلطُّفَافَۃُ - برتن کے بھرنے میں جسقدر کمی رہ جائے - طَفَّ النَّاقَۃَ یَطُفُّہَا - اس نے اونٹنی کے پاؤں باندھ دئے - اَطَفَّتِ النَّاقَۃُ - اونٹنی نے نا تمام بچہ دیا - طَفَّفَ الْمِکْیَالَ - اس نے پیمانہ کو پورا نہیں بھرا - اس میں کمی کی **-

قرآن کریم میں ہے - وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ (۸۳/۱) "مطففین" کے لئے تباہی ہے - اور اس سے اگلی دو آیتوں میں خود ہی اسکی تشریح کر دی کہ مطففین وہ ہیں کہ جب وہ لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا ناپ کر لیتے ہیں، اور جب دیتے ہیں تو ناپ اور وزن میں کمی کر دیتے ہیں (۸۳/۲-۳) - قرآن کریم نے اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی بتایا ہے (وَیْلٌ) - یہ اس معاشرہ کا ذکر ہے جس میں نظام زندگی کا یہ انداز ہو کہ سرمایہ دار اور صاحب اقتدار طبقہ دوسروں کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دیں بلکہ ان کی محنت کی کمائی سے اپنے عیش و عشرت کا سامان بہم پہنچائیں - نظام سرمایہ داری میں کسی کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دیا ہی نہیں جاتا۔ اگر پورا معاوضہ دیدیا جائے تو سرمایہ دار کو کیا ملے؟ وہ کام کرنے والوں کو کم از کم دیتا ہے اور خود زیادہ سے زیادہ رکھتا ہے - اسی سے سرمایہ داری قائم رہتی ہے۔ قرآن کریم اسے تَطْفِیْف کہتا ہے اور اس نظام کا انجام تباہی اور بربادی بتاتا ہے - پھر اس لفظ کے معنی (اونٹنی کے پاؤں باندھنے) میں اسطرف بھی اشارہ ہے کہ اس سے کام کرنے والوں کی صلاحیتیں زنجیروں میں جکڑی رہتی ہیں اور کبھی بھی اپنی حقیقی جولا نگاہ کی انتہائی وسعت تک نہیں پہنچنے پاتیں - وہ سمٹی، سکڑی، بندھی اور ناتمام رہ جاتی ہیں - لہذا تَطْفِیْف کے معنی صرف معاشی ناہمواریاں ہی نہیں بلکہ اس میں انسان کے احترام اور عزت میں کمی کرنا بھی داخل ہے - جس انداز اور طریق سے بھی شرف

* راغب - ** تاج و راغب -

انسانیت میں کمی واقع ہو جائے وہ تَطْفِیْفٌ ہے۔ جس معاشرہ میں تکریم آدمیت اور احترام انسانیت میں کمی ہو (یعنی انسان کا پورا پورا احترام بہ حیثیت انسان نہ کیا جائے) وہ مطففین کا معاشرہ ہے جس کا انجام تباہی ہے۔

ط ف ق

طَفِقَ یَفْعَلُ کَذَا۔ وہ ایسا کرنے لگا۔ یہ اسوقت بولتے ہیں جب کوئی کسی کام کو کرنا شروع کر دے اور پھر اس میں مسلسل لگا رہے۔ طَفِقَ الْمَوْضِعَ۔ وہ اس جگہ جم کر رہا اور وہاں سے نہ ہٹا*۔

قرآن کریم میں ہے وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ ..... (۲۲/۷)۔ وہ لگے ایسا کرنے۔

ط ف ل

اَلطَّفْلُ۔ ہر نرم اور نازک چیز۔ طَفُلَ۔ طَفَالَۃٌ۔ طُفُوْلَۃٌ۔ نرم و نازک ہونا۔ اَلطِّفْلُ۔ ہر چھوٹی چیز۔ بچہ۔ جمع اَطْفَالٌ (۲۴/۵۹)۔ (طِفْلٌ خود بھی جمع کیلئے آتا ہے) راغب نے کہا ہے کہ بچہ کو طِفْلٌ اس وقت تک کہتے ہیں جب تک کہ وہ نرم و نازک ہو**۔ قرآن کریم میں ہے۔ ثُمَّ نُخْرِجُکُمْ طِفْلًا (۲۲/۵)۔ پھر تمہیں ایک بچے کی حیثیت سے پیدا کرتے ہیں۔

ط ل ب

اَلطَّلَبُ۔ کسی چیز کے حصول کی خواہش، اسطرح کہ اس کے حاصل کرنے میں کوشش کرنی پڑے***۔ یا کسی چیز کے پانے کی تلاش اور جستجو****۔ کسی چیز کا متلاشی ہونا اور اسے پا لینا۔ طَلَبَ اِلَیْہِ۔ اس نے اس سے مانگا۔ کَلَاٌ مُطْلِبٌ۔ اس گھاس کو کہتے ہیں جو پانی سے بہت دور ہو اور اس تک پہنچنے کے لئے تکالیف اٹھانی پڑے۔ اُمُّ طِلْبَۃٍ۔ عقاب کو کہتے ہیں۔ اس میں تلاش اور دوری دونوں آجاتے ہیں*۔

سورۃ کہف میں ہے۔ فَلَنْ تَسْتَطِیْعَ لَہٗ طَلَبًا (۱۸/۴۱)۔ یہاں طلب کے معنی تلاش کے بعد حاصل کرنے کے ہیں۔ سورہ حج میں اَلطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (۲۲/۷۳) آیا ہے۔ طلب کرنے والا اور جسے طلب کیا جائے۔

---

*تاج و محیط۔ **تاج و راغب۔ نیز ابن فارس۔ ***محیط۔ ****راغب۔

ط ل ح

اَلطَّلْحُ - ابن شمیل نے کہا ہے کہ یہ ایک لمبا درخت ہوتا ہے جس کے سائے میں لوگ بیٹھتے ہیں - اس پر پتے تھوڑے اور کانٹے زیادہ ہوتے ہیں۔ ببول کے درخت جو اونٹوں کے چارے کا کام دیتے ہیں۔ لیکن ابو اسحق نے کہا ہے کہ اس سے مراد کیلے کا درخت ہے - نیز طَلْحٌ بمعنی طَلْعٌ بھی آتا ہے (دیکھئے ط - ل - ع) - رَجُلٌ طَالِحٌ - خراب آدمی کو کہتے ہیں جس میں کوئی بھلائی نہ ہو - یہ صَالِحٌ کی ضد ہے - اور بَعِيْرٌ طِلْحٌ - تھکے ماندہ لاغر اونٹ کو کہتے ہیں - لیکن دوسرے معانی کے لحاظ سے اَلطَّلْحُ - نعمت کو کہتے ہیں* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) ایک قسم کا درخت اور (۲) کمزوری اور لاغری کے ہیں -

قرآن کریم میں جنت کے ذکر میں ہے طَلْحٍ مَنْضُوْدٍ (۵۶/۲۹) - تہ بہ تہ کیلے یا ترتیب سے جمائے ہوئے کیلوں کے درخت۔

ط ل ع

طَلَعَ طُلُوْعًا - نکلنا - ظاہر ہونا (سورج وغیرہ کا) * - (۲۰/۱۳۰)۔ مَطْلَعٌ اور مَطْلِعٌ - طلوع ہونے کی جگہ - (۱۸/۹۰) - یا طلوع ہونے کا وقت - یہ مصدر بھی ہے - یعنی اس کے معنے طلوع ہونا ، اور ظاہر ہونا بھی ہیں- سورۃ قدر میں اس کے معنی طلوع کے وقت کے ہیں (۹۷/۵)۔ طَلَعَ الْجَبَلَ - وہ پہاڑ پر چڑھ گیا - اِطَّلَعَ عَلَى الْاَمْرِ کے معنی ہیں وہ کسی معاملہ سے واقف و باخبر ہوا۔ چنانچہ اصمعی نے کہا ہے کہ کبھی مُطَّلَعٌ اُس سیڑھی کو کہتے ہیں جس پر نیچے سے اوپر کی طرف چڑھا جائے*** - اِطَّلَعَ عَلَيْهِ کے معنے ہیں وہ اس کے اوپر پہنچا اور وہاں سے نیچے کی طرف جھانک کر دیکھا، اور مُطَّلِعٌ اس طرح جھانکنے والے کو بھی کہتے ہیں - (۳۷/۵۴-۵۵) -

فراء نے کہا ہے کہ اِطِّلَاعٌ اور بُلُوْغٌ کے ایک ہی معنی ہیں - یعنی کسی تک پہنچنا - (۲۸/۳۸) - تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ (۱۰۴/۷) جو دلوں تک پہنچ جاتی ہے - اِطَّلَعَ عَلٰى بَاطِنِهٖ - اس کی اندرونی حالت سے واقف ہو گیا * - اَلتَّطَلُّوعُ - بلندی اور سرفرازی کے ساتھ نمودار ہونا * - نَخْلَةٌ مُطْلِعَةٌ - وہ کھجور کا درخت جو اپنے ارد گرد کے کھجوروں کے درختوں سے اونچا ہو-** - اَلطَّالِعُ - وہ تیر جو نشانہ سے ہٹ کر اس کے اوپر کی جانب جا کر لگے* - اَطْلَعَهٗ عَلَى الْاَمْرِ - اسے معاملہ سے باخبر کیا (۳/۱۷۸)۔

---

* تاج و محیط۔ ** محیط۔ ***تاج

اَلطَّلْعُ ۔ کھجور کے درخت پر غلاف جیسی ایک چیز نکلتی ہے جس کے اندر اس کا خوشہ ہوتا ہے ۔ اس کا ایک سرا نوکیلا ہوتا ہے * ۔ (۲۶/۱۴۸ - ۳۷/۶۵ - ۵۰/۱۰) ۔

ط ل ق

طَلَقَ ۔ آزاد ہو گیا ۔ طَلَقَتِ الْمَرْأَۃُ مِنْ زَوْجِہَا ۔ عورت اپنے شوہر سے جدا ہو گئی ۔ اَطْلَقَ الْاَسِیْرَ ۔ قیدی کو رہا کر دیا ۔ نَاقَۃٌ طَالِقٌ ۔ بلا نکیل کے اونٹنی ۔ اَلطَّالِقَۃُ ۔ وہ اونٹنی جسے آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ جہاں سے جی چاہے کھائے پئے ۔ اَلطَّلْقُ ۔ ہرن (جو آزاد ہوتا ہے) ۔ نیز وہ اونٹنی جو مقید نہ ہو ۔ لِسَانٌ طَلْقٌ ۔ وَطُلَقٌ ۔ تیز چلنے والی زبان ۔ مُطْلَقٌ ۔ مُقَیَّدٌ کی ضد ہے * ۔ یعنی جو محدود و مقید نہ ہو ۔

سورۃ کہف میں ہے فَانْطَلَقَا (۱۸/۷۱) ۔ وہ دونوں روانہ ہو گئے ۔ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ (۳۸/۶) بڑے بڑے سردار (تیزی سے) کہنے لگے ۔ حضرت موسیٰ ؑ نے اللہ سے کہا تھا کہ لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ (۲۶/۱۳) ۔ میری زبان آزادی یا روانی سے نہیں چلیگی ۔ (اس لئے کہ انہیں جنگلوں اور صحراؤں میں رہتے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا یا کم از کم متمدن دنیا سے دور رہتے ہوئے ۔ اسلئے انہیں خیال تھا کہ وہ فرعون کے دربار میں شاید اس روانی اور طلاقت سے گفتگو نہ کر سکیں جس کی وہاں ضرورت تھی) ۔

راغب نے طلاقٌ کے بنیادی معنی کسی بندھن سے آزاد کرنا اور نجات دینا بتائے ہیں ۔ پھر یہ استعارۃً شوہر کا بیوی کو نکاح کے بندھن سے آزاد کرنے کے لئے بولا جاتا ہے (۲/۲۳۰) ۔ طَلَّقَ کے معنی ہیں طلاق دیدینا ۔ (۲/۲۳۶) ۔ مُطَلَّقَۃٌ ۔ طلاق دی ہوئی عورت ، اسکی جمع مُطَلَّقَاتٌ ہے (۲/۲۴۱) ۔

قرآن کریم کی رو سے نکاح ایسے معاہدہ کا نام ہے جو بالغ مرد اور عورت کی باہمی رضامندی سے طے پاتا ہے (دیکھئے عنوان ن ۔ ک ۔ ح) اس لئے اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ان کی ازدواجی زندگی ناممکن ہوجائے تو یہ معاہدہ ٹوٹ بھی سکتا ہے ۔ قرآن کریم نے اس کے متعلق تفصیلی احکام دئے ہیں کہ اس معاہدہ کے فسخ ہونے کی کیا کیا صورتیں ہیں اور اس کے لئے طریق کار کیا ہے ۔ لیکن یہ جو ہمارے ہاں رواج ہے کہ مرد نے جب جی چاہا طلاق ۔ طلاق ۔ طلاق ۔ کہدیا اور نکاح ٹوٹ گیا ۔ اور اس کے

* تاج و محیط ۔

بعد اس جوڑے کا باھمی ملاپ نہیں ھو سکتا جب تک یہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح (حَلالہ) کرکے ایک شب اس سے ھم آغوشی نہ کر لے۔ تو یہ قرآن کریم کے خلاف ھے۔

اَلطَّلاَقُ مَرَّتٰنِ۔ کے قرآنی مفہوم کے لئے عنوان م۔ ر۔ ر، دیکھئے۔ یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ھوگا کہ طلاق کا لفظ اسوقت بولا جائے گا جب میاں بیوی عقد نکاح سے آزاد ھو جائیں۔ طلاق کے ارادے یا اس کے ابتدائی مراحل کو طلاق نہیں کہا جائیگا۔

اس مقام پر یہ سمجھ لینا بھی ضروری ھے کہ لفظ طَلاَقٌ ایک تو طَلَقَ سے مصدر ھے جس کے معنی ھیں آزاد ھو جانا۔ اور دوسرے یہ لفظ طَلَّقَ سے اسم ھے۔ اس اعتبار سے اس کے معنی آزاد کرانا ھونگے۔ قرآن کریم سے معلوم ھوتا ھے کہ عقد نکاح کا فسخ کرنا میاں بیوی کا نجی معاملہ نہیں ھے۔ س کے لئے عدالت کی طرف رجوع کرنا ھوتا ھے۔ اور طلاق کا فیصلہ عدالت کی طرف سے ھوتا ھے۔ اس طرح لفظ طَلاَقٌ کے معنی آزاد کرانا بالکل صحیح بیٹھتے ھیں۔

ط ل ل

اَلطَّلُّ۔ بہت ھلکی سی بارش۔ پھوھار۔ بلکہ اوس جو کھلی فضا میں پڑتی ھے *۔ (۲/۲۶۵)۔ اَلطَّلاَلَۃُ۔ سرور۔ خوشی۔ حسن و جمال۔ ترو تازگی۔ زندگی کی خوشگواری *۔

ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) ترو تازگی اور نرمی و نزاکت۔ (۲) جھانکنا اور (۳) کسی چیز کو باطل کر دینا ھیں۔ اور اَلطَّلُّ ھلکی سی بارش کو کہتے ھیں کیونکہ اس سے زمین کو زینت اور تازگی حاصل ھوتی ھے۔

ط م ث

اَلطَّمْثُ۔ چھونا۔ ھٰذا جَمَلٌ مَاطَمَثَہٗ حَبْلٌ قَطُّ۔ یہ اونٹ ھے جسے رسی نے قطعاً نہیں چھوا۔ طَمَثَ الْمَرْاَۃَ۔ اس نے اس عورت کی بکارت زائل کر دی۔ بعض نے اس کے معنی عام جماع کرنے کے لئے ھیں۔ (عورت کو چھونے سے کنایہ بھی ھوتا ھے)۔ اَلطَّمْثُ تہمت، گندگی، اور فساد کو بھی کہتے ھیں **۔

---
*تاج۔ ** تاج و محیط و راغب۔

جنتی معاشرہ کی عورتوں کی عفت و عصمت کے ضمن میں کہا ہے کہ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ (۵۵/۵۶)۔ اس سے قبل کسی انسان نے (جن و انس میں سے کسی نے) انہیں چھوا نہیں ہوگا۔ کیسا فردوس آفریں ہے یہ اطمینان کہ جس لڑکی سے میں شادی کر رہا ہوں اسے اس سے پہلے کسی نے نہیں چھوا۔

ط م س

طَمَسَ ۔ مٹ گیا ۔ اس کا نام و نشان باقی نہ رہا ۔ طَمَسْتُهُ طَمْسًا ۔ میں نے اسے مٹا دیا ۔ اس کا نام و نشان تک ختم کر دیا (لازم و متعدی) *۔ سورہ نساء میں ہے قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا (۴/۴۷)۔ قبل اس کے کہ ہم ان کے بڑے بڑے لوگوں کا نام و نشان تک مٹا دیں ۔ انہیں تباہ و برباد کر دیں **۔ سورہ یونس میں ہے ۔ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ (۱۰/۸۸)۔ ان کے مال و دولت کو تباہ و برباد کر دے۔

طَمِيْسٌ ۔ مَطْمُوْسٌ ۔ اندھا ، جسے کچھ نظر نہ آئے *۔ سورہ قمر میں قوم لوط سے متعلق ہے ۔ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ (۵۴/۳۷)۔ سدوم کے آتش فشاں پہاڑوں سے آگ اور گندھک کے دھوئیں کا ایسا طوفان اٹھا کہ اس سے ان کی آنکھیں بیکار ہو گئیں۔ ہو سکتا ہے کہ شدت جذبات سے اندھا ہو جانے کیطرف بھی اشارہ ہو۔ اس لئے کہ بصیرت کے ختم ہو جانے کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے ۔ (دیکھئے ۳۶/۶۶) ۔ سورہ مُرْسَلٰت میں ہے فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ (۷۷/۸) ۔ جب ستاروں کی روشنی جاتی رہیگی ۔

ط م ع

طَمَعٌ ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنے ہوتے ہیں نفس انسانی کا کسی چیز کی طرف خواہش کے ساتھ میلان اور جھکاؤ **۔ اس میں حرص اور امید دونوں پہلو ہوتے ہیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنے دل میں کسی چیز کی پرزور امید کے ہیں۔ اَلْمَطْمَعُ ۔ وہ چیز جسکی طمع کی جائے۔ جس چیز کی طرف نگاہ کھنچکر چلی جائے * ۔ چنانچہ اس پرندے کو بھی اَلْمَطْمَعُ کہتے ہیں جسے جال کے اوپر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ اسے دیکھ کر دوسرے پرندے جال میں پھنس جائیں *** ۔

*تاج ۔ **راغب ۔ *** لین

قرآن کریم میں یہ لفظ خَوْف* کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۲/۱۳) - خَوْف* - نقصان کے احساس کو کہتے ہیں، اس لئے طَمَع* نفع کی امید ہے - آرزو رکھنے (خواہش کرنے) کے معنوں میں سورۃ معارج میں ہے۔ اَیَطْمَعُ کُلُّ امْرِیءٍ مِّنْهُمْ (۷۰/۳۸) - کیا ان میں سے ہر شخص اسکی آرزو رکھتا ہے؟ اور توقع رکھنے کے معنوں میں - ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ (۷۴/۱۵) - پھر وہ اس کی توقع بھی رکھتا ہے کہ میں اسے زیادہ کرتا جاؤں!

ط م م

طَمَّ الْمَآءُ یَطُمُّ - طَمًّا - پانی نے کسی چیز کو ڈھانپ لیا اور اس کے اوپر چھا گیا - طَمَّ السَّیْلُ الرَّکِیَّةَ - سیلاب نے کنوئیں کو پاٹ دیا اور برابر کر دیا * - طَمَّ الْبِئْرَ - کنوئیں کو مٹی سے بھر کر برابر کر دیا (ابن فارس) - طَمَّ الطَّائِرُ الشَّجَرَ - پرندہ درخت کے بالائی حصہ پر جا بیٹھا - اَلطَّمُّ - سمندر - بکثرت پانی - اَلطَّامَّةُ ایسی چیخ کی آواز جو ہر شے پر چھا جائے * -

قرآن کریم میں انقلاب عظیم کے لئے اَلطَّامَّةُ الْکُبْرٰی (۷۹/۳۴) آیا ہے - یعنی وہ بہت بڑی مصیبت کی گھڑی جو سیلاب کی طرح چھا جائے گی اور سب پر غالب آ جائے گی - مندرجہ بالا معانی کی رو سے اس حادثہ کو بھی طَامَّةٌ کہا جا سکتا ہے جو اونچ نیچ برابر کر دے -

ط م ن (طمأن)

اَلطُّمَنُ - ساکن - فِیْهِ تَطَامُنٌ - اس میں سکون اور وقار ہے ** - سورۃ بقرہ میں ہے کہ حضرت ابراهیم* نے اللہ سے کہا کہ مجھے بتا کہ تو مُردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے - اللہ نے کہا کیا تیرا اس پر ایمان نہیں؟ انہوں نے جواب دیا - "بَلٰی" - ایمان تو ہے - وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ (۲/۲۶۰) - ولے میں اپنا اطمینانِ قلب چاہتا ہوں - اس سے (اِطْمِئْنَانٌ) کا صحیح مفہوم واضح ہو جاتا ہے - یعنی تسکینِ قلب کی وہ کیفیت جو علی وجہ البصیرت حاصل ہو - جو علم و فکر، دلائل و برهان، بلکہ مشاهدہ اور تجربہ کا نتیجہ ہو - یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اطمینانِ قلب کو اِکْرَاہٌ* کی ضد قرار دیا ہے (۱۶/۱۰۶) - اِکْرَاہٌ* کے معنے ہیں کسی بات کو زبردستی منوانا - (*دیکھئے عنوان ک - ر - ہ*) *لہٰذا اطمینانِ* قلب کے معنی ہوئے کسی بات کو دل کی پوری رضامندی سے ماننا - اسی سورۃ (النحل) میں ذرا

* تاج - - راغب - محیط ** تاج

آگے چل کر آمْنٌ* اور اِطْمِیْنَانٌ* ۔ کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے ۔ (۱۶/۱۱۲) ، اگرچہ اطمینان کے لئے آمْنٌ* (بے خوفی) کو ضروری شرط قرار دیا گیا ہے(۲/۲۳۹) ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ملک میں امن ہو تو قلوب کو بھی اطمینان ہو۔ امن خارجی خطرات سے محفوظ ہونے کا نام ہوگا ۔ لیکن (اِطْمِیْنَانٌ*) اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان اپنی داخلی کشمکش سے محفوظ ہو، اور یہ چیز فریبِ نفس سے حاصل نہ ہوئی ہو بلکہ علم وحقیقت کی بنا پر ہو۔ انسانی ذات (نفس) کی یہی وہ کیفیت ہے جسے ''جنت کی زندگی،، سے تعبیر کیا گیا ہے (۸۹/۲۷) ۔ لیکن اس حقیقت کو ساتھ ہی واضح کردیا گیا ہے کہ یہ چیز خلوت گاھوں اور خانقاھوں میں حاصل نہیں ہوسکتی ۔ یہ معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے حاصل ہو گی ۔ اسی لئے ارشاد ہے کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ ۔ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (۸۹/۲۹-۳۰) ۔ جنت میں داخلہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسان ''خدا کے بندوں،، کے ساتھ شامل ہو ۔ اور پھر یہ سب ملکر قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں ۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۱۳/۲۸) ۔ ''اسے اچھی طرح سمجھ رکھو کہ صحیح اطمینانِ قلب قوانین خداوندی ہی سے نصیب ہوسکتا ہے،، ۔ (دیکھئے عنوان ذ ۔ ک ۔ ر) جہاں سے یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ اللہ کے ذکر سے مراد، تسبیح پر اللہ ۔ اللہ پکارنا یا دل پر ضربیں لگانا، نہیں ۔ اس سے مفہوم خدا کے قانون (قرآن) کو ہر وقت سامنے رکھنا ہے ۔ اس کا پہلا نتیجہ رزق کی فراوانی ہوتا ہے ۔ (۱۶/۱۱۲) ۔ اگر مقصودِ حیات ہر فرد کا اپنا اپنا اطمینانِ قلب ہو تو دنیا سے خیر و شر کی تمیز ہی اٹھ جائے ۔ ایک ڈاکو یا ٹھگ جب کسی کی جان لیکر کالی دیوی کے استھان پر مقررہ نذر چڑھا دیتا ہے، یا برھمن بت کی پوجا کر لیتا ہے تو اسے ایسا اطمینان نصیب ہوجاتا ہے جو ایک خداپرست کے اطمینان سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوتا ۔ لہذا مقصد زیست اپنا اطمینان نہیں (جو بسا اوقات فریب نفس ہوتا ہے) ۔ مقصد ایک ایسے معاشرہ کا قیام ہے جس میں ہر معاملہ عدل و احسان کی رو سے طے ہو اور اس طرح ہر فرد کو صحیح اطمینان میسر آ جائے ۔

مُطْمَئِنِّیْنَ (۱۷/۹۵) اطمینان سے سکونت پذیر ہونے والے۔ اقامت پذیر ہونے والے ۔

ط ھ ر

اَلطَّهَارَةُ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز سے نجاست کا دور ہوجانا*۔ ابن فارس نے اس کے معنی ستھرا پن اور میل کچیل کا زائل ہو جانا بتائے

*تاج ۔

ھیں۔ صاحب تاج نے کہا ہے کہ طَہَرَہٗ۔ طَحَرَہٗ کے معنی میں بھی آتا ہے، اور طَحَرَہٗ کے معنی ھیں اَبْعَدَہٗ۔ یعنی اسے دور کر دیا۔

قرآن کریم میں حضرت عیسٰیؑ کے متعلق ہے وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۳/۵۴)۔ جس کے معنی ھیں خدا تجھے ان لوگوں سے الگ ہٹا کر دور لے جائیگا جو تیری صداقت کا انکار کرتے ھیں۔ یا تیرے خلاف جو اتہام تراشتے ھیں ان سے خدا تجھے بری کر دیگا۔ اسی نہج سے تَطْهِيْرٌ کے معنی کسی شے سے نجاست اور آلائش وغیرہ کو دور کرکے اسے پاک اور صاف کرنا ھیں۔ طَاهِرٌ کے معنی ھیں پاک اور صاف۔ مُطَهَّرَةٌ میں طَاهِرَةٌ سے زیادہ شدت پائی جاتی ہے۔ یعنی بہت زیادہ پاکیزہ۔ طَهُوْرٌ اس چیز کو کہتے ھیں جس سے پاکیزگی حاصل کی جائے۔ یا اس کے معنی ھیں وہ چیز جو خود پاک ھو اور دوسری چیزوں کو پاک کر دے۔ (کیونکہ فَعُوْلٌ کے وزن میں فَاعِلٌ کے مقابلہ میں زیادہ مبالغہ اور شدت ہوتی ہے)*۔ چنانچہ قرآن کریم میں بارش کے پانی کو مَآءً طَهُوْرًا (۲۵/۴۸) کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ خود بھی کشید کردہ (لہذا صاف) ہوتا ہے اور ہر شے کو پاک اور صاف کر دیتا ہے۔ طُہْرٌ۔ وہ حالت یا زمانہ جس میں عورت حیض سے پاک ھو۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ عورت جب حیض سے فارغ ھو جائے تو طَهُرَتْ کہا جاتا ہے اور جب اس کے بعد غسل کرلے تو تَطَهَّرَتْ کہا جاتا ہے*۔ چنانچہ قرآن کریم میں جو ہے وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ ...... (۲/۲۲۲) تو اس میں یہی لطیف فرق ہے۔

قرآن کریم میں طَہَارَتٌ کا لفظ صرف جسمانی پاکیزگی کے لئے ھی نہیں استعمال ھوا بلکہ اس میں قلبی اور ذھنی پاکیزگی بھی شامل ہے۔ چنانچہ سورہ المائدہ میں ہے لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ (۵/۴۱)۔ یہ پاکیزگی قلب کی شہادت ہے۔ سورۂ واقعہ میں قرآن کریم کے متعلق ہے کہ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶/۷۹)۔ تو اس سے مراد یہی ہے کہ قرآن کریم کی صداقتوں سے وھی لوگ مس رکھتے ھیں، وھی ان تک پہنچ سکتے ھیں، وھی ان سے باخبر ھو سکتے ھیں*، جن کا ظاھر و باطن پاکیزہ ھو۔ جو قلب و نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ اس کی طرف آئیں۔ جو متوازن دل و دماغ کے مالک ھوں۔ جو اپنے ذھن کو تمام تعصبات سے خالی کرکے اور اپنے دلوں کو تمام ذاتی رحجانات و میلانات سے منزہ رکھ کر اسے سمجھنا

* تاج۔

چاھیں ۔ اگر ذھن پہلے ھی سے غیر قرآنی تصورات کی آماجگاہ ہے اور دل ذاتی مفاد پرستیوں سے آلودہ ، تو پھر قرآن کریم کے حقائق سمجھ میں نہیں آسکتے ۔ (دیکھئے عنوان م ۔ س ۔ س) ۔ جو لوگ زندگی کی آلودگیوں اور تباہ کاریوں سے بچنے کا احساس رکھتے ہوں انہیں مُتَّقِیْنَ کہا جاتا ہے ۔ اور قرآن کریم مُتَّقِیْنَ ھی کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے ۔ (هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۲/۲) اس کی بنیادی شرط ہے ۔

رَجُلٌ طَاهِرُ الثِّيَابِ ۔ اس شخص کو کہتے ھیں جو نہایت پاکیزہ نفس ہو* ۔ کیونکہ عرب عام طور پر ثِیَابٌ کا لفظ انسانی ذات یا شخصیت کے لئے بولتے ھیں * ۔ اس لئے وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ (۴/۷۴) کے معنی ہونگے ، اپنی ذات کو تمام پست خیالات سے بلند کرکے پاکیزگی قلب و نگاہ کا پیکر بناؤ ۔ اور اگر ثِیَابٌ کے معنی دعوت کے لئے جائیں تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ اپنی اس انقلابی دعوت کو تمام ایسے لوگوں سے دور رکھو جن کے قلب و دماغ پاکیزہ نہیں ۔ اس جماعت میں وھی لوگ شامل ہو سکتے ھیں جو اپنے دل اور دماغ کو تمام غیر خدائی تصورات سے پاک اور صاف رکھیں ۔ نیز اس دعوت میں نظری طور پر بھی کوئی غلط تصور شامل نہ ہونے پائے ۔ (ثِیَابٌ کے معانی کے لئے ث ۔ و ۔ ب کا عنوان دیکھئے) ۔

سورۂ احزاب میں رسول اللہ ؐ کے اہل خانہ کے متعلق ہے وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا (۳۳/۳۳) ۔ خدا تمہیں ہر قسم کے الزامات سے دور رکھے گا اور قلب و نظر کی پاکیزگی عطا کریگا ۔

جنتی معاشرہ کے پاکیزہ سیرت اور تربیت یافتہ ہم نشینوں کو اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (۲/۲۵) کہا گیا ہے ۔ اس میں بیویاں بھی شامل ھیں اور دوسرے رفقائے کار بھی ۔ (دیکھئے عنوان ز ۔ و ۔ ج) ۔

ط و د

اَلطَّوْدُ ۔ بلند پہاڑ ۔ ریت کا اونچا ٹیلہ ۔ اَلطَّادُ ۔ بوجھل اور جمی ہوئی چیز جو اپنی جگہ پر محکم ہو ۔ طَادَ الشَّيْءُ ۔ وہ چیز ایک جگہ پر جم گئی ۔ بِنَاءٌ مُّنْطَادٌ ۔ بلند عمارت ** ۔

قرآن کریم میں کَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ (۲۶/۶۳) آیا ہے ۔ یعنی بڑے تودہ (یا ٹیلہ) کی طرح ۔

* محیط ۔ ** تاج و راغب ۔

ط و ر

اَلطُّوْرُ - سر سبز پہاڑ - اگر پہاڑ سر سبز نہ ہو تو اسے طُوْرٌ نہیں کہتے * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے لمبا ہونے اور بڑھنے کے ہیں خواہ وہ زمان سے متعلق ہو یا مکان سے - اور پہاڑ کو طُوْرٌ اس کے طول، عرض اور بلندی میں پھیلنے اور بڑھنے کی وجہ سے کہتے ہیں - اَلطُّوْرُ - اَیْلَہْ کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے جو سَیْنَاء یا سِیْنِیْنَ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے * - (۲۳/۲۰ ; ۹۵/۲)- دعوتِ حضرت موسیٰؑ کی ابتدا وہیں سے ہوئی تھی - اسی (طُوْرٌ) کے دامن میں بنی اسرائیل سے اس دعوت پر ایمان کا عہد لیا گیا تھا (۲/۶۳)- اَلطَّوْرُ- بار - دفعہ - مرتبہ - طَوْرًا بَعْدَ طَوْرٍ - ایک بار کے بعد دوسری بار - دوسری مرتبہ - یا دوسری دفعہ - نیز جو کسی چیز کے بالمقابل یا اس کے برابر ہو - طَوْرٌ بھی اس معنی میں آتا ہے - اَطْوَارٌ- مختلف حدود یا اقسام - مختلف مدارج و احوال یا اندازے*- قرآن کریم میں ہے قَدْ خَلَقَکُمْ اَطْوَارًا (۷۱/۱۴) - خدا نے تمہیں مختلف ارتقائی منازل میں سے گذار کر انسانی منزل تک پہنچایا ہے - تمہاری تخلیق مختلف احوال ومدارج سے گذر کر ہوئی ہے - یا تمہیں مختلف احوال میں پیدا کیا ہے - طَارَ بِہٖ (یَطُوْرُ) کے معنی قریب ہونا ہیں **-

ط و ع

طَاعَ کے معنی ہوتے ہیں کسی شے کا وسیع ہو جانا - طَاعَ لَہٗ الْمَرْتَعُ - چراگاہ اس کے لئے وسیع ہو گئی اور وہ جہاں سے اس کا جی چاہا چر سکا* - اس سے " اطاعت " کا بنیادی مفہوم سامنے آ جاتا ہے - یعنی دل کی کشاد سے کسی کام کا کرنا - چنانچہ قرآن کریم میں طَوْعًا کے مقابلہ میں کَرْھًا (۳/۸۲) نے اس حقیقت کو واضح کردیا - کَرْھًا کے معنی ہیں کسی کام کو ناگواری اور دل کے جبر سے کرنا - لہذا طَوْعًا کے معنی ہوئے کسی کام کو بطیبِ خاطر، دل کی کشاد اور پسندیدگی سے کرنا - اسی لئے اَطَاعَ النَّخْلُ کے معنی ہوتے ہیں کھجوریں پک گئیں*- (اب انہیں زور لگا کر توڑنا نہیں پڑیگا - وہ ٹوٹنے کے لئے خود ہی آمادہ ہیں) - اَطَاعَ - کسی کے حکم کی بطیب خاطر تعمیل کرنا - اور طَاوَعَہٗ اس کی موافقت کرنا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی کے ساتھ لگنے اور تابعدار ہو جانے کے ہیں -

---

* تاج - ** محیط -

اِسْتِطَاعَ ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں کسی کام کے کرنے کے لئے جن قوتوں ، صلاحیتوں اور اسباب و ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے ان سب کا موجود ہونا ۔ اگر ان میں سے کوئی چیز ہے اور کوئی نہیں تو اسے صرف ایک حیثیت سے مُسْتَطِيْعٌ کہا جائیگا* ۔

سورۃ بقرہ میں ہے ۔ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا (۲/۱۵۸) ۔ اس کے معنے ہیں تھوڑی سی تکلیف اٹھا کر عمل خیر کرنا ۔ اس میں دل کی رضامندی توبہرحال ہوگی لیکن اس میں اگر تھوڑی سی مشقت بھی اٹھانی پڑے (جو قابل برداشت ہو) تو ایسا عمل خیر بھی کر لینا چاہئیے (۲/۱۸۴) ۔ سورۃ النحل میں غیر خدائی قوتوں کے متعلق ہے لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ (۱۶/۷۳) ۔ اس کے معنی صاحب اقتدار و اختیار کے ہیں ۔ یعنی کسی کام کو پورا کرنے کے لئے جن قوتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں نہیں ہیں ۔ سورۃ بقرہ میں ہے يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (۲/۲۱۷) ۔ اگر ان کے اختیار میں ہو تو وہ تمہیں تمہارے دین سے پھرا دیں ۔ سورۃ مائدہ میں ہے فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ (۵/۳۰) ۔ اس کے جذبات نے اسے اس امر پر آمادہ کر لیا ، یا راضی کر لیا ۔

قرآن کریم میں قوانین خداوندی کی اِطَاعَةٌ پر زور دیا گیا ہے ۔ درحقیقت سارے قرآن کی تعلیم کا منشا ہی یہ ہے کہ قوانین خداوندی کی اطاعت کی جائے ۔ اطاعت کے معنی ہم دیکھ چکے ہیں ۔ یعنی کسی کام کو دل کی پوری پوری رضامندی،وسعت اور کشادگی سے کرنا ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی اطاعت کسی مستبد حاکم کی فرمانبرداری نہیں، بلکہ اپنے دل کی مرضی سے خود اختیار کردہ حدود و قیود(Self-imposed Restrictions) کی پابندی ہے ۔ (اسی کو اِسْلَامٌ کہتے ہیں) ۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کی اطاعت نہ زبردستی کرائی جا سکتی ہے نہ اندھے، طور پر کی جا سکتی ہے ۔ اسی لئے قرآن کریم نے کتاب (قانون) کے ساتھ حِكْمَتٌ (اسکی علت غائی ۔ اس کے نتائج) کو بھی خود ہی واضح کر دیا ہے تاکہ ہر شخص علٰی وجہ البصیرت دیکھ لے کہ ان حدود کی پابندی میں کیا کیا فوائد مضمر ہیں اور اس کے بعد اپنے دل کی پوری رضامندی سے ان پر عمل پیرا ہو جائے ۔ یہ ہیں وہ بنیادی اصول جن کے مطابق قرآن،نظام خداوندی قائم کراتا ہے ۔ یعنی اس جماعت کے ہاتھوں جس کے افراد ، دل کی پوری کشاد کے ساتھ، علٰی وجہ البصیرت،اس نظام کے نتائج سے متفق ہوں اور کامل رضامندی سے اس کے قیام

---

*تاج ۔

و استحکام کے لئے کوشاں ۔ یہ ہے اطاعت کا صحیح مفہوم ۔ یعنی پکے ہوئے پھل کی طرح خود بخود کسی کی جھولی میں گر پڑنا ، نہ کہ اسے کھسوٹ کر حاصل کرنا ۔ اس کے مقابل میں تَوَلّٰی کا لفظ آیا ہے (۳/۳۱) ۔ یعنی منہ موڑ لینا یا گریز کی راہیں نکالنا ۔ اصل یہ ہے کہ اگر کسی کام کے کرنے میں ذرا سا بھی تردد ۔ تامل ۔ تذبذب ۔ ہچکچاہٹ ۔ یا کبیدگی خاطر ہو تو اسے اطاعت نہیں کہینگے، کیونکہ اطاعت کی بنیاد میں دل کی رضامندی شامل ہے ۔ (۴/۶۵) اطاعت کی جاتی ہے ، کرائی نہیں جاتی ۔ نا دانستہ یا لغزش سے کسی حکم کی خلاف ورزی اور بات ہے، لیکن جو شخص دل کی رضامندی سے نظام خداوندی (اسلام) میں نہ رہنا چاہے اُسے زبردستی نہیں رکھا جا سکتا ۔ نہ ہی کسی کو اسکے اندر زبردستی لایا جاسکتا ہے ۔ اس لئے دین میں اکراہ نہیں (۲/۲۵۶)۔ جو لوگ بطیب خاطر اس نظام کو قبول نہ کریں، وہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت سے رہیں گے ۔ انہیں تمام حقوق انسانیت حاصل ہوں گے لیکن اس نظام میں ان کا کوئی عمل دخل نہ ہوگا۔

مُطَاعٍ (۸۱/۲۱)۔ جس کی اطاعت کی جائے ۔ مُطَّوِّعٌ (۹/۷۹) جو دل کی کشاد سے کسی کام میں لگ جائے ۔

سورۃ مائدہ میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے کہا هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً (۵/۱۱۲) ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں کیا خدا ہماری اس عرض کو قبول کر لے گا ؟ اس کی تائید میں سورۃ مومن کی یہ آیت لکھی ہے مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (۴۰/۱۸) ۔ یعنی ایسا جس کی بات مانی جاسکے ۔

سورۃ کہف میں اِسْطَاعَ بجائے اِسْتَطَاعَ آیا ہے (۱۸/۹۷) ۔

ط و ف

طَوْفٌ کے معنی گھومنے اور چکر لگانے کے ہیں ۔ طَافَ ۔ اِسْتَطَافَ ۔ تَطَوَّفَ ۔ طَوَّفَ ۔ گھومنا ۔ چکر لگانا* ۔ کسی چیز کے ارد گرد بکثرت چلنا** ۔ اَلْمَطَافُ ۔ گھومنے کی جگہ ۔ اَلطَّائِفُ ۔ چوکیدار یا کوتوال جو رات کو حفاظت کے لئے پہرہ دے ۔ (یہ لفظ اگرچہ واحد ہے لیکن جمع کے لئے بھی آتا ہے)* ۔ ابن فارس نے بھی اس کے یہ معنی لکھے ہیں ۔ اَلطَّائِفَةُ ۔ کسی چیز کا ٹکڑہ ۔ لوگوں کی جماعت جو ہم آہنگیِ فکر و خیال یا اشتراک مذہب کی بناء پر متحد ہو اور اس سبب سے دوسروں سے ممتاز ہو** ۔ ابن فارس نے

* تاج ۔ ** محیط ۔

لکھا ہے کہ عرب طائفۃ کو کسی معین تعداد میں محدود نہیں کرتے تھے۔ نیز وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ بہرحال اس سے تھوڑی اور معمولی مقدار یا تعداد ہی مراد لی جاتی ہے۔ اَلطَّوَّافُ۔ ایسا خادم جو نہایت نرمی اور عنایت سے خدمت کرے**۔ اَلطُّوْفَانُ۔ ہمہ گیر موت، وہ مصیبت یا حادثہ جو قوم کو چاروں طرف سے گھیر لے اور ہر شے پر چھا جائے، مثلاً غرقابی، قتل و غارتگری، بارش جو زور دار ہونے کی وجہ سے بستیوں کو بہا لے جائے۔ نیز رات کی سخت تاریکی*۔ قرآن کریم میں قوم حضرت نوحؑ کے متعلق ہے فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ (۲۹/۱۴) انہیں طوفان نے آپکڑا۔

طَافَ۔ یَطُوْفُ کے معنی رفع حاجت کے لئے جانا بھی ہیں*۔

قرآن کریم میں ہے یُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ (۳۷/۴۵)۔ ان پر دور جام چلایا جائیگا۔ سورہ نور میں ہے طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰی بَعْضٍ (۲۴/۵۸)۔ وہ تمہارے ارد گرد پھرتے پھراتے رہتے ہیں۔ سورہ القلم میں ہے۔ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ (۶۸/۱۹) تیرے رب کی طرف سے ایک آفت ان پر پھر گئی۔ ایک مصیبت طاری ہو گئی۔ ایک حادثہ نے انہیں گھیر لیا۔ سورہ اعرف میں ہے طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ (۷/۲۰۱)۔اس کے معنی ہیں سرکش جذبات کا کوئی خیال جو یونہی گھومتے گھماتے ذہن میں آجائے۔ طَآئِفَةٌ۔ گروہ اور جماعت کے معنوں میں (۳/۱۲۹) میں آیا ہے۔

سورہ بقرہ میں ہے کہ خانہ کعبہ طَآئِفِيْنَ اور عَاكِفِيْنَ کے لئے مرکزی مقام ہے (۲/۱۲۵)۔ طَآئِفِيْنَ کے معنی ہیں نوع انسانی کے چوکیدار۔ وہ لوگ جو انسانیت کے حقوق کی حفاظت کرنے والے ہوں۔ اور عَاكِفِيْنَ کے معنی ہیں وہ جماعت جو نوع انسانی کے شیرازہ کو بکھرنے نہ دے، بلکہ اسے ایک رشتہ میں پرونے رکھے۔ ان کے معاملات کو درست رکھے۔ دنیا کے نظم و نسق میں درستگی اور آراستگی پیدا کرے (دیکھئے عنوان ع-ک-ف)۔ قرآن کریم نے ملت اسلامیہ (جماعت مومنین) کو ایک بین الاقوامی امت قرار دیا ہے جس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام نوع انسانی کے احوال و کوائف اور اعمال و افعال کی نگرانی کرے اور ان کے معاملات کو درست رکھے۔ اس مقصد کے لئے وہ جس نظام کی تشکیل کرتے ہیں اس کا مرکز کعبہ کو قرار دیا ہے (۲/۱۴۳)۔ لہذا اس نظام کو قائم کرنے والی جماعت، طَآئِفِيْنَ کی جماعت ہے۔ یعنی نوع انسانی کی چوکیداری کرنے والی۔ حقوق انسانیت کی حفاظت کرنے والی۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے

*تاج۔ **محیط۔

خدا سے پوچھا کہ ان کی اولاد میں بھی خانہ کعبہ کی تولیت (اور نوع انسانی کی امامت) کا منصب جاری رہیگا تو ان سے کہدیا کہ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ (۲/۱۲۴) - جو لوگ حقوق انسانیت میں کمی کرینگے وہ اس منصب کے اہل نہیں رہینگے -

یہ ہے طواف کعبہ کا صحیح مفہوم جس کی تمثیلی شکل (Symbolical Form) خانہ کعبہ کے گرد گھوم کر اس فریضہ کی یاد تازہ کرنا ہے - جس طرح صلٰوۃ کے اجتماعات میں رکوع وسجود اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ ہم قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں اور اس کے سوا اور کسی کے آئین و قانون کے سامنے نہیں جھکتے ، اسی طرح حج کے ان مناسک سے مراد یہ ہے کہ ہمارا یہ اجتماع ، نوع انسان کی حفاظت کے لئے نظام خداوندی کا عملی نشان ہے -

ط و ق

اَلطَّوْقُ - وہ حلقہ جسے گردن میں ڈال دیا جائے - ہر وہ چیز جو کسی کو اپنے گھیرے میں لے لے - راغب نے کہا ہے کہ دراصل طَوْق اس حلقہ کو کہتے ہیں جو پیدائشی طور پر گردن میں بنا ہوتا ہے ، جیسے قمری کی گردن کا حلقہ - یا مصنوعی حلقہ ، جیسے سونے چاندی کا گلے میں ڈالا جانے والا حلقہ ہوتا ہے - تَطَوَّقَ - طوق پہن لینا * - طَوَّقَ گردن میں طوق پہنانا - (۳/۱۷۹)

اَلطَّاقَۃُ - صاحب تاج العروس ، صاحب محیط ، راغب اور اقرب الموارد اس پر متفق ہیں کہ اَلطَّاقَۃُ اس قوت کا نام ہے جس سے کوئی کام بہ مشقت کیا جاسکے - یعنی وہ کام اس پر اتنا شاق گذرے جیسے کسی نے اس کی گردن میں طوق ڈال دیا ہو - اسی سے انہوں نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں آیا ہے کہ لَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَۃَ لَنَا بِہٖ (۲/۲۸۶) - تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم پر ایسی ذمہ داری نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم میں قدرت ہی نہ ہو - اس کے معنی ہیں ایسے کام جنہیں ہم بہ مشقت کرسکیں - جن کا کرنا ہمارے لئے دشوار ہو** -

روزوں کے احکام کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے - وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ (۲/۱۸۴) - اس کے عام طور پر

* تاج - ** تاج - محیط - راغب -

معنی یہ کئے جائیں ہیں کہ جن لوگوں کو (روزہ رکھنے یا فدیہ دینے کی) طاقت ہو وہ روزہ نہ رکھیں بلکہ اس کا فدیہ دیدیں - یہ معنی بالبداهت غلط ہیں۔ اگر وہ لوگ جنہیں روزہ رکھنے کی طاقت ہے یا جو فدیہ دے سکتے ہیں روزہ سے مستثنیٰ ہیں تو پھر روزہ کن پر فرض ہے ؟ کیا انہی پر جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں یا اتنے غریب ہوں کہ فدیہ بھی نہ دے سکیں ؟

اس کے صحیح معنی یہ ہیں کہ جو لوگ بہ مشقت روزہ رکھ سکیں وہ روزہ نہ رکھیں بلکہ اس کے بدلے میں فدیہ دیدیں - اس لئے کہ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (۲/۱۸۵) - خدا تمہارے لئے آسانیاں چاہتا ہے، مشقتیں نہیں چاہتا۔

اس آیت کی تفسیر میں صاحب المنار نے لکھا ہے کہ عرب أَطَاقَ الشَّيْئَ اسوقت کہتے ہیں جب قوت اتنی کم ہو کہ اسکی وجہ سے کسی کام کے کرنے میں شدید مشقت کا متحمل ہونا پڑے۔ اَلَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد ہیں ضعیف - بوڑھے - وہ اپاہج جن کے امراض کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ وہ کاریگر یا مزدور جن کی ہمیشہ کی معاش مشقت انگیز کاموں میں ہو۔ نیز وہ مجرم جنہیں مشقت کے کاموں پر لگایا جائے۔ ان لوگوں پر جب روزہ رکھنا شاق ہو اور وہ فدیہ دے سکیں تو وہ اس حکم میں داخل ہیں *۔ اس آیت کا اگلا حصہ یہ ہے کہ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ (۲/۱۸۴) - جو شخص قابل برداشت مشقت سے نیک کام کرے تو وہ اس کے لئے بہتر ہے - اس میں يُطِيْقُوْنَ اور تَطَوَّعَ کا فرق قابل غور ہے - یطیقون سے مراد سخت مشقت ہے اور تطوع سے مراد ایسی اطاعت جس میں ذرا سی تکلیف کا پہلو ہو، (دیکھئے عنوان ط - و - ع)

ط و ل

طَالَ - يَطُوْلُ - طُوْلاً - دراز ہونا۔ لمبا ہونا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلطِّوَلُ رسی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ لمبی ہوتی ہے - أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ (۲۰/۸۶) - وہ عہد جو تم نے مجھ سے کیا تھا، کیا اس پر بہت لمبا عرصہ گذر گیا جو تم نے سمجھ لیا کہ اب اس پر قائم رہنے کی کیا ضرورت ہے ؟ اس کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ کیا مجھے تم سے گئے ہوئے اتنا لمبا عرصہ گذر گیا تھا؟ یعنی عہد کے معنی زمانہ کے بھی ہوسکتے ہیں

* تفسیر المنار ج/۲ صفحہ ۱۵۶ ** تاج -

طَوْلٌ* ۔ وسعت ۔ فراخی ۔ خوش حالی ۔ استطاعت * ۔ (۴/۲۵) ۔ نیز قوت ۔ طاقت * ۔ (۴۰/۳) ۔ تَطَاوَلَ ۔ لمبا عرصہ گذر جانا (۲۸/۴۵) ۔ سورہ بنی اسرائیل میں پہاڑ کی اونچائی کے لئے یہی لفظ طُوْلاً آیا ہے (۱۷/۳۷)۔

ط و ی

طَوَی الصَّحِیْفَةَ یَطْوِیْھَا طَیًّا ۔ اس نے صحیفہ کو لپیٹ دیا ۔ اِطَّوَی ۔ وَانْطَوَی ۔ وہ لپٹ گیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں ۔ مجازاً کہتے ہیں طَوَی عَنِّی الْحَدِیْثَ وَالسِّرَّ ۔ یعنی اس نے مجھ سے بات اور راز کو چھپایا ۔ نیز طَوَی الْبِلَادَ طَیًّا ۔ اس نے شہروں کی مسافت کو قطع کیا ۔ یعنی راستوں کو لپیٹا ۔ نیز طَوَی اللّٰہُ الْبُعْدَ لَنَا ۔ خدا نے ہمارے لئے مسافت کو سمیٹ کر دوری کو قریب کر دیا * ۔ اَلطِّیَّةُ ۔ نیت اور مقصد ۔ لپیٹنے کی ہئیت ۔ منزلِ مقصود ** ۔ طَوَی اللّٰہُ عُمْرَہٗ ۔ خدا نے اس کی عمر ختم کر دی ۔ اس کی مدت عمر کو لپیٹ دیا ** ۔

سورۃ انبیاء میں ہے یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُبِ (۲۱/۱۰۴) ۔ جس دن ہم سَمَآءٌ کو لپیٹ دیں گے جس طرح لکھے ہوئے کاغذوں کا طومار لپیٹ دیا جاتا ہے ۔ اور سورۃ الزمر میں ہے وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ بِیَمِیْنِہٖ (۳۹/۶۷) ۔ اس دن (یوم القیٰمة) میں اَرْضٌ سب کی سب اللہ کے قبضہ میں ہوگی ۔ اور سَمٰوٰتٌ بھی اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے ۔ ان دونوں مقامات کے ملانے سے بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ جب قرآن کے قوانین کے مطابق انسانی معاشرہ متشکل ہو گا تو اس انقلابی دور میں معاشی ذرائع اور اخلاقی اقدار (اَرْضٌ اور سَمَآءٌ) دونوں کا مرکز ایک ہی ہوگا ۔ یہ دونوں ایک ہی مرکز کے کنٹرول میں ہونگے ۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ معاشی ذرائع ایسے نظام کے ہاتھوں میں ہیں جس نے اخلاقی اقدار کو الگ رکھ چھوڑا ہے ۔ لیکن اس دور میں یہ دونوں یک جا ہو جائیں گے اور اس طرح توحید عملاً متشکل ہو جائے گی ۔ اسی لئے اس کے بعد کہا ہے کہ سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (۳۹/۶۷) ۔ یہ لوگ جو معاشی نظام اور اخلاقی اقدار کو الگ الگ رکھکر عملاً شرک کرتے ہیں، خدا ان سے بہت دور اور بہت بلند ہے ۔ لیکن اگر یوم القیمة سے مراد دنیا کا طبعی انجام لیا جائے تو ارض و سماء سے مراد طبعی کائنات لی جائیگی ۔

* تاج ۔ ** محیط ۔

سورۃ "طٰہٰ" میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کو نبوت سے سرفراز کئے جانے کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اِنَّکَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّس اس سے عقلی طریق تحقیق اور وحی کے عمل انکشاف کا فرق نکھر کر سامنے "طُوًی" (۲۰/۱۲)۔ آجاتا ہے ۔ عقلی طریق تجرباتی ہوتا ہے جس میں مسافت بڑی لمبی ہوتی ہے۔ لیکن وحی اس مسافت کو لپیٹ کر راستے کو بہت مختصر کردیتی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں (It Economises Human Efforts) - عقل کی راہیں بڑی پرپیچ و خم ہوتی ہیں - وحی صراط مستقیم کے ذریعے سیدھے منزل تک لے جاتی ہے - عقل کے تجرباتی طریق سے مطلب یہ ہے کہ (مثلاً) آپ کے سامنے کوئی معاملہ آتا ہے - آپ اس کا ایک حل تجویز کر کے اس پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں - اس تجربہ میں کافی وقت صرف ہوتا ہے - محنت بھی کرنی پڑتی ہے - ایک مدت کے بعد جب نتیجہ سامنے آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تجربہ ناکام رہا ، وہ حل غلط تھا - آپ پھر دوسرا تجربہ شروع کر دیتے ہیں وقس علیٰ ھذا - اس طرح عقل کے تجرباتی طریق سے آپ کی مسافت بڑی لمبی ہو جاتی ہے - لیکن وحی شروع ہی میں آپ کے سامنے صحیح حل رکھ دیتی ہے اور اس طرح آپ کو ان تمام ناکام تجارب سے بچا لیتی ہے جو آپ کو عقل کے طریق کار کی رو سے کرنے تھے - اس طرح سفر حیات میں آپ کی مسافت بہت مختصر ہو جاتی ہے - نبی کے سامنے حقیقت اپنے آپ کو خود بخود منکشف کر دیتی ہے - اس طرح تلاش حقیقت میں اس کی مسافتیں سمٹ جاتی ہیں - لہذا نبوت سے سرفرازی کے معنی یہ ہیں کہ نبی سے عقلی تجربات کے لمبے راستوں کو چھڑا کر اسے ''الوادالمقدس طوی'' میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ جہاں مسافتیں لپیٹ کر رکھ دی جاتی ہیں - اس اعتبار سے اس وادی کو "طُوًی" کہا گیا ہے - راغب نے بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر "طُوًی" (کو ثُنُوْدِیَ کے ساتھ ملا دیا جائے جو اس سے پہلی آیت میں ہے تو اس کے) معنے یہ ہوں گے کہ میں نے موسیٰؑ کو دو مرتبہ پکارا - یا پھر یہ کہ اس وادی کو دوبار مقدس بنایا گیا ہے - لیکن یہ معنی کچھ دور از کار سے ہیں -

ط ی ب

طَیِّبٌ* - راغب نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی ہیں وہ چیز جس سے انسان کے حواس بھی لذت یاب ہوں اور نفس بھی * - یعنی ہر وہ چیز جو

* راغب -

دیکھنے ، سننے ، سونگھنے ، کھانے میں بھی پسندیدہ ہو اور اس سے انسانی نفس بھی کیف اندوز ہو ۔ اَلْاَطَایِبُ اور اَلْمَطَایِبُ ۔ پسندیدہ اور بہترین چیزیں ۔ اَلطُّوْبٰی ۔ یہ مصدر بھی ہوسکتا ہے اور اَطْیَبُ کا مؤنث بھی ۔ معنی ہیں بہت زیادہ پسندیدہ اور دائمی خوش حالی کی زندگی ۔ خوش بختی ۔ طَعَامٌ طَیِّبٌ ۔ وہ کھانا جو حلق میں سہولت سے اتر جائے ۔ مَاءٌ طَیِّبٌ ۔ خوشگوار پانی ۔ اَلطِّیْبُ ۔ خوشبو* ۔

طَابَتِ الْاَرْضُ طِیْبًا ۔ زمین زرخیز ہو گئی ۔ اس پر گھاس اُگ آئی * ۔ قرآن کریم میں ہے وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ (۷/۵۸) زرخیز زمین سے خدا کے قانون کے مطابق سبزی اُگتی ہے ۔ اس کے مقابلہ میں خَبِیْثٌ کا لفظ آتا ہے ۔ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا ۔ (۷/۵۸) ۔ اور جو زمین نکمی ہو اس میں (اول تو سبزہ پیدا ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے) تو بہت تھوڑا ۔ یہاں سے طَیِّبٌ اور خَبِیْثٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں ۔ اسی طرح سورہ ابراہیم میں شَجَرَۃٌ طَیِّبَۃٌ کی تعریف یہ بتائی گئی ہے کہ اسکی جڑیں زمین میں مضبوط ہوتی ہیں اور شاخیں فضا کی بلندیوں میں پھیلی ہوئی ۔ اور وہ ہمیشہ ثمربار رہتا ہے ۔ اس کے برعکس شَجَرَۃٌ خَبِیْثَۃٌ وہ ہے جس کی جڑیں زمین کے اوپر ہی اوپر ہوں اور ذرا سا جھٹکا اسے اکھاڑ پھینکے (۱۴/۲۴-۲۶) ۔

سورہ سبا میں بَلْدَۃٌ طَیِّبَۃٌ (۳۴/۱۵) اس شہر کو کہا گیا ہے جس کے دائیں بائیں باغات ہوں اور اس میں سامان رزق کی فراوانی ہو ۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جب قرآن کریم نے کہا ہے کہ ہم مومنین کو حَیٰوۃً طَیِّبَۃً (۱۶/۹۷) عطا کرتے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہے ۔ یعنی ایسی زندگی جس میں زندگی کی تمام خوشگواریاں نصیب ہوں ۔ جس میں انہیں تمام عمدہ اور پسندیدہ چیزیں بافراط میسر ہوں ۔ ایسی چیزیں جن سے حواس اور دل دونوں لذت یاب ہوں ۔

حلت و حرمت کے متعلق قرآن کریم نے اصول یہ بیان کیا ہے کہ دنیا کی ہر چیز حلال ہے بجز ان کے جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیدیا ہے ۔ لیکن اس نے حلال کے ساتھ طَیِّبٌ کا بھی اضافہ کیا ہے (کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ۔ ۲/۱۶۸) ۔ یعنی حلال چیزوں میں سے جو چیزیں تمہیں خوشگوار اور پسندیدہ ہوں وہ کھاؤ ۔ لہذا ان چیزوں کو چھوڑ کر

* تاج ۔

جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے ، دنیا کی ہر خوشگوار چیز سے متمتع ہوا جا سکتا ہے ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ نہ تو کوئی شخص کسی حلال شے کو حرام قرار دے سکتا ہے اور نہ ہی اسے مجبور کر سکتا ہے کہ وہ ہر حلال شے کو بالضرور کھائے ۔ اگر کوئی حلال شے کسی کو مرغوب نہیں یا نقصان دہ ہے تو اس کے لئے کسی قسم کی مجبوری نہیں کہ وہ اسے ضرور کھائے ۔ وہ جس چیز کو خوشگوار سمجھے اسے کھائے ۔ اس معاملہ میں نہ خدا کی طرف سے کوئی جبر ہے نہ کسی انسان کی طرف سے کوئی جبر ہونا چاہئے ۔

فَعَلْتُ بِطِيْبَةِ نَفْسِيْ کے معنی ہیں میں نے اسے کسی خارجی جبر و اکراہ کے بغیر اپنی مرضی سے کیا ہے * ۔ سورہ نساء میں ہے فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ (۴/۳)۔ جن عورتوں کا ذکر پہلے آچکا ہے ان میں سے اپنی پسند کے مطابق (جو تمہیں خوش آئند نظر آئیں) اپنے نکاح میں لاؤ ۔ نکاح کے لئے پسندیدگی اور دل کی رضامندی ضروری ہے ۔ رضامندی (دل کی خوشی) کے معنوں میں اس سے ذرا آگے ہے ۔ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ (۴/۴) وہ اگر دل کی رضامندی سے تمہارے لئے کچھ چھوڑ دیں ۔ سورہ آل عمران میں ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً (۳/۳۷) کہا گیا ہے ۔ ایسی اولاد جو دل و دماغ ، اخلاق و اطوار اور جسمانی صحت ہر لحاظ سے خوش آئند ، اور ماں باپ کے لئے سکون قلب کا باعث ہو ۔

مومنین کی کامرانی کے متعلق کہا گیا ہے طُوْبٰى لَهُمْ (۱۳/۲۹) ۔ ان کے لئے ہر قسم کی خوشگواریاں اور سعادتمندیاں ہیں ۔ کتنا جامع ہے یہ لفظ جس میں جنت کی ساری وسعتیں سمٹ کر آ گئی ہیں ۔

ط ی ر

طَارَ ۔ يَطِيْرُ طَيَرَانًا ۔ پرندہ کا اپنے پروں کے ساتھ ہوا میں حرکت کرنا ۔ اڑنا (۶/۳۸) ۔ اَطَارَهٗ ۔ طَيَّرَهٗ ۔ اڑا دینا ۔ یا کسی کو لے اڑنا ۔ اَلطَّيْرُ ۔ طَائِرٌ کی جمع ہے لیکن اس کا اطلاق واحد پر بھی ہو جاتا ہے (۳/۴۸) ۔ جمع کے طور پر یہ لفظ (۶/۳۸) میں آیا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ہوا میں ھلکا ہونے کے ہیں ۔ اس کے بعد استعارۃً اس کا استعمال ہر تیزی کے لئے ہوتا ہے ۔ اِسْتَطَارَ ۔ کسی چیز کا متفرق اور منتشر ہو جانا * ۔ اَلْمُسْتَطِيْرُ ۔ بلند اور منتشر ۔ ہوا میں تیزی کے ساتھ پھیلنے والا ۔ جس سے ساری فضا متاثر ہو چکی ہو ۔ (۷۶/۷) ۔ اَلطَّائِرُ ۔ دماغ ۔ ہر

* تاج ۔

چیز جس سے نیک یا بد شگون لیا جائے*۔ دماغ کی رعایت سے مجازاً اس کے معنی بلند پرواز انسان کے لئے جاسکتے ہیں ۔ چنانچہ سورہ آل عمران میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی قوم (بنی اسرائیل) سے کہا کہ اِنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ ..... (۳/۴۸) ۔ اس کے لفظی معنی ہیں ''میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی مانند بناتا ہوں'' ۔ لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں تمہارے لئے اسی آب و گل سے ایسے نظام نو کی تخلیق کرونگا جس سے تم اپنی اس موجودہ پستی (خاک نشینی) سے ابھر کر فضا کی بلندیوں میں بال کشا ہو جاؤ گے اور اس طرح تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہو جائینگی ۔ (آپ اناجیل میں دیکھئے ۔ حضرت مسیحؑ کا انداز تبلیغ یہ تھا کہ آپ تمثیلات اور استعارات میں حقائق بیان کیا کرتے تھے ۔)

اَلطَّائِرُ کے معنی نحوست (اعمال کے تباہ کن نتائج) یا شامت اعمال کے بھی لئے جاتے ہیں * ۔ اَلطَّائِرُ ۔ عربوں کے نزدیک بخت یا نصیبہ کو بھی کہتے ہیں، لیکن قرآن کریم میں اسے اعمال نامہ کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے ۔ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ (۱۷/۱۳) ۔ اس میں انسانی اعمال کو طائر کہا گیا ہے ۔ اس لئے بھی کہ عمل سے پہلے تو انسان کو اس پر اختیار ہوتا ہے کہ اسے کرے یا نہ کرے ۔ لیکن اس کے سرزد ہو جانے کے بعد اسے اس کا اختیار نہیں رہتا کہ اسے واپس لے لے (یعنی اس کے نتیجہ سے بچ جائے) ۔ یعنی وہ اس کے ہاتھوں سے اڑ جاتا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود وہ اسکی گردن میں لٹکا ہوا ہوتا ہے کیونکہ اس عمل کا نتیجہ تو اس انسان سے جدا نہیں ہوتا ۔ اَلطِّيَرَةُ ۔ بری فال سے جو بد شگونی لی جاتی ہے ۔ تَطَيَّرَ بِهٖ وَمِنْهُ وَاطَّيَّرَ ۔ اس نے اس چیز سے بد شگونی لی * ۔ (۳۶/۱۸-۱۹) و (۲۷/۴۷) میں بد شگونی کے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے جو خدا کے قانون مکافات کے مطابق مرتب ہوتا ہے ۔ اس کے سوا ''شگون'' کی کوئی حقیقت نہیں ۔

فَرَسٌ مُطَارٌ ۔ طَيَّارٌ ۔ ہوشیار اور تیز رفتار گھوڑا ** ۔ سورہ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے لشکر جِنّ ۔ اِنْس اور طَيْر پر مشتمل تھے ۔ جِنّ سے مراد وحشی قبائل ہیں ۔ اِنْس مہذب آبادیاں ۔ اور طَيْر تیز رفتار گھوڑے (رسالے) ۔ اسی طرح حضرت داؤدؑ کے متعلق ہے وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً (۳۸/۱۹) ۔ اسکے پاس نہایت تیز رفتار گھوڑوں کا لشکر جمع تھا ۔

---

* تاج ۔ ** محیط ۔

حضرت سلیمانؑ نے انہی کے متعلق کہا تھا کہ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ (۲۷/۱۶) اس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ ہمیں الطیر کی بولی سکھائی گئی ۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں گھوڑوں کے لشکر (رسالہ) کے قواعد و ضوابط سکھائے گئے ہیں ۔ اسی طرح سورہ (نمل) میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق ہے وَتَفَقَّدَ الطَّیْرَ فَقَالَ مَالِیَ لَا اَرَی الْھُدْھُدَ (۲۷/۲۰) ۔ اس میں طَیْرٌ انہی تیز رفتار گھوڑوں (کے رسالوں) کے لئے استعمال ہوا ہے ۔ ھُدْھُدٌ انہی رسالوں کے ایک رسالدار کا نام تھا (اس زمانہ میں پرندوں کے نام پر انسانوں کے نام عام طور پر رکھے جاتے تھے جیسا کہ تورات ۔ کتاب سلاطین سے ظاہر ہے) ۔ نیز لسان العرب میں ہے کہ ھُدْھُدٌ یمن کے ایک قبیلہ کا نام تھا ۔ اسی رعایت سے اس کے ہر فرد کو ھد ھد کہا جاتا تھا، جیسے قزلباش ایک قبیلہ کا نام ہے لیکن اس قبیلہ کے افراد کو بھی قزلباش کہتے ہیں ۔

ط ی ن

اَلطِّیْنُ ۔ گیلی مٹی * ۔ راغب نے کہا ہے کہ الطِّیْنُ پانی میں ملی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں خواہ اس سے پانی کا اثر زائل ہی کیوں نہ ہو جائے ۔ یعنی اگر وہ قدرے خشک ہوجائے تو بھی اسے طِیْنٌ کہدیا جائیگا** ۔ اَلطِّیْنَۃُ ۔ ایسی مٹی کا ٹکڑہ ۔ نیز یہ ایک قسم کی ٹھوس مٹی کو بھی کہتے ہیں جس سے دستاویز وغیرہ پر مہر لگائی جاتی ہے ۔ نیز مجازاً انسان کی جبلّت اور فطرت کو بھی کہا جاتا ہے * ۔ (قرآن کریم میں یہ لفظ ان معنوں میں نہیں آیا) ثعالبی نے فقہ اللغۃ میں کہا ہے کہ طِیْنٌ (مٹی) جب خشک ہو تو اسے صَلْصَالٌ کہتے ہیں ۔ جب آگ میں پکی ہوئی ہو تو اَلْفَخَّارُ کہلاتی ہے ۔ اور جب گارے کی طرح چپچپی ہو تو وہ لَازِبٌ کہلاتی ہے ۔

قرآن کریم میں ہے بَدَأَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ (۳۲/۷) ۔ تخلیق انسانی کی ابتدا طِیْنٌ سے ہوئی ہے ۔ (اسکی تفصیل کے لئے میری کتاب ”ابلیس و آدم“ ۔ عنوان انسان دیکھئے ۔ نیز عنوان ص ۔ ل ۔ ص ۔ ل)

حضرت عیسٰیؑ نے جب اپنی قوم (بنی اسرائیل) سے کہا کہ میں تمہیں طِیْنٌ سے طَائِرٌ بنا دونگا (۳/۴۸) تو اس سے مفہوم خاک نشینی کی پست حالت سے نکال کر عروج و پرواز عطا کر دینا تھا ۔ (دیکھئے عنوان ط ۔ ی ۔ ر ۔)

* تاج ۔ ** راغب ۔

ظ

ظ ع ن

ظَعَنَ - یَظْعَنُ - ظَعْنًا - کسی مقصد کے لئے سفر کرنا - پانی کے لئے ، چراگاہ کی تلاش میں ، ایک چشمہ سے دوسرے چشمے کی طرف یا ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف جانا - ظَاعِنٌ - سفر میں جانے والا ، مسافر - اَلظَّعِیْنَۃُ - وہ ہودج جس میں کوئی عورت سوار ہو - یا خود وہ عورت جو اس میں سوار ہو - راغب نے کہا ہے کہ یہ لفظ کنایۃً عورت کے لئے بولا جاتا ہے خواہ وہ ہودج میں نہ ہو - اَلظَّعُوْنُ - وہ اونٹ جسے سفر کے لئے تیار کیا جائے - (ابن فارس)- اَلظَّعْنَۃُ - حالت سفر* - سورۃ نمل میں ہے یَوْمَ ظَعْنِکُمْ ($\frac{16}{80}$) سفر کے دن - (بمقابلہ اِقَامَۃٌ) -

ظ ف ر

اَلظُّفُرُ - اَلظُّفْرُ - انسانوں اور دوسرے جانوروں کا ناخن - بعض لوگوں نے کہا ہے کہ غیر شکاری جانوروں کے ظُفُرٌ ہوتے ہیں اور شکاری جانوروں کے مِخْلَبٌ (پنجہ) - اَلْاَظْفَرُ - لمبے چوڑے ناخنوں والا - ظَفَرَہٗ - اس نے اس کے (چہرے میں) ناخن گاڑ دیا - اَلظُّفْرَۃُ - ایک پودا جو زمین سے نکلتے وقت ناخن کے مشابہ ہوتا ہے** -

قرآن کریم میں ہے وَعَلَی الَّذِیْنَ ھَادُوْا حَرَّمْنَا کُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ ($\frac{6}{147}$) - اور ہم نے یہودیوں پر تمام ناخن دار جانور حرام کر دئے تھے - یہ ان کی سرکشی کی وجہ سے بطور سزا کے تھا (جَزَیْنٰھُمْ بِبَغْیِھِمْ) ($\frac{6}{147}$)- قرآن کریم نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں ذِیْ ظُفُرٍ کا ذکر نہیں-

اَلظَّفَرُ - کامیاب ہونا - مطلوب کو پا لینا**- راغب نے لکھا ہے کہ یہ مفہوم دراصل ناخن گاڑ دینے سے لیا گیا ہے (اس لئے کہ جس چیز میں پنجہ

---

*تاج - راغب - محیط - **تاج - محیط -

گاڑ دیا جائے وہ قبضہ میں آجاتی ہے)***۔ اَلْاِظْفَارُ۔ کامیاب کر دینا ۔ سورۃ فتح میں ہے مِنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ (۴۸/۲۴) ۔ اس کے بعد کہ تمہیں انپر غالب کر دیا ۔ ان کے مقابلے میں کامیاب بنا دیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں قہر ۔ کامیابی ۔ غلبہ اور قوت شامل ہیں ۔

ظ ل ل

اَلظِّلُّ ۔ (جمع ظِلَالٌ) سایہ ۔ دھوپ نہ ہونا ۔ عام طور پر جو سایہ مغرب کی طرف پڑے (یعنی زوال آفتاب تک کےوقت کا سایہ) وہ ظِلٌّ کہلاتا ہے اور جو مشرق کی طرف پڑے (یعنی زوال آفتاب کے بعد مغرب تک کے وقت کا سایہ) اسے فَیْءٌ کہتے ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز کو چھپا لینا ۔

چونکہ عرب کا ملک نہایت گرم ہے اور درختوں کی وہاں بہت کمی ہے اس لئے ان کے ہاں سایہ ، راحت و آسائش کے عظیم ترین اسباب میں سے ہے ۔ اس بنا پر وہ راحت وآسائش کی ہر چیز کو کنایۃً ظِلٌّ سے تعبیر کرتے ہیں** ۔ حتیٰ کہ جنت کو بھی ظِلٌّ کہتے ہیں ۔ اور عزت ۔ حفاظت ۔ ہر قسم کی خوش حالی اور مرفہ الحالی کو بھی ۔ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِىْ ظِلٰلٍ وَّ عُيُوْنٍ (۷۷/۴۱) ۔ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۔ گھنا سایہ ۔ بہت زیادہ آسائشیں (۴/۵۷) ۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا (۱۳/۳۵) ۔ هُمْ وَ اَزْوَاجُهُمْ فِىْ ظِلٰلٍ (۳۶/۵۶) میں زندگی کی آسائشیں اور خوشگواریاں مراد ہیں ۔ اَظَلَّنِىْ فُلَانٌ کے معنے ہیں اس نے مجھے اپنے زیر سایہ لے لیا ۔ اس نے میری حفاظت کی اور بڑی عزت سے رکھا* ۔

ظِلٌّ ۔ ہر وہ جگہ جہاں دھوپ نہ پہنچے ۔ ہر وہ چیز جو کسی کو ڈھانک لے اور اس پر سایہ فگن ہو ۔ یہ اچھے اور برے دونوں موقعوں کے لئے عام ہے*** ۔ اَلظِّلَالُ مِنَ الْبَحْرِ ۔ سمندر کی بڑی بڑی موجیں ۔ اَلظَّلَلُ وہ پانی جو درختوں کے سایہ تلے ہو* ۔ ظُلَّةٌ (جمع ظُلَلٌ)۔ ہر ڈھانپ لینے والی چیز* ۔ نیز بدلی جو سایہ ڈالے* ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کا استعمال ناخوشگوار مواقع پر ہوتا ہے ۔ چنانچہ قوم شعیب کے عذاب کےمتعلق ہے ۔ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ (۲۶/۱۸۹) ۔ انہیں اس دن کے عذاب نے پکڑ لیا جب اوپر سے آجانے والی چیز نے انہیں ڈھانپ لیا تھا ۔ جس دن ان کے اعمال کے نتائج ان پر پوری طرح چھا گئے تھے ۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

ظَلَّ يَفْعَلُ كَذَا کے معنی ہیں وہ ہمیشہ ایسا کرتا رہا* ۔ سورۃ شعراء میں ہے کہ قوم حضرت ابراہیم نے کہا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ (۲۶/۷۱) ۔ ہم ہمیشہ ان (بتوں) کی پرستش کرتے رہیں گے ۔ سورۃ النحل میں ہے کہ جب ان میں سے کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی خبر ملتی ہے ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا (۱۶/۵۸) ۔ اس کا چہرا سیاہ ہو جاتا ہے ۔ سورۃ الحجر میں ہے ، وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ (۱۵/۱۴) ۔ ''اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں پھر وہ اس میں چڑھنے لگیں'' ۔ ان مثالوں میں مداومت اور استمرار کا پہلو غالب ہے ۔ یعنی ہمیشہ ایسا ہوتا ہے یا ایسا ہوگا ۔ اس کی بعض شکلوں میں ایک ہی لام رہ جاتا ہے ۔ مثلاً فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ (۵۶/۶۵) ''تم پشیمان ہو جاؤ گے'' ۔

ظِلٌّ بمقابلہ حَرُوْرٌ (گرمی) ۔ (۳۵/۲۱) میں آیا ہے ۔ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ (۳۹/۱۶) ۔ آگ کے شعلوں کو کہا گیا ہے جو چھا جائیں یا ڈھانپ لیں ۔

فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ (۲۶/۴) کے معنی ہیں ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں ۔

ظ ل م

ظُلْمٌ کے بنیادی معنی ہیں کسی دوسرے کی ملکیت میں بے جا تصرف کرنا ۔ حد سے تجاوز کرنا ۔ بعض آئمہ لغت نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نقص اور کم کرنے کے آتے ہیں ۔ اور امام راغب نے کہا ہے کہ ظُلْمٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے مخصوص مقام پر نہ رکھنا خواہ کمی زیادتی کرکے یا اسے اس کے صحیح وقت اور اصلی جگہ سے ہٹا کر ۔ کسی چیز کا توازن بگاڑ دینا** ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) تاریکی (۲) حد سے تجاوز کرکے کسی چیز کو بے جگہ رکھ دینا ، بتائے ہیں ۔

پہلے معنی (یعنی کسی دوسرے کی ملکیت میں تصرف کرنا) کے اعتبار سے مَظْلِمَةٌ اس چیز کو کہتے ہیں جسے کوئی زبردستی دوسرے سے چھین کر لے جائے ۔ اَلظَّالِمُ (جمع اَلظَّالِمُوْنَ اَلظَّالِمِيْنَ الظَّلَمَةُ) ان لوگوں کو کہتے ہیں جو دوسروں کے حقوق کو دبالیں*** ۔

ظَلَمَ فُلَانًا حَقَّهٗ، فلاں کا حق کم کیا ۔ اسی سے ہے لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا (۱۸/۳۳) ۔ اور انہوں نے اس میں کچھ کمی نہیں کی*** ۔ اس نہج سے ظَالِمٌ کے معنی ہیں حقوق انسانیت میں کمی کرنے والا ۔ دوسروں کے واجبات کو پورا پورا نہ دینے والا ۔

* محیط **تاج و محیط و راغب ۔ ***تاج ۔

کسی چیز کو اس کے اصلی مقام پر نہ رکھنے کے معانی میں یہ لفظ عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً عربوں میں ایک مثل ہے کہ مَنِ اسْتَرْعَی الذِّئْبَ فَقَدْ ظَلَمَ۔ جس نے بھیڑئیے سے توقع کی کہ وہ گلہ کی نگہبانی کرے گا، اس نے ظلم کیا۔ یعنی بھیڑئیے کو اس کے صحیح مقام پر نہیں رکھا۔ یا ظَلَمَ الْاَرْضَ اس وقت کہتے ہیں جب زمین کو ایسے مقام سے کھودا جائے جہاں سے اسے کھودنا نہیں چاہئیے تھا۔ اس قسم کی زمین کو مَظْلُوْمَۃٌ کہتے ہیں۔ ظَلَمَ الْبَعِیْرَ۔ اس نے اونٹ کو بغیر کسی بیماری کے یونہی ذبح کر دیا۔ ظَلَمَ الْوَادِیْ اس وقت کہتے ہیں جب پانی اس مقام تک پہنچ جائے جہاں تک وہ اس سے پہلے نہیں پہنچا تھا۔ (اس اعتبار سے ظَلَمٌ کے معنی حدود شکنی اور تجاوز کے ہوں گے)۔ نیز ظَلَمْتُہٗ کے معنے ہیں میں نے اسے وقت سے پہلے ہی استعمال کر لیا۔ الظَّلِیْمَۃُ والْمَظْلُوْمَۃُ اس دودھ کو کہتے ہیں جسے جمنے کے لئے رکھا جائے اور دہی بننے سے قبل ہی پی لیا جائے*۔

اَلظُّلْمَۃُ اور اَلظُّلُمَۃُ کے معنے ہیں اندھیرا۔ تاریکی۔ (جمع ظُلُمٰتٌ)۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہوتے ہیں روشنی کا معدوم ہونا (یعنی اس جگہ روشنی کا نہ ہونا جس کو روشن رہنا چاہئیے تھا)*۔ اس نہج سے اَمْرٌ مُظْلِمٌ اس معاملہ کو کہتے ہیں جسکے متعلق معلوم ہی نہ ہوسکے کہ اسے کہاں سے گرفت میں لیا جائے۔ یعنی تاریک اور غیر واضح معاملہ، اور یَوْمٌ مُظْلِمٌ اس دن کو کہتے ہیں جس میں سخت مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ چنانچہ ظُلُمَاتُ الْبَحْرِ کے معنی ہیں شَدَائِدُ الْبَحْرِ (سمندر کی مشکلات)*۔ شَعْرٌ مُظْلِمٌ نہایت سیاہ بالوں کو کہتے ہیں، اور نَبْتٌ مُظْلِمٌ ایسے پودے کو جو گہری سبزی کی وجہ سے سیاہی کے قریب پہنچ جائے*۔

قرآن کریم میں ظَالِمِیْنَ کا لفظ بکثرت آیا ہے جس کے معنی ہیں قانون شکنی، حدود فراموشی، دوسروں کی ملکیت پر ناجائز تصرف کرنے والے، حقوق انسانیت میں کمی کرنے والے، دوسروں کے واجبات کو پورا پورا ادا نہ کرنے والے، دوسروں کی محنت کو اپنے مصرف میں لے آنے والے، دوسروں پر زیادتی کرنے والے، اور اس طرح اپنی ذات کی نشو و نما میں کمی کرنے والے۔

سورہ بقرہ میں ہے وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ($\frac{2}{272}$)۔ تم اپنے مال میں سے جسقدر بھی نوع انسانی

*تاج۔

کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھو گے وہ پورا پورا تمہاری طرف لوٹا دیا جائیگا۔ یعنی جو کچھ تم نے دیا ہے اس میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائیگی۔ یہاں لَا تُظْلَمُوْنَ کا مفہوم یُوَفَّ اِلَیْکُمْ نے واضح کر دیا۔ اسی طرح دوسرے مقام پر ہے۔ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَ ھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (۲/۲۸۱)۔ یہاں بھی تُوَفّٰی کے مقابلہ میں لَا یُظْلَمُوْنَ لا کر بات واضح کر دی۔ سورہ کہف میں باغات کی مثال میں ہے۔ آتَتْ اُکُلَھَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْہُ شَیْئًا (۱۸/۳۳)۔ وہ اپنے پھل (پورے پورے) دیتے تھے اور اس میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے۔

سورہ بقرہ میں ہے۔ مَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲/۲۲۹)۔ جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ ظَالِمٌ ہیں۔ ظَالِمِیْنَ کی یہ بڑی جامع تعریف (Definition) ہے۔ اس لئے کہ انسانیت کے حقوق کا تعین، قوانین خداوندی ہی کی رو سے ہو سکتا ہے۔ اور جو شخص ان قوانین کو توڑتا ہے وہ حقوق انسانیت میں غصب کرتا ہے۔ لہذا حدود اللہ (قوانین خداوندی) کو توڑنے والا ظَالِمٌ ہے کیونکہ وہ حقوق انسانیت میں کمی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا کہ جو حقوق انسانیت میں کمی کرتا ہے وہ سمجھتا تو یہ ہے کہ میں دوسروں کی کسی چیز میں کمی کر رہا ہوں اور اپنے ہاں اضافہ۔ لیکن درحقیقت وہ شخص خود اپنی ذات (نفس) کی نشوونما میں کمی کرتا ہے۔ وَلٰکِنْ اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ۔ (۳/۱۱۶)۔

چونکہ حقوق انسانیت میں کمی کر دینے سے معاشرہ کا توازن بھی بگڑ جاتا ہے اور خود انسانی ذات کا توازن بھی قائم نہیں رہتا اس لئے قرآن کریم میں ظُلْمٌ کو سُوْءٌ کا مرادف قرار دیا ہے اور اس کے مقابلہ میں حُسْنًا کا لفظ آیا ہے (۲۷/۱۱)۔ ''حسن'' تناسب و توازن کی بہترین شکل کا نام ہوتا ہے۔

سورہ بقرہ میں نُوْرٌ کے مقابل میں ظُلُمٰتٌ کا لفظ آیا ہے (۲/۱۷) جس کے معنی تاریکیاں ہیں۔ نُوْرٌ وحی خداوندی ہے اور ظُلُمَاتٌ ذہن انسانی کی پیدا کردہ توہم پرستیاں اور غلط اندیشیاں۔ وحی کی تعلیم ایک ہی ہوتی ہے، لیکن ذہن انسانی کی پیدا کردہ تاریکیاں مختلف قسموں کی ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نُوْرٌ کی جمع کہیں نہیں آئی لیکن ظُلُمَاتٌ بطور جمع آیا ہے۔ حقیقت ہمیشہ ایک ہوتی ہے۔ افسانے مختلف ہوتے ہیں۔

آیت (۲۰/۲) میں أَضَاءَ کے مقابلہ میں أَظْلَمَ کا لفظ آیا ہے۔ أَظْلَمَ کے معنی ہیں تاریک ہو جانا اور تاریک کر دینا۔ نیز تاریکی میں داخل ہو جانا۔ چنانچہ مُظْلِمُوْنَ کے معنی ہیں اندھیرے میں رہ جانے والے (۳۶/۳۷)۔ سورہ انبیاء میں ظُلُمٰتٌ کا لفظ ایسے مصائب و مشکلات کے معنوں میں آیا ہے جن کا حل انسان کو سجھائی نہ دے (۲۱/۸۷)۔

سورہ ابراہیم میں ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۱۴/۳۴)۔ یعنی انسان اگر وحی کے تابع نہ چلے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق کرتا رہے تو اسکی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کو غصب کرتا ہے اور جو کچھ اسے حاصل ہو جاتا ہے اسے دبا دبا کر، چھپا چھپا کر رکھتا ہے۔ اس کے برعکس، وحی کی تعلیم یہ ہے کہ جو کچھ تمہیں حاصل ہو اسے نوع انسانی کی پرورش کیلئے کھلا رکھو اور کسی کے حقوق میں کمی نہ کرو۔ ظَلُوْمٌ میں مبالغہ پایا جاتا ہے۔ یعنی بہت زیادہ ظلم کرنے والا۔ اسی طرح ظَلَّامٌ کے بھی یہی معنی ہیں۔ (۳/۱۸۱)۔ قطعاً ظلم نہیں کرتا۔

دنیا میں جہاں جہاں ظلم ہو رہا ہو، خواہ اسکی نوعیت کچھ ھی کیوں نہ ہو، اس ظلم کو مٹانا اور اسکی جگہ نظام عدل واحسان قائم کرنا، یہ ہے قرآنی تعلیم کا منشا۔

ظ م أ

ظَمِئَ۔ يَظْمَأُ۔ ظَمْئًا۔ ظَمَأً۔ پیاسا ہونا۔ یا سخت پیاسا ہونا۔ ظَمِئٌ۔ ظَمْاٰنُ۔ پیاسا (۲۴/۳۹)۔ ظَمَأٌ۔ پیاس (۹/۱۲۰)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مرجھا جانے اور کم آب ہو جانے کے ہیں۔ "آدم" کی جنت کے متعلق ہے کہ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا (۲۰/۱۱۸)۔ تو اس میں پیاس محسوس نہیں کرتا۔ پانی بافراط ملتا ہے۔ پانی کی کمی اور فراوانی کی اہمیت کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس کا اندازہ صحراؤں کے رہنے والے ہی لگا سکتے ہیں جن کی زندگی کا دار و مدار پانی پر ہوتا ہے۔ ان کے لئے پانی کی قلت سب سے بڑی مصیبت اور پانی کی فراوانی سب سے بڑی خوش حالی ہوتی ہے۔ جنتی معاشرہ میں کسی کو بنیادی ضروریات زندگی (کھانا پینا۔ لباس۔ مکان وغیرہ) کے لئے جگر پاش مشقتیں نہیں اٹھانی پڑتیں، نہ ہی ان سے کوئی محروم رہتا ہے۔ (۲۰/۱۱۸)۔ اَلظِّمْءُ۔ دو مرتبہ پانی پینے کے درمیان کا وقفہ *۔

* تاج و راغب۔

ظ ن ن

ظَنٌّ۔ (جمع ظُنُوْنٌ)۔ غیر یقینی عقیدہ کے دونوں سروں میں سے جو زیادہ قوی ہو اسے ظَنٌّ کہتے ہیں ۔ ظَنٌّ واضح اور صاف صاف یقین نہیں ہوتا ۔ صاف یقین کو عِلْمٌ کہتے ہیں ۔ مناوی نے کہا ہے کہ ظنٌّ اس راجح عقیدہ کو کہتے ہیں جس میں احتمالِ نقیض ہو۔ نیز یہ شک اور یقین دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے بھی اس کی تائید کی ہے ۔ اور ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی یہ دونوں لکھے ہیں ۔ راغب نے کہا ہے کہ کسی چیز کے علامات سے جو نتیجہ (Inference) حاصل کیا جائے اسے ظَنٌّ کہتے ہیں ۔ جب یہ علامات قوی ہوں تو نتیجہ سے عِلْمٌ کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور جب بہت کمزور ہوں تو ان سے مستنبط نتیجہ وہم سے آگے نہیں بڑھتا ۔ لیکن جوھری نے کہا ہے کہ کبھی کبھی یہ لفظ علم کی جگہ بھی استعمال ہو جاتا ہے *۔

آپ نے اوپر دیکھا ہے کہ اہل لغت نے یہ کہا ہے کہ ظن کا لفظ ایک طرف شک اور قیاس کے معنوں میں آتا ہے اور دوسری طرف علم اور یقین کے معنوں میں ۔ لیکن یہ ان لوگوں کی محض خیال آفرینی اور قیاس آرائی ہے ۔ قرآن کریم نے (جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا) ظن کا لفظ علم اور یقین اور حق کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے ۔ اس لئے ظن کبھی علم اور یقین کے معنوں میں نہیں آسکتا ۔ دراصل (جیسا کہ راغب نے کہا ہے) جب کسی حقیقت کے متعلق پورا یقین نہ ہو تو اس کے دو پہلو ہوتے ہیں ۔ انسان کبھی حقیقت کی طرف مائل ہوتا ہے اور کبھی اس سے دور ہٹ جاتا ہے ۔ اس لحاظ سے ان دونوں پہلوؤں کو ظن کہتے ہیں ۔ راغب نے یہ بھی کہا ہے کہ جب اس کے بعد أَنْ یا أَنَّ آئے تو اس میں علم کی طرف رجحان غالب رہتا ہے اور وہ تقریباً یقین کے قریب پہنچ جاتا ہے ۔ قرآن کریم میں اسکی مثالوں کے لئے دیکھئے $(\frac{2}{46})$; $(\frac{2}{249})$; $(\frac{69}{20})$ وغیرہ۔

یقین اور قیاس کے ملے جلے پہلو کے اعتبار سے اَلظَّنُوْنُ اس باشرف عورت کو کہتے ہیں جس سے باوجود زیادہ عمر ہونے کے شادی کرلی جائے اور یہ امید ہو کہ اس سے اولاد ہو سکتی ہے ۔ نیز اس کنویں کو کہتے ہیں جس کے متعلق معلوم نہ ہو کہ اس میں پانی ہے یا نہیں ۔ نیز اس قرضے کو الدَّیْنُ الظَّنُوْنُ کہتے ہیں جس کے متعلق اطمینان نہ ہو کہ قرضہ لینے والا اسے ادا کریگا یا نہیں **۔

* تاج و راغب ۔ ** تاج و محیط ۔

قرآن کریم میں لفظ ظَنُّوْنٌ قیاس آرائیوں کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوْنَا (۳۳/۱۰)۔ ''اور تم خدا کے بارے میں طرح طرح کے گمان اور قیاس آرائیاں کرنے لگ گئے''۔ یعنی تمہارے دل میں یقین کے بدلے شکوک اور وساوس پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ سورۃ بقرہ میں ظَنٌّ بمقابلہ عِلْمٌ آیا ہے۔ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِیَّ وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ (۲/۷۸)۔ ''وہ کتاب کو اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ محض (ناظرہ) پڑھ لیتے ہیں۔ وہ صرف قیاس آرائیاں کرتے ہیں''۔ سورہ النساء میں ہے مَالَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ (۴/۱۵۷)۔ انہیں اسکی بابت یقینی علم نہیں، وہ محض ظن کے پیچھے چلتے ہیں۔ سورہ یونس میں ظَنٌّ بمقابلہ حَقٌّ آیا ہے۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (۱۰/۳۶) ظن، حق کے مقابلہ میں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

دین کی ساری عمارت علم اور یقین کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ اگر کسی معاملہ کے متعلق آپ کو یقینی طور پر علم نہ ہو کہ اس کی بابت خدا کا کیا حکم ہے تو آپ کے اعتقاد و عمل کی ساری عمارت متزلزل رہیگی۔ اس لئے دین کا یقینی ہونا ضروری ہے۔ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے اسی لئے لیا ہے (۱۵/۹) کہ ہمیں یقینی طور پر علم رہے کہ اس کا ایک ایک حرف وہی ہے جسے خدا نے نازل کیا تھا۔ رسول اللہؐ نے اسی قرآن کریم کو مرتب شکل میں امت کو دیا تھا اور اسکے علاوہ اور کچھ نہیں دیا تھا۔ اس لئے دین میں صرف قرآن کریم یقینی ہے۔ اور سب ظنیات ہیں۔ اور اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (۱۰/۳۶) خدا کا ارشاد ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے مقابلہ میں کوئی دوسری چیز دین نہیں ہو سکتی۔ دین وہی ہے جو قرآن کریم کے اندر ہے۔ خارج از قرآن، جو باتیں قرآن کریم کے مطابق ہوں انہیں صحیح مانا جا سکتا ہے اور جو اس کے خلاف ہوں وہ غلط ہونگی۔

اَلظِّنَّۃُ تہمت کو کہتے ہیں۔ اَلظَّنِیْنُ۔ متہم شخص، جس سے بدگمانی کی بنا پر عداوت رکھی جائے*۔

ظ ھ ر

اَلظَّھْرُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ۔ ہر چیز کا بیرونی اور بالائی حصہ (اندرونی حصہ کی ضد)۔ انسان کے جسم کا شانوں سے لیکر سرین کے اوپر تک کا حصہ

* تاج و محیط۔

پیٹھ ۔ پشت) ۔ سواری کو بھی کہتے ہیں ۔ اور مال کثیر کو بھی جو نمایاں طور پر نظر آجاتا ہے ۔ اَلظِّھْرَۃُ ۔ مددگار ۔ پشت پناہ* ۔

ظِھْرِیٌّ وہ فالتو اونٹ جسے سفر میں احتیاطاً (بطور Extra) ساتھ رکھ لیا جاتا ہے کہ اگر کسی وقت ضرورت پڑ جائے تو اسے استعمال کرلیا جائے ۔ یعنی اس کی حیثیت مقدم نہیں ہوتی ، ثانوی ہوتی ہے ۔ اسی سے اس کے معنی کسی کو پس پشت ڈال دینے یا نظر انداز کر دینے کے آتے ہیں ۔ اِتَّخَذَ حَاجَتَہٗ ظِھْرِیًّا ۔ اس کی ضرورت کو ناقابل توجہ سمجھا* ۔

ظَھَرَ الشَّیْءُ ۔ چیز ظاہر ہوگئی ۔ نمایاں ہوگئی ۔ ابھر کر سامنے آگئی ۔ واضح ہوگئی* ۔ ظَھَرَ عَلَیَّ ۔ اس نے میری مدد کی ۔ ظَھَرَ بِہٖ ۔ ظَھَرَ عَلَیْہِ ۔ اس پر غالب آگیا ۔ ظَھَرْتُ الْبَیْتَ ۔ میں مکان کے اوپر چڑھ گیا ۔ ظَھَرَ عَلَی السِّرِّ ۔ وہ راز سے واقف اور مطلع ہوا ۔ اَظْھَرَہٗ عَلَیْہِ اسے اس پر غالب کردیا ۔ اَلظُّھْرُ ۔ زوال آفتاب کا وقت ، یہ ظَھِیْرَۃُ الشَّمْسِ (دھوپ کی سخت تپش اور حرارت) سے ماخوذ ہے کیونکہ وہ سخت گرمی کا وقت ہوتا ہے* ۔ اَظْھَرَ ۔ ظہر کے وقت میں داخل ہونا ۔ ($\frac{30}{18}$) ۔ ظَاھَرَ و تَظَاھَرَ عَلَیْہِ ۔ اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کی ۔ اَلظَّھِیْرُ ۔ مددگار ۔ (یہ واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے) اَلظِّھَارُ مِنَ الْمَرْاَۃِ ۔ خاوند کا بیوی سے یہ کہنا کہ تو میرے لئے ایسی ہے جیسے میری ماں کی پشت ۔ عربوں میں زنا شوئی کے تعلقات منقطع کرنے کے لئے ایسا کہا جاتا تھا* ۔

ظَاھِرُ الْجَبَلِ ۔ پہاڑ کی چوٹی یا بالائی حصہ ۔ اَلظَّاھِرَۃُ ۔ اونچی زمین* ۔ کسی چیز کے زیادہ ہونے ، عام ہونے اور پھیل جانے کو بھی ظَھَرَ کہتے ہیں** ۔

قرآن کریم میں ہے تَظَاھَرُوْنَ عَلَیْھِمْ ($\frac{2}{85}$) ۔ تم ان کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو ۔ سورۃ المومن میں ہے ظَاھِرِیْنَ فِی الْاَرْضِ ($\frac{40}{29}$) ۔ ملک میں غالب قوم ۔ سورۃ زخرف میں ہے ۔ مَعَارِجَ عَلَیْھَا یَظْھَرُوْنَ ($\frac{43}{33}$) ۔ سیڑھیاں جن پر وہ چڑھتے ہیں ۔ اور سورۃ نور میں ظَھِیْرَۃٌ کا لفظ (گرمی کی) دوپہر کے لئے آیا ہے ($\frac{24}{58}$) ۔ سورۃ احزاب میں تُظَاھِرُوْنَ ($\frac{33}{4}$) کے معنی ہیں بیوی کے متعلق ظِھَارٌ کا اعلان کر دینا ۔ اس کا اعادہ ($\frac{58}{2-3}$) میں ہوا ہے ۔ سورۃ نور میں ہے لَمْ یَظْھَرُوْا عَلٰی عَوْرَاتِ النِّسَآءِ ($\frac{24}{31}$) ۔ وہ عورتوں کے پردہ کی باتوں سے واقف نہیں ہیں ۔ سورۃ جن

*تاج ۔ **راغب ۔

میں ہے فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا (۲۶/۷۲) - وہ اپنے غیب سے کسی کسو مطلع نہیں کرتا - سورۃ بقرہ میں اَبْوَابٌ (دروازوں) کے مقابلہ میں ظُهُوْرٌ (پچھواڑے) آیا ہے (۱۸۹/۲) - یعنی مکان کی پشت کی طرف سے -

قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا (۳۱/۲۴) - وہ اپنی زینت (آرائش) کی چیزوں کی نمائش نہ کریں، بجز ان کے جو (خود بخود) ظاہر ہو جائیں - اسے مثال دیکر یوں سمجھا دیا کہ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ (۳۱/۲۴) - اور وہ اپنے پاؤں کو (زمین پر) اس طرح مار کر نہ چلیں کہ جو کچھ وہ اپنی زینت کی اشیاء سے چھپائے ہوئے ہیں ان کا دوسروں کو علم ہوجائے - ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ آوازدار زیور ہے جسے پنڈلیوں پر پہنا جاتا ہے اور جو معمولاً ڈھنپا رہتا ہے - اس کی نمود کا طریق یہ ہے کہ زمین پر زور سے پاؤں مار کر چلا جائے جس سے اس زیور (چھاگل - جھانجھن وغیرہ) سے آواز پیدا ہوجائے - یہ وہ اشیائے زینت ہیں جو شلوار وغیرہ سے ڈھکی رہتی ہیں- باقی رہیں وہ اشیائے زینت جو اوپر کے حصے میں پہنی جاتی ہیں ، سو ان کے لئے کہدیا کہ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ (۳۱/۲۴) - وہ اپنے سر کی چادروں کو جیب گریبان (سینے پر) ڈال لیا کریں - دوسری جگہ ہے يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ (۵۹/۳۳)- وہ اوپر اوڑھے ہوئے (یا اور کوٹ کی طرح پہنے ہوئے) کپڑے کو جسم کے ساتھ لگائے رکھیں -

ان اشیائے زینت کے اظہار کی ممانعت ، باھر کے لوگوں سے ہے - اپنے گھر کے لوگوں سے نہیں- (۳۱/۲۴)- اب رہیں وہ چیزیں جو خود بخود ظاہر ہوجاتی ہیں تو انکی مثال ھاتھ کی انگوٹھی یا کنگن کی سمجھئے - یا ناک کے کسی زیور کی- اس لئے کہ اوڑھنی یا جلباب سے ھاتھ اور چہرہ بہرحال کھلے رہتے ہیں اور قرآن نے انہیں چھپانے کا حکم نہیں دیا - بلکہ یہ جو اس نے کہا ہے کہ مرد اور عورتیں اپنی نگاہیں نیچی رکھیں - انہیں بےباک نہ ہونے دیں (يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ ۳۰/۲۴-۳۱) تو اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کا منشا یہ نہیں کہ چہرہ کو بھی چھپایا جائے - اس لئے کہ اگر عورتیں اپنے چہرے کو بھی چھپا کر باھر نکلیں تو مردوں کو اپنی نگاھیں نیچی رکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی-

یہ ہیں اظہار زینت کے متعلق قرآن کریم کی ھدایات - ممانعت ، نمود آرائش کی ہے - خود بخود ظاھر ہو جانے والی اشیائے زینت کی نہیں -

سورۃ ھود میں ھے کہ حضرت شعیب ؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم نے خدا کو محض بطور ظِھْرِیًّا (۱۱/۹۲) رکھ چھوڑا ھے ۔ یعنی تمہارے نزدیک اھمیت تو تمہارے اپنے فیصلوں کی اور انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی ھے لیکن خدا کو (محض بطور Extra) ساتھ اس لئے رکھ چھوڑا ھے کہ اگر کبھی ضرورت پڑے تو اسے بھی اپنے مفاد کے لئے استعمال کر لیا جائے ۔ غور کیجئے کہ یہی چیز آج ھم پر بھی کس طرح صادق آتی ھے ۔

سورۃ حدید میں اللہ کی ایک صفت اَلظَّاھِرُ بھی آئی ھے ۔ ھُوَ الظَّاھِرُ (۵۷/۳) ۔ اس میں اَلظَّاھِرُ کے معنی آنکھوں سے نظر آ جانے والا نہیں ۔ اس لئے کہ جب بنی اسرائیل نے تقاضا کیا تھا کہ ھم اللہ کو جَھْرَۃً (اپنی آنکھوں سے) دیکھنا چاھتے ھیں (۲/۵۵) تو ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ ان کا تقاضا طفلانہ ھے ۔ خدا کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا ۔ لہذا یا تو اَلظَّاھِرُ کے معنی ھیں وہ ذات جس کی ھستی پر کائنات کی مرئی اور مشھود اشیاء دلیل ھیں یا اس کے معنی ھیں سب پر غالب ۔ لیکن اُس کا غلبہ ایسا ھے کہ وہ غیر محسوس طور پر کام کرتا ھے ۔ کیونکہ وہ اَلظَّاھِرُ کے ساتھ (اَلْبَاطِنُ) بھی ھے (۵۷/۳) ۔ جیسا کہ (ب ۔ ط ۔ ن) کے عنوان میں بھی لکھا جا چکا ھے ، خدا اپنے تخلیقی مظاھر (Created World) کی رو سے سامنے آتا ھے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اشیائے کائنات خود خدا ھیں ۔ مطلب یہ ھے کہ یہ اشیاء اپنے خالق کی ھستی کی علامات (آیات اللہ) ھیں ۔ اور جو قانونِ خداوندی رگِ کائنات میں خونِ حیات بن کر دوڑ رھا ھے وہ اُس کے اقتدار و اختیار کی زندہ شہادت ھے ۔ اسی اعتبار سے خدا اَلظَّاھِرُ ھے ۔ لیکن خدا کی ذات کی کنہ و حقیقت سے کوئی واقف نہیں ھو سکتا ۔ اس اعتبار سے وہ اَلْبَاطِنُ ھے ۔ اس سے (Immanence and Transcendence of God) کا وہ مسئلہ بھی حل ھو جاتا ھے جو مفکرین الٰہیات کے لئے اس قدر وجہ پیچ و تاب بنا رھتا ھے ۔ یعنی یہ مسئلہ کہ خدا کائنات میں حاضر و موجود ھے یا اس سے الگ (کہیں اور ۔ مثلاً عرش پر) بیٹھا ھے ۔ وہ (اپنے قانون و اقتدار کے اعتبار سے) کائنات کے اندر ھے لیکن اس میں محبوس نہیں ۔ اور (اپنی ذات کے اعتبار سے) کائنات سے بالا ھے لیکن اس سے الگ (Excluded) نہیں ۔ وہ بیک وقت اَلظَّاھِرُ بھی ھے اور اَلْبَاطِنُ بھی ۔ (Immanent) بھی ھے اور (Transcendent) بھی ۔ وہ اپنی ذات (Personality) رکھتا ھے لیکن مشخّص (Personified) نہیں ۔ اس کا اقتدار ، ایک توانائی (Divine Energy) ھے لیکن بغیر ذات (Personality) کے نہیں ۔

ع

عاد

جیسا کہ تذکرہ قوم ثمود (عنوان ث ۔ م ۔ د) میں لکھا جاچکا ہے، تاریخ کے ابتدائی ایام میں عرب اور اس کے گرد و پیش کے علاقہ (شام ۔ عراق وغیرہ) میں امم سامیہ پھیلی ہوئی تھیں ۔ ان میں سب سے اہم اور مقتدر قوم، عاد کی تھی جو ایکطرف حضر موت اور یمن کے علاقہ سے شروع ہو کر خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جاپہنچی تھی اور دوسری طرف عرب سے نکل کر مصر و شام پر حکمران تھی ۔ قریب دو اڑھائی ہزار (ق ۔ م) تک ان علاقوں پر اس قوم کا تسلط نظر آتا ہے ۔ سام کے بیٹے ارم کی نسبت سے انہیں عاد ارم بھی کہا جاتا ہے ۔ قرآن کریم نے انہیں قوم نوح کا جانشین بتایا ہے (۷/۶۹) جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی ابتداء بہت قدیم زمانہ میں ہوئی تھی ۔ اس قوم (عاد) کیطرف حضرت ہود[ؑ] مبعوث ہوئے تھے ۔ ان کا مقام بعثت و تبلیغ احقاف کا علاقہ تھا ۔ احقاف ریتیلے بل کھاتے ہوئے ٹیلوں اور ریگستانی صحرا کو کہتے ہیں ۔ عرب کا وہ طویل و عریض ریگستان جسے اب ربع خالی کہا جاتا ہے، احقاف کہلاتا تھا ۔ قرآن کریم کا بیان ہے کہ اس قوم کو (اُس زمانے کے لحاظ سے) سامان زیست افراط سے حاصل تھا ۔ آبپاشی کے لئے قدم قدم پر چشمے ۔ پھلوں سے لدے ہوئے باغات ۔ اولاد اور مواشی کی کثرت (۲۶/۱۳۲-۱۳۴) ۔ وہ ہر بلند مقام یا شاہ راہ عام پر بڑی بڑی عمارات بناتے تھے (۲۶/۱۲۸) ۔ وہ علم و بصیرت بھی رکھتے تھے (۲۶/۲۹) لیکن ان کی مفاد پرستیوں نے انہیں ایسی غلط روش پر ڈال رکھا تھا کہ ان کا علم و بصیرت صحیح کاموں میں صرف نہیں ہوتا تھا (۲۹/۳۸) ۔ حضرت ہود[ؑ] نے انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا لیکن انہوں نے ان کی ایک نہ مانی اور ان پر ایسی مسلسل آندھی چلی کہ وہ تباہ و برباد ہوگئے (۶۹/۶-۸) ۔ انہیں قرآن کریم نے عاد اولیٰ کہا ہے (۵۳/۵۰) ۔ ان میں سے جو حضرت ہود[ؑ] پر ایمان لا کر بچ گئے تھے ان کی نسل آگے چلی ۔ انہیں عاد ثانیہ کہا جاتا ہے ۔

(ان امور کی تفصیل - نیز اس نکتہ کی وضاحت کہ ان اقوام سابقہ کے اعمال، اور حوادث طبعی کے ذریعے ان کی تباہی میں باھمی ربط کیا تھا - میری کتاب "جوئے نور" میں ملیگی)

ع ب أ

اَلْعِبْءُ - بار - بوجھ - وزن، سامان وغیرہ کا - مَاعَبَأْتُ بِہٖ - میرے نزدیک اسکا کوئی وزن نہیں - مجھے اسکی کچھ پرواہ نہیں *- قرآن کریم میں ہے مَایَعْبَؤُ بِکُمْ رَبِّیْ (۲۵/۷۷) - میرے نشوونما دینے والے کے نزدیک تمہارا وزن ھی کیا ہے - اس کی نگاھوں میں تمہاری قدر وقیمت کیا ہے - وہ تمہاری پرواہ کیا کرتا ہے - (ابن فارس)

ع ب ث

اَلْعَبَثُ ہر اس کام کو کہتے ھیں جس کی کوئی صحیح غرض نہ ھو، یا ایسا کام جس کا فائدہ معلوم نہ ھو، یا ایسا کام جس کے کرنے والے کے سامنے اسکی کوئی غرض متعین نہ ھو - اسے معلوم نہ ھو کہ میں اسے کیوں کر رھا ھوں - بغیر مقصد اور غرض و غایت متعین کئے کوئی کام کرنا - اسی لئے کھیل کود کو عَبَثٌ کہتے ھیں *- اصل میں عَبَثَہٗ بِالشَّیْءِ کے معنی ھیں اسے کسی چیز میں ملایا - خلط ملط کیا *- ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی خلط ملط کرنا ھی بتائے ھیں *- جب کوئی کام مقصد اور غایت کو سامنے رکھکر کیا جائے تو انسان اس میں کسی ایسی بات کو نہیں ملاتا جس سے وہ مقصد حاصل نہ ھوتا ھو - لیکن جب کوئی مقصد اور منزل ھی متعین نہ ھو تو پھر اس کام میں جو کچھ چاھے ملتا جائے - عَبِیْثَۃٌ النَّاسِ - مختلف قبائل کے ملے جلے لوگ جو ایک جداعلیٰ کی اولاد نہ ھوں - اَلْعَبِیْثَۃُ - ملی جلی بکریاں - لہذا اَلْعَبَثُ کے معنی ھیں غیر مفید کام، وہ کام جس سے کوئی غرض و مقصد مطلوب نہ ھو *-

قرآن کریم کی رو سے یہ تمام کائنات ایک متعین مقصد اور غایت کو سامنے رکھکر پیدا کی گئی ہے اور انسانی تخلیق کی بھی ایک خاص غایت اور خاص مقصد ہے - صحیح روش زندگی وہ ہے جو انسان کو اس غایت اور مقصد کی طرف لے جائے - لیکن مادی نظریہ حیات کی رو سے کائنات اور انسان کی تخلیق یونہی اتفاقیہ عمل میں آگئی ہے - اسکی نہ کوئی غرض ہے نہ

* تاج - راغب - محیط -

غایت ۔ لہذا انسان اپنی طبعی آسائش کے لئے جو روش بھی اختیار کر لے صحیح ہے ۔ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ قرآنی تصور زندگی اور مادی نظریہ، حیات میں یہی بنیادی فرق ہے اور اسی بنیاد پر دونوں نظریوں کے مطابق زندگی کی پوری کی پوری عمارت (الگ الگ انداز سے) اٹھتی ہے ۔ قرآن کریم نے اسی فرق کو واضح کرنے کے لئے کہا ہے کہ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا (۲۳/۱۱۵) ۔ کیا تم یہ خیال کئے بیٹھے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بے غرض و غایت پیدا کر دیا ہے ؟ اور پوری کائنات کے متعلق ہے وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَا لٰعِبِیْنَ (۲۱/۱۶ - نیز دیکھئے (۴۴/۳۸) جس میں السماء کی جگہ السَّمٰوٰت ہے) ۔ ہم نے اس سلسلہ کائنات کو بطور کھیل تماشا کے نہیں بنا دیا ۔ اسکی تخلیق کا ایک خاص مقصد ہے ۔ اسے بِالْحَقِّ" پیدا کیا گیا ہے (۴۴/۳۸) ۔ یعنی ایک غیر متبدل محکم پروگرام کے مطابق تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے ۔ ہندو فلسفہ کی رو سے یہ تمام کائنات "ایشور کی لیلا" ہے ۔ یعنی خدا کا رچایا ہوا ناٹک ، جس میں وہ خود سب سے بڑے ایکٹر کا پارٹ ادا کر رہا ہے ۔ اسی لئے اسے "نٹ راجن" کہا جاتا ہے ۔ یعنی نٹوں (کھلاڑیوں) کا بادشاہ ۔ قرآن کریم نے اس تصور کی خاص طور پر تردید کی ہے اور زندگی کی ٹھوس حقیقت (Seriousness) پر بڑا زور دیا ہے ۔ اسی بنیاد پر انسان کے وہ تمام ایسے کام جو یونہی ، بلا صحیح غرض و غایت ، عمل میں آتے رہیں ، اُس کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتے ۔ چنانچہ اس نے قوم عاد کا ایک جرم یہ بھی بتایا ہے کہ وہ بڑی بڑی بلند عمارتیں محض اس لئے بناتے تھے کہ وہ بطور یادگار قائم رہیں ۔ اسے اس نے تَعْبَثُوْنَ سے تعبیر کیا ہے (۲۶/۱۲۸) ۔ یعنی عمارت کا کوئی افادی مقصد ہونا چاہئے ۔ یونہی ایک عظیم الشان مقبرہ بنا دینا جو کسی مصرف میں نہ آسکے ، فعل عبث ہے ۔ کسقدر عبرت انگیز ہے یہ حقیقت کہ جس قوم (مسلمانوں) کو اس قسم کی تعلیم دی گئی تھی ان کی سلطنت کے باقیات ، مقبروں کے علاوہ اور کچھ نہیں ۔ اور ان پر ہم فخر کرتے ہیں ۔ یادگار ایسی ہونی چاہئے جس سے منفعت بخش اور جمال آفریں نتائج مسلسل طور پر جاری رہیں ۔ اسی لحاظ سے زندگی کا ہر کام جو نوع انسانی کے لئے نفع رساں نہیں فعل عبث ہے ۔ (اس سلسلہ میں عنوانات (ث ۔ و ۔ ب) ۔ (ل ۔ ع ۔ ب) اور (س ۔ د ۔ ی) بھی دیکھئے)

ع ب د

عَبَدٌ ۔ دراصل ایک خوشبودار پودے کو کہتے ہیں جو اونٹوں کے لئے بڑی کشش رکھتا ہے ۔ اس کے کھانے سے اونٹ فربہ ہو جاتے ہیں اور

ان کا دودھ بھی زیادہ ہو جاتا ہے ۔ خاصیت کے اعتبار سے اس پودے کا مزاج گرم ہوتا ہے اس لئے جب اونٹ اسے کھاتے ہیں تو وہ پیاسے ہو جاتے ہیں اور پانی مانگتے ہیں ۔ اس اعتبار سے اس پودے میں تین خصوصیتیں ہیں ۔ (۱) کشش و جاذبیت ۔ (۲) ابتداءً پیاس کی تکلیف لیکن آخر الامر (۳) فربہی اور دودھ کی فراوانی ۔ لہذا اس کے بنیادی معنوں میں ابتداءً تکلیف لیکن آخر الامر نفع بخشی کے پہلو مضمر ہیں ۔ اسی بنیادی معنی کے پیش نظر عرب، کشتی پر تیل یا چربی یا تارکول ملتے تھے تو اس سے کشتی بد صورت ہو جاتی تھی لیکن نتیجہ کے اعتبار سے اس کی لکڑی پانی کے اثرات سے محفوظ ہوجاتی تھی ۔ اسی لئے ایسی کشتی کو سَفِیْنَۃٌ مُعَبَّدَۃٌ کہتے تھے * ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں دونوں باتوں کو شامل کیا ہے ۔ یعنی نرمی و ذلت اور سختی و غلظت ۔ (یعنی اس طرح کی نرمی کہ جس سے درحقیقت سختی آ جائے) اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے عِبَادَۃٌ کے معنی ایسا کام کرنا ہیں جو دل کے شوق اور رغبت سے سر انجام دیا جائے (کیونکہ عَبْدٌ پودا اپنی خوشبو کی وجہ سے اپنے اندر خاص کشش رکھتا ہے) اور وہ نتائج کے لحاظ سے نہایت منفعت بخش ہو اگرچہ اس کے لئے تھوڑی سی مشقت بھی برداشت کرنی پڑے ۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ($\frac{۲}{۲۸۶}$) عبادت کے اس مفہوم کو واضح کر رہا ہے ۔ یعنی انسان ، قوانین خداوندی کی اطاعت سے جو پابندیاں اپنے اوپر عائد کرتا ہے، بظاہر ان میں مشقت اور تکلیف ہوتی ہے لیکن در حقیقت وہ نفس انسانی کی وسعت اور کشود کے لئے ہوتی ہیں ۔

قرآن کریم نے عبادت کے اس مفہوم کو تین آیتوں میں واضح کر دیا ہے ۔ اس نے پہلے کہا کہ وَ ذَکِّرْ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ ($\frac{۵۱}{۵۵}$) ۔ ان کے سامنے خدا کا ضابطہ قانون (واضح طور پر) پیش کرتا رہ کیونکہ یہ ان کے لئے نہایت منفعت بخش ثابت ہوگا ۔ اس کے بعد بتادیا کہ وہ منفعت بخش اصول حیات کیا ہے ۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۔ ($\frac{۵۱}{۵۶}$) ۔ ان سے کہدے کہ ہم نے تمام انسانوں کو ، خواہ وہ حضری ہوں یا بدوی** ، اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے ۔ یہ وہ کام ہیں جن میں ابتداءً مشقت اٹھانی پڑیگی (اس لئے کہ السابقون الاولون کو ہمیشہ مشقت اٹھانی پڑتی ہے) لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ مشقت اس لئے ہے کہ تم محنت کرو اور ہم تمہاری محنت کی کمائی کھائیں ۔ بالکل نہیں ۔ مَآ اُرِیْدُ مِنْھُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّ مَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ ($\frac{۵۱}{۵۷}$) ۔

*تاج ۔ **(جن و انس کے معانی کے لئے ان الفاظ کو اپنے اپنے مقام پر دیکھئے)

ہم ان سے رزق نہیں چاہتے - یعنی ہم یہ نہیں چاہتے کہ یہ کمائیں اور ہم کھائیں - ان کی یہ مشقت خود انہی کے فائدے کے لئے ہے (تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ) - آپ پہلے پہل جو پابندی بھی اپنے اوپر عائد کرینگے اس سے آپ کو اپنے سابقہ معمول سے ہٹنا پڑیگا اور یہ گراں گذریگا - لیکن اس کے بعد جب اس پابندی کی نفع رسانیاں آپ کے سامنے آئیں گی تو وہ عین راحت بن جائیں گی -

''مشقت اور منفعت'' کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر عَبَّدَ کے معنی سمجھئے - تَعْبِيْدٌ کے معنی ہیں اونٹ (یا گھوڑے) کو سدھا کر جوتنے کے قابل بنا دینا* (اسے انگریزی میں Breaking یا Harnessing) کہتے ہیں - یعنی اس جانور کا اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اس پروگرام کی تکمیل کے لئے صرف کرنا جو اس کے لئے متعین کیا گیا ہو - اسی طرح سڑک کو کوٹ کر ہموار کر دینا تاکہ لوگ اس پر آسانی سے چل سکیں، یہی تَعْبِيْدٌ کہلاتا ہے* - آپ دیکھئے کہ ان کاموں میں ابتداءً کس قدر محنت اور مشقت درکار ہوتی ہے لیکن آخر الامر ان کا نتیجہ کس قدر منفعت بخش ہوتا ہے - قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے میں بھی یہی ہوتا ہے -

لہذا عبادت کے معنے یہ ہیں کہ انسان اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو (سرکش و بے باک رکھنے کے بجائے) قوانین خداوندی کے قالب میں ڈھال کر ایک سدھائے ہوئے گھوڑے کی طرح منشائے خداوندی کے مطابق صرف کرے جس کا نتیجہ منفعت عامہ ہوگا - چنانچہ قرآن کریم نے اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (۱۶/۳۶) سے اس مفہوم کو واضح کردیا - طَاغُوتٌ** کے معنی ہیں سرکش قوتیں - لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ اپنی قوتوں کو سرکش و بےباک رکھنے کی بجائے، یا سرکش قوتوں کے منشاء کے مطابق صرف کرنے کے بجائے، قوانین خداوندی کے تابع رکھ کر صرف کرو - دوسری جگہ ہے لَاتَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ (۱۹/۴۴) - اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ سرکش قوتوں کی اطاعت مت کرو***- ''شیطان'' کا یہ مفہوم آیت کے اگلے ٹکڑے نے

---

* لین و تاج ** اسکے معنی (ط - غ - ی) کے تحت دیکھئے-*** اسکے معنی یہ نہیں کہ شیطان کی پرستش مت کرو - دنیا میں شیطان کی پرستش کوئی بھی نہیں کرتا - عراق میں (موصل کے قریب) ایک باطنی فرقہ (یزیدی) کے متعلق مشہور ہے کہ وہ شیطان کی پرستش کرتے ہیں - لیکن ایک انگریز خاتون نے ان لوگوں کے کوائف و معتقدات کا ذاتی طور پر مطالعہ کر کے (''ملک طاؤس'' کے نام سے) ایک کتاب شائع کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ شیطان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اس سے ڈرتے بہت ہیں اور اس وجہ سے اس کے خلاف کچھ نہیں کہتے -

واضح کر دیا کہ اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّا (۱۹/۴۴) کیونکہ شیطان خدا کے قوانین و احکام سے سرکشی اختیار کئے ہوئے ہے ۔ اس میں خارجی قوتوں کے علاوہ انسان کے اپنے جذبات بھی آجاتے ہیں جو قانون خداوندی سے سرکشی برتیں (دیکھئے عنوان ش ۔ ط ۔ ن)۔ نیز قرآن کریم کی وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ (۴۵/۲۳) کیا تو نے اسے بھی دیکھا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیا؟ سورۃ نحل کی مندرجہ بالا آیت (۱۶/۳۶) یوں ہے ۔ وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۔ یعنی خدا کی طرف سے جو رسول بھی آتا تھا وہ یہی پیغام لاتا تھا کہ ''اللہ کی عبودیت اختیار کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو'' ۔ اس تقابل سے '' اللہ کی عبودیت '' کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ دوسری جگہ ہے کہ ذرا ان لوگوں کا حال دیکھو جو اپنے ذہن میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قرآن پر اور کتب سابقہ پر ایمان رکھتے ہیں وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِهٖ (۴/۶۰) ۔ اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خدائی قوانین کی رو سے کرائیں ، حالانکہ انہیں حکم دے دیا گیا ہے کہ وہ غیر خدائی قوتوں سے اجتناب کریں (۲/۲۵۶) ۔ اس سے ظاہر ہے کہ طاغوت سے اجتناب کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے معاملات کے فیصلے نہ تو اپنے ذاتی جذبات و خیالات کے مطابق کرے اور نہ ہی غیر خدائی قوانین کے مطابق کرائے ، بلکہ ان کے فیصلے قوانین خداوندی کے مطابق کرائے ۔ اسی کو اُعْبُدُوا اللّٰهَ کہا گیا ہے ۔ یعنی خدا کی عبودیت اختیار کرنا ۔ یہ ہے عبادت کا قرآنی مفہوم ۔

قرآن کریم نے ''خدا کی عبادت'' کی اصطلاح ٹھیک ان معنوں میں استعمال کی ہے جن معنوں میں آجکل ''حکومت'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ سورۃ کہف میں ایک جگہ ہے کہ وَ لَا یُشْرِکْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا (۱۸/۱۱۰)۔ ''ان کو چاہئے کہ وہ اپنے رب کی ''عبادت'' میں کسی کو شریک نہ کریں'' اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے کہ وَ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِهٖ اَحَدًا (۱۸/۲۶)۔ ''وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا'' ۔ اسی طرح سورۃ یوسف میں پہلے کہا گیا کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) ۔ ''حکومت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی'' ۔ اور اس کے بعد کہا ''اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاهُ (۱۲/۴۰) ۔ ''اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت (محکومیت) اختیار نہ کرو'' ۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم

کسطرح ''حکومت'' اور ''عبادت'' کے الفاظ مرادف معانی میں استعمال کرتا ہے۔ قصۂ حضرت موسیٰؑ میں ہے کہ آپ نے فرعون سے کہا کہ تم اپنے جو احسانات جتا رہے ہو، تو وہ ان کے سوا کیا ہیں اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ (۲۶/۲۲) کہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنا رکھا ہے! اسی طرح قوم فرعون کا یہ قول قرآن کریم نے نقل کیا ہے کہ (انہوں نے کہا کہ) کیا ہم ان دو (بھائیوں) کی بات مان لیں جو ہمارے جیسے انسان ہیں۔ وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ (۲۳/۴۷)۔ اور ان کی قوم ہماری محکوم ہے۔ ان مقامات میں بھی یہ مادہ، حکومت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کا مقصود یہ ہے کہ انسان صرف قوانین خداوندی کی محکومی اختیار کرے۔ کافر اور مومن میں یہی فرق ہے۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)۔ جو قوم قرآن کریم کے مطابق حکومت نہیں کرتی، تو یہی لوگ کافر ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہدیا ہے کہ جماعت مومنین کو حکومت اسی لئے دی جائے گی کہ (۱) ان کے دین کا تمکن ہوسکے (۲) یہ خدا کی ''عبادت'' کر سکیں (یَعْبُدُوْنَنِیْ)۔ اور (۳) اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں (لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا ۲۴/۵۵)۔ ظاہر ہے کہ اگر ''عبادت'' سے مراد محض پرستش ہو تو اس کے لئے اپنی حکومت کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ پرستش تو ہر حکومت میں ہوسکتی ہے۔ ہمیں انگریز کی غلامی کے زمانے میں بھی ''خدا کی پرستش'' کی پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ لہٰذا ''اللہ کی عبادت'' سے مفہوم اس کے احکام کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ یعنی قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرنا۔

ظالم اور جابر بادشاہوں اور سرداروں کے خلاف جنگ کرکے ان کی مظلوم رعایا کو اپنی حفاظت میں لے لیا جاتا تھا تو ان پناہ میں آئے ہوئے لوگوں کو عَبِیْدٌ کہتے تھے (اس لئے کہ ان لوگوں کو مستبد حاکموں کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لئے سخت مشقت اٹھانی پڑتی تھی لیکن یہ چیز آخر الامر ان مظلوموں کے لئے بڑی منفعت بخش ثابت ہوتی تھی۔ عَبِیْدٌ اور عِبَادٌ۔ عَبْدٌ کی جمع ہیں۔ عَابِدٌ کی جمع عَابِدُوْنَ اور عَبَدَةٌ ہیں)۔ پناہ دینے کا یہ جذبہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا اور اس طرح ہاتھ میں آئے ہوئے مظلوموں کو لوگ غلام بنانے لگ گئے۔ اب انہی کو عَبْدٌ اور عَبِیْدٌ کہنے لگے۔ یوں اس لفظ میں غلامی اور محکومی کے معنے پیدا ہوگئے*۔ چنانچہ قرآن کریم میں عَابِدٌ کے معنی محکوم (۲۳/۴۷)۔ عَبَّدَ کے معنی محکوم بنانا (۲۶/۲۲) اور

*تاج۔

عَبْدٌ کے معنی غلام (۲/۸) واضح ھیں ۔ اس سے اس لفظ میں اطاعت شعاری کا مفہوم آ گیا ھے ۔ چنانچہ اب تَعَبَّدٌ اور تَذَلَّلٌ ھم معنی استعمال ہوتے ھیں ۔ (یعنی مطیع و منقاد ہو جانا ، قانون کے سامنے جھک جانا) ۔ تعبد و تذلل کا یہی جذبہ ، پرستش کے اندر کارفرما ہوتا ھے ۔ اس سے عِبَادَۃٌ کے معنی پرستش ھو گئے ۔ قرآن کریم میں ھے قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا ۔ (۲۶/۷۱) ۔ انہوں نے کہا ، ھم بتوں کی پرستش کرتے ھیں ۔ یہ بت در حقیقت مظاھر ہوتے ھیں ان معبودوں کے جو ان لوگوں کے ذھن میں مجرد شکل (Abstract Form) میں موجود ہوتے ھیں اور جن کے متعلق ان کا عقیدہ ھے کہ وہ انہیں نفع یا نقصان پہنچا سکتے ھیں ۔ لہذا وہ ان کے سامنے طمع یا خوف (جلبِ منفعت یا دفعِ مضرت) کے خیال سے جھکتے ھیں ۔ یہی بنیاد کسی کی محکومی اختیار کرنے کے لئے بھی ہوتی ھے ۔

ابتدائی مشقت کے پیش نظر اسی مادہ سے عَبِدَ یَعْبَدُ آتا ھے جس کے معنی نفرت یا بیزاری کا اظہار کرنا ھیں** ۔ چنانچہ سورۃ زخرف میں ھے قُلْ اِنْ کَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِیْنَ (۴۳/۸۱) ۔ جس کا مطلب یہ ھے کہ ان سے کہدو کہ اگر کوئی رحمان ایسا ہو سکتا ھے جسکے یہاں اولاد بھی ہوتی ہو تو میں سب سے پہلا شخص ہونگا جو اس قسم کے رحمٰن سے نفرت و بیزاری کا اظہار کردے***۔ (ایسے رحمٰن کو دور ھی سے سلام ھے) ۔ واضح رھے کہ اگر عَابِدِیْن کو عَبَدَ ۔ یَعْبُدُ ھی سے فاعل مانا جائے تو اس کے معنی فرمان بردار کے ھونگے ۔ اس شکل میں اس جملہ شرطیہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہو سکتا ھے تو میں سب سے پہلے اس کا فرمان بردار ہوں ، لیکن چونکہ اس کا کوئی بیٹا ھو ھی نہیں سکتا اس لئے اس بیٹے کے فرمان بردار ہونے کا سوال ھی پیدا نہیں ہوتا ۔

اَلْعَبْدُ کے پہلے معنی انسان کے ھیں خواہ وہ آزاد ہو یا غلام ۔ پھر رفتہ رفتہ یہ غلام کے لئے استعمال ہونے لگا* ۔

لہذا قرآن کریم میں

(۱) جہاں اللہ کی عبادت کا ذکر ہوگا اس کے معنی ہونگے قوانین خداوندی کی برضا و رغبت اطاعت جس سے نہایت منفعت بخش نتائج مرتب ہونگے ۔ چونکہ جذباتِ اطاعت و فرماں پذیری کے اظہار کے لئے کوئی محسوس انداز اختیار کرنا ۔ (مثلاً جھکنا) انسان کے لا شعور میں چلا آرھا ھے اس لئے قرآن کریم

*تاج ۔ **تاج و لین لیز کتاب الاشتقاق ۔ ***ابن قتیبہ (القرطین ج/۲ صفحہ ۱۲۵

نے بھی اظہار جذبات کے اس محسوس انداز کا لحاظ رکھا ہے۔ لیکن اس نے اسے بھی ایک اجتماعی حیثیت دے دی ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے صَلٰوۃ جو ص۔ ل۔ و کے عنوان کے ماتحت درج ہے)۔ یعنی خدا کے سامنے جھکنا (رکوع و سجود) اس حقیقت کا محسوس مظاہرہ ہے کہ ہم قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ ہم ان کی اطاعت اور فرماں پذیری کو قبول کرتے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں دیکھئے اَسْلَمْتُ اور نَعْبُدُ مرادف معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔اسی کو آللّٰہِ بِیْن کہا گیا ہے ($\frac{۲}{۱۳۱ - ۱۳۳}$)۔ نیز مُسْلِمُوْنَ اور عَابِدُوْنَ اور مُخْلِصُوْنَ بھی ($\frac{۲}{۱۳۶ - ۱۳۸}$)۔

(۲) جہاں طاغوت اور شیطان کی عِبَادَت کا ذکر ہوگا اس سے مفہوم یا تو انسان کے خود اپنے جذبات کی اطاعت ہوگی یا دوسرے انسانوں کے احکام کی اطاعت۔ ان میں مستبد حکمرانوں کی محکومیت اور مذہبی پیشواؤں کی عقیدتمندانہ اطاعت بھی شامل ہوگی۔ اس کے مقابلہ میں ''خدا کی عبادت'' سے مراد ہوگی اس کے قوانین کی اطاعت۔ خدا کی محکومیت۔

(۳) جہاں بتوں یا دیوی دیوتاؤں کی عبادت کا ذکر ہوگا وہاں ان کی توہم پرستانہ پرستش مفہوم ہوگا۔ ان کی پرستش کا جذبہ محرکہ بھی وہی ہوتا ہے جو بادشاہوں کے سامنے جھکنے کا ہوتا ہے۔

(۴) عِبَادُ الرَّحْمٰن کے معنی ہونگے وہ لوگ جو صرف قوانین خداوندی کی اطاعت کریں۔ جو اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اس راستہ (Channel) پر ڈال دیں جو اس کے قانون نے متعین کیا ہے۔ اسی سے اِیَّاکَ نَعْبُدُ ($\frac{۱}{۴}$) کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی ہم صرف تیرے قوانین کے سامنے جھکتے ہیں۔ ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ ہم اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو (ایک سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح) اس مقصد کے حصول کے لئے صرف کرتے ہیں جو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے۔

اجتماعات صلٰوۃ میں اٹھنا اور جھکنا انہی جذبات اطاعت و فرماں پزیری کا محسوس مظہر ہے۔ لیکن خدا کی عبادت اسی حد تک محدود نہیں۔ اُسکی عبادت سے مقصود یہ ہے کہ انسان، زندگی کے ہر سانس میں قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ($\frac{۵۱}{۵۶}$) سے یہی مقصود ہے۔

اتنا اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ '' قوانین خداوندی کی محکومیت'' اختیار کرنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں جنت کی

خوشگواریوں کی زندگی نصیب ہو جائے اور اس کی ذات کی ایسی نشو و نما ہو جائے جس سے یہ مرنے کے بعد، زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔ یہ ''محکومی'' درحقیقت، زندگی کی بلند، مستقل، اقدار کو از خود اپنے اوپر عائد کرنا ہوتا ہے۔ یہ (Self - Imposed Restrictions) ہوتی ہیں۔ کسی کی خارج سے عائد کردہ پابندیاں نہیں ہوتیں۔ نہ ہی اس میں (Worship) کا وہ مفہوم ہوتا ہے جسے زمانہ قدیم کے انسان نے، فطرت کی قوتوں سے ڈر کر، انہیں خوش کرنے کے لئے، اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔

ع ب ر

عَبَرَ کے معنی ہوتے ہیں ایک مقام (یا حالت) سے دوسرے مقام (یا حالت) تک پہنچ جانا۔ عَبَرَ النَّھْرَ۔ اس نے نہر کو عبور کر لیا۔ اس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔ عَبَرَ السَّبِیْلَ۔ اس نے راستہ قطع کیا، طے کیا۔ اَلْمِعْبَرُ۔ وہ چیز جس کے ذریعے نہر کو عبور کیا جائے۔ کشتی یا پل وغیرہ *۔ اس اعتبار سے راغب نے لکھا ہے کہ عِبَارَۃٌ وہ کلام ہے جو متکلم کے منہ سے نکل کر فاصلہ عبور کرکے سامع کے کان میں پہنچتا ہے۔ اور عِبْرَۃٌ اس حالت کو کہتے ہیں جس کے ذریعے کسی دیکھی چیز کی وساطت سے آن دیکھے نتائج وغیرہ تک پہنچا جائے **۔ اس سے اِعْتَبَرَ الشَّیْءَ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اچھی طرح سے پرکھنا اور اس کی کسی مثال کو سامنے لا کر اسکے مطابق اس کا فیصلہ کرنا ***۔ اَلتَّعْبِیْرُ۔ خواب کا انجام بتانا۔ اس سے فعل عَبَرَ یَعْبُرُ عَبْرًا وَعِبَارَۃً بھی آتا ہے **۔ ابن فارس نے اس معنی کی تائید میں خلیل کا یہ قول نقل کیا ہے عَبَّرْتُ الدَّنَانِیْرَ تَعْبِیْرًا۔ جس کے معنی دیناروں کو ایک ایک کر کے تولنے کے ہیں۔ یعنی باٹ کو دیکھکر دینار کے وزن کا اندازہ کر لینا۔

خواب کی تعبیر کے لئے یہ مادہ (۱۲/۴۳) میں آیا ہے۔ عِبْرَۃٌ (۱۲/۱۱۱) میں۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ (۵۹/۲) میں۔ یعنی مظاہر فطرت یا تاریخی شواہد کے مطالعہ سے زندگی کی غرض و غایت اور قوانین خداوندی کے مقصود و مطلوب تک پہنچ جانا ارباب بصیرت کا کام ہے۔

عَبَرَ السَّبِیْلَ (راستہ قطع کرنے) سے، عَابِرِیْ سَبِیْلٍ آیا ہے (۴/۴۳) جس کے معنے ہیں، راستے کو پار کرنے والے۔

---

* راغب۔ ** تاج۔ *** محیط۔

ع ب س

عَبَسَ وَجْهَهٗ - اسنے اپنا چہرہ بگاڑ لیا - عَبَّسَ تَعْبِیْساً کے بھی یہی معنی ہیں - اَلْعَبَّاسُ - وہ شخص جس کے چہرے پر ہر وقت شکن پڑی رہے - شیر کو بھی کہتے ہیں - اَلْعَبَسُ دراصل اس گوبر اور پیشاب کو کہتے ہیں جو اونٹ کی دم کے ساتھ لگ جائے اور خشک ہو جائے* -

قرآن کریم میں ہے ثُمَّ عَبَسَ (۲۲/۷۴) - پھر اس نے تیوری چڑھائی یا چہرہ بگاڑا - دوسری جگہ ہے - یَوْماً عَبُوْساً قَمْطَرِیْراً (۱۰/۷۶) - ایسا دن جس کا چہرہ سخت شکن آلود ہو - بڑا بھیانک دن - جسکی سختی سے لوگوں کے چہرے بگڑ جائیں - راغب نے کہا ہے کہ سینہ کی تنگی سے چہرے کے بگڑنے کو کہتے ہیں** -

ع ب ق ر

عَبْقَرٌ - صحراء میں ایک چشمہ یا آبادی کا نام تھا جسکے متعلق عربوں میں مشہور تھا کہ وہاں جن رہتے ہیں - وہ جب کوئی ایسی چیز دیکھتے جسکا بنانا دشوار ہوتا اور اسمیں نادرہ کاری کا نمونہ ہوتا تو وہ کہدیتے کہ یہ انسانوں کی بنائی ہوئی نہیں ، یہ تو عَبْقَرٌ والوں کی بنائی ہوئی ہے - یعنی جنوں کی - ابن سیدہ نے عَبْقَرٌ ، یمن کے ایک شہر کا نام بتایا ہے جہاں کپڑوں اور فروش پر نقاشی ، کڑھائی اور زری کا کام کیا جاتا تھا ، وہاں کے کپڑے حسن و رعنائی میں ضرب المثل تھے - چنانچہ جب کسی چیز میں انتہائی حسن و جودت پائی ہوتی تو اسکی طرف نسبت کردی جاتی تھی - اس کے بعد اَلْعَبْقَرِیُّ - ہر کامل ، غیر معمولی ، اور سب سے اعلیٰ شے ، نیز قبیلے کے سردار اور بلند مرتبہ شخص کو کہنے لگ گئے - فراء نے کہا ہے کہ اسکے معنی نہایت عمدہ دبیز فرش کے ہیں یا دیباج کے*** - قرآن کریم نے عَبْقَرِیٍّ حِسَانٍ کہا ہے (۷۶/۵۵) - حسین اور نادر فروش -

ع ت ب

اَلْعَتَبَةُ - دروازہ کی چوکھٹ - اَلْعَتَبَةُ - (کسی معاملہ میں) سختی - یا نہایت ناخوشگوار بات - چنانچہ سخت اور پتھریلی زمین کو بھی اَلْعَتَبُ کہتے ہیں**** - نیز ایسی زمین کو بھی جو وہاں اترنے والے کے لئے سازگار نہ ہو** - اَلْعَتْبُ - اونٹ کا تین پاؤں پر چلنا جبکہ اسکا ایک

*تاج - **راغب - ***تاج - راغب - محیط - ****تاج و محیط -

پاؤں بندھا ہوا یا زخمی ہو۔ آدمی کا ایک پاؤں اٹھا کر دوسرے پاؤں پر کود کود کر چلنا۔ تَعَتَّبَ عَلَيْهِ۔ وہ اس پر ناراض ہوگیا۔ اَلتَّعَاتُبُ وَالْمُعَاتَبَةُ۔ باہم غصہ اور ناراضگی کو بیان کرنا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سختی اور صعوبت کے ہیں۔ چنانچہ سیڑھی کے درجات کو عَتَبَاتٌ کہتے ہیں۔ نیز پہاڑوں میں پتھروں کی جو سیڑھیاں بنی ہوں انہیں بھی عَتَبَاتٌ کہتے ہیں۔ دروازہ کی چوکھٹ کو بھی اس لئے عَتَبَةٌ کہتے ہیں کہ وہ نشیبی جگہ سے ذرا اونچی ہوتی ہے۔

اَلْعُتْبٰی کے معنی رضامندی ہیں۔ اِسْتَعْتَبَهٗ۔ اس کی رضامندی اور خوشنودی چاہی۔ نیز اس کے معنی اپنی ناراضگی دور کرکے اس سے راضی ہوگیا بھی ہیں*۔

قَدْ اَعْتَبَنِیْ فُلَانٌ۔ جن باتوں کی وجہ سے میں فلاں آدمی پر ناراض تھا اس نے وہ باتیں چھوڑ دیں اور مجھے راضی کرلیا*۔ اَلْاِسْتِعْتَابُ رضامندی طلب کرنا۔ معافی چاہنا۔ کسی سے یہ خواہش کرنا کہ وہ اس ناگواری، ناراضگی اور عتاب کو دور کر دے جو وہ محسوس کر رہا ہے۔ اَلْمُعْتَبُ۔ راضی کیا ہوا۔ جس سے عتاب دور کر دیا جائے*۔

قرآن کریم میں ہے وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ (۴۱/۲۴)۔ اگر وہ ان باتوں کو دور کرنا چاہیں جو ان کے لئے وجہ ذلت و عذاب ہوئی تھیں اور اسطرح ہماری رضامندی طلب کرنا چاہیں تو وہ (ایسا کر نہیں سکینگے)۔ ذلت اور عذاب ان سے چھوٹ نہیں سکیگا۔ ان سے عتاب دور نہیں کیا جائے گا۔ (نیز ۱۶/۸۴)۔

ع ت د

عَتِيْدٌ۔ تیار۔ موجود۔ حاضر۔ قریب**۔ (۵۰/۱۸)۔ اَعْتَدَ۔ تیار کرنا۔ حاضر رکھنا**۔ ضرورت کی چیزوں کا پہلے سے ذخیرہ کر لینا***۔ (۴/۱۸)۔ جہنم چونکہ انسان کے اپنے اعمال کے نتائج سے مرتب ہوتی ہے اس لئے وہ اعمال کے ساتھ ساتھ تیار ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم میں ہے کہ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۴/۱۸)۔ ان کے لئے درد انگیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جسے خدا نے وہاں اپنے طور پر الگ تیار کر رکھا ہے۔ اس کا مفہوم وہی ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ یعنی ہر شخص اپنی جنت یا جہنم، زندگی کے ہر سانس

*تاج و محیط۔ **تاج۔ ***راغب۔

میں ساتھ کے ساتھ تیار کرتا رہتا ہے۔ اور یہ سب کچھ خدا کے قانون مکافات کے مطابق ہوتا ہے۔ (تفصیل کے لئے عنوانات جَہَنَّمُ وغیرہ دیکھئے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ آج بھی ہر فرد جہنم کے سامنے موجود اور اس کے قریب ہے)۔ ابن فارس کے نزدیک اس مادہ کے بنیادی معنی قرب اور موجودگی ہیں۔

ع ت ق

اَلْعِتْقُ۔ حریت۔ آزادی۔ شرافت۔ نجابت۔ عزت۔ جمال۔ عَتَقَ الْعَبْدُ یَعْتِقُ۔ غلام آزاد ہؤا۔ آزاد ہونے والا غلام عَتِیْقٌ وَعَتَاتِیْقُ کہلائیگا*۔ قرآن کریم میں خانہء کعبہ کوالبَیْتِ الْعَتِیْقِ کہا گیا ہے ($\frac{22}{29}$)۔ یعنی نظام خداوندی کا وہ مرکز جو دنیا میں ہر قسم کی غلامی اور محکومی سے آزاد ہے۔ جس پر کسی کا اثر و غلبہ نہیں۔ نہ ذہنی نہ حکمرانی۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے بھی انہی معانی کی تائید کی ہے۔ کسقدر بلند ہے وہ مقام جو ہر قسم کی غلامی سے آزاد ہو۔ اور کسقدر صاحب شرف وعظمت ہے وہ قوم جس کے مرکز کی یہ شان ہو۔ رَاحٌ عَتِیْقٌ۔ وہ سربند شراب جسکی مہر کسی نے نہ توڑی ہو۔ شراب کہنہ۔ عَتَقَ الْفَرَسُ عِتْقًا۔ گھوڑا چلنے میں آگے نکل گیا*۔ تعریفات میں ہے کہ عِتْقٌ کے معنی لغت میں قوت کے آتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مادہ (i) ساخت اور اخلاق دونوں اعتبارات سے معزز و مکرم ہونے کے لئے۔ اور (ii) قدیم ہونے کے لئے آتا ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَلْعَتِیْقُ ہر پیشرو چیز کو کہتے ہیں خواہ اس کا تقدم زمان کے اعتبار سے ہو، خواہ مکان کے اعتبار سے، یا رتبہ کے اعتبار سے***۔ لہذا کعبہ کے البَیْتِ الْعَتِیْقِ ($\frac{22}{29}$) ہونے میں اس کا آزاد، صاحب قوت، اور شرف و عظمت نیز زمان کے اعتبار سے سب سے بلند اور آگے ہونا، تمام معانی آجاتے ہیں۔ یہی مقام اقوام عالم میں امت مسلمہ کا تھا۔ اس لئے کہ کعبہ درحقیقت نشان (Symbol) ہے نظام خداوندی کا اور اس قوم کا جس کا وہ مرکز ہے۔ جسطرح دارالسلطنت یا عَلَمٌ کسی مملکت کا نشان ہوتا ہے۔ اور عَلَمٌ کی سربلندی سے مراد خود اُس مملکت کی سربلندی ہوتی ہے۔

زمان (Time) کے لحاظ سے کعبہ کے متقدم ہونے کے معنی یہ ہونگے کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے قومی مرکز (بیت المقدس) سے بہت پہلے (ملت ابراہیمی کے مرکز کی حیثیت سے) وجود میں آیا تھا۔

* تاج۔ ** محیط۔ *** راغب۔

ع ت ل

اَلْعَتَلَةُ ۔ لوہے کا ایک موٹا سا ڈنڈا جس کا ایک سرا آگے سے ذرا چوڑا ہو (گینتی)۔ اس سے زمین یا دیوار کھودی یا ڈھائی جاتی ہے ۔ نیز اس سے کھجور کی شاخیں کاٹی جاتی ہیں ۔ اَلْعَتْلُ ۔ کسی کو نہایت بیدردی اور بیرحمی سے گھسیٹنے اور اٹھا لینے ، نیز ہانکنے میں نہایت سختی اور طاقت سے زیادہ زور ڈالنے کے معنوں میں آتا ہے ۔ اَخَذَ بِزِمَامِ النَّاقَةِ فَعَتَلَهَا ۔ اس نے اونٹنی کی مہار پکڑی اور اسے نہایت بے دردی کے ساتھ کھینچا ۔ ابن السکیت نے کہا ہے کہ عَتَلَهٗ کے معنی ہوتے ہیں کسی کو جیلخانے کی طرف نہایت بے دردی سے کھینچ کر لے جانا یا دھکے دیکر لیجانا ۔ هُوَ مِعْتَلٌ ۔ وہ بیدردی کے ساتھ کھینچنے کی طاقت رکھتا ہے*۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْعَتْلُ کے معنی ہیں کسی چیز کو اس مقام سے پکڑنا جہاں اس کے مختلف حصے جمع ہو جاتے ہوں اور بزور اسے گھسیٹنا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی شدت اور قوت کے ہیں ۔

سورہ دخان میں ہے فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَاءِ الْجَحِيْمِ (۴۴/۴۷) ۔ اسے کھینچکر دوزخ کے اندر لے جاؤ ۔

اَلْعُتُلُّ ۔ بہت کھانے والا اور مال کو روک کر رکھنے والا ۔ خیر خواہی کی باتوں سے اعراض کرنے والا ۔ بہت جھگڑالو*** ۔ بیرحم ۔ بیدرد ۔ سخت گیر ۔ اس میں یہ تمام معانی آجائینگے ۔ قرآن کریم میں ہے عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ (۶۸/۱۳) ۔ (زَنِيْمٌ کے لئے دیکھئے عنوان ز ۔ ن ۔ م)

ع ت و

عَتَا ۔ يَعْتُوْ ۔ عِتِيًّا وَ عُتُوًّا ۔ حد سے تجاوز کر جانا ۔ حکم عدولی کرنا ۔ عَتَتِ الرِّيْحُ ۔ ہوا تندی و تیزی میں حد سے بڑھ گئی ۔ یعنی جھکڑ اور آندھی بن گئی*** ۔ سورۃ حاقہ میں قوم عاد کے متعلق ہے فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ (۶۹/۶) ۔ انہیں سخت زبردست آندھی کے طوفان نے ہلاک کر دیا ۔ لَيْلٌ عَاتٍ ۔ سخت تاریک رات کو کہتے ہیں*** ۔ مَلِكٌ عَاتٍ ۔ جابر اور سنگ دل بادشاہ کو**** ۔ سورۃ طلاق میں ہے عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا (۶۵/۸) ۔ اپنے نشو و نما دینے والے کے حکم سے سرکشی کی ۔

*تاج و محیط ۔ **راغب ۔ *** تاج ۔ ****محیط ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تکبر اور غرور کے ہیں ۔ سورۃ فرقان میں ہے وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيرًا (۲۵/۲۱) ۔ انہوں نے سخت سرکشی اختیار کی ۔ سورۃ مریم میں ہے أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا (۱۹/۶۹) جو رحمٰن کے خلاف سرکشی میں سب سے زیادہ سخت تھے ۔ لیکن دوسری جگہ یہ لفظ صرف شدت اور انتہا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا (۱۹/۸) ۔ میں بڑھاپے کی انتہا تک پہنچ گیا ہوں ۔ یعنی بہت بوڑھا ہو چکا ہوں ۔ راغب کہتا ہے کہ اس کے معنی ہیں بڑھاپے کی ایسی حالت تک پہنچ جانا جہاں اصلاح اور مداوا کا امکان نہ رہے ۔

ع ث ر

عَثَرَ الْعِرْقُ ۔ رگ پھڑکی ۔ عَثَرَ عُثُوْرًا ۔ کسی بات پر بغیر قصد کے مطلع ہو جانا ۔ عَثَرَ عَلَى السِّرِّ ۔ وہ راز سے واقف ہوا ۔ أَعْثَرَهُ ۔ اسے آگاہ اور مطلع کیا ۔ کہتے ہیں أَعْثَرْتُ فُلَانًا عَلَى كَذَا ۔ میں نے فلاں کو اس چیز سے باخبر اور اس پر مطلع کر دیا* ۔ قرآن کریم میں ہے وَكَذٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ (۱۸/۲۱) ۔ اس طرح ہم نے لوگوں کو ان پر مطلع کر دیا ۔ یعنی لوگوں کو ان کی خبر مل گئی ۔ ان کا پتہ چل گیا ۔ دوسری جگہ ہے فَإِنْ عُثِرَ عَلَى أَنَّهُمَا اسْتَحَقَّا إِثْمًا (۵/۱۰۷) ۔ اگر تمہیں یہ محسوس ہو، یا اس کا علم ہو جائے کہ انہوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہے ۔ اَلْعِثْيَرُ کسی چیز کے اثر خفی کو کہتے ہیں ۔ نیز مٹی ۔

ع ث ی

عثی کے معنی ہیں سخت فساد پیدا کرنا ۔ شیرازہ بکھیرنا* ۔ راغب نے کہا ہے کہ (ع ۔ ث ۔ ی) اور (ع ۔ ی ۔ ث) کا مفہوم قریب قریب ایک ہی ہے، تاہم بیشتر یہ لفظ (یعنی عَثَی) ذہنی اور فکری فساد کے لئے بولا جاتا ہے*** ۔ صاحب المنار نے لکھا ہے کہ عَثَا کے معنے ہیں شر اور فساد پھیلانا ، شرارت اور بد معاشی عام کرنا**** ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی فساد کے لکھے ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (۲/۶۰) ۔ ملک میں انتشار پیدا نہ کرو ۔ معاشرہ میں فساد مت پھیلاؤ ۔

---

*تاج ۔ **محیط نیز ابن فارس ۔ ***راغب ۔ ****المنار ، ج۱ ، ص۳۲۷ ۔

ع ج ب

اَلْعَجْبُ - جانور کی دم کا وہ حصہ جو سرین سے ملا ہوا ہو۔ ہر چیز کا آخری حصہ* - تَعَجُّبٌ اس حیرت کو کہتے ہیں جو کسی بات کا سبب معلوم نہ ہونے کی وجہ سے انسان کو لاحق ہو جاتی ہے - یا اس کیفیت کو کہ تم کسی چیز کو دیکھو اور وہ تمہیں پسند آئے اور تم سمجھو کہ تم نے ایسی چیز پہلے کبھی نہیں دیکھی - جس چیز سے تعجب کیا جاتا ہو، یا جس سے پہلے کبھی سابقہ نہ پڑنے کی وجہ سے اس سے اظہار حیرت و انکار کیاجائے، اسے عَجَبٌ کہتے ہیں**۔ اس گھبراہٹ کو بھی عَجَبٌ کہتے ہیں جو کسی کام کو بہت بڑا سمجھنے سے طاری ہوتی ہے - جس جیسی چیز عام طور پر نہ دیکھی جاتی ہو اسے عَجِیْبٌ کہتے ہیں۔ اَلْعُجْبُ کے معنی غرور اور تکبر۔ خودرائی اور خود پسندی کے ہوتے ہیں*۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ عَجِیْبٌ اس بات کو کہتے ہیں جس سے تعجب پیدا ہو اور عُجَابٌ اسے کہتے ہیں جو عَجِیْبٌ کی حد سے تجاوز کر گیا ہو۔

قرآن کریم میں ہے مَنْ یُّعْجِبُکَ قَوْلُہٗ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (۲۰۴/۲) - اس کے معنی حیرت میں ڈالنے یا بھلی معلوم ہونے کے ہیں - یعنی دنیاوی زندگی کے متعلق جس کی بات تمہیں حیرت میں ڈالتی ہے - سورۃ جن میں ہے اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۱/۷۲) - اس میں اس حیرت کی طرف اشارہ ہے جس کا سبب معلوم نہ ہو - یعنی وحی کی ماہیت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے تعجب، کہ یہ قرآن کریم اس قسم کا عجیب و غریب کس طرح بن گیا؟

سورۃ احزاب میں ہے وَلَوْ اَعْجَبَکَ حُسْنُھُنَّ (۵۲/۳۳) خواہ ان کا حسن تمہیں کتنا ہی اچھا کیوں نہ لگے -

ع ج ز

عَجْزٌ کے اصلی معنی کسی چیز سے پیچھے رہ جانے یا اسے ایسے وقت میں حاصل کرنے کے ہیں جب کہ وہ بالکل ہاتھ سے نکل رہا ہو۔ لیکن عام طور پر یہ لفظ کسی بات سے قاصر رہ جانے اور اسے کرنے کی طاقت نہ ہونے

*تاج و راغب - **قرآن کریم (۱/۷۲) میں جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں اس کے یہی معنی موزوں نظر آتے ہیں اگرچہ کتب لغت میں یہ معنی نہیں ملتے۔ اس کے مصدری معنی بھی کئے جا سکتے ہیں -

کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) کمزوری اور (۲) کسی چیز کا پچھلا حصہ لکھے ہیں۔ پیچھے رہ جانا خود عَجْزٌ کی دلیل ہے۔ چنانچہ اَلْعِجْزَۃُ۔ بوڑھے آدمی کے سب سے آخری بچے کو کہتے ہیں۔ تَعَجَّزْتُ الْبَعِیْرَ۔ میں اونٹ کے پچھلے حصے پر سوار ہو گیا*۔ اَلْعَجُوْزُ کے قریب ایک سو معانی کتب لغت میں لکھے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (عَجُوْزٌ عَقِیْمٌ ۵۱/۲۹) ۔ بوڑھی یا کمزور اور ضعیف عورت کے لئے آیا ہے۔ اَلْعَجُزُ۔ کولھا۔ کسی چیز کا آخری حصہ۔ اس کی جمع اَعْجَازٌ ہے۔ نیز درخت کے تنے کے آخری حصہ کو بھی کہتے ہیں جو زمین سے متصل ہوتا ہے۔ اَعْجَازُ نَخْلٍ (۵۴/۲۰) کے معنے ہیں کھجور کے درختوں کے جڑ والے تنے۔ اَعْجَزَ۔ عاجز کرنا۔ کمزور کرنا۔ کمزور سمجھنا۔ اِنَّھُمْ لَا یُعْجِزُوْنَ (۸/۵۹) ۔ وہ عاجز نہیں کر سکتے۔ مُعْجِزٌ۔ عاجز کرنے والا۔ شکست دینے والا (۲/۹)۔ نیز مُعَاجِزِیْنَ (۲۲/۵۱)۔ ایک دوسرے کو شکست دینے اور بے بس کرنے کی کوشش کرنے والے۔

قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ غلط روش پر چلنے والے جو جی میں آئے کرلیں، وہ کبھی قانون خداوندی کو شکست نہیں دے سکتے۔ جو قانون انسانوں سے شکست کھا جائے وہ خدا کا قانون کیا ہوا؟ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر انسانوں کی جماعت اس قانون کے نفاذ کی کوشش کرے تو وہ اپنے نتائج انسانی پیمانوں کے مطابق (جلدی) سامنے لے آتا ہے، اور اگر وہ کائناتی طریق پر کارفرما رہے تو اس کے نتائج کائناتی پیمانوں کے مطابق برآمد ہوتے ہیں (جن کی رو سے ایک ایک ''یوم'' ہزار ہزار سال کا بھی ہوتا ہے)۔ شکست اس قانون کو کبھی نہیں ہوسکتی۔

ہمارے ہاں جن معنوں میں معجزہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، (یعنی نبی سے کسی ایسی خارق عادت بات کا سرزد ہونا جسے دیکھ کر دوسرے عاجز آ جائیں) قرآن کریم میں یہ لفظ ان معنوں میں نہیں آیا۔

ع ج ف

اَلْعَجَفُ۔ موٹاپے کا جاتے رہنا۔ اَعْجَفُ** (جمع عِجَافٌ)۔ دبلا، لاغر،***۔ سورۃ یوسف میں سَبْعٌ عِجَافٌ (۱۲/۴۳) آیا ہے۔ یعنی سات دبلی پتلی (گائیں)۔ عَجَفَ نَفْسَہٗ عَنِ الطَّعَامِ۔ اس نے بھوک کی خواہش ہوتے ہوئے اپنے آپ کو کھانے سے روک لیا***۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (i) لاغری اور (ii) ضبطِ خواہش کے لکھے ہیں۔

*تاج و راغب۔ **بظاہر یہ عجیف کی جمع معلوم ہوتی ہے جس کے معنی لاغر ہیں۔ ***تاج و محیط۔

ع ج ل

اَلْعَجَلُ ۔ اَلْعَجَلَةُ ۔ جلدی ۔ تیزی ۔ راغب نے کہا ہے کہ اسکے معنی ہیں کسی چیز کو اسکے وقت سے پہلے ہی حاصل کر لینے کی خواہش ۔ اَعْجَلَتِ النَّاقَةُ ۔ اونٹنی نے وقت سے پہلے ہی نا تمام بچہ دیدیا ۔ اَلْاِعْجَالُ فِی السَّیْرِ ۔ اونٹ کا اٹھ کھڑے ہونے میں جلدی کرنا ۔ یعنی سواری ابھی اچھی طرح بیٹھنے بھی نہ پائے اور اونٹ اٹھ کھڑا ہو ۔ اَلْمِعْجَالُ ۔ وہ کھجور کا درخت جسکا پھل پہلے پک جائے ۔ اَلْعُجَیْلُ ۔ وہ تھوڑا سا کھانا جو کھانے سے پہلے یونہی سہارے کے لئے پیش کیا جائے ۔ مُسْتَعْجَلَاتُ الطَّرِیْقِ ۔ قریب اور مختصر راستے * ۔

قرآن کریم میں تَعَجَّلَ بمقابلہ تَاَخَّرَ آیا ہے (۲/۲۰۳) ۔ اور عَاجِلَةٌ بمقابلہ آخِرَةٌ (۱۷/۱۸-۱۹)؛ (۷۵/۲۰-۲۱) ۔ قرآن کریم کی یہ دو اصطلاحات (عَاجِلَةٌ اور آخِرَةٌ) بڑی غور طلب ہیں ۔ (انکے تفصیلی مفہوم کیلئے أ ۔ خ ۔ ر اور د ۔ ن ۔ و کے عنوانات دیکھئے) ۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ دو کسان ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک من گیہوں ہے جو انہوں نے بیج کے لئے رکھے ہیں ۔ انکے ہاں کھانے کی تنگی ہے ۔ ان میں سے ایک کسان اٹھتا ہے اور اپنا گیہوں چکی میں پسوا لاتا ہے ۔ اسکے گھر میں گھنٹہ بھر میں روٹیاں ہی روٹیاں ہو جاتی ہیں ۔ لیکن دوسرا کسان اس وقتی تنگی کو برداشت کر لیتا ہے اور اس گندم کو اپنے کھیت میں بو دیتا ہے ۔ اس پر چھ سات مہینے کا زمانہ تو بڑا سختی کا گزرتا ہے لیکن اسکے بعد اسکے گھر دانے ہی دانے ہو جاتے ہیں اور وہ بڑی فارغ البالی کی زندگی بسر کرتا ہے ۔

اول الذکر کسان نے عجلت سے کام لیا ۔ یعنی اسکی نگاہ مفاد عاجلہ پر تھی ۔ ایسے مفاد پر جو جلدی سے ہاتھ آجائیں ۔ لیکن دوسرے کسان کی نگاہ مفاد آخرہ پر تھی ، یعنی مستقبل کی خوش حالی اور فارغ البالی پر ۔ یہ ہے فرق عَاجِلَةٌ اور آخِرَةٌ کا ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جن لوگوں کی نگاہ صرف مفاد عاجلہ (پیش پا افتادہ مفاد) پر ہوتی ہے ہم انہیں مفاد عاجلہ دیدیتے ہیں ۔ لیکن مستقبل کی خوشگواریوں میں انکا کوئی حصہ نہیں ہوتا (۱۷/۱۸ ; ۲/۲۰۰) ۔ اسکے برعکس جو لوگ مستقبل کی خوشگواریوں پر نگاہ رکھتے ہیں تو انکا مستقبل بھی درخشندہ ہو جاتا ہے اور (ابتدائی محنت کے بعد) حال بھی خوشگوار (۱۷/۱۹ ; ۲/۲۰۱) ۔ یہی دو گروہ ہیں جنکا تقابل سارے قرآن کریم میں نظر آتا ہے ۔

* تاج و محیط ۔

ایک پیش پا افتادہ، قریبی مفاد کیطرف لپکنے والے۔ (تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَۃَ۔ (۷۵: ۲۰-۲۱؛ ۷۶: ۲۸) ۔ اور دوسرے، مستقبل کی خوشگواریوں کیلئے کوشش کرنے والے۔ ’’ مستقبل ‘‘ میں دونوں باتیں آجاتی ہیں ۔ اس زندگی میں موجودہ نسل کے بعد آنے والی انسانیت (Humanity) ۔ اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ۔ قرآن کریم وہ پروگرام دیتا ہے جسمیں عَاجِلَۃ اور آخِرَۃ۔ حال اور مستقبل ۔ دونوں کی خوشگواریاں حاصل ہو جائیں ۔ یا یوں سمجھئیے کہ ایک گروہ وہ ہے جو انسانی زندگی کو محض طبیعی زندگی (Physical Life) قرار دیتا ہے جس کے مفاد اور تقاضے پیش پا افتادہ ہوتے ہیں ۔ دوسرا گروہ، انسان کو عبارت سمجھتا ہے اسکی طبیعی زندگی اور اسکی ذات سے ۔ طبیعی زندگی، موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے لیکن انسانی ذات مرنے کے بعد آگے چلتی ہے ۔ اس لئے جن مفادات کا تعلق انسانی ذات سے ہے وہ عاجلہ کے مقابلہ میں آخرہ ہیں ۔ یہ مستقل اقدار سے حاصل ہوتے ہیں ۔ قرآن کریم ایسا پروگرام دیتا ہے جس میں انسان کی طبیعی زندگی کے تقاضے بھی بطریق احسن پورے ہو جاتے ہیں اور انسانی ذات کی نشوو نما بھی ہوتی جاتی ہے ۔ یوں ’’ دنیا اور آخرت ‘‘ دونوں کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں ۔

اَلْعَجَلُ ۔ لغت حمیر میں مٹی کو کہتے ہیں ۔ اسی لئے خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (۲۱: ۳۷) کے معنی کئے گئے ہیں انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے*۔ (اسکی تائید قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے ہوتی ہے جہاں تخلیق انسانی کی ابتدا طین ۔ مٹی ۔ سے بتائی گئی ہے ۔ ۳۲/۷) ۔ لیکن سورہ بنی اسرائیل میں ہے ۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (۱۷: ۱۱) ۔ انسان جلدباز ہے ۔ اس لئے (۲۱: ۳۷) میں بھی اسکے یہی معنی لئے جائیں تو زیادہ مناسب نظر آتا ہے ۔ بالخصوص جب اسی آیت میں فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بھی آیا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو وہ ہمیشہ مفاد عاجلہ کے پیچھے جاتا ہے ۔ یہ صرف وحی کا قانون ہے جس کے تابع چلنے سے اسکی نگاہ مستقبل پر بھی رہتی ہے ۔ دوسری طرف، اسی عجلت کا نتیجہ ہے کہ وہ ہمیشہ یہ اعتراض کرتا ہے کہ اسکی غلط روش کے نتائج فوراً سامنے کیوں نہیں آتے ۔ حالانکہ خدا کے قانون مہلت کی رو سے ہر عمل اور اس کے نتیجے میں ایک وقفہ ہوتا ہے (جسطرح بیج اور اسکے پھل کے درمیان ایک مہلت کی مدت ہوتی ہے) ۔ جن کی نگاہ خدا کے اس قانون پر ہوتی ہے وہ اس سے نہیں گھبراتے کہ مخالفین کی غلط روش کا نتیجہ فوراً کیوں نہیں سامنے آتا ؟ انہیں خدا کے محکم قانون کی نتیجہ خیزی پر یقین ہوتا ہے ۔

* محیط ۔

اَلْعِجْلُ ۔ بچھڑا ۔ بعض کا خیال ہے کہ ایک ماہ تک کی عمر کے گائے کے بچے کو عِجْلٌ کہتے ہیں *۔ (۳/۹۲) ؛ (۲/۸۸) ۔ لیکن بعض کا خیال ہے کہ ایک سال تک کی عمر کے گوسالہ کو عِجْلٌ کہتے ہیں **۔ راغب نے کہا ہے کہ اس میں عجلت کا تصور موجود ہے ۔ یعنی بچھڑا پھرتیلا اور تیز ہوتا ہے اور یہ پھرتی اور تیزی بیل بننے کے بعد اس میں باقی نہیں رہتی ***۔

سورہ القیٰمۃ میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے لَا تُحَرِّکْ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ (۷۵/۱۶) ۔ اس کے لفظی معنی ہیں ، تو اپنی زبان کو اسکے ساتھ حرکت نہ دے تاکہ اسے جلدی لے لے ۔ لیکن (جیسا کہ ح ۔ ر ۔ ک کے عنوان میں بھی لکھا گیا ہے) اس کے معنی (۲۰/۱۱۴) کو ساتھ ملانے سے واضح ہو جاتے ہیں جہاں کہا گیا ہے کہ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰی اِلَیْکَ وَحْیُہٗ ، یعنی تو (کسی نقطہ کے متعلق) عملی قدم اٹھانے میں عجلت نہ کر تاآنکہ اس کے متعلق پورا پروگرام بذریعہ وحی تجھے دیدیا جائے ۔ جب وحی سارا پروگرام سامنے لے آئے پھر اس کے متعلق عملی اقدام کرو ۔

ہم نے (ح ۔ ر ۔ ک) کے عنوان میں ضمناً یہ بھی کہا ہے کہ اس سے انسانی اعمالنامہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے ۔ اس صورت میں (۷۵/۱۶) کا (۲۰/۱۱۴) سے تعلق نہیں ہوگا ۔ لیکن (۲۰/۱۱۴) کا مفہوم اس کے بغیر بھی واضح ہے ۔

ع ج م

لغت عرب میں (ع ۔ ج ۔ م) کا مادہ ابہام اور اخفاء کیلئے آتا ہے ۔ یعنی وضاحت اور بیان کے خلاف ۔ اَلْاَعْجَمُ ۔ وہ آدمی جسکی بات فصیح اور واضح نہ ہو اگرچہ وہ عرب ہی کیوں نہ ہو (جمع اَعَاجِمُ ۔ اَعْجَمُوْنَ اَعْجَمِیْنَ) ۔ پھر اسکے بعد اَلْعَجَمِیُّ ہر غیر عرب کیلئے بولا جانے لگا خواہ وہ فصیح ہی کیوں نہ ہو ۔ اَلْاَعْجَمُ ۔ گونگا ۔

لطائف اللغۃ میں ہے کہ اَلْعَجَمِیُّ غیر عرب کیلئے بولا جاتا ہے خواہ وہ فصیح البیان ہی کیوں نہ ہو ۔ اور اَلْاَعْجَمِیُّ غیر فصیح ، خواہ وہ عربی ہی کیوں نہ ہو ۔ اَعْجَمَ فُلَانٌ الْکَلَامَ ۔ فلاں نے بات مبہم رکھی ۔ بَابٌ مُّعْجَمٌ ۔ بند دروازہ ۔ اِسْتَعْجَمَتِ الدَّارُ ۔ گھر سونا ہو گیا اور اسمیں جواب دینے والا کوئی نہ رہا ****۔ ابن فارس نے سکوت اور خاموشی

---

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** راغب ۔ **** تاج ۔ محیط و راغب ۔

کو اس کے بنیادی معنوں میں لکھا ہے ۔ قرآن میں اَعْجَمِیٌّ بمقابلہ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ* آیا ہے (۱۶/۱۰۳) ۔ نیز دیکھئے (۲۶/۱۹۸ ؛ ۴۱/۴۴) ۔ اَلْعَرَبِیٌّ کے معنی فصیح ہیں (دیکھئے عنوان ع ۔ ر ۔ ب)

ع د د

اِعْدَادٌ* کے معنی ہیں تیار کرنا ۔ مہیا کرنا ۔ اَعْدَدْتُ لِحَوَادِثِ الدَّهْرِ مِنَ الْمَالِ وَالسِّلَاحِ کے معنی ہیں میں نے حوادث زمانہ کے لئے مال و ہتھیار کی پوری پوری تیاری کر لی ۔ اِسْتَعَدَّ لَهُ کے معنی بھی یہی ہیں ۔ یعنی اس کے لئے مستعد اور تیار ہو گیا ۔ عَدَّ یَعُدُّ عَدًّا کے معنی ہیں شمار کرنا ۔ گنتی کرنا ۔ عَدَدٌ* اور عَدِیْدٌ* اس سے اسم آیا ہے* ۔ (وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۱۴/۳۴) ۔ مَعْدُوْدٌ* ۔ گنے ہوئے* ۔ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً (۲/۸۰) گنتی کے دن* ۔ وہ دن جن کی تعداد معلوم ہو ۔ چنانچہ جب حضرت یوسف کو قافلہ والوں نے بازار مصر میں بیچا ہے تو اس کے لئے قرآن کریم میں دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ (۱۲/۲۰) آیا ہے ۔ یعنی انہوں نے اسے چند گنتی کے سکوں کے عوض بیچڈالا ۔ روزوں کے لئے بھی اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ آیا ہے (۲/۱۸۴) ۔ لیکن اس کی تشریح ذرا آگے چل کر کردی گئی ہے جہاں کہا گیا کہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (۲/۱۸۵) ۔ یعنی جو تم میں اس مہینہ (رمضان) میں اپنے مکان پر موجود ہو اسے چاہئیے کہ اس کے روزے رکھے ۔ اس سے واضح ہے کہ روزے رمضان کے پورے مہینے کے ہیں ۔ عِدَّةٌ* اس شمار کی ہوئی مدت کو کہتے ہیں جس میں عورت دوسری جگہ نکاح نہیں کر سکتی* ۔ اور اَلْعُدَّةُ* اس مال و دولت یا ساز و سامان کو کہتے ہیں جسے حوادث زمانہ کا مقابلہ کرنے کے لئے انسان تیار رکھے* ۔ عَدًّا ۔ شمار کرنا (۱۹/۸۴) ۔ عَدَدًا ۔ متعدد ، گنے ہوئے ، (۱۸/۱۱) ۔ عِدَّةٌ* ۔ تعداد ۔ گنتی (۹/۳۶) ۔ عُدَّةٌ* ۔ سامان جو تیار ہو ۔ جو کسی حادثہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رکھا جائے ۔ (۹/۴۶) ۔ اَعَدَّ ۔ تیار کرنا ۔ مہیا کرنا (۹/۱۰۰) ۔ اِعْتَدَّ ۔ شمار کرنا (۳۳/۴۹) ۔

ع د س

اَلْعَدَسُ* ۔ مسور کو کہتے ہیں* ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ (۲/۶۱) میں آیا ہے ۔

*تاج و محیط ۔

ع د ل

اَلْعِدْلُ ۔ اونٹ کے دونوں طرف جو بوجھ لادا جاتا ہے اور جو ایک دوسرے کے بالکل برابر ہوتا ہے ۔ ان میں سے ہر ایک عِدْلٌ کہلاتا ہے ۔ لہٰذا اس کے بنیادی معنی ہیں برابر ہونا ۔ عَدَّلَ الْمِیْزَانَ ۔ میزان کو برابر کر دیا ۔ فَاعْتَدَلَ ۔ پس میزان برابر ہوگئی ۔ عَادَلَہٗ مُعَادَلَۃً ۔ اس کے ہموزن اور برابر ہوا۔ عَادَلَ بَیْنَ الشَّیْئَیْنِ ۔ دو چیزوں کو باہمدگر ہم وزن کیا ۔ برابر کیا ۔ نیز دو چیزوں کا موازنہ کیا۔ عَدَّلَہٗ فِی الْمَحْمِلِ وَعَادَلَہٗ ۔ محمل میں کسی دوسرے کے ساتھ سوار ہونا اور اس کے ساتھ وزن میں برابر ہونا۔ اَلْعَدْلُ ۔ اَلْعِدْلُ ۔ اَلْعَدِیْلُ ۔ مثل اور نظیر ۔ ہموزن ۔ اِعْتِدَالٌ ۔ کمیّت و کیفیت کے لحاظ سے دو حالتوں کے درمیان ہونا ۔ تناسب و توازن ۔ قرآن کریم میں ہے فَعَدَلَکَ (۸۲/۷) ۔ خدا نے انسان کو متناسب الاعضاء بنایا ۔ اس میں پورا پورا توازن و تناسب قائم رکھا۔ اسے سیدھا کھڑا کیا ۔ اس کے لئے توازن کا برقرار رہنا ضروری ہوتا ہے ۔

کسی چیز کے برابر اس کا معاوضہ عَدْلٌ کہلاتا ہے ۔ اَوْ عَدْلُ ذٰلِکَ صِیَامًا (۵/۹۵) ۔ ”یا اس کے برابر روزے رکھنا“ ۔ ابن فارس نے عَدْلٌ کے معنے فدیہ بھی بتائے ہیں ۔ لَا یُؤْخَذُ مِنْھَا عَدْلٌ (۲/۴۸) ۔ اس سے معاوضہ یا فدیہ نہ لیا جائیگا ۔ یا وَاِنْ تَعْدِلْ کُلَّ عَدْلٍ (۶/۷۰)۔ اور اگر وہ ہرقسم کا معاوضہ دینا چاہے ۔ سورۃ حجرات میں عَدْلٌ اور قِسْطٌ کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں (۴۹/۹) ۔ (قِسْطٌ کا مفہوم عنوان ق ۔ س ۔ ط میں بیان کیا جائیگا) ۔ قرآن کریم نے عَدْلٌ اور اِحْسَانٌ کا حکم دیا ہے (۱۶/۹۰)۔ کسی کو پورا پورا معاوضہ دے دینا عَدْلٌ ہے اور اس کی کمی کو پورا کرکے اس کے توازن (حسن) کو قائم کر دینا اِحْسَانٌ ہے (دیکھئے عنوان ح ۔ س ۔ ن)۔

مثل اور نظیر کے معنوں میں یہ لفظ سورۃ انعام میں آیا ہے جہاں مشرکین کے متعلق کہا ہے کہ وَھُمْ بِرَبِّھِمْ یَعْدِلُوْنَ (۶/۱۵۰) ۔ یہ لوگ دوسروں کو خدا کے برابر ٹھہراتے ہیں ۔

عَدَلَ عَنِ الطَّرِیْقِ کے معنی ہیں راستہ سے ہٹ جانا ۔ عَدَلَ الطَّرِیْقُ ۔ راستہ ایک طرف کو مڑا یا جھکا* ۔ عَادَلَ الشَّیْیُٔ ۔ وہ چیز ٹیڑھی ہوگئی** ۔ سورۃ النمل میں ہے بَلْ ھُمْ قَوْمٌ یَعْدِلُوْنَ (۲۷/۶۰)۔

*تاج ۔ **محیط ۔

یہ وہ لوگ ھیں جو سیدھے راستے سے ایک طرف ھٹ گئے ھیں ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی دو ھیں جو ایک دوسرے کی ضد ھیں ۔ یعنی ھموار ھونا ۔ اور ٹیڑھا ھونا ۔ لیکن غالب یہ ھے کہ ٹیڑھا ھونے کا مفہوم عَنٌ سے پیدا ھوتا ھے ، خواہ وہ مقدر کیوں نہ ھو ۔

قرآنی معاشرہ کی بنیادیں عدل و احسان پر استوار ھوتی ھیں ۔ اس معاشرہ میں ھر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ ملتا ھے ۔ کسی پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ھوتی ۔ لیکن اس معاشرہ کے افراد نے شروع ھی سے یہ عہد کر رکھا ھوتا ھے کہ وہ اپنی محنت کا معاوضہ اتنا ھی لینگے جو ان کی ضروریات کے لئے کافی ھو ۔ باقی سب نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دینگے ۔ (۲/۲۱۹) ۔ یہ بقایا ان لوگوں کے لئے ھوگا جو کسی وجہ سے محنت کرنے کے قابل نہیں رھے اور جن کی محنت کا ماحصل ان کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ھوسکتا ۔ ان کی اس کمی کو پورا کردینے کا نام اِحْسَانٌ ھے ۔ یہ احسان کسی پر ''احسان'' نہیں ھوتا ۔ نہ ھی اس کی شکل خیرات کی ھوتی ھے ۔ ان تمام افراد معاشرہ نے اس امر کا عہد کر رکھا ھوتا ھے کہ ان کی محنت کا ماحصل سب کی نشو و نما کے لئے کھلا رھے گا ۔ یہ سب کچھ نظام معاشرہ کی تحویل میں رھتا ھے اور تمام افراد معاشرہ کی نشوونما کے کام آتا ھے ۔ یہی وجہ ھے کہ قرآن کریم نے عدل و احسان کے حکم کے ساتھ ھی کہدیا ھے کہ فَحْشَاءُ اور مُنْکَر سے باز رھو (۱۶/۹۰) ۔ فَحْشَاءُ کہتے ھیں۔ بخل کو ، اور مُنْکَرٌ کہتے ھیں عقلِ فریب کار کی حیلہ جوئیوں کو جو انسان کو زیادہ سے زیادہ سمیٹ لینے پر اکساتی رھتی ھے ۔

ع د ن

عَدَنَ ۔ یَعْدُنُ وَ یَعْدِنُ ۔ کسی جگہ قیام کرنا ۔ ٹھہرنا ۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ ۔ ایسے باغات جن میں جم کر قیام کیا جاسکے ۔ اَلْمَعْدِنُ ۔ کان ۔ (Mine) ۔ ھر چیز کی جگہ جہاں اس کی پیداوار ھو اور وہ وھاں مستقل طور پر پائی جائے ۔ ھر چیز کا مرکز ۔ اَلْمَعَادِنُ ۔ جڑیں * ۔ قرآن کریم میں جَنّٰتِ عَدْنٍ (۹/۷۲) آیا ھے ۔ اس کے معنی ھیں راحت و آرام کی قیام گاھیں ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی ''قیام کرنے کے باغ'' لکھے ھیں ۔ یعنی ایسے باغیچے جن میں قیام بھی کیا جاسکے ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ کتاب الاشتقاق ۔

ع د و

اَلْعَدَاءُ وَ الْعَدَوَاءُ کے معنے ہیں دوری ۔ اَلْعِدَیٰ ۔ اجنبی لوگ جو ایک دوسرے سے الگ ہوں ۔ اَلْعُدْوَۃُ ۔ دور جگہ ۔ الیعْدْوَۃُ (ع پر تینوں حرکتیں) کنارہ ۔ اَلْعِدَیٰ ۔ وہ لکڑی جو دو لکڑیوں کے درمیان دیدی جاتی ہے (اس طرح وہ دونوں لکڑیاں ایک دوسرے سے دور رہتی ہیں) ۔ تَعَادَیٰ کے معنی ہیں ایک دوسرے سے دور ہونا* ۔ گویا اس مادہ میں ایک بنیادی مفہوم دوری کا پایا جاتا ہے ۔

اسی بُعد اور افتراق کی وجہ سے عَدُوٌّ دشمن کو کہتے ہیں ۔ یعنی صَدِیْقٌ (دوست) کی ضد ۔ نیز وَلِیٌّ کی ضد (یعنی جو مددگار نہ ہو) ۔ تَعَادَی الْقَوْمُ ۔ قوم نے ایک دوسرے سے دشمنی رکھی* ۔ اَلْعِدَیٰ ۔ وہ دشمن جس سے تمہاری جنگ ہو ۔ اَلْعَادِیَاتُ ۔ مجاہدین کے دوڑنے والے گھوڑے ۔ (یعنی دور دور تک دوڑ کر چلے جانے والے) ۔

عَدَا ۔ یَعْدُوْ ۔ عَدْوًا ۔ عَدَوَانًا ۔ تَعْدَاءً کے معنی ہیں تیز چلنا ۔ دوڑنا ۔ تَعَادَوْا کے معنی ہیں انہوں نے تیز رفتاری میں ایک دوسرے کا مقابلہ کیا* ۔ راغب نے کہا ہے کہ عَدْوٌ کے اصلی معنی حد سے بڑھنا اور باہمی تطابق و ہم آہنگی نہ ہو سکنا ہیں ۔ اگر یہ صورت محض رفتار کے اعتبار سے ہو تو اسے عَدْوٌ کہا جاتا ہے اور اگر دلی کیفیت کے اعتبار سے ہو تو یہ عَدَاوَۃٌ کہلاتی ہے ، اور اگر عدل و انصاف میں ابتری سے ہو تو عُدْوَانٌ کہلائیگی* ۔ عَدَا عَلَیْہِ کے معنی ہیں اس نے اس پر ظلم کیا ۔ یعنی حد سے تجاوز کیا ۔ تَعَدَّاہُ ۔ وہ اس سے تجاوز کر گیا ، آگے بڑھ گیا ۔ اور اِعْتَدَیٰ عَلَیْہِ کے معنی ہیں اس پر ظلم و زیادتی کی* ۔ عُدْوَانٌ کے معنی بزور اور بدترین طریقہ سے ، حد سے تجاوز کرنا بھی ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز میں حد سے بڑھنا اور ایسے معاملہ میں آگے بڑھ جانا جس میں ایک خاص حد میں رہنا چاہئے تھا ۔

اَعْدَی الْاَمْرَ ۔ وہ ایک معاملہ سے دوسرے کی طرف بڑھ گیا ۔ اَعْدَاہُ الدَّاءُ ۔ بیماری اس کے ساتھ دوسرے کو لگ گئی ۔ مرض متعدی ہو گیا* ۔ اَلتَّعَادِیْ نا ہموار جگہوں کو کہتے ہیں* ۔ اَلْعَدْوَیٰ کے معنی ہیں بیماری کا متعدی ہونا ۔ نیز کسی والی یا امیر سے ظالم کے خلاف مدد طلب کرنا** ۔

*تاج ۔ **محیط ۔

قرآن کریم میں قصہ* آدم میں ہے کہ جب انسانوں نے "امت واحدہ" کے بجائے باہمی تشتت و افتراق (مشاجرت) کی زندگی شروع کردی تو ان کی انفرادی مفاد پرستیاں ایک دوسرے کے درمیان حائل ہو گئیں اور ان میں دوری اور بُعد پیدا ہوگیا ۔ بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ* (۲/۳۶) ۔ اس کے برعکس زندگی اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ (۳/۱۰۲) کی ہے ، جس میں دلوں کو اس طرح ایک دوسرے سے پیوست کر دیا جائے جس طرح بادل کا ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے میں جذب ہو جاتا ہے ۔ باہمی عَدَاوَۃٌ* سے اَلتَّعَادِیْ ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ اس لئے یہ مادہ مَوَدَّۃٌ* کے مقابلہ میں آیا ہے (۶۰/۷) ۔

سورۃ بقرۃ میں اِعْتِدَاءٌ* اور عِصْیَانٌ* مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں (۲/۶۱) ۔ یعنی سرکشی اور حدود فراموش ۔ اسی طرح عُدْوَانٌ* کا لفظ تَقْوٰی کے مقابل میں آیا ہے (۵/۲) ۔ تقویٰ کے معنی ہیں قوانین خداوندی (حدود اللہ) کی نگہداشت کرنا ۔ لہذا عُدْوَانٌ* کے معنی ہوئے حدود فراموشی- حد سے تجاوز کر جانا ۔ (۲/۱۹۳) میں یہ لفظ (عُدْوَانٌ*) اس زیادتی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جسے سزا کہا جاتا ہے ۔ یعنی ظالموں کو خود ان کا عدوان گھیر لیتا ہے ۔ سورۃ مائدہ میں عَدَاوَۃٌ* اور بَغْضَاءٌ اکٹھا آیا ہے (۵/۶۴) ۔ سورۃ کہف میں ہے وَلَا تَعْدُ عَیْنَاکَ عَنْهُمْ (۱۸/۲۸)۔ تم انہیں (Over Look) نہ کرو ۔ نظر انداز نہ کرو ۔ (۸/۴۲) میں عُدْوَۃٌ* کے معنی کنارہ ہیں ۔

قرآن کریم میں جرم کے لئے اِثْمٌ* اور عُدْوَانٌ* کے الفاظ بالعموم اکٹھے آئے ہیں (مثلاً ۲/۸۵) ۔ اِثْمٌ* کے معنے ہیں ایسا کام جس سے انسان کی صلاحیتوں میں کمی آجائے اور اس لئے وہ دوسرے افرادِ کارواں کے ساتھ نہ چل سکے بلکہ ان سے پیچھے رہ جائے (دیکھئے عنوان ا ۔ ث ۔ م) ۔ اور عُدْوَانٌ* کے معنی ہیں سرکشی کرکے آگے بڑھ جانا ۔ اسلام کا نظام یہ ہے کہ تمام افراد امت باہمدگر، بانھوں میں بانہیں ڈالے، ایک دوسرے کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں (دیکھئے عنوان س ۔ ل ۔ م) ۔ جو شخص جماعت سے بچھڑ کر پیچھے رہ گیا (اِثْمٌ*) وہ بھی مجرم ہے اور جو سرکشی اختیار کرکے ان سے آگے نکل گیا (عُدْوَانٌ*) وہ بھی مجرم ہے ۔ اور اگر عُدْوَان کو تَعْدِیَۃٌ* سے لیا جائے تو اس سے مراد ہونگے ایسے جرائم جن کا اثر متعدی ہو، یعنی جن کے

*تفصیل ان امور کی ا ۔ د ۔ م اور ش ۔ ج ۔ ر کے عنوانات میں دیکھئے۔

اثرات سے دوسرے افراد معاشرہ بھی متاثر ہوں ، اور اثم سے مراد ہونگے ایسے جرائم جن کا اثر اس شخص کی ذات تک محدود رہے ۔ (مزید تفصیل ا ۔ ث ۔ م کے عنوان میں دیکھئے) ۔

عَادٍ (۲/۱۷۳) ۔ حدود شکنی یا سرکشی کرنے والا ۔ تَعَدّٰی (۲/۲۲۹) تجاوز کرنا ۔ حد سے آگے بڑھ جانا ۔ اِعْتَدٰی (۲/۱۷۸) زیادتی کرنا ۔ مُعْتَدٍ (۲/۱۹۰) ۔ زیادتی کرنے والا ۔ اس کی جمع مُعْتَدُوْنَ اور مُعْتَدِیْنَ ہے ۔

ع ذ ب

اس مادہ کے بنیادی معنوں میں تین باتیں شامل ہیں (۱) پانی کی خوشگواری اور شیرینی جو پیاس کو روک دیتی ہے ۔ (۲) اذیت اور تکلیف جو زندگی کے آرام میں حائل ہوتی ہے ۔ اور (۳) بندش ، منع کرنا ، اور رکاوٹ * ۔ ان معانی کو سمجھنے کیلئے صحرائے عرب کی زندگی کا سامنے رکھنا ضروری ہے ۔ وہاں پانی بہت کمیاب تھا ، اور پھر شیریں پانی ؟ یہ نعمت بڑی تلاش و جستجو ، محنت و مشقت اور لڑائی جھگڑوں کے بعد ملا کرتی تھی ۔ کئی کئی دن اس سے رکنا پڑتا تھا (یعنی بغیر پانی کے رہنا پڑتا تھا) تب کہیں جا کر آب شیریں حاصل ہوتا تھا ۔ اس نقشہ کو سامنے رکھئے اور پھر اس مادہ کی تفصیلات پر غور کیجئے ۔ اَلْعَذْبُ ۔ خوشگوار شیریں پانی ۔ قرآن کریم میں ہے هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ (۲۵/۵۳) ۔ یہ خوشگوار اور شیریں (پانی والا) ہے ۔ اِسْتَعْذَبَ الرَّجُلُ مَاءَهٗ ۔ وہ شخص میٹھا پانی لایا ۔ اور اَعْذَبَ الْحَوْضَ کے معنی ہیں تالاب میں پانی کے اوپر جو تنکے وغیرہ پڑ گئے ہوں انہیں صاف کر دینا ۔ اَلْاَعْذَبَانِ ۔ دو خوشگوار چیزیں ۔ یعنی کھانا اور لذت جماع ۔ یا شراب اور لعابِ دہن * ۔

اب اذیت اور تکلیف کا پہلو لیجئے ، عَذَبٌ ان تنکوں (یا کوڑے کرکٹ) کو کہتے تھے جو پانی کے اوپر پڑجائیں اور اسطرح اسے مکدر کر دیں ۔ ان کپڑے کی چندیوں کو بھی کہتے ہیں جسے نوحہ کرنے والی عورتیں اپنے ساتھ رکھتی ہیں ۔ عَذْبَةٌ ایک درخت جسے کھا کر اونٹ مر جاتے ہیں ۔ عَذَابٌ ۔ سزا ، نیز بھوک ، پیاس اور تکلیف کو بھی کہتے ہیں * ۔

اب بندش اور رکاوٹ کے مفہوم کو لیجئے ۔ عَذُوْبٌ اور عَاذِبٌ اُس آدمی یا اونٹ یا گھوڑے کو کہتے ہیں جو پیاس کی شدت کی وجہ سے

---

*تاج و محیط ۔

کھانا پینا چھوڑ دے۔ جو بغیر کچھ کھائے رات گذار دے اسے بھی عَاذِبٌ کہتے ہیں *۔ نیز اسے بھی جسے حفاظت اور سایہ کے لئے چھت نصیب نہ ہو**۔ لہذا بھوک، پیاس، تکلیف، خانماں خرابی، سب کیلئے عَذَابٌ کا لفظ آیا ہے۔ روکنے کیلئے عَذَبَہٗ عَنِ الشَّیْءِ وَ اَعْذَبَہٗ وَ اسْتَعْذَبَہٗ کہتے ہیں۔ یعنی اسے کسی چیز سے روک دیا***۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے معانی کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا نہ ہی ان سب کو کسی ایک معنی پر متحد کیا جا سکتا ہے۔

قرآن کریم نے ان تمام سختیوں اور تکلیفوں کیلئے جو فرعون کی قومِ غالب اپنی محکوم قوم بنی اسرائیل پر روا رکھا کرتی تھی عَذَابٌ کا لفظ استعمال کیا ہے (مثلاً ۲/۴۹)۔ اور سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں مُفْلِحُوْنَ (کامیاب اور کامران گروہ) کے مقابلہ میں لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۲/۷) لا کر بتا دیا ہے کہ عَذَابٌ کے معنی زندگی کی خوشگواریوں سے محرومی و ناکامی ہیں۔ ایسی محرومی کہ پھر زندگی کی شیرینیوں سے متمتع ہونے کی صلاحیت ہی نہ رہے۔

نیز یہ لفظ جرم کی اس سزا کے لئے بھی آیا ہے جو عدالت سے ملتی ہے (۵/۳۳ ; ۲۴/۲)۔ اس میں اذیت کے مقابلہ میں روکنے کا پہلو زیادہ نمایاں ہے کیونکہ سزا سے مقصود ہی جرائم کی روک تھام ہے۔

خدا کیطرف سے عَذَابٌ کے معنی ہیں انسانوں کے غلط کاموں کے تباہ کن اور ہلاکت انگیز نتائج۔ اس اعتبار سے اللہ کو مُعَذِّبٌ کہا گیا ہے (۷/۱۶۴)۔ اور جو اسطرح تباہ و برباد ہوجائے وہ مُعَذَّبٌ ہے (۲۶/۲۱۳)۔

قرآن کریم کی رو سے دنیاوی زندگی میں ذلت و خواری، خدا کا عذاب ہے (۲۰/۱۳۴)۔ بھوک اور خوف، عذاب ہے (۱۶/۱۱۲)۔ برکاتِ سماوی اور ارضی کے دروازوں کا بند ہو جانا عذاب ہے (۷/۹۶)۔ گروہ بندی اور پارٹی بازی عذاب ہے (۶/۶۵)۔ باہمی اختلاف، عذاب ہے (۳/۱۰۴)۔ [اختلافات کا مٹ جانا رحمت ہے۔ ۱۱/۱۱۸، ۱۱۹]۔ یہ عذاب خداوندی کی صرف چند شکلیں ہیں۔ تفصیل اس کی قرآن کریم کے صفحات میں شروع سے آخر تک پھیلی ہوئی ہے۔

ع ذ ر

اَلْعَذْرُ۔ ایسی کوشش جس سے انسان اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کو مٹا دینا چاہے****۔ نیز وہ حجت جسے انسان بطور اعتذار پیش کرے*****۔

* تاج و لین۔ ** لین۔ ***تاج و محیط۔ ****راغب۔ *****محیط۔

ابن فارس نے اس کے معنی لکھے ہیں انسان کا محض باتوں سے ان اعتراضات و الزامات کو رفع کرنے کی کوشش کرنا جو اس پر عائد کئے جائیں ۔ عَذِرَۃٌ کے اصلی معنی مکانات کے سامنے کا کھلا میدان ہیں ۔ اس کے بعد ان نجاستوں اور گندگیوں کو کہنے لگے جو ان میدانوں میں پھینکی جاتی ہیں* ۔ عَذَّرَ الشَّیْءَ ۔ چیز کو گندگی سے آلودہ کر دیا ۔ پھر (سلب خاصیت کے طور پر) باب افعال سے نجاست اور آلودگی کو الگ کرنے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ۔ چنانچہ اَعْذَرَ الْغُلَامَ اِعْذَارًا کے معنی ہیں اس نے لڑکے کا ختنہ کر دیا ۔ لڑکی کے پردہ بکارت کو بھی عُذْرَۃٌ کہتے ہیں ۔ دوسری طرف اَعْذَرَ الرَّجُلُ اِعْذَارًا کے معنی ہیں اس آدمی کے عیوب بہت زیادہ ہوگئے ۔ اَعْذَرَتِ الدَّارُ ۔ گھر میں غلاظت بہت ہوگئی ۔ اِعْتَذَرَتِ الْمَنَازِلُ ۔ مکانوں کے نشانات مٹ گئے** ۔ اس مادہ کے اسی قسم کے مختلف معانی کے پیش نظر ابن فارس نے کہا ہے کہ اس میں قیاس کو بالکل دخل نہیں ، بلکہ اس کا ہر لفظ اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے ۔

الغرض اس کے معنوں میں آلودگیوں کا زیادہ ہو جانا بھی ہیں اور آلودگیوں کے نشان کا مٹ جانا بھی ۔

سورۃ مرسلٰت میں ہے عُذْرًا اَوْ نُذْرًا (۷۷/۶) ۔ سورۃ روم میں مَعْذِرَتُهُمْ (۳۰/۵۷) آیا ہے ۔ یہاں مَعْذِرَۃٌ مصدر بمعنی عذر ہو سکتا ہے ۔ نیز اس کے معنے عذرخواہی اور معذرت کے علاوہ حجت بھی ہیں** ۔ اور سورۃ قیامۃ میں مَعَاذِیْرَہٗ (۷۵/۱۵) ہے، جس کا واحد مِعْذَارٌ ہے ۔ لغت یمن میں مَعَاذِیْرُ کے معنے پردے اور حجابات ہیں ۔ اس طرح اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ کے معنے اصل حقیقت پر پردے ڈالنا ہونگے ۔ نیز اس کے معنے حجتیں پیش کرنا بھی ہیں ۔

سورۃ توبہ میں ہے لَا تَعْتَذِرُوْا (۹/۶۶) جس کے معنے بہانہ سازیاں کرنا ہیں ۔ عَذَّرَ کے معنی ہیں ایسا عذر پیش کرنا جو ثابت نہ ہو** ۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں مُعَذِّرُوْنَ (۹/۹۰) ۔ کے یہی معنی ہیں ۔ یعنی جھوٹے عذر پیش کرنے والے ۔ بہانہ سازیاں کرنے والے ۔ کوتاہیاں کرنے والے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ان لوگوں کے ہیں جن کے پاس کوئی عذر تو نہ تھا لیکن وہ بتکلف عذر بناتے تھے ۔ تَعَذَّرَ الْاَمْرُ عَلَیْهِ ۔ اس پر کام مشکل یا دشوار ہوا ۔

* راغب ۔ ** تاج ۔

لہذا عُذْرٌ جہاں سچے دل سے ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس شخص کو اپنی خطا کا احساس ہے اور وہ صحیح طور پر بتاتا ہے کہ اس سے ایسا کیوں ہؤا ، یہ عذر مستحسن ہے ۔ لیکن دوسری قسم کا عذر یہ ہے کہ انسان جان بوجھ کر اپنے قصور کی غلط توجیہ کرتا ہے اوراس طرح محض باتوں سے اس کا ازالہ کردینا چاھتا ہے ۔

ع ر ب

اَلْعَرَبُ ۔ اَلْعُرْبُ ۔ اھل عرب ۔ راغب نے لکھا ہے کہ حضرت اسمٰعیل ؑ کی اولاد کو اَلْعَرَبُ کہتے ھیں* ۔ لیکن صاحب تاج کے نزدیک یَعْرُبُ بْنُ قَحْطَانَ کی اولاد عرب عاربہ کہلاتی ہے ۔ یہ شخص یمنی قبائل کا جد اعلیٰ تھا اور اسی نے پہلے پہل عربی زبان میں گفتگو کی تھی** ۔ (لیکن یہ توجیہ کچھ وقیع نظر نہیں آتی)۔ اَلْاَعْرَابُ ۔ اَعْرَابِیٌّ کی جمع ہے ۔ یہ لفظ بادیہ نشین (یعنی دیہات اور جنگلوں میں رہنے والے) عربوں کے لئے مختص ہوگیا*** ۔ قرآن کریم میں اَلْاَعْرَابُ ($\frac{9}{97}$) انہی بادیہ نشینوں کو کہا گیا ہے ۔

اَلْعَرَبِیُّ ۔ واضح کرنے والا ۔ فصیح* ۔ اَلْاِعْرَابُ ۔ کسی بات کو صاف اور واضح کر دینا ۔ بولنے میں غلطی نہ کرنا ۔ عَرَّبْتُ لَهُ الْكَلَامَ ۔ میں نے اس سے بات کھول کر کہدی ** ۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں آتا ہے حُكْمًا عَرَبِيًّا ($\frac{13}{37}$) یا قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا ($\frac{12}{2}$)۔ یا لِسَانًا عَرَبِيًّا ($\frac{46}{12}$)۔ تواس کے معنے صرف عربی زبان کا قرآن نہیں، بلکہ اس کے معنے ھیں واضح کتاب ۔ ایسی کتاب جو ھر بات کو صاف صاف بیان کرتی ہے ۔ چنانچہ سورۃ زمر میں قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا کے ساتھ غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ ($\frac{39}{28}$) کہکر اس کی وضاحت کردی ۔ یعنی ایسی واضح کتاب جس میں کوئی پیچیدگی نہیں ۔

اَلْعَرُوْبُ ۔ وہ بیوی جو اپنے شوھر کو محبوب ہو ۔ اس کی عاشق ہو ۔ اپنی محبت کو ظاھر کرتی ہو ۔ اس کے ساتھ ھنستی بولتی ہو**** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنے (۱) کھولنا اور واضح کرنا (۲) نشاط اور طیب نفس (۳) جسم یا عضو میں خرابی کے ھیں ۔ نشاط اور طیب نفس سے، عَرُوْبٌ خوش دل اور پر نشاط عورت کو کہینگے ،لیکن عَرِبَتْ مَعِدَتُهٗ کے معنے ھیں اس کا معدہ خراب ہوگیا ۔ اس اعتبار سے اِمْرَاَةٌ عَرُوْبٌ خراب اور بد اطوار عورت کو بھی کہتے ھیں ۔ عَرُوْبٌ کی جمع عُرُبٌ ہے ۔

*راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔ ****ابن قتیبہ (القرطین ۔ ج/۲ صفحہ ۱۵۴) ۔

''جنت'' کی بیویوں کے متعلق ہے عُرُبًا اَتْرَابًا (۵۶/۳۷) - لیکن سیاق عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ (محبت اور پیار کے علاوہ ، جو ایک اچھی بیوی کی بنیادی صفت ہے) اس سے مراد شائستہ ، مہذب ، فصیح الکلام ، واضح اور صاف باتیں کرنے والیاں بھی ہیں - اس لئے کہ قرآن کریم نے عہد جاہلیہ کی (غیر تربیت یافتہ) عورت کو غَیْرُ مُبِیْنٍ (۴۳/۱۸) کہا ہے - یعنی جو متنازعہ فیہ امور میں اپنی بات کو واضح طور پر بیان نہ کرسکے - اس کے بعد انہی عورتوں کو جب قرآنی معاشرہ میں صحیح تربیت ملی تو وہ نہایت فصیح اور واضح باتیں کرنے والی ہو گئیں -

اَلتَّعْرِیْبُ - صرف واضح بات کرنے ہی کو نہیں کہتے ، بلکہ دلیل کے ساتھ بات کرنے کو بھی کہتے ہیں* - لہذا قرآنی معاشرہ میں مرد اور عورتیں سب کی باتیں صاف ، واضح اور دلیل کے ساتھ ہوتی ہیں -

ع ر ج

عَرَجَ - اوپر چڑھنا - عَرَجَ فِی الدَّرَجَۃِ - سیڑھی پر چڑھنا - مَعْرَجٌ سیڑھی (جمع مَعَارِجُ) - مِعْرَاجٌ بھی سیڑھی کو کہتے ہیں (قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا) - عَرَجَ - یَعْرُجُ - اس کے پاؤں میں کوئی چیز لگ گئی اور اس کی وجہ سے وہ لنگڑا کر چلنے لگ گیا - یہ لنگڑا پن عارضی ہوگا - مستقل طور پر لنگڑانے کے لئے عَرِجَ یَعْرَجُ کہینگے - اَعْرَجُ - لنگڑا* - (یعنی وہ آدمی جو ہموار زمین پر ایسے چلے جسطرح کوئی سیڑھیاں چڑھ رہا ہو) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) عارضی یا مستقل جھکاؤ اور ٹیڑھے پن (۲) بلندی اور ارتقاء کے ہیں - اَلْعَرَجُ - لنگڑا ہونا ، اس اعتبار سے ہے کہ لنگڑا آدمی ٹیڑھا چلتا ہے -

قرآن کریم میں اشیائے کائنات کے سلسلہ ارتقاء کے ضمن میں آیا ہے - یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ - خدا کسی اسکیم کو اپنے قانون مشیت کی رو سے طے کرتا ہے - پھر اس کا آغاز پست ترین نقطہ سے کرتا ہے - ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲/۵) - پھر وہ شے اس نقطہ آغاز سے بتدریج بلندیوں کی طرف اٹھتی ہے اور ایک ایک مرحلہ کو ہزار ہزار سال (اور پچاس ہزار سال (۷۰/۴)) کی مدت میں طے کرتی ہوئی اپنی تکمیل تک پہنچتی ہے - اسی نہج

*تاج -

سے خدا نے اپنے آپ کو ذِی الْمَعَارِجِ (۷۰/۳) کہا ہے۔ ''سیڑھیوں والا خدا''۔ یعنی جو اس طرح بتدریج تمام اشیاء کو ان کی ارتقائی منازل طے کراتا ہے۔ وہ خدا صراط مستقیم پر بھی ہے (۱۱/۵۶)۔ یعنی ایک توازن بدوش سیدھے راستے پر۔ اور اس کے ساتھ ہی ذِی الْمَعَارِجِ بھی ''صراط مستقیم'' پر ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے سلسلہ کائنات کو آگے کی طرف بڑھا رہا ہے۔ یہ نہیں کہ اس نے ایک دفعہ اس کائنات کو بنا دیا اور اب یہ کائنات فضا کی پہنائیوں میں ایک ساکن اور جامد ڈھیلے کی طرح پڑی ہے، بلکہ یہ کہ اس میں حرکت ہے اور یہ آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ (Dynamic) ہے۔ نیز اس کی حرکت خط مستقیم پر (Linear) ہے۔ دوری (Cyclic) نہیں۔ یہ تصور یونانیوں کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ اوپر کی طرف بھی چڑھ رہی ہے۔ یعنی اس میں ارتقاء بھی ہے۔ یہ ہے کائنات کا تصور جو قرآن کریم پیش کرتا ہے۔ یعنی ہر آن آگے بڑھنے والی اور اوپر چڑھنے والی۔ قوانین خداوندی کی یہی راہ ہے جس پر چلنے کی تاکید انسان کو کی گئی ہے۔ یعنی انسان کو بھی ساکن اور جامد نہیں رہنا چاہئے۔ اسے آگے بڑھنا اور بلندیوں کی طرف جانا چاہئے (Progressive and Ascending)۔

اَعْرَجُ بمعنی لنگڑا سورۃ نور میں آیا ہے۔ وَلَا عَلَى الْاَعْرَجِ (۲۴/۶۱)۔ چونکہ لنگڑے کی ٹانگ میں خم ہوتا ہے اس لئے کھجور کے خوشے کی خمیدہ ڈنڈی کو عُرْجُوْنٌ (۳۶/۳۹) کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اِنْعَرَجَ الطَّرِيْقُ کے معنے ہیں راستہ ٹیڑھا ہو گیا۔

اَلْعَرْجُ اسّی سے نوے تک اونٹوں کو کہتے ہیں۔ (ابن فارس)

ع ر ج ن

عُرْجُوْنٌ۔ (دیکھئے ع۔ ر۔ ج)۔ کھجور کے خوشے کی ٹیڑھی ڈنڈی۔ (۳۶/۳۹)

ع ر ر

اَلْعَرُّ۔ اَلْعُرُّ۔ اَلْعُرَّةُ۔ خارش کی بیماری۔ اَلْمَعَرَّةُ۔ ہر قسم کی مضرت، تکلیف، اذیت، گزند یا نقصان۔ نیز گناہ و قصور کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ عَرَّهٗ اس نے اسے تکلیف دی*۔ سورہ فتح میں ہے فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ (۴۸/۲۵)۔ تمہیں ان کی وجہ سے کوئی نقصان پہنچ جائے۔ عَرَّهٗ۔ اِعْتَرَّهٗ۔ کسی کے پاس جانا اور بغیر سوال کئے اس کا احسان طلب

* تاج و راغب۔

کرنا - بخشش طلب کرنے کے لئے کسی کے سامنے آنا - ابن القطاع نے کہا ہے کہ اَلْمُعْتَرُّ ملنے والے کو کہتے ہیں، لیکن اہل لغت کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اَلْقَانِعُ تو وہ ہے جو سوال کرے (دیکھئے ق - ن - ع) اور مُعْتَرٌّ وہ ہے جو تم سے کچھ لینے کیلئے تمہارا چکر لگائے خواہ زبان سے اپنی حاجت بیان کرے یا نہ کرے* - اس کا مطلب مصیبت زدہ یا حاجت مند ہی ہے - قرآن کریم میں اَلْقَانِعُ وَالْمُعْتَرَّ (۲۲/۳۶) اکٹھا آیا ہے، مطلب مصیبت زدہ سے ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس محتاج کو کہتے ہیں جو ہر وقت تمہارے ساتھ چمٹا رہے اور تمہارا پیچھا لیے لے - اس لئے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ''کسی چیز کو کسی خراب چیز کے ساتھ لتھیڑ دینے'' کے بھی آتے ہیں -

ع ر ش

اَلْعَرْشُ - کسی چیز کا رکن - ستون - گھر کی چھت - یا وہ سہارے جس پر چھت کھڑی ہو - سائبان* - راغب نے کہا ہے کہ اَلْعَرْشُ دراصل ہر چھت والی چیز کو کہتے ہیں - اسکی جمع عُرُوْشٌ ہے - نیز بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ (تخت) کو بھی کہتے ہیں** - اسی سے اسکے معنی حکومت و سلطنت اور قوت و اقتدار کے ہو گئے - صاحب لطائف اللغة نے اس کے معنی غلبہ اور قوت کے کئے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی بنائی ہوئی چیز میں بلندی کے ہیں -

سورہ النمل میں ملکۂ سبا کے متعلق ہے وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ (۲۷/۲۳) - اسکا بہت بڑا تخت تھا - سورہ بقرہ میں ایک اجڑی ہوئی بستی کے متعلق ہے وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا (۲/۲۵۹) - اس بستی کے مکانات اپنی چھتوں یا ستونوں پر گرے پڑے تھے - جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ (۶/۱۴۲) - ایسے باغات جن میں اس قسم کی بیلیں ہوں جو بانس وغیرہ کی ٹٹیوں پر چڑھائی جائیں - جیسے انگور کی بیلیں -

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لئے عَرْشٌ کا لفظ متعدد بار آیا ہے - مثلاً هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۹/۱۲۹) - اسکے معنی اقتدار اعلیٰ - مرکزی کنٹرول کے ہیں - یعنی ساری کائنات کا خالق بھی وہی ہے اور اسکا اقتدار اور کنٹرول بھی اسیکے ہاتھ میں ہے - اور یہ کنٹرول اسکی بڑی محکم گرفت

*تاج و راغب - **راغب -

میں ہے، جس میں کسی قسم کی کمزوری نہیں آسکتی - ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (۷/۵۴) - اِسْتَوٰی کے معنی کسی چیز پر جم کر بیٹھنا - یعنی پوری طرح غالب آجانا ھیں -

سورہ ھود میں ہے وَ کَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ (۱۱/۷) - اسکا عرش (مرکزی اقتدار) پانی پر ہے - یہ نکتہ سمجھنے کے قابل ہے - سورہ انبیاء میں ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (۲۱/۳۰) - ہم نے ہر شے کو پانی سے زندگی عطا کی ہے - یعنی حیات کا سرچشمہ پانی ہے - اسکی تائید دور حاضر کی تحقیق سے ہو رہی ہے کہ پانی کے بغیر زندگی ناممکن ہے - حیات کی جل پری نے آنکھ ھی پانیوں میں کھولی ہے - لہذا جب قرآن کریم نے کہا کہ خدا کا عرش پانی پر ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ سرچشمۂ حیات پر واحد کنٹرول خدا کا ہے - خدا کا یہ کنٹرول اسکے قانون کی رو سے کار فرما ہے - اسنے ہر شے کے لئے ایک قانون بنا دیا ہے اور کسی کو مجال نہیں کہ اس قانون کی خلاف ورزی کر سکے - خارجی کائنات کیطرح انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کیلئے بھی خدا کا قانون ہے (جسے وحی کہتے ھیں) - انسان کو چونکہ صاحب اختیار بنایا گیا ہے اسلئے اسے اسکا اختیار ہے کہ یہ جی چاہے تو خدا کے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے تو اپنے لئے کوئی اور قانون وضع کر لے - لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ، قانون خداوندی کے خلاف چلنے سے زندگی کے خوشگوار نتائج مرتب کر لے - نتائج ہمیشہ قانون خداوندی کے مطابق ھی مرتب ہونگے - اس پر صرف خدا کا کنٹرول ہے، کسی اور کا نہیں - خدا کا عرش تمام کائنات پر بچھا ہوا ہے -

ع ر ض

عَرْضٌ کے معنے ھیں کسی چیز کا ظاہر ہو جانا، یا کسی کے سامنے پیش کرنا (۳/۳۶) - عَرَضَ لَهٗ کَذَا - اسے ایسا ماجرا پیش آیا - سرسری طور پر کوئی چیز اسے نظر آئی - عَرَضَ عَلَیْهِ کَذَا - اسے فلاں چیز دکھلائی - عَرَضَ الشَّیْءُ - چیز ظاہر ہوگئی - اَلْعَارِضُ - وہ چیز جو تمہیں پیش آئے یا تمہارے سامنے آئے - اَلْعَارِضَةُ - دروازے کی چوکھٹ کی بالائی لکڑی جس میں دروازہ گھومتا ہے - اَلْعَارِضُ - وہ بادل جو افق میں پھیلا ہوا ہو* (۴۶/۲۴) - اَلْعَرْضُ - کسی چیز کی چوڑائی کو کہتے ھیں* - قرآن

* تاج

کریم میں جنت کے متعلق ہے عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ (۵۷/۲۱) جسکی وسعت اور کشادگی تمام ارض و سماء (ساری کائنات) جتنی ہے۔

اَعْرَضَ عَنْهُ۔ اس سے اعراض کرلیا۔ پیٹھ موڑ لی۔ عَرَضَ الْفَرَسُ فِیْ عَدْوِهٖ۔ گھوڑا اپنی دوڑ میں سر اور سینے کو ایک طرف ٹیڑھا کرکے دوڑا۔ یعنی اپنے آپ کو سیدھا رکھنے کے بجائے چوڑائی (عرض) میں رکھ کر دوڑا*۔

اِعْتِرَاضٌ۔ کسی چیز کا اس طرح سامنے آجانا کہ اس سے راستہ رک جائے*۔ عُرْضَةً (۲/۲۲۴)۔ آڑ۔

اَلْعَرَضُ۔ گھر کا ساز و سامان۔ مال و دولت*۔ (۴/۹۴)۔ سورۃ اعراف میں ہے یَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰی (۷/۱۶۹)۔ یہ لوگ پیش پا افتادہ مفاد (ساز و سامان) حاصل کر لیتے ہیں (اور مستقبل کا خیال نہیں رکھتے)۔ یہاں عَرَضٌ کے معنے ساز و سامان ہیں۔ راغب نے العَرَضُ کے معنے ناپائدار شے بھی لکھے ہیں**۔ سورۃ توبہ میں ہے لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا (۹/۴۲) اگر کوئی فائدہ یا سامان ایسا ہو جو جلد مل جائے۔ یہاں بھی عَرَضٌ کے معنے واضح ہیں***۔

قرآن کریم نے مُعْرِضُوْنَ کی تشریح تَوَلَّيْتُمْ سے کردی ہے (۲/۸۳ و ۳/۲۳)۔ یعنی روگردانی کرنے والے۔ گریز کی راہیں نکالنے والے۔ پھر جانے والے۔ ایک طرف ہٹ جانے والے۔ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۵/۹۴) کے معنی ہیں فَاصْفَحْ (۱۵/۸۵)۔ ان سے الگ ہٹ جاؤ۔ ایک طرف ہو جاؤ۔

ع ر ف

اَلْعَرْفُ۔ بو (مہک) کو کہتے ہیں۔ عَرَفْتُهُ۔ میں نے اس کی بو پالی۔ یہیں سے اس کے معنے پہچاننے کے آتے ہیں۔ راغب کے نزدیک، کسی چیز کی علامات و آثار پر غور و فکر سے اس کا ادراک کرلینا، مَعْرِفَةٌ یا عِرْفَانٌ کہلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا جاننا عِلْمٌ سے کم درجے کا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اَللّٰهُ يَعْلَمُ کہتے ہیں (خدا کو اس کا علم ہے)۔ اَللّٰهُ يَعْرِفُ (خدا کو اس کی معرفت ہے) نہیں کہتے، کیونکہ خدا کا علم (ہر شے کے متعلق) یقینی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس خدا کی ذات کا علم انسان کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ البتہ کائنات پر غور و فکر کرنے سے اس کی صفات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اسے خدا کی معرفت کہہ سکتے ہیں*۔ (قرآن کریم میں اللہ کے لئے معرفت کا لفظ نہیں آیا)۔

---

*تاج۔ **راغب۔ ***لطائف اللغۃ۔

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں عَارِفٌ بِاللّٰہِ (خدا کی معرفت رکھنے والوں) کے متعلق جو عام تصور ہے کہ وہ خدا کی ذات کا علم رکھتے ہیں، کسقدر غلط ہے۔ کائنات کے مشاہدہ اور قرآنی حقائق پر غور و فکر سے قوانین خداوندی کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ خود ذات خداوندی کے متعلق کوئی کچھ نہیں جان سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے خدا پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کے عرفان کا نہیں۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) کسی چیز کا یکے بعد دیگرے۔ پے در پے ہونا۔ اور (۲) سکون اور اطمینان۔ چنانچہ اَلْعَرْفُ (اور اَلْعُرْفُ) گھوڑے کی ایال کو کہتے ہیں، کیونکہ اس میں بال یکے بعد دیگرے، پے در پے، ہوتے ہیں۔ عَرَفَ کے معنی پہچاننا اس لئے ہیں کہ نہ جانی پہچانی چیز سے انسان کو وحشت ہوتی ہے اور جانی پہچانی سے سکون و اطمینان ہوتا ہے۔ اَلْعَرْفُ۔ عمدہ خوشبو کو کہتے ہیں۔

عَرَفَ یَعْرِفُ۔ مَعْرِفَةً وَ عِرْفَانًا۔ کسی چیز کو پہچان لینا۔ مَعَارِفُ الْاَرْضِ۔ زمین کے جانے پہچانے راستے*۔ تَعَارَفُوْا۔ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ اَمْرٌ عَرِیْفٌ۔ جانا پہچانا ہوا کام**۔ اَلْعَرِیْفُ۔ جو اپنے آدمیوں کو پہچانتا ہو۔ (یا ان کا تعارف کراتا ہو)۔ رئیس قوم۔ نقیب جو سردار کے نیچے ہوتا ہے۔ اَلتَّعْرِیْفُ۔ کسی چیز کو پہچنوا دینا**۔

پہچاننے کے اعتبار سے بلند چیز کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اَلْعُرْفُ۔ ریت کا بلند ٹیلہ یا بلند جگہ۔ اَلْاَعْرَافُ۔ بلند جگہ۔ نیز جو کھیتی ڈولوں اور کناروں پر ہو۔ قُلَّةٌ عَرْفَاءُ۔ بلند چوٹی۔ نَاقَةٌ عَرْفَاءُ۔ بلند کوھان والی اونٹنی۔ اَلْعُرْفَةُ۔ دو چیزوں کے درمیان کی حد**۔

اِعْتَرَفَ بِذَنْبِہٖ۔ اس نے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا**۔ ($\frac{۶۷}{۱۱}$)۔ عَرَفَ فُلَانًا۔ فلاں کو اس کے جرم کی سزا دی**۔

آگے پیچھے آنے کو بھی عُرْفًا کہتے ہیں۔ جَاءَ الْقَوْمُ عُرْفًا۔ قوم آگے پیچھے آئی۔ اس سے بعض نے کہا ہے کہ وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا ($\frac{۷۷}{۱}$) کے معنی ہیں وہ فرشتے جو یکے بعد دیگرے آئیں**۔

قرآن کریم میں یَعْرِفُوْنَ بمقابلہ یُنْکِرُوْنَ آیا ہے ($\frac{۱۶}{۸۳}$)۔ اسی سے اَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَہْیٌ عَنِ الْمُنْکَرِ متعدد مقامات پر آیا ہے۔

*تاج۔ ** تاج و راغب۔

(مثلاً ۳/۱۰۴) ۔ سورۃ اعراف میں اَلْمَعْرُوْفْ کی جگہ اَلْعُرْفْ آیا ہے (۱۹۹/۷)۔ مَعْرُوْفْ سے مراد ہیں وہ تمام امور جنہیں ایک قرآنی معاشرہ اپنے ہاں تسلیم (Recognise) کرلے ۔ اور مُنْکَرْ ۔ وہ تمام باتیں جنہیں وہ صحیح تسلیم نہ کرے ۔ جنہیں وہ (Recognise) نہ کرے ۔یہ قرآن کریم کی ایک جامع اصطلاح ہے جسمیں قرآنی نظام کے نافذ کردہ احکام و قوانین سے لیکر اس معاشرہ کے روزمرہ کے رسوم و آداب تک سب آجاتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان رسوم و آداب کے بنیادی اصول تو غیر متبدل رہینگے کیونکہ وہ قرآن کریم نے متعین کر دئے ہیں، لیکن ان کی شکل و صورت اور تفاصیل و جزئیات زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہینگی ۔ لہذا ایک قرآنی معاشرہ جن آئین و آداب کو اپنے وقت میں (Recognise) کرلے وہ معروف ہونگے ، خواہ وہ پہلے سے موجود ہوں یا وہ انہیں خود تجویز کرے ، حتکہ کسی قوم یا ملک کے رسم و رواج کو بھی وہ اپنے ہاں رائج رہنے دے تو وہ بھی مَعْرُوْفْ کے ذیل میں آجائینگے۔ لیکن اس کے ساتھ اس شرط کو بھی پیش نظر رکھئے کہ ان میں سے کوئی چیز قرآن کریم کے اصول و احکام کے خلاف نہیں ہونی چاہئے ۔ ایسی بات منکر ہو جائیگی (دیکھئے عنوان ن ۔ ک ۔ ر) ۔

قرآن کریم میں ایک مقام پر اَلْاَعْرَافْ کا بھی ذکر آتا ہے ۔ وَعَلَی الْاَعْرَافِ رِجَالٌ یَعْرِفُوْنَ کُلًّا بِسِیْمٰهُمْ (۴۶/۷) ۔ عام طور پر اَعْرَافْ اس مقام کو کہا جاتا ہے جو جنت اور دوزخ کے بین بین ہے اوران لوگوں کو اعراف والے سمجھا جاتا ہے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر برابر ہونگی اوران کا معاملہ ہنوز طے نہیں ہوا ہوگا کہ اُنہیں کدھر بھیجا جائے ۔ لیکن یہ مفہوم درست نہیں ۔ قرآن کریم میں صرف اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اور اَصْحٰبُ النَّارِ کے دو گروھوں ھی کا ذکر ہے ۔ کسی ایسے (تیسرے) گروہ کا ذکر نہیں جو بین بین معلق ہو۔ دوسرے یہ کہ ان اہل اعراف کا مقام اتنا بلند بتایا گیا ہے کہ وہ تمام اہل جنت اور اہل جہنم کو انکی نشانیوں سے پہچانتے ہونگے ۔ لہذا بلندی کے اعتبار سے (جو اَعْرَافْ کا صحیح مفہوم ہے ۔ یعنی بلند مقامات*)۔ یہ طبقہ بلند ترین انسانوں کا ہے ۔ یہ حضرات اپنے اپنے گروھوں پر بطور شاھد حاضر آئینگے (۴۱/۴) ۔ یہ گروہ ، اَصحٰبُ الجنه میں سے غالباً وہ طبقہ ہے جسے اَلسّٰبِقُوْنَ اور اَلْمُقَرَّبُوْنَ کہکر پکارا گیا ہے (۱۱-۱۰/۵۶)۔ یہ وہ جماعت مومنین ہے جسے شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (۱۴۳/۲) کہا گیا ہے ۔

*ابن قتیبه (القرطین ۔ ج/۱ صفحه ۱۷۸) ۔

حج کے اجتماع میں عَرَفَات کا بھی ذکر ہے (۲/۱۹۸) - یہ وہ میدان ہے جس میں تمام دنیا کی ملت اسلامیہ کے نمائندوں کا باہمی تعارف ہوتا ہے -

سورۃ محمد میں جنت کے متعلق ہے، عَرَّفَهَا (۴۷/۶) - راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جنت جسے ان کے لئے خوشگوار بنایا گیا ہے - اس کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ جنت ان کی جانی پہچانی ہے، کیونکہ اس کا تعارف قرآن کریم نے کرا دیا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے جنت کو خوشبو سے بسا دیا - لیکن اس کے معنے متعارف کے زیادہ موزوں نظر آتے ہیں -

ع ر م

عُرَامُ الْجَيْشِ - لشکر کی تندی و تیزی، شدت اور کثرت - اَلْعُرَامُ مِنَ الرَّجُلِ - آدمی کی تندی و درشتی، سختی اور اذیت رسانی - اَلْعَرِمُ - بند یا دیگر رکاوٹیں جو وادیوں میں بنا دی جائیں - نیز سخت بارش جسے برداشت نہ کیا جاسکے*-

قرآن کریم میں سَيْلَ الْعَرِمِ (۳۴/۱۶) آیا ہے - جسکے معنی نہایت تند و تیز سیلاب کے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی سختی اور تیزی کے ہیں -

ع ر و

عُرْوَةٌ - بیری وغیرہ کی قسم کی خاردار جھاڑیوں یا پیلو کی قسم کے درختوں کا جھنڈ (جن کی جڑیں زمین میں پائیدار رہتی ہوں اور) جن کے پتے سردی میں بھی نہ گریں - چنانچہ جب جانوروں کے لئے کوئی اور چارہ نہ رہے تو یہی درخت ان کی جان بچاتے ہیں - ان پر ہر موسم میں اعتماد کیا جا سکتا ہے - اس نہج سے ہر وہ شے جس پر بھروسہ کیا جا سکے عُرْوَةٌ کہلاتی ہے - نیز ڈول وغیرہ کا دستہ جس سے اسے پکڑا جائے عُرْوَةٌ کہلاتا ہے**- ہر وہ سہارا جسے پکڑ کر کوئی لٹک جائے***- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چمٹے رہنے اور جم کر باقی رہنے کے ہیں - اسی جہت سے عُرْوَةٌ کاج کو بھی کہتے ہیں جس میں بٹن اٹکا رہتا ہے -

سورہ بقرہ میں خدا پر ایمان کو اَلْعُرْوَةُ الْوُثْقٰى (۲/۲۵۶) کہا ہے - یعنی ایسا محکم آسرا جس پر کامل بھروسہ کیا جا سکے - زندگی کا ایسا قانون

* تاج - محیط - راغب - **تاج - ***راغب -

جو اپنی نتیجہ خیزی میں کبھی خطا نہ کرے۔ جسکی محکمیت پر پورا پورا اعتماد ہو۔ جو کبھی دغا نہ دے۔ جو راستہ ہی میں نہ ٹوٹ جائے۔

عَرَاهُ۔ اِعْتَرَاهُ۔ اس کے سامنے آیا۔ پیش آیا۔ یعنی وہ بات اس کے سامنے اسطرح آگئی کہ اس کے اور اس بات کے درمیان کوئی آڑ نہ رہی**۔ سورہ ہود میں ہے اِعْتَرَاکَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوْءٍ (۱۱/۵۴)۔ " ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تجھ پر کوئی مصیبت ڈال دی ہے"۔

ع ر ی

اَلْعُرْیُ۔ ننگا ہونا۔ عَرِیَ۔ یَعْرٰی۔ عُرْیاً۔ ننگا ہونا*۔ قرآن کریم میں ہے لَا تَعْرٰی (۲۰/۱۱۸)۔ تو ننگا نہ رہیگا۔ لباس کی محتاجی نہ ہوگی۔ جنتی معاشرہ میں جو بنیادی ضروریات ہر ایک کو میسر ہونگی ان میں لباس بھی ہے۔ (نیز کھانا پینا اور مکان (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)۔ اَلْعَرَاءُ۔ کھلی جگہ جہاں کوئی چیز آڑ کے لئے نہ ہو*۔ قرآن کریم میں ہے فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَاءِ (۳۷/۱۴۵)۔ ہم نے اسے کھلے میدان میں ڈال دیا۔ نیز نُبِذَ بِالْعَرَاءِ (۶۸/۴۹)۔ اَلْعَرَیٰ کے معنے ہیں کنارہ، گوشہ، صحن، آنگن نیز دیوار۔ اَعْرَاءُ الْاَرْضِ۔ زمین کے ابھرے ہوئے حصوں کو کہتے ہیں*۔

[عَرَاهُ اور اِعْتَرَاهُ کے لئے دیکھئے عنوان ع۔ ر۔ و]

ع ز ب

عَزَبَ۔ یَعْزُبُ۔ غائب ہو جانا۔ پوشیدہ ہو جانا۔ دور ہو جانا۔ چلا جانا۔ اَلْمِعْزَابُ۔ وہ آدمی جو اپنے جانوروں کو لیکر لوگوں سے بہت دور چراگاہ میں چلا جائے۔ اَلْعَزِیْبُ۔ وہ آدمی جو اپنے اہل و عیال سے بہت دور چلا جائے۔ اِبِلٌ عَزِیْبٌ۔ وہ اونٹ جو شام کو اپنے گھروں پر نہ آئیں***۔

قرآن کریم میں ہے وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّکَ ...... (۱۰/۶۱) تیرے رب (کے علم) سے کوئی چیز بھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ دور نہیں جاسکتی۔ غائب نہیں ہو سکتی۔ یعنی خدا کے قانون کی دسترس سے کوئی چیز باہر نہیں رہ سکتی۔

ع ز ر

اَلْعَزْرُ کے بنیادی معنی کسی کو روکنے (منع کرنے) کے ہوتے ہیں۔ عَزَرْتُ الرَّجُلَ۔ میں نے اس آدمی کو روک دیا۔ اسی سے تَعْزِیْرٌ

* تاج۔ ** راغب۔ *** تاج۔ محیط۔ راغب۔

کے معنی تادیب کے آتے ہیں۔ یعنی کسی کو حد شرعی سے کم سزا دینا تاکہ وہ آئندہ جرم سے رک جائے۔ چونکہ یہ تادیبی کاروائی درحقیقت اُس آدمی کی اصلاح کے لئے ایک قسم کی مدد ہوتی ہے، اس لئے اَلتَّعْزِیْرُ نصرت کو بھی کہتے ہیں جس میں تعظیم کا جذبہ شامل ہو**۔ قرآن کریم میں ہے وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ (۵/۱۲)۔ تم نے ان کی مدد کی تعظیم کے ساتھ۔ صاحب تاج العروس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں قوت بہم پہنچانا۔ تلوار اور زبان سے مدد دینا*۔ ابن فارس نے اسکے بنیادی معنوں میں تعظیم و نَصْر اور تعزیر (مار کی سزا) دونوں لکھے ہیں۔

سورہ اعراف میں ہے فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ (۷/۱۵۷)۔ اور سورہ فتح میں ہے لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (۴۸/۹)۔ ان آیات میں مومنین سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے رسولؐ کی مدد کریں (نصرت)۔ تعظیم کریں (توقیر)۔ اور عَزَّرُوْهُ۔ اس کے معنی ہیں رسولؐ کی ایسی مدافعت کرنا جس سے اس کی ذات اور اس کا پیغام تمام شرپسند عناصر کی تخریب سے محفوظ رہے۔ یعنی رسول اللہؐ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ ہونے دی جائے جس سے حضورؐ کی ذات پر کسی قسم کا طعن آئے یا آپؐ کی تعظیم پر کوئی اعتراض وارد ہو۔

ع ز ز

اَلْعِزُّ۔ قوت۔ شدت۔ غلبہ۔ رفعت اور حفاظت کو کہتے ہیں۔ بصائر میں ہے کہ عِزَّةٌ اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو مغلوب ہونے سے محفوظ رکھے۔ (یعنی اپنے اندر ایسی سختی پیدا ہو جانا کہ کسی کے دبانے سے دب نہ سکے)۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے اس کے معنی صلابت اور شدت کے لکھے ہیں۔ اسیلئے کہتے ہیں اِسْتَعَزَّ الرَّمْلُ۔ ریتیلا ٹیلہ اپنی جگہ پر مستحکم رہا اور ڈھیلا ہو کر نیچے نہیں گرا***۔ اَلْمَعْزُ وَالْعَزَازُ سخت زمین۔ اس زمین کو کہتے ہیں جس پر بارش ہونے سے اسکی مٹی یا ریت جم جائے اور وہ سخت ہو جائے۔ تَعَزَّزَتِ النَّاقَةُ۔ اونٹنی کے تھنوں کے سوراخ تنگ ہوئے اور ان سے مشکل سے دودھ نکلا۔ تَعَزَّزَ اللَّحْمُ۔ گوشت سخت ہوا۔ لہذا عَزَّهٗ یَعُزُّهٗ کے معنی ہیں کسی پر غالب آجانا۔ اسے اپنی صلابت اور سختی کی وجہ سے زیر کر لینا (۳۸/۲۳)۔ اسیلئے اَلْعَزِیْزَةُ۔ عقاب کو کہتے ہیں***۔ عَزَّ کے معنی ہیں قوی ہوا۔ عَزَّزَهٗ۔ اسے تقویت دی (۳۶/۱۴)

---

* تاج۔ ** راغب۔ ***تاج و محیط۔

عَزَّ عَلَیَّ اَنْ تَفْعَلَ كَذَا - مجھ پر یہ بات بڑی ہی گراں گذری کہ تم ایسا کرو*۔

قرآن کریم میں یہ لفظ ذِلَّةٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۳/۲۵) اور اسکے معنی بتائے ہیں قوت و اختیار کا ملجانا (۳/۲۵) - سورہ کہف میں اَعَزُّ نَفَرًا (۱۸/۳۴) آیا ہے - یعنی قبیلہ اور جتھے کے اعتبار سے میں زیادہ صاحب اقتدار ہوں - سورہ صٓ میں ہے فِی عِزَّةٍ وَ شِقَاقٍ (۳۸/۲) - قرآن کریم کی مخالفت کرنے والے اپنی قوت کے نشہ میں بد مست ہو کر اسکی مخالفت پر اتر آئے ہیں - سورہ التوبہ میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ (۹/۱۲۸) - جس بات سے تمہیں تکلیف پہنچے وہ اس پر سخت شاق گزرتی ہے۔

قرآن کریم میں خدا کیلئے اَلْعَزِیْزُ آیا ہے - (۲/۱۲۹) - یعنی کائنات میں غلبہ و اقتدار صرف اسیکے قانون کو حاصل ہے اور کوئی طاقت ایسی نہیں جو اسکے قانون پر غالب آسکے - انسانی معاشرہ میں اس قسم کا غلبہ واقتدار اس جماعت کو حاصل ہو سکتا ہے جو ایک مرکز کے ماتحت، قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے (۶۳/۸) - جیسا کہ اوپر کہا جا جا چکا ہے : اقتدار اور غلبہ صرف خدا کیلئے ہے - لیکن اس نے ایسے قوانین بنا دئے اور بتا دئے ہیں جنکے مطابق چلنے سے انسان کو بھی اپنے دائرے میں غلبہ اور اقتدار حاصل ہو جاتا ہے - یہ قوانین طبعی دنیا سے بھی متعلق ہیں اور انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی سے بھی متعلق - جو قوم ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گی اسے غلبہ و اقتدار حاصل ہو جائیگا - یہ معنی ہیں وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ (۳/۲۵) کے - یعنی اللہ اپنے قانون مشیت کے مطابق عزت اور ذلت عطا کرتا ہے - یونہی اندھا دھند کچھ نہیں ہوجاتا ۔

سورہ یوسف میں اَلْعَزِیْزُ (۱۲/۳۰) وھاں کے رئیس کیلئے آیا ہے - یعنی صاحب اقتدار - اسی رئیس کی بیوی نے حضرت یوسفؑ پر ڈورے ڈالنے چاہے تھے - اس عورت کا نام قرآن کریم میں نہیں آیا - اسے صرف اِمْرَاَتُ الْعَزِیْزِ کہا گیا ہے - (۱۲/۳۰) یعنی عزیز کی عورت ۔

اَلْعُزّٰی (۵۳/۱۹) ایک بت کا نام ہے جسکی عہد جاہلیت میں قبیلہ غطفان پرستش کرتے تھے - (یہ لفظ اَلْاَعَزُّ کا مؤنث بھی ہے)۔

---

* تاج و محیط ۔

العُزّٰی

عرب کے زمانہء جاہلیت میں ، قبیلہء غطفان کا ایک بت تھا ۔ (۵۳/۱۹)
(دیکھئے عنوان ع ۔ ز ۔ ز)

ع ز ل

عَزَلَہٗ عَنِ الْعَمَلِ وَعَزَّلَہٗ ۔ اسے کام سے الگ کر دیا ۔ فَاعْتَزَلَ ۔ پس وہ الگ ہو گیا ۔ یعنی اسے ایک طرف ہٹا دیا اور وہ ہٹ گیا ۔ مَعْزُوْلٌ ۔ الگ کیا ہوا ۔ ہٹایا ہوا ۔ اَلْعُزْلَۃُ ۔ الگ ہو جانا ۔ علیحدگی ۔ اَلْاِعْتِزَالُ ۔ کسی چیز کا ایک طرف ہو جانا ۔ اَلْعَزْلُ ۔ ضبط ولادت کے لئے مادہء تولید کو رحم تک نہ پہنچنے دینا * ۔

سورہ کہف میں ہے وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ (۱۸/۱۶) ۔ جب تم ان سے الگ ہو گئے ۔ سورہ شعراء میں ہے اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (۲۶/۲۱۲) ۔ وہ سننے سے الگ ہٹا لئے گئے ۔ سننے سے روک دئے گئے ۔ سورہ ہود میں ہے وَکَانَ فِیْ مَعْزِلٍ (۱۱/۴۲) ۔ وہ ان لوگوں سے ہٹ کر کسی الگ جگہ میں تھا ۔ سورہ احزاب میں ہے مِمَّنْ عَزَلْتَ (۳۳/۵۱) ۔ جن سے تو نے علیحدگی اختیار کی تھی ۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ حیض کے دوران میں فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ ۔ عورتوں سے الگ رہو ۔ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰی یَطْهُرْنَ (۲/۲۲۲) ۔ اس کے معنی واضح ہو گئے ۔ یعنی جب تک وہ حیض سے پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ ۔

ع ز م

اِعْتَزَمَ الرَّجُلُ ۔ وہ دوڑنے ، چلنے نیز دیگر امور میں درمیانہ روی پر قائم رہا ۔ اِعْتَزَمَ الطَّرِیْقَ ۔ وہ راستہ پر بغیر مڑے سیدھا چلتا چلا گیا ۔ عَزَمَ عَلَی الْاَمْرِ وَاعْتَزَمَ عَلَیْهِ ۔ کسی کام کو قطعی طور پر کرنے کا ارادہ کیا ۔ اس اعتبار سے عَزْمٌ اور عَزِیْمَۃٌ کے معنی ہیں کسی بات کا فیصلہ کرکے اس پر پختگی سے جم جانا ۔ مَا لِفُلَانٍ عَزِیْمَۃٌ ۔ فلاں آدمی کسی بات پر جمتا ہی نہیں ۔ اَلْعَزَّامُ ۔ ارادے کا دھنی ۔ شیر * ۔
ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی معاملہ کو حتمی اور قطعی کرنے کے ہوتے ہیں ۔

---

* تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔

سورہ بقرہ میں ہے وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ (۲/۲۲۷) ۔ اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں ۔ سورہ طٰہٰ میں آدم کے متعلق ہے وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (۲۰/۱۱۵) ۔ ہم نے اس میں ارادہ کی پختگی نہیں پائی ۔ سورہ بقرہ میں ہے وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ (۲/۲۳۵) ۔ تم نکاح کی گرہ کو پختہ مت کرو ۔ اُولُوا الْعَزْمِ (۴۶/۳۵) ۔ عزم و استقلال والے ۔ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۴۲/۴۳) ۔ معاملات میں پختگی اور عزیمت ۔

قرآن کریم نے حضرات انبیاء کرامؑ اور مومنین کی صفت یہ بتائی ہے کہ وہ صاحب عزیمت (بڑی ہمت اور استقلال کے مالک) ہوتے ہیں ۔ اور ان کے عزائم بڑے بلند ہوتے ہیں ۔ لیکن اب عَزِيْمَةٌ کے معنے ہیں تعویذ ، اور عَزَائِمُ الْقُرْاٰنِ کے معنی ہیں قرآن کریم کی آیات جن سے تعویذ لکھے جاتے ہیں اور جھاڑ پھونک کی جاتی ہے ** ۔ اور اَلْمُعَزِّمُ کے معنی ہیں جھاڑ پھونک کرنے والا ** ۔

ع ز و

اَلْعِزَةُ ۔ لوگوں کا گروہ ۔ جماعت ۔ فرقہ ۔ اسکی جمع (حالت رفعی میں) عِزُوْنَ اور (حالت نصبی اور جری میں) عِزِيْنَ آتی ہے ۔ یعنی جماعتیں جو متفرق ہوں * ۔ (۷۰/۳۷) ۔ راغب کا خیال ہے کہ یہ عَزَوْتُهٗ سے مشتق ہے جسکے معنی ہیں منسوب کیا ** ۔ اس طرح یہ لفظ ایسی جماعت کیلئے بولا جائیگا جو کسی کی طرف منسوب ہو ، لیکن راغب ہی نے دوسرا خیال یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ عَزَاءٌ سے مشتق ہے جسکے معنے صبرو تسلی حاصل کر لینے کے ہیں ** ۔ اس طرح اس سے مراد وہ جماعت بھی ہو سکتی ہے جو کسی خاص عقیدہ وغیرہ پر مطمئن ہو ، یا وہ جماعت جسکے افراد آپس میں ایک دوسرے سے صبرو تسلی حاصل کر لیتے ہوں ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی منسوب ہونے اور وابستہ ہونے کے لکھے ہیں ۔

عزیر

سورۃ توبہ میں ہے وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُنِ ابْنُ اللّٰهِ (۹/۳۰) ۔ ”یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے“ ۔

عزیر یہودیوں میں بڑی عظیم شخصیت کے مالک ہیں ۔ جب یہودی بابل کی اسیری کے بعد ، یروشلم میں واپس آئے تو کتاب مقدس (تورات کا

* تاج و محیط ۔ ** راغب ۔

مجموعہ ٔ کتب) ان سے ضائع ہو چکا تھا ۔ کتاب یحمیاہ ۔ (باب ۸) میں تفصیلاً بتایا گیا ھے کہ تورات کے سلسلہ ٔ اول کی پانچ کتابوں کو عزرا نبی (یا عزرا فقیہ) نے دوبارہ مرتب کیا ۔ موجودہ تورات میں خود کتاب عزرا بھی موجود ھے جس میں عزرا نبی نے بتایا ھے کہ انہوں نے ان کتابوں کو کیسے از سر نو مرتب کیا ۔ یہ قریب ساڑھے چار سو سال قبل مسیح کا واقعہ ھے (تفصیل میری کتاب ''معراج انسانیت'' کے باب اول ''ظَہَرَ الْفَسَادُ'' میں ملے گی) ۔

یہود لٹریچر میں ان کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز بیانات ملتے ھیں ۔ جیوئش انسائیکلو پیڈیا نے تو یہاں تک لکھدیا ھے کہ اگر حضرت موسیٰؑ پر شریعت نازل نہ ھوئی ھوتی تو عزیر پر نازل ھوتی ۔

قرآن کریم نے ان کا مزید تعارف نہیں کرایا ۔ نہ ھی زمرہ ٔ انبیائے کرام میں ان کا نام لیا ھے ۔ اس لئے ھم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ آپ (قرآن کی اصطلاح میں) نبی تھے یا نہیں ۔ یہودیوں کے ھاں ''نبی'' ھیکل کے ایک بڑے منصب دار کو کہتے تھے جس کا کام کہانت ھوتا تھا ۔

''ابنیت عزیر'' کا سوال بڑی اھمیت رکھتا ھے ۔ اس لئے کہ یہودی قرآن کریم کے اس بیان کو چیلنج کرتے ھیں اور کہتے ھیں کہ انہوں نے کبھی عزیر نبی کو ابن اللہ نہیں مانا ۔ ھمارے ھاں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ھے کہ مدینہ میں کچھ یہودی اس قسم کا اعتقاد رکھتے تھے۔ ابن حزم نے لکھا ھے کہ یہودیوں کا صدوقی فرقہ جو یمن میں تھا اس کا یہ عقیدہ تھا*۔ لیکن یہودیوں کا کہنا ھے کہ یہ روایات ان کے لئے سند نہیں قرار پا سکتیں۔ یہودیوں کے موجودہ لٹریچر سے بھی ان کے اس عقیدہ کی شہادت نہیں ملتی ۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہودی (اور نصرانی) لٹریچر میں جس طرح مسلسل رد و بدل ھوتا چلا آ رھا ھے اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ھے کہ ممکن ھے پہلے ان کے ھاں اس قسم کا عقیدہ موجود ھو اور بعد میں انہوں نے اسے اپنی کتابوں سے خارج کر دیا ھو۔ نیز ھمارے زمانے میں جس انداز سے عہد قدیم کے تاریخی انکشافات ھو رھے ھیں ان کے پیش نظر کون کہہ سکتا ھے کہ کل کو کونسی تاریخی حقیقت بے نقاب ھو کر سامنے آنے والی ھے؟ اس حقیقت کے پیش نظر ھم کہہ سکتے ھیں کہ ھو سکتا ھے کہ (فرعون کی لاش کی طرح) مزید تحقیقات کے بعد یہودیوں کے اس عقیدہ کی بھی نقاب کشائی ھوجائے ۔

*(ارض القرآن سید سلیمان ندوی) ۔

لیکن حال ہی میں بعض محققین کا خیال اس طرف گیا ہے کہ قرآن کریم نے جس عزیر کے متعلق کہا ہے کہ یہودی اسے ''ابن اللہ'' مانتے تھے ، اس سے مراد عزرا نبی نہیں بلکہ مصر کا ''عزیر دیوتا'' ہے جس کی وہاں پرستش ہوتی تھی اور انہی کی دیکھا دیکھی یہودیوں نے بھی اس کی پرستش شروع کر دی تھی - ہیروڈوٹس نے ، آج سے قریب اڑھائی ہزار سال قبل ، اس دیوتا کا نام (Osiris) یعنی عزیرس لکھا ہے - یونان میں اسماء کے بعد ''س'' ہمیشہ زائد ہوتی ہے - اس صورت میں اس دیوتا کا اصل نام عزیر ہے جو قرآنی عزیر کے بالکل مشابہ ہے - مصر کے آثار قدیمہ میں اس کا نام ''ایزاری'' آیا ہے - اسکے نام پر جو سانڈ بیل پوجا جاتا تھا اس کا نام ''ایزار ھاپی''- یعنی عجل عزیر تھا - اس بچھڑے کو عزیر کی روح کا مظہر اور ''فتاح'' یعنی خالق خدا کا اوتار اور بیٹا (ابن اللہ) مانا جاتا تھا - مصر سے یہ اعتقادات نکل کر شام اور فلسطین کے علاقوں میں پھیل چکے تھے اور یہی وہ عجل (بچھڑا) تھا جس کی پرستش یہودیوں نے حضرت موسیٰ[ؑ] کی غیر حاضری میں شروع کردی تھی (اس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے) - حضرت موسیٰ[ؑ] نے یہود کو اس گوسالہ پرستی سے روک دیا لیکن آپ[ؑ] کے بعد اس کی پرستش دوبارہ شروع ہوگئی - چنانچہ یہودیوں کی سلطنت کی تقسیم کے بعد ، شمالی سلطنت کے بادشاہ یربعام اول (۹۳۳ ق - م) نے عجل پرستی کو شاہی مذہب قرار دے دیا اور سونے کے دو بچھڑے بنا کر ان کی پرستش عام کردی - یہی وہ عزیر دیوتا ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے - موجودہ زمانے میں بائبل کے عبرانی نسخوں کے قراجم کی جو تصحیح ہوئی ہے اس کے پیش نظر اب یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ بائبل میں بھی بنی اسرائیل کی عزیر پرستی کا ذکر موجود تھا لیکن (غلطی سے) لفظ عزیر کو ''اسیر'' سمجھ کر اس کا ترجمہ ''قیدی'' کردیا گیا - اب لیگارڈ نے اپنے یونانی ترجمہ میں اس کی تصحیح کی ہے -

مصر کے آثار قدیمہ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ دنیا میں غالباً سب سے پہلے، عزیر ہی کو ابن اللہ مانا گیا ہے - چنانچہ کم و بیش چار ہزار سال قبل مسیح ، عزیر کے متعلق یہ اعتقاد ملتا ہے کہ یہ دیوتا خداوند اعلیٰ ''آمن رع'' کی نسل سے اور خداوند ارض کا بیٹا تھا -مصر سے اب ایک صحیفہ بھی برآمد ہؤا ہے جس میں عزیر کے حالات درج ہیں -

ان تصریحات سے ذہن کا رخ اسی طرف جاتا ہے کہ عزیر سے مراد مصر کا دیوتا ہے نہ کہ عزرا نبی - بہر حال ، یہ تاریخی قیاسات ہیں - ہوسکتا ہے کہ بعد میں مزید انکشافات حقیقت کو حتم و یقین کے ساتھ بے نقاب کردیں-

ہمارا ایمان بہرحال یہ ہے (اور یہی ہونا چاہئے) کہ قرآن کریم نے جو کچھ کہا ہے وہ حرفاً حرفاً سچ ہے اور اگر کسی زمانے تک کا علم انسانی اس کے کسی بیان کی تصدیق نہیں کرتا تو یہ علم کی کوتاہ دستی کا قصور ہے نہ کہ قرآن کریم کے تخیل بلند کا گناہ*۔

ع س ر

اَلْعُسْرُ ۔ یہ یُسْرٌ کے مقابلہ میں آتا ہے جس کے معنی نرمی، کشادگی، فارغ البالی کے ہیں (دیکھئے عنوان ی ۔ س ۔ ر) لہذا عُسْرٌ کے معنی تنگی، سختی، مصیبت، مشقت، کے ہیں** ۔ (۲/۱۸۵ ؛ ۹۴/۵) ۔ سورہ الفرقان میں ہے وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكَافِرِينَ عَسِيرًا (۲۵/۲۶)۔ وہ دن کافرین کے لئے بڑی سختی کا ہوگا۔

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ معاملات میں کشادہ روئی کی کمی، اور اخلاق کی تنگی، ہو جانے کو بھی عُسْرٌ کہتے ہیں***۔ سورہ طلاق میں ہے وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ (۶۵/۶) ۔ اگر تم ایک دوسرے سے تنگی محسوس کرو۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی سختی اور شدت کے ہوتے ہیں ۔ اگر سوت الجھ جائے اور سلجھ نہ سکے تو کہینگے قَدْ تَعَسَّرَ الْغَزْلُ ۔ تنگ حالی اور تنگدستی کو عُسْرَةٌ کہتے ہیں ۔

قرآن کریم نے آسانیاں حاصل کرنے کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ تم مشکلات کا سامنا کرو۔ جو مشکلات کا سامنا نہیں کرتا اسے آسانیاں نصیب نہیں ہو سکتیں ۔ (۹۴/۵) ۔ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے ۔ یہ نہیں کہ جب یُسر (آسانیاں) مل جائیں تو انسان مطمئن ہو کر بیٹھ جائے ۔ اُسوقت بھی انسان کے سامنے مشکلات آئینگی جن پر غلبہ پانے کے لئے اسے سعی وعمل کی ضرورت ہوگی ۔ حیات جاوداں اندر ستیزاست ۔ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (۹۴/۵-۶) ۔ یقیناً تنگی کے ساتھ آسانی ہے ۔ فی الواقعہ تنگی کے ساتھ آسانی ہے ۔

---

*اس عنوان میں ہم نے شیخ عبد القادر صاحب کے ایک مقالہ سے مدد لی ہے جو رسالہ الفرقان کی اگست ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا ۔ مقالہ نگار نے اپنے مضمون میں انسائیکلو پیڈیا برٹانکا (لفظ Apis) ۔ لےگیسی آف ایجپٹ (Glanuille) ارلی ہسٹری آف ایجپٹ (Sidney Smith) ۔ اور آکسفورڈ جونیئر انسائیکلو پیڈیا کے حوالے دیئے ہیں ۔ **تاج ۔ ***محیط۔

ع س ع س

عَسْعَسَ اللَّيْلُ - رات آئی یا ختم ہو گئی - بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی گذر جانے کے ہیں، اور دوسروں کا خیال ہے کہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے اور اسکے معنی آنے اور چلے جانے دونوں کے آتے ہیں - چنانچہ صاحب لطائف اللغۃ نے بھی اسے اضداد میں سےکہا ہے - لغت میں العَسْعَسَۃُ کے معنی تاریکی کے ہلکا ہونے کے بھی ہیں اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب رات جانے والی اور صبح آنے والی ہو، یا دن جانے والا اور رات آنے والی ہو* - ابن فارس نے عَسْعَسَ کے معنے آنے ہی کے لکھے ہیں اور کہا ہے کہ جانے کے لئے جو عَسْعَسَ بولا جاتا ہے وہ دراصل سَعْسَعَ ہے - عَسْعَسَ الشَّیْءَ - اسنے اس چیز کو حرکت دی - عَسْعَسَ الذِّئْبُ - بھیڑیا رات میں گھوما* - قرآن کریم میں ہے وَاللَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ (۸۱/۱۷) اسکے معنی رات کی تاریکی جانے کے ہی ہونگے کیونکہ اس سے آگے وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ (۸۱/۱۸) ہے - یعنی طلوع فجر - قرآن کریم نے ان مظاہر فطرت کو شہادت میں پیش کرنے کے بعد کہا ہے کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۸۱/۱۹) یہ ایک صاحب عزت و تکریم رسول کی (زبان سے تم تک پہنچی ہوئی) بات ہے - یعنی جسطرح فطرت کے قوانین خدا کے متعین فرمودہ اور اٹل ہیں اسی طرح قرآنی حقائق بھی خدا کے نازل کردہ اور غیر متبدل ہیں -

ع س ل

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) اضطراب اور (۲) شہد کے ہیں - اول الذکر کے اعتبار سے ہلنے والے لچکدار نیزہ کو رُمْحٌ عَسَّالٌ کہتے ہیں- نیز جو بلبلے ہوا کے زور سے سطح آب پر چلنے لگ جائیں انہیں اَلْعَسَلُ کہتے ہیں - العَسَلُ شہد کو کہتے ہیں - اَلْعَسَّالُ - شہد کا چھتہ توڑنے والا - عَسَلَ اللّٰهُ فُلَانًا - خدا فلاں آدمی کو لوگوں میں محبوب بنائے - اَلْعَسُوْلُ وَالْعَنْسَلُ - تیز رفتار اونٹنی - اَلْعُسُلُ نیک اور صالح لوگ - اَلْعَاسِلُ - نیک عمل انسان جسکی تعریف بھلی اور شیریں سمجھی جائے - هُوَعَلٰی اَعْسَالٍ مِنْ اَبِيْهِ - وہ اپنے باپ کی خصوصیات کا حامل ہے*** -

قرآن کریم میں جنت کی انہار کے متعلق ہے - اَنْهٰرٌ مِنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى (۴۷/۱۵) - عام معنی ہیں صاف کردہ شہد کی نہریں - لیکن چونکہ یہ

---

* تاج - ** محیط - *** تاج - محیط - راغب -

سب بیان تمثیلی ہے (مَثَلُ الْجَنَّةِ ..... ۴۷/۱۵) اسلئے اس سے مراد پاکیزہ، شیریں اور قابل ستائش اوصاف و خصوصیات بھی ہو سکتے ہیں۔ ویسے اس دنیا کے جنتی معاشرہ میں رزق کی فراوانیاں بھی مقصود ہیں۔ '' وہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں'' انتہائی فراوانی کے لئے بولا جاتا ہے۔

عَسیٰ

عَسٰی۔ یہ عام طور پر ان معنوں میں آتا ہے جن معنوں میں ہم اپنے ہاں کہتے ہیں (۱) قریب ہے کہ ایسا ہو جائے۔ (۲) امید ہے کہ ایسا ہو جائے۔ (۳) ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ..... (۴) شاید ایسا ہو جائے۔ مثلاً عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔ (۱۷/۷۹) قریب ہے یا امید ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر کھڑا کر دے۔ یا مثلاً سورہ تحریم میں ہے عَسٰی رَبُّهٗ اِنْ طَلَّقَکُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْکُنَّ ..... (۶۶/۵)۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ اگر وہ تمہیں طلاق دیدے تو اس کا رب اُسے تم سے بہتر بیویاں دیدے۔ یا عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ (۲/۲۱۶)۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں کوئی چیز نا پسند ہو لیکن وہ درحقیقت تمہارے فائدے کی ہو۔ دوسری جگہ اسی سورۃ میں ہے۔ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا (۲/۲۴۶)۔ تم سے کچھ بعید نہیں کہ اگر تم پر جنگ کرنا ضروری قرار دیدیا جائے تو تم جنگ نہ کرو۔ یا اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ '' کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر ......

ع ش ر

اَلْعَشَرَةُ وَالْعَشْرُ۔ دس۔ اَلْعِشْرُوْنَ۔ بیس۔ اَلْعَشِیْرُ وَالْعُشْرُ۔ دسواں حصہ*۔ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ (۱۱/۱۳)۔ دس سورتیں لاؤ۔

عَاشَرُوْا۔ وہ لوگ مل جل کر رہے*۔ یہیں سے مُعَاشَرَةٌ ہے۔ عَشِیْرَةُ الرَّجُلِ کے معنی ہیں آدمی کے باپ کی قریبی اولاد یا قبیلہ۔ راغب نے اس کے معنے آدمی کے اقرباء پر مشتمل جماعت لکھے ہیں۔ اَلْمَعْشَرُ۔ جماعت۔ گروہ*۔

---

* تاج۔

ذَهَبَ الْقَوْمُ عَشَارَيَاتٍ ۔ قوم ہر طرف متفرق ہو کر منتشر ہو گئی ** ۔ عَشِيْرَةٌ (۲۶/۲۱۴) قبیلہ ۔ کنبہ ۔ نیز ساتھ رہنے والے ۔ اَلْعَشِيْرُ (۲۲/۱۳) رفیق ۔ ساتھی ۔ مَعْشَرٌ (۵۵/۳۳) جماعت ۔ گروہ ۔ مِعْشَارٌ (۳۴/۴۵) دسواں حصہ ۔ عِشَارٌ (۸۱/۴) دس ماہ کی گابھن (حاملہ) اونٹنیاں ۔ عَاشَرَ (۴/۱۹) ۔ مل جل کر رہنا سہنا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) دس اور (۲) باہمی اختلاط ہیں ۔

ع ش و (ع ش ی)

اَلْعَشَا ۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آجانا ۔ اندھا ہوجانا * ۔ عَشَا عَنْهُ ۔ وہ اسکی طرف سے پلٹ کر کسی دوسرے کی طرف مائل ہو گیا ۔ اس سے اعراض برتا ** ۔ چنانچہ سورۃ زخرف میں ہے وَ مَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ . . . . (۴۳/۳۶) ۔ جو خدائے رحمٰن کے قانون سے آنکھیں پھیر لے ۔ جو اس کی طرف سے ہٹ کر کسی دوسرے قانون کو اختیار کرلے ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں جو خدا کے ذکر سے آنکھیں بند کرلے ۔ اس کی طرف سے اندھا ہو جائے *** ۔ مطلب دونوں کا ایک ہی ہے ۔ یعنی قانون خداوندی سے اعراض برتنا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دھندلکا (روشنی کا کم ہو جانا) ۔ اور کسی چیز کا کم واضح ہونا ہیں ۔

اَلْعِشَاءُ ۔ عام طور پر اس سے مراد رات سمجھی جاتی ہے لیکن اس کا اطلاق مختلف اوقات پر ہوتا ہے ۔ مثلاً ابتدائی تاریکی، مغرب سے عشاء کیوقت تک ۔ زوال آفتاب سے طلوع فجر تک کا وقت ۔ اَلْعَشِيُّ وَ الْعَشِيَّةُ ۔ دن کا آخری حصہ ۔ مغرب سے عشاء کے وقت تک ۔ اَلْعَشِيُّ ۔ زوال آفتاب سے صبح تک کا وقت ۔ زوال آفتاب سے غروب آفتاب ۔ کبھی عَشِيُّ سے مراد رات بھی ہوتی ہے کیونکہ اس مادہ میں عِشَاءٌ کے معنی تاریکی کے ہیں ۔ شام کے کھانے کو اَلْعَشَاءُ کہتے ہیں ۔ صَلَاتَا الْعَشِيِّ سے مراد ظہر اور عصر کی نمازیں ہیں ۔ لیکن اَلْعِشَاآنِ ۔ مغرب اور عشاء کی نمازوں کو کہتے ہیں **** ۔

سورۃ آل عمران میں ہے وَ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ (۳/۴۰) ۔ یہاں عَشِيُّ بمقابلہ اِبْكَارٌ (دن کا پہلا حصہ) آیا ہے ۔ سورۃ النّٰزِعٰتْ میں عَشِيَّةً اَوْضُحٰهَا (۷۹/۴۶) آیا ہے ۔ یعنی صبح کے مقابلہ میں شام ۔ سورۃ صٓ میں عَشِيُّ کا لفظ (۳۸/۱۸) دن کے پچھلے حصے کے لئے آیا ہے ۔ سورۃ روم میں عَشِيًّا کا لفظ حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ (۳۰/۱۸) کے ساتھ آیا ہے ۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****یہ تمام معانی تاج نے مختلف حوالوں سے نقل کئے ہیں ۔

سورۃ یوسف میں خالی عِشَاءً آیا ہے (۱۲/۱۶)۔ اس سے مراد پچھلا پہر، شام کا وقت یا رات کا وقت لیا جاسکتا ہے۔ سورۃ نور میں مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ کے مقابلہ میں مِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ آیا ہے (۲۴/۵۸)۔

ع ص ب

اَلْعَصَبُ۔ بدن کے پٹھے بالخصوص جو جوڑوں کو تھامے ہوتے ہیں، قوم کے بہترین آدمی۔ عَصَبٌ کے بنیادی معنی موڑنے۔ لپیٹنے اور بل دینے کے ہیں۔ نیز کس کر باندھنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ عَصَبَ الشَّجَرَةَ کے معنے ہیں درخت کی متفرق شاخوں کو یکجا کرکے رسی سے کس کر باندھنا پھر اس کے پتے جھاڑنے کے لئے اسے جھنجھوڑنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ لمبائی یا گولائی میں باندھنے کے ہوتے ہیں۔ اَلْعِصَابَةُ۔ پٹی (جو باندھی جاتی ہے)*۔ اَلْاَمْرُ الْعَصِيْبُ۔ سخت معاملہ*۔ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ (۱۱/۷۷)۔ یہ سخت دن ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے وہ دن مراد ہے جس نے ہر طرف سے ان کو باندھ رکھا ہو اور انہیں گھیر لیا ہو۔ یعنی جس سے بچ نکلنا ان کے لئے دشوار ہو۔ اَلْعَصَبِيَّةُ۔ آدمی کا اپنے خاندان کی مدد کے لئے لوگوں کو بلانا اور حق و ناحق، بہرطور، اپنی جماعت ہی کی حمایت و مدافعت کرنا۔ عُصْبَةٌ۔ جماعت*۔ (ایک قدر مشترک کے ساتھ بندھے ہوئے افراد)۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ نَحْنُ عُصْبَةٌ (۱۲/۸)۔ ہم ایک اچھی خاصی جماعت ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لئے وجہ تقویت ہیں۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ کم از کم دس مردوں پر مشتمل جماعت کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس سے کم تعداد پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔

ع ص ر

عَصْرٌ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تین ہیں (۱) وقت اور زمانہ۔ (۲) کسی چیز کو دبانا یا نچوڑنا۔ اور (۳) کسی چیز کے ساتھ چمٹ جانا۔ عَصَرَ الْعِنَبَ۔ انگور کا شیرہ نچوڑ لیا**۔ سورۃ یوسف میں ہے اِنِّیْ اَرٰىنِیْ اَعْصِرُ خَمْرًا (۱۲/۳۶)۔ میں نے اپنے آپ کو شراب کشید کرتے ہوئے دیکھا۔ نیز (۱۲/۴۹)۔ اَلْعَصْرُ۔ دن۔ رات۔ صبح۔ شام

*تاج و راغب۔ **تاج۔

کا وقت آفتاب کے سرخ ہونے تک۔ ہر طویل مدت جو غیر محدود ہو اور کچھ اُمتوں (قوموں) پرمشتمل ہو جن کے ختم ہوجانے سے وہ عصر بھی ختم ہو جائے*۔ (Age or Period) ۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے اس کے معانی اَلدَّھْرُ (زمانہ) کئے ھیں ۔ قرآن کریم میں ھے وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۔ ($\frac{۱۰۳}{۱۰۲}$) ۔ زمانہ (یعنی تاریخ انسانیت) اس حقیقت پر شاھد ھے کہ انسان (جو وحی کی روشنی کے بغیر چلتا ھے) وہ ھمیشہ نقصان میں رھتا ھے ۔ اَلْعَصْرُ کے معنے روکنے کے بھی ہوتے ھیں* ۔ (یعنی وقت کی وہ حدیں جن کے اندر کوئی واقعہ رکا ہؤا ھو) ۔ اَلْعَصْرُ ۔ قبیلہ اور خاندان کو بھی کہتے ھیں* ۔ اَلْعَصَرُ جائے پناہ کو کہتے ھیں (ابن فارس) ۔ اَلْاِعْصَارُ ۔ بگولا ۔ (جو تند و تیز ھو) ۔ گرد و غبار والی تندھوا ۔ ($\frac{۲}{۲۶۶}$) ۔ اَلْمُعْصِرَاتِ ۔ بادل یا وہ ھوائیں جو بادلوں کو لاتی ھیں* ۔ وہ بادل جو برستے ھیں** ۔ ($\frac{۷۸}{۱۴}$) ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ھے کہ اَلْمُعْصِرَاتُ وہ ھوائیں ھیں جو بارش لاتی ھیں اور اَلْمُبَشِّرَاتُ وہ جو بادل لاتی ھیں ۔

ع ص ف

اَلْعَصْفُ ۔ کھیتی کی سبزی ۔ کھیتی کے پودوں کے تنوں کے پتے جو سوکھ کر جھڑتے اور چورہ چورہ ھو جاتے ھیں ۔ پودوں کے تنوں کے پتے ۔ کھیتی کے پتے ۔ بھوسہ ۔ (غلے کے دانوں کے اوپر جو چھلکا ھوتا ھے اس کے بھوسے کو کہتے ھیں) ۔ خود بال کو بھی کہتے ھیں ۔ قرآن کریم میں اصحاب الْفِیْلِ کے متعلق ھے کہ انہیں کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ ($\frac{۱۰۵}{۵}$) کر دیا۔ یعنی جیسے کھایا ہوا بُھس ھو ۔ یا وہ کھیتی جس کے دانے کھالئے گئے ھوں، یا اسے کیڑا لگ گیا ھو ۔ کلیات میں ھے کہ ھر چیز کے پتے عَصْفٌ کہلاتے ھیں۔ اسی سے دانے نکلتے ھیں۔ پہلی شکل یہ ھوتی ھے کہ پتے نمودار ھوتے ھیں ، پھر تنا بنتا ھے ، پھر اس میں سے دانوں یا پھلوں کے خول نکلتے ھیں*** ۔ اسی اعتبار سے قرآن کریم میں وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ ($\frac{۵۵}{۱۲}$) آیا ھے ۔ یعنی وہ دانے جو چھلکے کے اندر ھوں۔ بعض نے کہا ھے کہ اس سے مراد پودوں کے تنوں کے وہ پتے ھوتے ھیں جو خشک ھوکر چورا چورا ھو جائیں* ۔ راغب نے لکھا ھے کہ کھیتی اور پودوں میں سے جو کچھ ٹوٹ کر گر چکا ھو اسے عَصْفٌ کہتے ھیں**** ۔

*تاج ۔ **محیط نیز (ابن فارس) ۔ ***محیط ۔ ****راغب ۔

اَلْمُعْصِفَاتُ ۔ وہ ہوائیں جو بادلوں، پتوں، اور خشک پتوں کے چورے کو اڑا کر لاتی ہیں*۔ رِیْحٌ عَاصِفٌ ۔ تیز چلنے والی ہوا۔ آندھی ۔ جھکڑ ۔ (۲۲/۱۰) ۔ اس کے مقابل میں رِیْحٌ طَیِّبَۃٌ آیا ہے (۲۲/۱۰) ۔ یعنی خوشگوار ہوا۔ سورۃ مرسلٰت میں ہے فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا (۷۷/۲) ۔ غبار اور خس و خاشاک کو اڑا کر لے جانے والی آندھیاں ۔ اَلْعَصْفُ ۔ تیزی اور سرعت کو بھی کہتے ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں ۔

صاحب لطائف اللغۃ نے کہا ہے کہ اَلْعَوَاصِفُ وہ تند و تیز ہوائیں ہیں جو میدانوں یا صحراؤں میں طوفان برپا کردیں اور اَلْقَوَاصِفُ وہ ہوائیں جو سمندروں میں طوفان لے آئیں ۔

ع ص م

عِصْمَۃٌ کے اصلی معنی روکنے یا منع کرنے ، نیز کسی چیز کو باندھنے کے ہیں۔ گردن کے پٹھے کو بھی کہتے ہیں ۔ اس کی جمع اَعْصَامٌ ہے ۔ اَلْعِصَامُ ۔ محمل کی اس رسی کو کہتے ہیں جو محمل کو جمانے کے لئے اسکے ایک طرف باندھی جاتی ہے ۔ ایسی دو رسیوں کو عِصَامَانِ کہتے ہیں۔ اَلْعِصَامُ مِنَ الدَّلْوِ وَالْقِرْبَۃِ ۔ ڈول یا مشک کی وہ رسی جس سے باندھ کر انہیں اٹھایا جاتا ہے ۔ عَصَمَ الشَّیْئَ یَعْصِمُہٗ ، کے معنی ہیں کسی چیز کو روک دینا ۔ عَصَمَہُ اللّٰہُ مِنَ الْمَکْرُوْہِ ۔ خدا نے نا پسندیدہ اور تکلیف دہ چیز سے اس کی حفاظت کی اور بچا لیا ۔ عَصَمَ اِلَیْہِ اور اِعْتَصَمَ بِہٖ کے معنے ہیں کسی چیز کو ہاتھ سے پکڑ کر مضبوطی سے تھام لینا ۔ (اِعْتِصَامٌ کے یہی معنی ہیں) ۔ اِعْتَصَمَ بِاللّٰہِ کے معنی ابن فارس نے خدا کی حفاظت میں آکر محفوظ ہو جانے کے لکھے ہیں ۔ اَعْصَمَ بِفُلَانٍ ۔ اس نے فلاں کو پکڑ لیا اور اس سے چمٹا رہا ۔ اَعْصَمَ بِالْفَرَسِ ۔ اس نے گھوڑے کی ایال پکڑ لی تاکہ وہ گھوڑے کی تیز رفتاری کی وجہ سے اس پر سے گر نہ پڑے** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی پکڑلینا ، تھام لینا ، روکنا اور ساتھ لگے رہنا ہیں ۔

سورۃ آل عمران میں ہے وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ھُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۳/۱۰۱) ۔ جس نے قانون خداوندی کو مضبوطی سے تھام لیا اُسے زندگی کی متوازن راہ کی طرف راہ نمائی مل گئی۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا (۳/۱۰۲) کے بھی یہی معنی ہیں ۔ سورۃ مائدہ میں ہے وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (۵/۶۷) (اسے رسول تو اس قانون خداوندی کو لوگوں سے

*تاج ۔ **تاج و محیط و راغب ۔

پہنچانے جا۔ ۔ ۔ ۔ ۔) وہ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ ظاہر ہے کہ یہاں حضورؐ کے جسم کی حفاظت مراد نہیں۔ اس لئے کہ آپؐ کے متعلق خود قرآن کریم میں ہے اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ (۳/۱۴۴)۔ تو کیا اگر وہ مرجائے یا قتل کردیا جائے۔ یعنی اس میں قتل کردئے جانے کے امکان کی وضاحت ہے، لہذا (۵/۶۷) میں حضورؐ کے جسم کی حفاظت کی طرف اشارہ نہیں بلکہ حفاظتِ رسالت (پیغامات خداوندی) مقصود ہے۔

عَاصِمٌ۔ حفاظت کرنے والا (۱۱/۴۳)۔ اِسْتَعْصَمَ۔ اس نے اپنے آپکو بچانے رکھنا چاہا۔ (۱۲/۳۲)۔ تاج نے اِسْتَعْصَمَ کے معنے انکار کیا، باز رہا بھی لکھے ہیں۔ عِصَمٌ جمع ہے عِصْمَةٌ کی۔ اس کے معنی عقد نکاح کے ہیں (۶۰/۱۰)۔ یعنی وہ عورتیں جو تمہارے نکاح میں ہیں لیکن وہ مسلمان نہیں ہونا چاہتیں، انہیں روکے نہ رکھو۔ بلکہ انہیں عقد نکاح سے آزاد کر دو۔

ع ص و

عَصَا کے اصلی معنی اجتماع اور ائتلاف کے ہیں۔ لاٹھی کو اس لئے عَصَا کہتے ہیں کہ اسے پکڑنے کے لئے انگلیوں کو اکٹھا ہونا پڑتا ہے۔ عَصَوْتُ الْقَوْمَ کے معنی ہیں میں نے قوم کو جمع کر لیا*۔ اَلْعَصَا۔ جماعت کو کہتے ہیں۔ شَقَّ الْعَصَا۔ جماعت میں افتراق پیدا کر دینا*۔ اَلْقٰی الْمُسَافِرُ عَصَاہُ۔ اس کے لفظی معنی ہیں مسافر نے اپنی لاٹھی ڈالدی۔ لیکن یہ محاورہ ہے یہ بتانے کے لئے کہ وہ منزل پر پہنچکر ٹھہر گیا اور پڑاؤ ڈالا*۔ صاحب لطائف اللغۃ نے اَلْعَصَا کے معنی اَلْوَبِیْلُ (یعنی سخت۔ گراں) کئے ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ حضرت موسٰےؑ سے کہا گیا اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ (۲/۶۰) اس کے ایک معنی تو یہ ہیں اپنی جماعت کو ساتھ لیکر پتھریلی زمین کی طرف چلا جا۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اپنے عصا سے چٹان کو مار۔ اس سے اسکی اوپر کی مٹی اتر جائیگی اور چشمے کا پانی باہر نکل آئیگا۔ اسی طرح اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ (۲۶/۶۳) کے ایک معنی ہیں اپنی جماعت کو لیکر سمندر (یا دریا) کیطرف چلا جا۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اپنا عصا ٹیکتا ہوا سمندر کے راستے چلا جا۔

عصائے حضرت موسٰےؑ کا ذکر قرآن کریم میں اور بھی متعدد مقامات پر آیا ہے۔ (مثلاً (۲۰/۱۸) اگر اسے حقیقی معنوں پر محمول کیا جائے تو اس سے

---

* تاج و راغب۔ تاج نے لکھا ہے کہ "اَلْعَصَا جَمَاعَةُ الْاِسْلَام" یعنی عصا سے مراد اسلامی جمعیت ہے۔ راغب نے محاورہ "شَقَّ الْعَصَا" کے معنی جماعت سے الگ ہوجانا کئے ہیں۔

مراد لاٹھی ہوگی۔ لیکن اگر اسے مجازی معنوں میں لیا جائے تو اس سے مفہوم وہ ضابطہٴ خداوندی (وحی کا پیغام) ہوگا جو آپ کی زندگی کا سہارا اور قوم کے لئے وجہٴ تقویت تھا اور جس کے سامنے ساحرین فرعون کی باطل تعلیم کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ اس اعتبار سے قرآن کریم کے مختلف مقامات میں سیاق و سباق کے مطابق معانی متعین کئے جا سکتے ہیں۔

ع ص ی

عَصٰی۔ یَعْصِیْ۔ عِصْیَانًا۔ وَمَعْصِیَةً۔ سرکشی کرنا۔ نافرمانی کرنا *۔ وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّهٗ (۲۰/۱۲۱) آدم نے اپنے نشو و نما دینے والے کی نافرمانی کی۔ اصل میں اَلْعَاصِیْ اس اونٹ کے بچے کو کہتے ہیں جو اپنی ماں کے پیچھے پیچھے نہ چلے۔ ادھر ادھر نکل جائے *۔ عَصٰی الطَّائِرُ۔ پرندہ اڑ گیا۔ عَصٰی الْعِرْقُ۔ رگ سے خون بند نہیں ہوا اور برابر جاری رہا **۔ اِعْتَصَتِ النَّوَاةُ۔ گٹھلی سخت ہو گئی۔ تَعَصّٰی الْاَمْرُ۔ معاملہ شدید ہو گیا *۔ ان مثالوں سے اَلْعِصْیَانُ کے معنے واضح ہو جاتے ہیں۔ سورہ حجرات میں ہے کہ جو (مؤمن) کفر و فسوق و عصیان سے نفرت کرتے ہیں، وہ اَلرَّاشِدُوْنَ ہیں (۴۹/۷) ۔ یعنی خدا کے تجویز کردہ صحیح راستہ پر۔ سورہ مجادلہ میں مَعْصِیَةِ الرَّسُوْلِ (۵۸/۸) سے روکا گیا ہے۔ سورہ مریم میں عَصِیًّا (۱۹/۱۴) نافرمان بردار کے معنوں میں آیا ہے۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ معصیت کا اطلاق بعض اوقات لغزش پر بھی ہو جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جو لوگ قانون خداوندی کا اتباع کرتے ہیں وہ صحیح راستہ پر چلتے ہیں۔ جو اس راستہ کو چھوڑ کر ادھر ادھر نکل جاتے ہیں وہ زندگی کی تباہ کن روش اختیار کرتے ہیں۔ یہی مَعْصِیَةٌ ہے۔

راغب نے عَصٰی کو عَصًا (ع-ص-و) کے تابع لکھا ہے اور کہا ہے کہ عَصٰی کے معنی اطاعت سے نکل جانے کے ہیں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ جو شخص نافرمانی کرتا ہے وہ اپنی لاٹھی (عَصًا) سے اپنا بچاؤ کرتا ہے۔ نیز اس شخص کے لئے جو جماعت سے علیحدگی اختیار کرے فُلَانٌ شَقَّ الْعَصَا کہتے ہیں۔ یہیں سے عَصٰی کے معنے نافرمانی کے لئے جانے لگے ***۔ لیکن یہ توجیہ کچھ جچتی نہیں۔ عَصًا کے لئے عنوان (ع-ص-و) دیکھئے۔

ع ض د

اَلْعَضُدُ۔ ہاتھ کا کہنی سے لیکر کندھے تک کا حصہ۔ (بازو) مجازاً عَضَدَهٗ کے معنے ہیں اسکی مدد و اعانت کی، دستگیری کی۔ العَضُدُ۔

* تاج۔ ** محیط۔ *** راغب۔

حامی و مددگار - کسی کا دست و بازو *- قرآن کریم میں ہے وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا (۱۸/۵۱) - میں ایسا نہیں تھا کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو بناتا۔

اَعْضَادُ الْحَوْضِ وَغَيْرِهِ - حوض وغیرہ کے ارد گرد جو پشتہ مضبوطی اور حفاظت کی خاطر بنا دیا جاتا ہے۔

ع ض ض

عَضٌّ - کسی چیز کو دانتوں سے پکڑلینا - دانتوں سے کاٹنا - عَضَّ عَلٰی يَدِهِ غَيْظًا - اسوقت بولتے ہیں جب کوئی شخص کسی سے انتہائی عداوت رکھے اور دشمنی میں بہت زیادتی سے کام لے **- سورہ آل عمران میں ہے - عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ (۳/۱۱۸) - یعنی تمہارے خلاف ان کی دشمنی کا یہ عالم ہے کہ یہ غصے سے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں - دراصل یہ محاورہ اسوقت بولا جاتا ہے جب کوئی غصے میں اپنا ہی کچھ بگاڑلے، اپنے مقابل پر اس کا بس نہ چل سکے۔

ع ض ل

اَلْعَضَلَةُ - پٹھا جسکے ساتھ موٹا گوشت ہو (مچھلی جو پنڈلی اور بازو وغیرہ میں ہوتی ہے) **- عَضَلْتُهٗ - میں نے اسکی مچھلی پر مارا - اسکے بعد اسکے معنی ہو گئے کسی کو زبردستی اور سختی سے (کسی کام سے) روک دینا - فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ (۲/۲۳۲) انہیں مت روکو - نیز اس کے معنے تنگ کرنے اور مجبور کرنے کے بھی ہیں **- عَضَلَ عَلَيْهِ - اس نے اس پر تنگی کی - اسے روکا اور باز رکھا - اَلْمُعْضِلَاتُ - مشکل اور پرپیچ مسائل جنہیں سلجھایا نہ جاسکے - سختیاں - مصیبتیں **- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سختی اور معاملہ میں پیچیدگی کے ہوتے ہیں۔

ع ض و

اَلْعَضْوُ - اَلْعِضْوُ - بدن کا ٹکڑا - جسم کا کوئی ایک حصہ **- (مثلاً ہاتھ، کان، ٹانگ وغیرہ) - مجموعہ کا ایک فرد - جماعت کا ایک فرد***- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے حصے کر دینے کے ہوتے ہیں - اَلتَّعْضِيَةُ - ٹکڑے ٹکڑے کر دینا - تقسیم کر دینا -

* تاج و راغب و محیط - ** تاج - *** محیط -

متفرق کر دینا۔ اَلْعِضَۃُ۔ چیز کا ٹکڑہ۔ لوگوں کا فرقہ۔ جھوٹ۔ (یہ دراصل عِضْوَۃٌ تھا) اسکی جمع عِضُوْنَ اور عِضِیْنَ ہے۔ نیز یہ عِضَہٌ (ہاء کے ساتھ) کی بھی جمع ہو سکتی ہے جسکے معنی سحر (جادو) کے ہوتے ہیں۔ اَلْعَاضِہُ۔ ساحر*۔ غالباً اس لئے کہ جادو ٹونا عام طور پر گوشت کے ٹکڑے (یا ھڈی) پر کیا جاتا ہے۔

سورہ حجر میں ہے اَلَّذِیْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ (۱۵/۹۱)۔ جنہوں نے قرآن کریم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئیے***۔ جس بات سے اپنا مطلب حل ہوتا ہو اسے مان لیا۔ جو بات اپنے مفاد کے خلاف جاتی ہو اسکی جگہ اپنی خود ساختہ شریعت کا اتباع کر لیا۔ ایسی روش کا جو نتیجہ ہوتا ہے اسے (۲/۸۵) میں دیکھئے۔

یا اسے محض منتروں کی طرح پڑھنے یا تعویذ گنڈے لکھنے کے لئے رکھ چھوڑا*۔

ع ط ف

عِطْفٌ۔ ایک جانب۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مڑنے اور ٹیڑھا ہونے کے ہیں۔ عِطْفَا الرَّجُلِ۔ آدمی کے دونوں پہلو (Sides) ۔ سر سے لیکر سرین تک۔ عِطْفَا کُلِّ شَیْئٍ۔ ہر چیز کے دونوں جانب۔ اَلْعَطْفُ۔ لوٹنا۔ مڑنا*۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ اسوقت بولا جاتا ہے جب کسی چیز کا ایک سرا دوسرے سرے کی طرف موڑ دیا جائے****۔ قرآن کریم میں ہے ثَانِیَ عِطْفِہٖ (۲۲/۹)۔ پہلو تہی کرتے ہوئے۔

عَطَفَ۔ یَعْطِفُ۔ عَطْفاً کے معنی مائل ہونے کے ہوتے ہیں۔ اَلْعَاطِفَۃُ۔ مہربانی۔ شفقت۔ صلہ رحمی*۔

ع ط ل

عَطَلٌ۔ عُطُوْلٌ۔ زیور سے خالی ہونا۔ عَطِلَتِ الْمَرْاَۃُ۔ عورت زیور سے خالی ہوئی۔ ایسی عورت کو اَلْعَاطِلُ اور العُطُلُ کہتے ہیں۔ (اَلْمِعْطَالُ اس عورت کو کہتے ہیں جو زیور کے بغیر رہنے کی عادی ہو)۔ اَلتَّعْطِیْلُ۔ خالی کر دینا۔ بیکار کرکے چھوڑ دینا۔ چنانچہ اس ڈول کو جس کی رسیاں ٹوٹ چکی ہوں اور اس سے پانی نہ نکالا جا سکے اَلْعَطِلَۃُ کہتے ہیں۔ قَوْسٌ عُطُلٌ۔ وہ کمان جس پر تانت نہ ہو۔ بِئْرٌ مُعَطَّلَۃٌ۔

*تاج۔ **محیط۔ ***ابن قتیبہ (القرطین۔ ج/۱ صفحہ ۲۴۱) ****راغب۔

وہ کنواں جس کے آس پاس آبادی نہ ہونے کی وجہ سے وہ بیکار ہو چکا ہو، اور اس سے پانی نہ بھرا جاتا ہو*۔ (۲۲/۴۵)۔ سورہ تکویر میں ہے اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (۸۱/۴) جب حاملہ اونٹنیوں کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دیا جائیگا۔ اَلْعِشَارُ ان اونٹنیوں کو کہتے ہیں جو بچہ دینے کے قریب ہوں۔ عربوں میں اونٹ کی جو اہمیت تھی وہ واضح ہے۔ اور ایسی اونٹنیاں جو بچہ دینے کے قریب ہوں ان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔ اس قسم کی اونٹنیوں کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دینے سے مفہوم یہ ہے کہ اس دور میں خود اونٹوں کی قدر و قیمت ہی نہیں رہیگی۔

عَطَلَ الْاَجِيْرُ۔ مزدور کا بیکار رہنا**۔

ع ط و

اَلْعَطْوُ۔ لینا۔ کسی چیز کو لینے کے لئے سر اور ہاتھوں کو اوپر اٹھا دینا۔ ظَبْيٌ عَطُوٌّ۔ (عین کی تینوں حرکتوں کے ساتھ) وہ ہرن جو درخت سے پتے کھانے کے لئے اپنے سر کو اوپر اٹھائے*۔

اَلْاِعْطَاءُ۔ دینا۔ اَلْعَطَاءُ وَالْعَطِيَّةُ۔ جو کچھ دیا جائے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اِيْتَاءٌ (دینے) اور اِعْطَاءٌ میں فرق یہ ہے کہ اِيْتَاءٌ کسی واجب کے ادا کرنے پر بھی بولا جاتا ہے اور ایسی چیز پر بھی جو محض تفضلاً دی جائے۔ لیکن اِعْطَاءٌ صرف تفضلاً دینے کو کہتے ہیں*۔ اَلْاِعْطَاءُ۔ سپردگی۔ اَعْطَى الْبَعِيْرُ۔ اونٹ نے منہ زوری ختم کی اور مطیع ہوگیا۔ قَوْسٌ عَطْوَى۔ نرم اور آسانی سے کھنچ جانے والی کمان*۔

قرآن کریم میں ہے وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۷/۲۰)۔ جو سامان زیست نوع انسانی کی نشوونما کے لئے خدا کیطرف سے مفت عطا ہوا ہے (یعنی رزق کے قدرتی وسائل) ان پر کوئی روک نہیں۔ جب خدا نے انہیں عالمگیر انسانیت کی نشوونما کے لئے عام کر دیا ہے تو ان پر روک کون ڈال سکتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے نظام ربوبیت کو قائم کرنے والوں کے متعلق کہا کہ مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى (۹۲/۵) جو دیتا ہے اور اس طرح زندگی کی تباہیوں سے محفوظ رہنا چاہتا ہے اسی کے لئے آسانیاں ہیں۔ برخلاف اس کے مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى (۹۲/۸)۔ جو سب کچھ سمیٹ کر اپنے ہی لئے رکھتا ہے اور اس طرح دوسروں سے بے نیاز ہو جانا چاہتا ہے تو اس کے لئے دشواریاں ہی دشواریاں ہیں۔

* تاج و راغب۔ ** محیط

یہ ظاہر ہے کہ انسانی جسم کی پرورش کا مدار ہر اس چیز پر ہے جسے انسان اپنے لئے لیتا ہے۔ جسے وہ خود کھاتا پیتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ نوالہ آپ کے منہ میں جائے اور پرورش میرے جسم کی ہوتی جائے۔ لیکن اس کے بالکل برعکس، انسانی ذات (Self) کی نشو و نما ہر اُس شے سے ہوتی ہے جسے وہ شخص دوسروں کی نشو و نما کے لئے دیتا ہے۔ اور برضا و رغبت دیتا ہے۔ اسی کو اِعْطَاءٌ کہتے ہیں۔ قرآنی نظام کی یہی اصل و بنیاد ہے۔ پوری پوری محنت کرنا لیکن اپنی محنت کے ماحصل سے اپنی ضروریات کے مطابق لیکر باقی سب نوع انسانی کی نشو و نما کے لئے دیدینا۔ یہ ہے جماعت مؤمنین کا شعار زندگی۔

اَلتَّعَاطِیْ۔ جس چیز کا حق نہ ہو اسے لے لینا۔ باہم کسی چیز کو لینے کے لئے کشمکش کرنا۔ پاؤں کے پنجوں پر کھڑے ہونا اور ہاتھ بڑھانا۔ بہت بڑی جرأت کرنا *۔ سورہ قمر میں اس سرکش کے متعلق ہے جس نے اس اونٹنی کو جسے حضرت صالح ؑ نے خدا کے نام پر چھوڑا تھا قتل کر دیا تھا کہ فَتَعَاطٰی فَعَقَرَ (۵۴/۲۹)۔ اس نے بڑی جرأت کرکے ہاتھ بڑھایا اور اونٹنی کو مار دیا۔ یعنی اس چیز کو جا لیا جس کا اسے حق نہیں تھا (ابن فارس)

ع ظ م

عَظْمٌ۔ ھڈی کو کہتے ہیں جو انسان کے جسم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ عَظْمُ الْفَدَّانِ۔ کسان کے ھل کی اس چوڑی لکڑی کو کہتے ہیں جسکے آگے لوہے کا پھل لگا ہوتا ہے۔ ھل میں اس لکڑی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ عَظَمَاتُ الْقَوْمِ۔ قوم کے سرداروں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اساسی حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔ عَظَمُ الطَّرِیْقِ۔ راستہ کے کشادہ حصے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ راستہ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ عَظَمَةٌ کے معنی تکبر و غرور۔ بڑائی۔ نیز عزت و حرمت کے بھی ہیں۔ اَلْعَظِیْمَةُ۔ سخت پیش آنے والی بات یا حادثہ *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی بڑا ہونے اور قوی ہونے کے ہیں۔

قرآن کریم میں عَظْمٌ (جمع عِظَامٌ اور اَعْظُمٌ) ھڈیوں کے معنی میں متعدد مقامات پر آیا ہے (مثلاً ۱۷/۴۹ ; ۲/۱۹ ; ۳۶/۷۸ ; ۲۳/۴۵)۔ سورہ نور میں هَیِّنٌ (آسان) کے مقابلہ میں عَظِیْمٌ کا لفظ اہمیت کا مفہوم لئے ہوئے ہے (۲۴/۱۵)۔ اور اَلنَّبَاِ الْعَظِیْمِ (۷۸/۲) میں سخت حادثہ یا انقلاب عظیم کے معنوں میں۔

* تاج۔

اور اَلْقُرْآنَ الْعَظِیْمَ (۸۷/۱۵) کے معنی ہیں زندگی کے بنیادی حقائق کا ضابطہ ۔ '' عَظُمَ الْقَدْآنِ '' کی رعایت سے ، قرآن کریم وہ ضابطہ ہے جس سے زندگی کی سنگلاخ زمین قابل کاشت ہوجاتی ہے ۔ جس سے راستے کشادہ ہو جاتے ہیں ۔

سورہ بقرہ میں خدا کے متعلق ہے وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (۲/۲۵۶) ۔ یعنی بلندیوں اور عظمتوں کا مالک اور انسان کو شرف کی بلندیاں اور زندگی کی بنیادی قوتیں عطا کرنے والا ۔ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ (۹/۱۲۹) ۔ جس کے قبضۂ قدرت میں کائنات کی اساس و بنیاد کا کنٹرول ہو ۔

ع ف ر

اَلْعَفَرُ ۔ مٹی ۔ عَفَرَہٗ فِی التُّرَابِ یَعْفِرُہٗ ۔ اسے مٹی میں لت پت کر دیا ۔ مٹی میں دبا دیا ۔ اَلْمَعْفُوْرُ ۔ وہ چیز جس پر مٹی مل دی گئی ہو ۔ اَلْعُفْرُ ۔ موٹا ۔ مضبوط آدمی ۔ نیز بہادر چست آدمی ۔ رَجُلٌ عِفْرٌ و عِفْرِیْنٌ ۔ (نیز عِفِرِّیْنٌ) وَ عِفْرِیْتٌ ۔ چالاک اور شریر آدمی ۔ نہایت تیز و طرار آدمی ۔ حیرت انگیز ہوشیاری کے ساتھ معاملات میں گھس جانے والا آدمی ۔ نیز ضبط کرنے والا ، قوی تند خو انسان جو اپنے مد مقابل کو زیر کرلے* ۔

سورۂ نمل میں حضرت سلیمانؑ کے درباریوں میں سے ایک کے لئے عِفْرِیْتٌ مِنَ الْجِنِّ (۲۷/۳۹) آیا ہے ۔ یعنی وحشی اور پہاڑی قبائل میں سے ایک مضبوط ، قوی ہیکل ، اور چست و چالاک آدمی ، جس میں قوت اور معاملات کے اندر تک گھسجانے کی صلاحیت بدرجۂ اتم تھی ۔ تیز و طرار ۔ زیرک اور ہوشیار ۔ انتہائی معاملہ فہم ۔

عِفْرِیْت

حضرت سلیمانؑ کے لشکر کا ایک زبردست اور شاہ زور (پہاڑی قبیلہ کا سردار (۲۷/۳۹) جو بہت تیز طرار اور معاملہ فہم تھا ۔ دیکھئے عنوان (ع ۔ ف ۔ ر) ۔

ع ف ف

العِفَّۃُ ۔ نفس کا ایسی حالت میں پہنچ جانا جس کے ذریعہ وہ غلبۂ شہوت سے محفوظ رہے** ۔ عِفَّۃٌ ۔ عَفَافٌ کے معنی ہیں حرام و نازیبا چیزوں

*تاج و محیط و راغب ۔ **راغب ۔

سے خود کو روکنا - قبائح سے رک جانا** - ابن فارس نے بھی اس کی تائید کی ہے - اِعْتَفَقَتِ الْاِبِلُ الْيَبِيْسَ - اونٹوں نے اپنی زبانوں سے خشک گھاس کو مٹی سے صاف کرتے ہوئے اٹھا لیا** - اس مادہ کے بنیادی معنوں میں رک جانے کا مفہوم پایا جاتا ہے - چنانچہ اَلْعُفَافَةُ اس تھوڑے سے دودھ کو کہتے ہیں جو دودھ دوہ لینے کے بعد تھنوں میں رک کر رہ جائے** - عَفَّ الرَّجُلُ - آدمی نامناسب چیزوں سے رکا - تَعَفَّفَ - کے معنی ہیں تھوڑی چیز پر کفایت کرلینا* - بتکلف اپنے نفس کو روکنا اور کسی چیز سے دور رکھنا** - بےجا باتوں سے شرم و حیا کرنا - ضرورت کے باوجود کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرنا - (۲/۲۷۳) - سورۃ نور میں ہے وَ اَنْ يَسْتَعْفِفْنَ (۲۴/۶۰) اگر وہ اس کی بھی احتیاط رکھیں تو زیادہ اچھا ہے - نیز وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا (۲۴/۳۳). جو نکاح کا سامان نہیں پاتے انہیں چاہئے کہ اپنے آپ کو بچائے رکھیں - اسی کو عفت (پاکبازی) کہتے ہیں -

قرآن کریم انسانی عفت پر بڑا زور دیتا ہے - یعنی جنسی اختلاط کے صرف ایک طریقے کو جائز قرار دیتا ہے جسے نکاح کہا جاتا ہے - اس کے علاوہ جنسی اختلاط سخت جرم ہے - وہ کھانے پینے کے معاملہ میں اضطراری حالت کو تسلیم کرتا ہے اور اس میں حرام تک کھانے کی اجازت دیتا ہے - لیکن جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے اضطراری حالت کو تسلیم نہیں کرتا ، اس لئے وہ اس کی تسکین کے لئے ناجائز اختلاط کی اجازت نہیں دیتا - بھوک اور پیاس انسان کے اپنے کنٹرول میں نہیں ہوتی - لیکن جنسی جذبہ انسان کے اپنے خیال سے ابھرتا ہے - اگر اس کا خیال نہ کیا جائے تو یہ کبھی بیدار نہیں ہوتا - اس لئے جس جذبہ پر انسان کا اپنا کنٹرول ہو اس میں اضطراری حالت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا -

ع ف و

عَفْوٌ - اس کے اصلی معنی ''ترک'' کے ہیں - عَفَا عَنْهُ - اسے سزا دئے بغیر چھوڑ دیا اور جانے دیا - معاف کر دیا***- قرآن کریم میں عَفْوٌ اور صَفْحٌ کے لفظ اکٹھے آئے ہیں (۲/۱۰۹) - ان دونوں لفظوں میں فرق یہ ہے کہ صَفْحٌ بلیغ تر ہے - یعنی بالکل چھوڑ دینا ، اور عَفْوٌ میں یہ ہوسکتا ہے کہ کچھ کہہ سن کر چھوڑدیا جائے ***- صاحب محیط کے نزدیک عَفْوٌ اور مَغْفِرَةٌ میں فرق یہ ہے کہ غُفْرَانٌ میں سزا قطعاً نہیں ہوتی اورعَفْوٌ

*راغب - **محیط و تاج - *** تاج -

سزا سے پہلے بھی ہو سکتا ہے اور سزا کے بعد بھی** ۔ (سزا کے بعد عَفْوٌ سے مراد ہوگا سزا کے اثرات کو مٹا دینا ۔ کیونکہ عَفْوٌ کے معنی مٹا دینا بھی ہیں ۔ اور مَغْفِرَۃٌ کے معنی ہونگے ان اثرات سے شروع ہی سے بچائے رکھنا)۔

عَفْوٌ ۔ مٹا دینا ۔ نیز مٹ جانا ۔ عَفَا اَثَرُہٗ ۔ وہ ہلاک ہوگیا ۔ اسکا نشان تک مٹ گیا ۔ اَلْعَفَاءُ ۔ وہ بارش جو آثار منازل تک کو مٹا دے* ۔

صحاح میں ہے کہ عَفْوُ الْمَالِ اس مال کو کہتے ہیں جو کسی کے خرچ سے زائد ہو ۔ اَعْطَیْتُہٗ عَفْوَ الْمَالِ کے معنی ہیں میں نے اسے بغیر مانگے مال دیا* ۔ ابن فارس نے بھی اس کی تائید کی ہے ۔ اَلْعَفْوُ مِنَ الْمَاءِ ۔ وہ پانی جو پینے والوں سے بچ جائے اور بلا کلفت و مزاحمت حاصل ہوسکے ۔ عَفَا شَعْرُ الْبَعِیْرِ ۔ اونٹ کے بال لمبے اور زیادہ ہوگئے ۔ عَفَا عَلَیْہِ فِی الْعِلْمِ ۔ وہ علم میں اس سے آگے بڑھ گیا اور اس کی معلومات پر اضافہ کیا ۔ عَفَا الصُّوْفَ ۔ اون کو زیادہ بڑھا کر کاٹا* ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے اسے اضداد میں سے لکھا ہے ۔ یعنی اس کے معنی مٹا دینے کے بھی ہیں اور زیادہ کرنے کے بھی ۔

لہذا اسکے معنی ہیں ضرورت سے زائد ۔ قرآن کریم میں ہے کہ یہ لوگ دریافت کرتے ہیں کہ ہم کسقدر مال و دولت نوع انسانی کی نشو و نما کے لئے کھلی رکھیں اور کس قدر خود اپنے لئے رکھیں ۔ اس کے جواب میں کہا کہ قُلِ الْعَفْوَ ($\frac{۲}{۲۱۹}$) ۔ ان سے کہہ دو کہ جسقدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب کا سب ۔ یہ ہے قرآن کریم کے نظام ربوبیت کا اصل الاصول ۔ یعنی ہر فرد معاشرہ پوری محنت کرے اور اس کے بعد اپنی محنت کے ماحصل سے اپنے لئے صرف اس قدر لے جس سے اس کی بنیادی ضروریات پوری ہو جائیں ۔ باقی سب دوسروں کی ضروریات کے لئے قرآنی نظام کے حوالے کردے ۔ نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد فاضلہ دولت (Surplus Money) ہے ۔ قرآنی نظام میں فاضلہ دولت کسی فرد کے پاس رہنے نہیں پاتی ۔ تمام افراد کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری نظام کے سر پر ہوتی ہے اور افراد اپنی محنت کا ماحصل اس نظام کی تحویل میں دے دیتے ہیں ۔ اس لئے نہ کوئی شخص بھوکا مرتا ہے اور نہ ہی کسی کے پاس زائداز ضرورت دولت رہتی ہے ۔

اَلْعَافِیَۃُ والْمُعَافَاۃُ کے معنی ہیں دوسروں کی ایذاء سے محفوظ رکھنا ۔ بیماریوں اور آفتوں سے بچانا* ۔ ابن اثیر نے اس کا یہ مفہوم بنایا ہے

*تاج ۔ **محیط ۔

کہ لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے مستغنی کر دینا ۔ ایک کی اذیت سے دوسرے کو محفوظ کرنا ۔ گویا نہ کوئی تمہارا محتاج ہو اور نہ تم کسی کے محتاج ہو ۔ اَلْمُعْتَفِیْ ۔ وہ شخص جو تمہارے ساتھ رہے لیکن تم سے کسی سلوک کا طلبگار نہ ہو* ۔ طلبگار نہ ہونے کے اعتبار سے اَعْطَیْتُہٗ عَفْوًا کے معنی ہیں میں نے اس کو بے مانگے دے دیا ۔ نیز عَفْوٌ کے معنے بہترین چیز کے ہوتے ہیں ۔ نیز وہ چیز جس میں کسی قسم کی تکلیف و مشقت نہ اٹھانی پڑے* ۔

سورۃ بقرہ میں بنی اسرائیل کی خطاکاری کے بعد کہا ہے ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْکُمْ (۲/۵۲) ۔ یعنی اس غلطی کے مضر اثرات کو مٹا دیا ۔ اسے معاف کرنا یا در گزر کرنا کہتے ہیں (واضح رہے کہ یہ اثر اس طرح سے مٹتا ہے کہ کوئی ایسا اچھا کام کیا جائے جس کے خوشگوار نتائج پہلی غلطی کے مضر نتائج کی تلافی کر دیں ۔ (دیکھئے عنوان ح ۔ س ۔ ن اور س ۔ و ۔ أ) ۔ اپنے حق کو چھوڑ دینے کے معنوں کے لئے (۲/۲۳۷) دیکھئے ۔ آگے بڑھ جانے کے معنوں میں یہ لفظ (۷/۹۵) میں آیا ہے ۔ یعنی وہ تعداد میں زیادہ ہو گئے ۔ ترقی کر گئے ۔

سورۃ شوریٰ میں ہے وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا ۔ یعنی قانون عدل کا اصول یہ ہونا چاہئے کہ سزا ہمیشہ جرم کی نسبت سے دی جائے ۔ جیسا جرم ویسی سزا ۔ اس کے بعد ہے وَ مَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ (۴۲/۴۰) ۔ لیکن اگر مستغیث معاف کر دے اور اس طرح مجرم کی اصلاح کر دے اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا کرنے کا موجب بن جائے، تو اس کا اجر اللہ سے ملیگا ۔ یعنی عدل سے مقصد تلافی مافات ہوتا ہے یا اصلاح ۔ انتقامی سزا اس صورت میں دی جاتی ہے جب اول الذکر صورتوں کا امکان نہ ہو ۔ [گناہوں کے معاف ہو جانے کے متعلق عنوانات (ت ۔ و ۔ ب) و (غ ۔ ف ۔ ر) اور (ح ۔ س ۔ ن) دیکھئے ۔]

ع ق ب

اَلْعَقِبُ ۔ اَلْعَاقِبُ ۔ اَلْعَاقِبَۃُ ۔ اَلْعُقْبٰی ۔ ان الفاظ کے معنی ہیں ہر چیز کا آخر ۔ یہی اس مادہ کے اصلی معنی ہیں ۔ باقی تمام معانی (جو بہت سے ہیں) اسی مرکزی مفہوم کے گرد گھومتے ہیں ۔ اَلْعَقِبُ ۔ ایڑھی (جمع اَعْقَابٌ) ۔ اولاد ۔ نسل جو انسان کے پیچھے آتی ہے ۔ بیٹے پوتے ۔ اَلْعَاقِبُ ۔ ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کی جانشین ہو ۔

*تاج ۔

اسکے پیچھے آئے ۔ مثلاً بیٹا ۔ سردار قوم کے پیچھے آنے والا افسر ۔ عَقَبَهٗ ۔ وہ اسکا جانشین ہوا ۔ تَعَاقَبَ الْمُسَافِرَانِ عَلَى الدَّابَّةِ ۔ دو مسافر یکے بعد دیگرے ایک سواری پر سوار ہوئے ۔ اَلْعُقْبَةُ ۔ دن کو بھی کہتے ہیں اور رات کو بھی ، کیونکہ دونوں یکے بعد دیگرے آتے ہیں ۔ نیز اس کے معنی باری یا بدل کے بھی ہیں ۔ تَعَقُّبٌ ۔ ادھر ادھر دیکھنا یا مڑ کر پیچھے کو دیکھنا یا لوٹنا ۔ تَعَقَّبَ ۔ کسیکا پیچھا کرنا ۔ نیز کسی کو جرم کی وجہ سے گرفتار کرنا اور اسے جرم کی سزا دینا *۔

راغب نے کہا ہے کہ اَلْعُقْبُ وَالْعُقْبٰی ۔ اچھے بدلے کیلئے مخصوص ہوتے ہیں ۔ نیز عَاقِبَةٌ بھی ۔ اور عِقَابٌ اور عُقُوْبَةٌ سزا کیلئے ** ۔ لیکن یہ کلیہ نہیں ۔ قرآن کریم میں عُقْبٰی کا لفظ مومنین کی جزا اور کفار کی سزا دونوں کے لئے آیا ہے (۱۳/۳۵) ۔ محیط میں اَلْمُعَقِّبُ کے معنی ٹال مٹول کرنے والے کے بھی ہیں *** ۔ قرآن کریم میں ہے وَاللّٰهُ یَحْکُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُکْمِهٖ (۱۳/۴۱) ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے فیصلے کی کہیں اپیل نہیں ہو سکتی ۔ اس کے فیصلے کے بعد کسی اور کا فیصلہ نہیں آسکتا ۔ اَلْعَقَبَةُ ۔ پہاڑ پر چڑھنے کا دشوار گذار راستہ * ۔ (۹۰/۱۱) ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنوں میں بلندی ، سختی اور صعوبت بھی لکھے ہیں ۔

قرآن کریم نے اعمال کے نتائج کیلئے اس مادہ کے مشتقات استعمال کرکے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف راہ نمائی کی ہے ۔ قانون مکافات کے معنی یہ ہیں کہ ہر عمل کا نتیجہ اسکے ساتھ ہی لگا ہوا ہوتا ہے ۔ یعنی آگے آگے کام جاتا ہے اور اسکے پیچھے پیچھے اسکا نتیجہ چلا جاتا ہے ۔ اسے جزا اور سزا کہتے ہیں ۔ لہذا جزا یا سزا کہیں خارج سے نہیں آتی ۔ خود اعمال کے اندر ہی پوشیدہ ہوتی ہے ۔ اعمال کا جزء ہوتی ہے ۔ جیسے ورزش کا نتیجہ (صحت) خود اس عمل کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے ۔ اسیلئے سورہ رعد میں کہا ہے کہ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (۱۳/۱۱) ۔ ہر انسان (یا اسکے عمل) کے ساتھ اسکے آگے اور پیچھے ایسی قوتیں لگی ہوئی ہیں جو خدا کے قانون کے مطابق اسکی نگرانی کرتی ہیں اور اس کے ہر عمل کو آخری نتیجہ تک پہنچا کر چھوڑتی ہیں ، اسی کو مآل کار ، یا کام کا آخری نتیجہ کہتے ہیں ۔ یہی ہر انسانی عمل کی عَاقِبَةٌ یا عُقْبٰی ہے ۔

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط ۔

یعنی اس کا آخری نتیجہ ۔ تِلْکَ عُقْبَی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا (۱۳/۳۵)۔ یہ مآل (انجام) ہے ان لوگوں کا جو قانون خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں ۔ لہٰذا عُقْبٰی کے معنی اس دنیا کے بعد دوسری دنیا ہی نہیں ۔ اس کے معنی ہر کام کا نتیجہ یا انجام ہیں ۔ خواہ وہ انجام اسی دنیا میں سامنے آجائے ۔ (یا اس کے بعد کی زندگی میں)۔ چنانچہ (۱۳/۲۲) میں جو آیا ہے اُولٰٓئِکَ لَہُمْ عُقْبَی الدَّارِ تو اسکے معنی یہی ہیں کہ ان کے لئے اس دنیا کا انجام نہایت اچھا ہے ۔ یہی معنی عَاقِبَۃُ الدَّارِ (۶/۱۳۶) کے ہیں جہاں یہ کہہ کر بات واضح کر دی ہے کہ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۔ تمہیں جلدی معلوم ہوجائیگا ۔ یعنی اسی زندگی میں بات واضح ہو جائیگی کہ دنیا کی خوشگواریاں کس کے لئے ہیں ۔

یَنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْہِ ۔ اپنی ایڑھیوں پر لوٹ جانا ۔ بمقابلہ اتباع (۲/۱۴۳)۔ اس کے معنی پھر اسی حالت کی طرف لوٹ جانا ، پھر اسی روش زندگی کو اختیار کرلینا ہیں جس پر کوئی پہلے ہو۔ یعنی جاہلیت کے بعد اسلام قبول کرنا ، اور اسلام کے بعد پھر جاہلیت کی طرف لوٹ جانا۔ (۳/۱۴۳) میں یہی معنی ہیں جہاں کہا گیا ہے کہ اسلام کا نظام ، رسول اللہؐ کی زندگی تک ہی نہیں کہ ان کی وفات کے بعد تم پھر نظام جاہلیت کی طرف لوٹ جاؤ ۔ یہ نظام علیٰ حالہٖ جاری رہیگا ۔ اس سے قرآن کریم نے اس حقیقت عظمٰی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نظام ، افراد یا شخصیتوں کی زندگی سے وابستہ نہیں ہوتا ۔ وہ اپنے اصولوں کے زور پر آگے چلتا ہے ۔ شخصیتیں آتی ہیں اور جاتی ہیں ۔ لیکن جب تک وہ اصول قائم رہتے ہیں جن پر وہ نظام متشکل ہوا تھا ، وہ نظام رواں دواں آگے بڑھتا رہتا ہے ۔ البتہ جب ان اصولوں کو ترک کر دیا جائے تو پھر وہ نظام ختم ہوجاتا ہے ۔ ختم نبوت کے معنی ہی یہ تھے کہ اب یہ نظام (اسلام)شخصیتوں کے سہاروں کا محتاج نہیں رہیگا ۔ یہ اپنے محکم اصولوں کی قوت پر آگے چلے گا ۔ جب تک امت ان اصولوں پر قائم رہی وہ نظام آگے بڑھتا گیا ۔ جب اس نے وہ اصول چھوڑ دئے تو وہ نظام بھی ختم ہو گیا ۔ اب اس کے احیاء کی صورت یہی ہے کہ قرآن کریم کے اصولوں کو پھر سے ضابطۂ حیات بنا لیا جائے ۔

ع ق د

عَقْدٌ ۔ مضبوطی سے گرہ باندھنا ۔ یہ حَلٌّ (گرہ کھولنا) کی ضد ہے ۔ پھر اسکے معنی کسی بات کو مؤکد کرنے کے ہو گئے ۔ عَقَدَ الْعَہْدَ ۔

اپنے عہد کو مضبوط کر دیا * ۔ اَلَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ (۴/۳۳) وہ لوگ جن سے تم نے محکم عہد باندھ رکھا ہے ۔ اَلْعَقْدُ ۔ عہد و پیمان * ۔ (جمع عُقُوْدٌ) ۔ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (۵/۱) ۔ اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو ۔ اَلْعُقْدَۃُ ۔ (جمع عُقَدٌ) گرہ * ۔ عُقْدَۃَ النِّکَاحِ (۲/۲۳۵) ۔ نکاح کی گرہ ۔ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ (۲۰/۲۷) ۔ میری زبان کی گرہ کھول دے ۔ ایسے روانی اور طلاقت عطا کر دے ۔ تاکہ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ (۲۰/۲۸) اہل فرعون میری (حضرت موسیٰ ؑ کی) بات کو سمجھ لیں ۔

عُقْدَۃٌ ۔ ارادے کو پختہ کرنا ۔ حکومت ۔ حکومت کی بیعت ۔ وفاداری ۔ (جمع عُقَدٌ) ۔ اَلنَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ (۱۱۳/۴) ۔ وہ جماعتیں جو کسی حکومت کو کمزور کرنے یا اسکی وفاشعاری میں تذبذب پیدا کرنے کی کوشش کریں ۔ یا نفسیاتی اثرات سے کسی کے محکم یقین کو متزلزل کر دیں ۔ اَلْعَقِیْدَۃُ ۔ دل میں مضبوطی سے جمی ہوئی بات ** ۔ (قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا) ۔

ع ق ر

عَقَرَ النَّخْلَۃَ ۔ کھجور کے درخت کے بالائی حصہ کو گابھے کے ساتھ کاٹ دینا ، جس کے بعد وہ خشک ہو جاتا ہے * ۔ اور راغب کے نزدیک اس کے معنی ہیں کھجور کے درخت کو جڑ سے کاٹ دینا *** ۔ بہرحال دونوں صورتوں میں اس کے معنی اسے اسطرح کر دینے کے ہیں کہ وہ پھل نہ لاسکے ۔ اس لئے اَلْعَقْرَۃُ کے معنی ہیں رحم کا عقیم (بانجھ) ہو جانا ۔ حمل قبول کرنے کی صلاحیت نہ رکھنا ۔ اَلْعَقْرُ ۔ زخمی کرنا ۔ نَاقَۃٌ عَقِیْرٌ ۔ وہ اونٹنی جس کی کونچیں کاٹ دی گئی ہوں * ۔ قرآن کریم میں عَاقِرٌ بانجھ عورت کے لئے (۳/۴۰ ؛ ۱۹/۵) میں آیا ہے ۔ اور عَقَرَ اونٹنی کی کونچیں کاٹ دینے (یا اسے قتل کر دینے) کے لئے (۵۴/۲۹ ؛ ۹۱/۱۴) میں ۔

ع ق ل

عَقْلٌ کے معنی ہیں روکنا ۔ منع کرنا ۔ عِقَالٌ اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کی ٹانگ کے نچلے حصہ کو موڑ کر اس کی پنڈلی کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے ۔ اُعْتُقِلَ لِسَانُہٗ ۔ اسکی زبان رک گئی ۔ وہ بول نہ سکا عَقَلَ ۔ اس نے عقل سے کام لیا ۔ عَقَلَ الشَّیْءَ ۔ کسی چیز کو سمجھنا ، اس میں غور و تدبر کیا ۔ عَقَلَ فُلَانًا ۔ فلاں کو روک دیا ۔ بند کر دیا ۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

قید کر دیا ۔ اَلْعُقْلَۃُ ۔ وہ چیز جس سے کسی کو باندھ دیا جائے ۔ مثلاً بیڑی وغیرہ ۔ اَلْمَعْقِلُ ۔ جائے پناہ (کیونکہ آدمی اس میں پناہ گیر ہوتا اور رک جاتا ہے ۔ نیز اس لئے کہ وہ جگہ دشمن کو وہاں آنے سے روک دیتی ہے) ۔ بلند پہاڑ کو بھی کہتے ہیں جو روک بن جاتا ہے * ۔

قرآن کریم میں عقل و فکر سے کام لینے کی بڑی تاکید آئی ہے ۔ جو عقل سے کام نہیں لیتے انہیں حیوانات سے بدتر قرار دیا گیا ہے ، اور ان کا مقام جہنم بتایا گیا ہے (۷/۱۷۹) ۔ قرآنی حقائق کو نہ ماننے والوں (کفار) سے بار بار کہا گیا ہے کہ تم عقل و فکر سے کام کیوں نہیں لیتے ۔ تم قرآن کریم میں غور و تدبر کیوں نہیں کرتے ۔ انہیں چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو اس کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو ۔ (۲/۲۳) ۔ اس اعتبار سے عقل کا مقام بہت بلند ہے ۔ خود عربوں کے ہاں بھی اَلْعَقِیْلَۃُ اس صاحب شرف و عزت خاتون کو کہتے تھے جو پردہ نشین ہو ۔ نیز قوم کے سردار کو ۔ بلکہ ہر اعلیٰ اور بہترین چیز کو * ۔ عَقِیْلَۃُ الْبَحْرِ ۔ موتی کو کہتے ہیں ۔ اور اَلْعَاقُوْلُ ۔ سمندر کے گہرے اور بہت پانی والے حصہ یا سمندر کی موج کو * ۔ واضح رہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں کے اعتبار سے ان تمام الفاظ میں یہ مفہوم مشترک ہوگا کہ ان کے بیش قیمت ہونے کی وجہ سے لوگ ان کی زیادہ حفاظت کرتے ہیں اور انہیں روک کر رکھتے ہیں ۔

عقل کا صحیح منصب یہ ہے کہ وہ انسان کو نامناسب باتوں سے روکے ۔ لیکن یہی عقل اگر جذبات کے تابع ہو جائے تو تباہیوں اور بربادیوں کا موجب بن جاتی ہے (۲۹/۳۸) ۔ ایسا انسان (یا قوم) علم و عقل کے باوجود زندگی کی غلط روش پر چل نکلتا ہے ۔ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ (۴۵/۲۳) ۔ اور اسکے ذرائع علم اسے کچھ فائدہ نہیں دیتے ۔ (۴۶/۲۶) ۔ جسطرح نشے کی حالت میں انسان کے حواس صحیح کام نہیں کرتے اسی طرح جذبات سے مغلوب ہو کر اسکی عقل صحیح کام نہیں کرتی ۔ وہ جذبات کی لونڈی بن جاتی ہے اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں اس کے حصول کا ذریعہ ۔ اس مقام پر عقل ، انسان کو اسکی انفرادی مفاد پرستیوں کے زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے اور اسے ربوبیت عامہ (عالمگیر انسانیت کی نشو و نما) سے روکتی ہے ۔ لہذا عقل کا صحیح مقام یہ ہے کہ اسے وحی کے تابع رکھا جائے ۔ یعنی انسان اپنے جذبات کو وحی کے تابع رکھے تو اسکی عقل اسے صحیح فائدہ پہنچا سکتی ہے (۲۸/۵۰) ۔

* تاج و محیط ۔

بالفاظ دیگر، عقل کو اپنی راہ نمائی کے لئے اسی طرح وحی کی روشنی کی ضرورت ہے جسطرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت ہے۔ یہ ہے تعلق عقل اور وحی کا۔ اس طرح عقل سے کام لینے والوں کو مومن کہا گیا ہے (۶۵/۱۰)۔ جو عقل وحی کے تابع نہیں چلتی اسے شَیْطَان* اور اِبْلِیْس* کہا گیا ہے۔ (دیکھئے عنوانات ب۔ ل۔ س اور ش۔ ط۔ ن)۔

ع ق م

عُقْمٌ*۔ دراصل اس خشکی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا اثر قبول کرنے میں مانع ہو۔ عَقِیْمٌ*۔ وہ عورت جو مرد کا مادہ قبول نہ کرے*۔ لیکن اس لفظ کا استعمال عورت تک ہی محدود نہیں۔ رَجُلٌ* عَقِیْمٌ* وَعُقَامٌ*۔ اس مرد کو بھی کہتے ہیں جسکے اولاد نہ ہو۔ رِیْحٌ* عَقِیْمٌ*۔ خشک ہوا جو بادلوں کو ساتھ نہیں لاتی یا بارش نہیں برساتی، یا درختوں کو باردار نہیں کرتی۔ یَوْمٌ* عَقِیْمٌ*۔ سخت دن۔ ایسا دن جس میں ٹھنڈ (سامان راحت) نہ ہو**۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ عُقْمٌ* کے اصل معنی بند کرنا، روکنا۔ اور قطع کرنا ہیں***۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نمایاں نہ ہونا۔ تنگ ہونا اور سخت ہونا ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کے متعلق ہے عَجُوْزٌ عَقِیْمٌ*۔ (۵۱/۲۹)۔ بڑھیا بانجھ۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ آیا ہے (۵۱/۴۱)۔ بمقابلہ رِیَاحٌ* لَوَاقِحَ (۱۵/۲۲) کے جو پانی برساتی ہیں۔ سورہ حج میں عَذَابُ یَوْمٍ عَقِیْمٍ (۲۲/۵۵) آیا ہے۔ "تباہ کرنے والے دن کا عذاب"۔ یعنی ایسا عذاب جس سے اس قوم کی نشوونما کی صلاحیتیں سلب ہو جائیں۔ جس سے اسکی جڑ کٹ جائے۔ وہ عقیم رہ جائے۔

ع ک ف

عَکَفَ۔ کسی چیز کو روکنا، یا رکنا۔ عَکَفَ عَلَیْہِ۔ اسکی طرف مسلسل بڑھا اور اس سے اپنا رخ نہ پھیرا۔ عَکَّفَ۔ کسی چیز کو بکھرنے سے بچانے کیلئے لڑی میں پرو دینا، جسطرح موتیوں کو پرو دیا جاتا ہے۔ عَکَفَ الْجَوْهَرُ فِی النَّظْمِ۔ گوهر لڑی میں پر گیا۔ شَعْرٌ* مَعْکُوْفٌ*۔ کنگھی کئے ہوئے، گندھے ہوئے بال (برخلاف پریشان اور بکھرے ہوئے بالوں کے)۔ اسلئے عَکَفَ کے معنی ہیں (معاملات کو) درست کرنا**۔ راغب

---

* راغب۔ ** تاج۔ *** محیط۔

نے لکھا ہے کہ اَلْعُکُوْفُ۔ تعظیماً کسی شے کی طرف بڑھنے اور اس سے مستقل طور وابستہ ہونے کو کہتے ہیں **۔ عَکَفَ الْقَوْمُ حَوْلَہٗ۔ قوم نے اسکے گرد گھیرا بنا لیا *۔

قرآن کریم میں ہے اَلْهَدْیَ مَعْکُوْفًا (۲۵/۴۸) وہ جانور جسے کعبہ لئے جارہے ہوں لیکن اسے راستے میں روک دیا گیا ہو۔ یہاں اسکے معنی روکنے کے ہیں۔ سورہ حج میں ہے کہ کعبہ کو سَوَآءَ نِ الْعَاکِفُ فِیْهِ وَالْبَادِ (۲۲/۲۵) بنایا ہے۔ یعنی وہاں رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں، سب کے لئے یکساں۔ وہ تمام نوع انسانی کے لئے مشترکہ طور پر جائے پناہ ہے اور کسی پر اسکے دروازے بند نہیں۔ نہ ہی کسی کے حقوق زیادہ ہیں۔ سورہ طٰہٰ میں عَاکِفِیْنَ کا لفظ (۲۰/۹۱) میں آیا ہے جسکے معنی ہیں کسی کام پر مسلسل لگے رہنا۔ جمے رہنا۔

کعبہ کے متعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ سے کہا کہ اسے طَآئِفِیْنَ اور عَاکِفِیْنَ کے لئے پاکیزہ بنا دیں۔(۲/۱۲۵)۔ عَاکِفِیْنَ کے معنی ہیں وہ جماعت جو نوع انسانی کا شیرازہ بکھرنے نہ دے بلکہ انہیں ایک رشتہ میں پرو کر انکے معاملات کو درست حالت میں رکھے۔ ان کے الجھے اور بکھرے ہوئے بالوں کی مشاطگی کرے اور اسطرح گیسوئے انسانیت کو سنوار دے۔ (تفصیل اسکی ط۔ و۔ ف کے عنوان میں دیکھئے)۔ یہ ہے منصب امت مسلمہ کا جس کے نظام کا مرکز کعبہ ہے۔ یعنی یہ امت اپنے آپ کو اپنے مرکز نظام خداوندی (کعبہ) سے متمسک رکھتی ہے، اور نوع انسانی کے معاملات کو سنوارتی ہے۔ اسی کو شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (۲/۱۴۳) بھی کہا ہے۔ یعنی تمام نوع انسانی کے اعمال کی نگران۔ لیکن دوسروں کے اعمال کی نگران وہی جماعت ہوسکتی ہے جو خود قوانین خداوندی پر جم کر رہے اور اپنی تمام توجہات کو اسی نقطہ پر مرکوز رکھے۔

ع ل ق

اَلْعَلَقُ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی بلند چیز کے ساتھ کسی چیز کو باندھنا یا وابستہ کر دینا ہیں۔ اَلْعَلَقُ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس پر کنویں کی چرخی لگی ہوتی ہے۔ یا چرخی مع اپنے ضروری سامان کے۔ اَلْعَلَقُ۔ خون (خواہ کسی قسم کا ہو)۔ یا تیز سرخ

* تاج۔ ** راغب۔

یا گاڑھا یا جما ہوا خون جو ابھی خشک نہ ہوا ہو بلکہ لوتھڑے کی قسم کا ہو۔ نیز جونک جو خون چوس لیتی ہے۔ نیز وہ مٹی جو ہاتھ سے چمٹ جائے۔ اَلْمِعْلَاقُ۔ ہر وہ چیز جس کے ساتھ کسی چیز کو لٹکایا جائے۔ مثلاً ڈول کے دونوں کنارے جن میں رسیاں بندھی ہوتی ہیں انہیں اَلْمِعْلَاقَانِ کہتے ہیں۔ اَلْعُلَّیْقُ۔ ایک قسم کی درخت پر چڑھنے والی بیل یا جھاڑی جس میں کانٹے بہت ہوتے ہیں۔ جب کوئی چیز اس میں الجھ جائے تو اس کا بسلامت نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اَلْعِلَاقَۃُ۔ اَلْعَلَاقَۃُ۔ محبت کو کہتے ہیں جو دل کے ساتھ چمٹ جاتی ہے۔ اَلْمُعَلَّقَۃُ۔ وہ عورت جو شوہر کے مفقود الخبر ہونے کی وجہ سے نہ شادی شدہ کی طرح ہو نہ مطلقہ کی طرح۔ ازہری نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ عورت ہے جس کا خاوند نہ اس کے ساتھ انصاف کرے، نہ اسے چھوڑے۔ اور اس طرح اس کی حالت شادی شدہ اور بے شوہر والی عورت کے درمیان ہوجائے اور وہ ادھر لٹکتی رہے*۔ قرآن کریم میں ہے فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (۴/۱۲۹)۔ تو تم اسے معلقہ کی طرح چھوڑ دو۔

سورۃ مومنون میں انسانی بچہ (جنین) کی جو مختلف حالتیں بتلائی گئی ہیں ان میں دوسری حالت عَلَقَۃ* کی ہے (۲۳/۱۴)۔ یعنی جونک کی طرح (Sole-Shaped)۔

سورۃ علق میں ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۹۶/۲)۔ عَلَقٍ کے معنے اگر خون کے لوتھڑے کے لئے جائیں تو آیت میں انسان کی طبیعی خلقت کی طرف اشارہ ہوگا۔ اور اگر اس کا وسیع مفہوم لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کو اگر (بغیر وحی کی راہ نمائی کے) علی حالہ چھوڑ دیا جائے تو اس کی ہوس کا یہ عالم ہوتا ہے کہ یہ اپنے مفاد کے ساتھ جونک کی طرح چمٹا اور خون پیتا رہتا ہے اور ہر جگہ شکار پھانسنے کی فکر میں رہتا ہے۔ چنانچہ اَعْلَقَ الصَّائِدُ کے معنی ہیں شکاری کے جال میں شکار پھنس گیا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْعَلَقُ عشق و محبت (جس میں کسی کو جی چاہتا ہے اور اس سے بندھ جاتا ہے یا، بقول تاج، جو دل میں جم جاتی ہے) کو بھی کہتے ہیں۔

ع ل م

عِلْمٌ (عَلِمَ۔ یَعْلَمُ)۔ کسی چیز کو کماحقہ جاننا۔ پہچاننا۔ حقیقت کا ادراک کرنا۔ یقین حاصل کرنا۔ محسوس کرنا۔ محکم طور پر

*تاج و محیط و راغب **تاج۔

معلوم کرنا* ۔ اس طرح ادراکِ حقیقت کرنے والے کو عَالِمٌ* کہتے ھیں جس کی جمع عَالِمُوْنَ آتی ھے ۔ اور عَلِیْمٌ* کی جمع عُلَمَاءُ* یعنی گہرا اور پختہ علم رکھنے والے ۔ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز پر ایسے نشان کے ھیں جس سے وہ شے دیگر اشیاء سے متمیز ھو سکے۔ (ابن فارس)

عربوں کے نزدیک عِلْمٌ* کا درجہ معرفت اور شعور سے زیادہ بلند ھے ۔ یہی وجہ ھے کہ وہ اللہ کے لئے عِلْمٌ* کا لفظ استعمال کرتے ھیں ۔ معرفت یا شعور کا نہیں ۔ چنانچہ خدا کو عَالِمٌ* یا عَلِیْمٌ* کہہ سکتے ھیں ، عَارِفٌ (معرفت رکھنے والا) یا شَاعِرٌ* (شعور رکھنے والا) نہیں کہہ سکتے ۔ عِلْمٌ* اور مَعْرِفَۃٌ* میں (انکے نزدیک) ایک فرق یہ بھی ھے کہ مَعْرِفَتْ کسی چیز کے آثار و قرائن میں غور و فکر کرکے اس کا ادراک کرنے کو کہتے ھیں لیکن علم کے لئے یہ ضروری نہیں ۔ ثانیا معرفت کا لفظ بیشتر اس موقع پر استعمال ھوتا ھے جب کوئی چیز ادراک کے بعد دھیان سے نکل جائے اور پھر دوبارہ اس کا ادراک ھو، لیکن عِلْمٌ* میں یہ صورت نہیں ھوتی**۔ (اس علم کی مثال جو تدبر و تفکر سے حاصل نہیں ھوتا وحی ھے ۔ (۲/۱۴۵) ۔

قرآن کریم نے (۱۷/۳۶) سمع ، بصر اور قلب کو حصول علم کے ذرائع قرار دیا ھے (جو ایمان تک پہنچنے کا ضروری ذریعہ ھے) ۔ دوسرے مقام پر قَلْبٌ* کی جگہ فُؤَادٌ* بھی کہا ھے (۱۶/۷۸) *** ۔ اس میں علم بذریعہ حواس (Perceptual Knowledge) اور بذریعہ تصورات (Conceptual) دونوں آجاتے ھیں ۔ اور فُؤَادٌ* کی نسبت سے اس میں احساسات بھی آجاتے ھیں (دیکھئے عنوان ف ۔ أ ۔ د) ۔ لیکن چونکہ علم اس وقت عِلْمٌ* کہلا سکتا ھے جب وہ یقین کے درجے تک پہنچ جائے اس لئے قرآن کریم نے وحی کو عِلْمٌ* کہا ھے اور اس کی ضد کو اَھْوَاءٌ* (۲/۱۲۰) ۔ یعنی انسان کے خود ساختہ تصورات یا جذباتی عقیدت مندیاں جن کے لئے اس کے پاس کوئی دلیل و برھان نہیں ھوتی ۔ یہی وجہ ھے کہ قرآن کریم خارجی کائنات کے متعلق علم حاصل کرنے پر بڑا زور دیتا ھے ۔ اس لئے کہ اس علم کی بنیاد دلائل و براھین اور حقائق و شواھد پر ھوتی ھے ۔ جذباتی عقیدت مندی کا اس میں کوئی دخل نہیں ھوتا ۔ وہ اپنے ھر دعوے کو دلیل و برھان کے زور پر پیش کرتا ھے (۵/۴۸) ۔ اور ان دعاوی سے انکار کرنے والوں سے بھی دلائل و براھین طلب کرتا ھے (۲۱/۲۴) ۔ اسے اپنے دعاوی کی محکمیت پر اتنا یقین ھے (اور یقین علم

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔ ***قلب اور فؤاد کے فرق کے لئے ف ۔ أ ۔ د کا عنوان دیکھئے۔

سے پیدا ہوتا ہے) کہ وہ ان دعاوی سے انکار کرنے والوں کے متعلق علانیہ کہہ دیتا ہے کہ وہ ان کی تردید میں کوئی برہان پیش نہیں کر سکتے (۲۳/۱۱۷) ۔ اسی لئے قرآن کریم کی دعوت، علیٰ وجہ البصیرت دعوت ہے (۱۲/۱۰۸) ۔ یعنی (Rational) طریق ۔

اَلْعَلَمُ وَ الْعَلَامَۃُ ۔ ایسی نشانی جس سے کوئی شے پہچانی جاسکے۔ دو کھیتوں کے درمیان جو ڈول بنا دی جائے*، اسی طرح ریگستانوں یا دوسرے راستوں میں راہ کی پہچان کے لئے جو چیزیں کھڑی کر دی جاتی تھیں انہیں بھی عَلَامَۃٌ یا عَلَمٌ کہتے تھے* ۔ بڑے اور لمبے پہاڑ کو بھی عَلَمٌ کہتے ہیں ۔ اسکی جمع اَعْلَامٌ ہے (۵۵/۲۴) ۔ اور جھنڈے کو بھی اسی لئے عَلَمٌ کہتے ہیں کہ اس سے ایک جماعت دوسری کو پہچانتی ہے ۔ نیز وہ اثر یا نشان جس سے راستہ کا پتہ چلایا جاسکے مَعْلَمٌ کہلاتا ہے*۔ اَعْلَمُ اُس اونٹ کو کہتے ہیں جس کا بالائی ہونٹ پھٹا ہو* ۔ قدیم عرب، جنگ میں گھوڑے پر رنگین اون لٹکا دیتے تھے ۔ اس عمل کے لئے اَعْلَمَ الْفَرَسَ کہتے تھے* ۔ اَعْلَمَ نَفْسَہٗ ۔ اپنے اوپر وہ نشان لگایا جو جنگ میں شریک ہونے والے لگاتے ہیں**** ۔

اسی سے عَالَمٌ ہے (جس کی جمع عَالَمِیْنَ ہے) ۔ اسم آلہ کا ایک وزن فَاعَلٌ بھی ہے جیسے خاتَمٌ ۔ مَایُخْتَمُ بِہٖ ۔ قَالَبٌ ۔ مَایُقْلَبُ بِہٖ ۔ وغیرہ ۔ عَالَمٌ بھی اسی طرح ہے جس کے معنی ہیں مَایُعْلَمُ بِہٖ ۔ یعنی وہ شے جس کے ذریعے کسی چیز کا علم حاصل کیا جائے ۔ چونکہ خدا کا علم، کائنات کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اس لئے ساری کائنات عَالَمٌ کہلائی جانے لگی ۔ نیز کائنات کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں میں سے ہر ایک بھی عَالَمٌ کہلائیگا ۔ مثلاً عالم انسان ۔ عالم ماء ۔ عالم نار وغیرہ ۔ اس کی جمع مذکر سالم لانے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں انسان بھی شامل ہے ۔ اور جب کسی لفظ میں دوسری مخلوقات کے ساتھ انسان بھی شامل ہوں تو انسانوں کو غالب رکھا جاتا ہے** ۔ اسی لئے نسل یا قوم کو بھی عَالَمٌ کہا گیا ہے ۔ (اور قرن اور صدی کو بھی) ۔ ۔ قرآن کریم نے عَالَمِیْنَ کو اکثر اَقْوَامٌ کے معنی میں استعمال کیا ہے ۔ یعنی کسی ایک زمانہ (Age) کے ہم عصر انسان ۔ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعَالَمِیْنَ ۔ (۲/۴۷) یعنی بنی اسرائیل کو (اُس زمانے میں) ان کی ہم عصر اقوام پر فضیلت دی ۔ نیز مختلف قسم کے لوگ یا دنیا بھر کے لوگ ۔ (۲۵/۱) ۔ اس جہت سے

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** المنار ۔ **** محیط ۔

رَبُّ الْعَالَمِيْنَ (۱/۱) کے معنی ، دور حاضر کی اصطلاح میں "بین الاقوامی انسانیت کی نشو و نما دینے والا" بھی ھوسکتے ھیں ۔ یعنی خدا کی عالمگیر ربوبیت انسانیہ ۔ اور تمام کائنات کا نشو و نما دینے والا بھی جس میں انسان بھی شامل ہونگے ۔

اتنا سمجھ لینا چاھئے کہ اگرچہ عَالَمْ کا لفظ کائنات کے لئے استعمال ھوتا ھے لیکن اھلِ عرب ھر موجود شے مثلاً پتھر ۔ مٹی کے لئے اسے نہیں بولتے بلکہ وہ اس لفظ کا اطلاق ھر ایسے جداگانہ مجموعہ پر کرتے ھیں جسکے افراد اگر عاقل نہ ھوں تو عاقل سے قریب تر ضرور ھوں ۔ مثلاً عَالَمُ الْاِنْسَانِ ۔ عَالَمُ الْحَیَوَانِ یا عَالَمُ النَّبَاتِ کہہ سکتے ھیں ۔ اور یہ ظاھر ھے کہ یہی وہ چیزیں ھیں جن میں خدا کی صفت ربوبیت کا جلوہ نظر آتا ھے کیونکہ ان اشیاء میں صفت ربوبیت کو اپنانے کے لئے بنیادی صلاحیت موجود ھے ۔ اور یہ صفت حیوان میں نمایاں ھے ۔ مثلاً زندگی ۔ غذا حاصل کرنا ۔ سلسلہ تولید ۔ وغیرہ ۔

لہذا خدا کی رَبُّ الْعَالَمِیْنِیْ کی صفت محسوس اور مشہود شکل میں سامنے آنی چاھئے ۔ محض ذھنی تصور یا عقیدہ میں نہیں رھنی چاھئے ۔ اسی سے حَمْدْ کی کیفیت پیدا ھوسکتی ھے (دیکھئے عنوان ح ۔ م ۔ د) ۔

قرآن کریم میں ھے عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا (۲/۳۱) ۔ اللہ نے آدم (آدمی) کو تمام اشیائے کائنات کا علم عطا کردیا ۔ یا عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (۹۶/۵) ۔ اس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا ۔ اور عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۹۶/۴)۔ اسے قلم سے (لکھنا) سکھایا۔ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ (۵۵/۴)۔ اسے بولنا (اپنے آپ کو (Express) کرنا) سکھایا ۔ ان مقامات کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ھر انسان کو اس طرح سکھایا جس طرح ایک استاد بچے کو تعلیم دیتا ھے ۔ اس کا مطلب یہ ھے کہ خدا نے انسان کے اندر ان باتوں کی صلاحیت رکھدی ۔ اسے ان کی استعداد عطا کردی ۔ اسکی واضح مثال سورۃ مائدہ میں ملیگی جہاں فرمایا کہ تم اپنے شکاری کتوں کو (شکار پکڑنا) سکھاتے ھو مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰهُ (۵/۴) ۔ اس علم کی رو سے جو تمہیں اللہ نے دیا ھے ۔ ظاھر ھے کہ اللہ کسی انسان کو شکاری کتوں کو سدھانے کا طریقہ نہیں سکھاتا ۔ اس نے انسان میں اسکی استعداد رکھ دی ھے جس سے انسان اس علم کو خود حاصل کرتا ھے ۔

لہذا ایک علم تو وہ ھے جو نبی کو خدا کی طرف سے براہ راست ملتا ھے ۔ اسے وحی کہتے ھیں ۔ اور دوسرا علم وہ ھے جس کی استعداد تمام انسانوں

میں رکھ دی گئی ہے ، اور جو انسان چاہے اسے حاصل کرسکتا ہے ۔ قرآن کریم کے ان مقامات میں اس فرق کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ یعنی یہ فرق کہ کس مقام پر علم سے مراد وحی کا علم ہے اور کس مقام پر عام انسانی استعداد ۔ یہی فرق ایک نبی کے علم میں بھی ہوتا ہے ۔ ایک علم اسے بذریعہ وحی ملتا ہے جس میں کوئی غیر از نبی شریک نہیں ہوتا ۔ اور اس کا دوسرا علم انسانی استعداد ہوتی ہے جس میں اس کی حیثیت نبی کی نہیں ہوتی ، بشر کی ہوتی ہے ۔ یہی وہ حیثیت ہے جس میں اسے دوسروں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے (۳/۱۵۸) ۔

سورۃ فاطر میں ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِہٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُھَا ۔ کیا تو نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ اللہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے مختلف اقسام کے پھل پیدا کرتا ہے ۔ وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِیْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُھَا وَ غَرَابِیْبُ سُوْدٌ ۔ اور پہاڑوں (میں دیکھو کہ کس طرح) سفید اور سرخ خطے (یا طبقات) ہیں جن کی مختلف اقسام ہیں اور بعض ان میں سے بہت سیاہ ہیں ۔ وَمِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُہٗ کَذٰلِکَ ۔ اور اسی طرح انسانوں میں ، اور دیگر جانداروں میں اور مویشیوں میں بھی مختلف اقسام ہیں ۔

ان مقامات میں دیکھئے ۔ قرآن کریم نے ان علوم کا ذکر کیا ہے جنہیں دور حاضر کی اصطلاح میں خالصتاً علوم سائنس کہا جاتا ہے ۔ اس کے بعد ہے اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ۔ . . (۳۵/۲۷-۲۸) ۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کے بندوں میں سے صرف وہی اس (کی عظمت و قدرت) کے سامنے لرزہ براندام رہتے ہیں جو "علماء" ہیں ۔ یعنی جو ان علوم کا علم رکھتے ہیں ۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم نے "علماء" کا لفظ ٹھیک ان معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں آجکل سائنسدان (Scientist) کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ قرآن کریم علم الاشیاء کو بڑی بنیادی اہمیت دیتا ہے ۔ (تفصیل ان امور کی "سلیم کے نام خطوط" میں ملیگی) ۔

ع ل ن

عَلَنَ الْاَمْرُ ۔ بات ظاہر ہوگئی اور پھیل گئی ۔ اَلْعِلَانُ ۔ اَلْاِعْلَانُ ۔ کسی کام کو کھلم کھلا کرنا* ۔ اَلْعَلَانِیَۃُ ۔ ظاہر و آشکارا ۔ یہ سِرٌّ کی ضد ہے ، یعنی پوشیدہ یا چھپ کر ۔ نیز راز** ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ

* تاج ۔ ** محیط و راغب ۔

سِرًّا کے مقابل میں آیا ہے (۲/۲۷۴)۔ اَسَرَّ کے بالمقابل اَعْلَنَ۔ یعنی برملا کہنا، کھول کر کہنا۔ (۷۱/۹)۔

ع ل و

عِلْوُ الشَّیْءِ۔ چیز کا بلند ترین حصہ۔ (سِفْلٌ کی ضد ہے)۔ اَلْعَلَاءُ۔ شرف۔ بلندی۔ اَعْلَاہُ۔ عَالٰی بِہٖ۔ اِسْتَعْلَاہُ۔ کسی چیز کے اوپر چڑھ گیا۔ اِسْتَعْلٰی۔ بلند ہوا۔ غالب ہوا۔ اَعْلَاہُ۔ اسے بلند کر دیا۔ تَعَالٰی۔ وہ بلند ہوا (۱۶/۳)۔ اَلْعِلَاوَۃُ۔ پورے بوجھ کے بعد اوپر سے جو زائد رکھا جائے۔ نیز یہ زائد یا اوپر سے، کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔

مَا عَلَوْا (۱۷/۷) جس چیز پر بھی وہ غالب آجائیں۔

عُلُوًّا (۱۷/۴) سرکشی۔ لیکن جب بھی لفظ خدا کے لئے بولا جائے تو اس کے معنی عظمت اور بلندی کے ہونگے (۱۷/۴۳)۔ عَالِیْنَ (۲۳/۴۶) سرکشی کرنے والے (اس کا واحد عَالٍ (اَلْعَالِی) ہے اور مؤنث عَالِیَۃٌ)۔ لَتَعْلُنَّ تم ضرور سرکشی اختیار کرو گے (۱۷/۴)۔ وَجَعَلْنَا عَالِیَھَا سَافِلَھَا (۱۱/۸۲) ہم نے اس کے بالائی حصہ کو نیچے کا حصہ بنا دیا۔ اَلْمُتَعَالِ (۱۳/۹) بہت بلند۔ عالی مرتبت۔ اَلْاَعْلٰی (۸۷/۱)۔ سب سے بلند۔ سب پر غالب۔

عَلَا (۲۳/۹۱)۔ غالب ہوا (ایک دوسرے پر)۔

عِلِّیُّوْنَ عِلِّیِّیْنَ (۸۳/۱۸، ۱۹)۔ بلندیوں کے اوپر بلندیاں*۔ لیکن (۸۳/۲۰) میں عِلِّیُّوْنَ کی تفسیر کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ سے کی گئی ہے۔ لہذا اس کے معنی اعمال نامہ کے ہونگے۔ لکھی ہوئی کتاب۔ لیکن ایسا اعمال نامہ جو انسان کو بلندیوں کیطرف لے جائے۔ اس کے برعکس سِجِّیْنٌ ایسا اعمالنامہ ہے جو انسانی نشوونما کو جکڑ کر رکھ دے۔ (۸۳/۷، ۹)۔

سورہ النمل میں ہے اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ (۲۷/۳۱)۔ اس میں تَعْلُوْا کے معنی ہیں سرکشی اختیار کرنا، اور مُسْلِمِیْنَ کے معنی مطیع و فرمانبردار ہو جانا۔

تَعَالَ۔ عربوں میں جب کوئی بلندی سے نیچے والوں کو آواز دیتا تو یہ لفظ کہتا تھا۔ لیکن کثرت استعمال کے بعد یہ امتیاز باقی نہ رہا اور ہر بلانے والا اس لفظ کو استعمال کرنے لگا**۔ چنانچہ سورہ احزاب میں ہے فَتَعَالَیْنَ (۳۳/۲۸) تم سب عورتیں آؤ۔

* تاج۔ ** محیط۔

واضح رہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں بلندی اور غلبہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ لیکن غلبہ دوقسم کا ہوتا ہے۔ ایک ظالم پر غلبہ پا کر مظلوم کی حمایت کرنا۔ یہ غلبہ مستحسن ہے اور جماعت مومنین کا شعار۔ دوسرا غلبہ یہ ہے کہ کمزوروں اور ناتوانوں پر غلبہ پا کر انہیں اپنے استبداد کا نشانہ بنانا۔ یہ غلبہ مذموم ہے اور فرعونیت کی علامت۔ اس قسم کے غلبہ کو ہم نے سرکشی سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اس میں اپنی قوت کو قوانین خداوندی کے خلاف صرف کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (۳/۱۳۸) تم افسردہ خاطر مت ہو۔ اور مت گھبراؤ۔ (آخرالامر) تم ہی غالب ہو گے، اس لئے کہ تم قوانین خداوندی کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہو۔ اس میں اسی غلبہ کی طرف اشارہ ہے جو طاغوتی قوتوں کو شکست دیکر، دنیا میں نظام عدل و مساوات قائم کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ مومن کبھی کافر سے مغلوب نہیں رہ سکتا۔ وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (۴/۱۴۱) "اور اللہ ہرگز کافروں کو مومنوں پر غلبہ کی راہ نہیں دیگا"۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی معرکہ میں جماعت مومنین کو ہنگامی طور پر شکست ہوجائے (۳/۱۳۹)۔ لیکن کفار کا مؤمنین پر غالب رہنا، ناممکن ہے۔ لہذا اگر اپنے آپ کو "مؤمن" کہنے والے مستقلاً کفار سے مغلوب ہیں (خواہ کفار کا غلبہ حکمران کا ہو یا معاشی و معاشرتی) تو انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ قرآن کریم کی رو سے مؤمن کی (Definition) پر پورے نہیں اترتے۔ کفار سے مغلوب ہونا تو ایکطرف، مومن کی یہ کیفیت ہے کہ، اقبال کے الفاظ میں

مومنے بالائے ہر بالاترے غیرت او برنتابد ہمسرے

(عَلیٰ۔ حرف ہے جو الگ لکھا گیا ہے۔ دیکھئے عنوان "عَلیٰ")

عَلیٰ (حرف)

عَلیٰ۔ یہ حرف بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) پر۔ اوپر۔ خواہ حقیقتاً ہو۔ جیسے عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ (۲۳/۲۲) تم کشتیوں کے اوپر سوار کرائے جاتے ہو (سوار ہوتے ہو)۔

خواہ مجازاً۔ جیسے فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (۲/۲۵۳) ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

(۲) قریب کے معنوں میں — اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى (۲۰/۱۰) یا میں اس آگ کے قریب کسی راہ نما کو دیکھوں (دیکھئے عنوان ھ۔ د۔ ی)

(۳) باوجود کے مفہوم میں۔ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ (۲/۱۷۷) مال کی محبت کے باوجود اسے (دوسروں کو) دے۔

(۴) مِنْ (سے) کے معنوں میں۔ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ (۸۳/۲) جب وہ لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں۔

(۵) "کی وجہ سے" کے معنوں میں۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (۲/۱۸۵) تاکہ تم اللہ (کے نظام) کو بلند کرو، اس وجہ سے (یا اس بنیاد پر) کہ اس نے تمہیں راہ نمائی دی ہے۔ (لیکن یہاں اس کے معنی ذریعے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی تم ہدایت خداوندی (قرآن) کے ذریعے اللہ کے نظام کو بلند کرو۔ (دیکھئے نمبر ۱۳۔) ۔ (نیز "کے مطابق" بھی۔ دیکھئے نمبر ۱۱)

(۶) فِیْ (میں) کے معنوں میں وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا (۲۸/۱۵) وہ اسوقت شہر میں داخل ہوا جب اسکے رہنے والے بیخبر تھے۔ ان کی بے خبری کی حالت میں۔۔۔۔۔۔

(۷) "کے ساتھ۔ کے متعلق" کے معنوں میں۔ حَقِيْقٌ عَلٰى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ (۷/۱۰۵) مجھ پر واجب ہے کہ میں اللہ کے متعلق حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔ اس میں عَلٰى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ کا مطلب ہے بِاَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ۔ یعنی یہ کہ میں کچھ نہ کہوں۔ (سوائے حق کے)۔

(۸) اِلٰی (تک) کے معنوں میں۔ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ (۱۶/۹) اور درمیانی (سیدھی) راہ اللہ تک پہنچتی ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ کہا ہے۔ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ (۱۵/۴۱) یہ سیدھا راستہ مجھ تک پہنچتا ہے۔

(۹) سامنے۔ روبرو۔ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ (۲۰/۳۹) تاکہ تیری تربیت میرے سامنے ہو۔

(۱۰) خلاف۔ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (۲۰/۶۱) تم اللہ کے خلاف جھوٹ تو نہ تراشو۔

(۱۱) کے مطابق۔ اِعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ (۶/۱۳۵) تم اپنی طاقت کے مطابق (یا اپنی جگہ پر) کام کرو۔

(۱۲) کبھی یہ زائد بھی ہوتا ہے (یعنی اسکے کچھ معنی نہیں ہوتے)۔

(۱۳) بذریعہ۔ کے ذریعے۔ مثلاً سورہ آل عمران میں ہے رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ (۳/۱۹۳)۔ اے ہمارے پرور دگار! جو کچھ تو نے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعے وعدہ کیا تھا، وہ ہمیں عطا کر۔

(۱۴) عَلَیْہِ۔ اس کے خلاف۔ عربی زبان میں ''ل'' کسی کے فائدہ کے لئے آتا ہے اور اس کے برعکس ''عَلٰی'' آتا ہے۔ قرآن کریم میں عورتوں کے حقوق (مفاد) اور ذمہ داریوں کے متعلق آیا ہے۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ (۲/۲۲۸)۔ جسقدر ان کی ذمہ داریاں ہیں اسی کے مثل ان کے حقوق ہیں۔

(۱۵) عَلَیْکُمْ بِالصِّدْقِ۔ تم پر سچائی واجب ہے۔ تم ہمیشہ سچائی کے ساتھ رہو، اور اسے نہ چھوڑو۔ (یہ اسم فعل ہے)

قرآن کریم میں ہے عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ (۵/۱۰۵)۔ تم پر اپنی ذات (کی اصلاح) واجب ہے۔

عَمَّا (حرف)

دیکھئے عَنْ اور مَا۔

ع م د

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادے کے بنیادی معنی استقامت و استواری (سیدھا کھڑے ہو جانا) ہیں، خواہ وہ محسوس چیزوں میں ہو یا رائے اور ارادے میں۔ اَلْعَمُوْدُ۔ اس لکڑی (بلّی) کو کہتے ہیں جو خیمہ کے وسط میں ہوتی ہے اور جس کے سہارے خیمہ کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَعْمِدَۃٌ عَمَدٌ۔ عُمُدٌ آتی ہے۔ اَلْعَمَدُ۔ سنگ مرمر کے ستونوں کو بھی کہتے ہیں*۔ قرآن کریم میں ہے رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (۱۳/۲)۔ خدا نے فضائی کرّوں کو بغیر مرئی (Visible) اور محسوس ستونوں کے کھڑا کر رکھا ہے۔ ان کے ستون، وہ باہمی کشش و جذب ہے جو آنکھوں سے نہیں دیکھی جاسکتی۔ اس میں عَمَدٌ جمع ہے عَمُوْدٌ کی یا عِمَادٌ کی۔ سورۃ الھمزہ میں ہے فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ (۱۰۴/۹)۔ لمبے لمبے ستونوں میں۔

---

*تاج۔

اَلْعَمُوْدُ ۔ وہ سردار جس پر معاملات میں بھروسہ کیا جائے ۔ رئیسِ لشکر ۔ طَوِیْلُ الْعِمَادِ ۔ لمبے تڑنگے آدمی کو کہتے ہیں ۔ عِمَادٌ کے معنے طول اور لمبائی بھی ہیں* ۔ قرآن کریم میں قوم عاد کے متعلق ہے اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ (۸۹/۷) ۔ اس کے معنوں میں مختلف اقوال ہیں ۔ اَلْعِمَادُ بلند عمارتوں کو کہتے ہیں* ۔ اس کا واحد عِمَادَۃٌ ہے ۔ اس سے اس کے معنے ہونگے وہ قوم جو بڑی بڑی بلند عمارتوں کی مالک تھی ۔ عِمَادٌ خیموں کو بھی کہتے ہیں ۔ اس سے اس کے معنے ہونگے وہ لوگ جو خیموں میں رہا کرتے تھے* ۔ یا وہ لوگ جن کے قد لمبے تھے* ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْعِمَادُ اس چیز کو کہتے ہیں جس پر ٹیک لگائی جائے اور بھروسہ کیا جائے ۔ لہذا ذَاتِ الْعِمَادِ کے معنے ہونگے ان چیزوں کے مالک جن پر انہیں بڑا بھروسہ تھا** ۔ اَلْعُمْدَۃُ ۔ جس پر اعتماد یا بھروسہ کیا جائے*** ۔

اَلْعَمْدُ ۔ اَلتَّعَمُّدُ ۔ وہ کام جو مقصد و نیت سے کیا جائے ۔ یہ خَطَأً کے مقابلہ میں آیا ہے (۴/۹۲۔۹۳ و ۳۳/۵) ۔ (قتلِ عمد اور قتلِ خطا کے لئے دیکھئے عنوان ق ۔ ت ۔ ل) ۔

ع م ر

اَلْعِمَارَۃُ ۔ خَرَابٌ کی ضد ہے ۔ خَرَابٌ کے معنی ہیں ویران اور برباد کرنا ۔ لہذا عِمَارَۃٌ کے معنی ہیں آباد کرنا ۔ اَلْعُمْرُ ۔ اس مدت کا نام ہے جس میں بدن حیات کے ساتھ آباد رہے** ۔ عَمَّرَہُ اللّٰہُ ۔ خدا نے اس کی عمر دراز کی ۔ اسے باقی رکھا* ۔ ابن فارس کے نزدیک اس مادہ کے بنیادی معنی دو ہیں ۔ (۱) بقاء اور درازیِ زمانہ اور (۲) اونچی اور بلند ہونے والی چیز، خواہ وہ آواز ہو یا اس کے سوا کوئی اور چیز ۔ سورۃ بقرہ میں ہے لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَۃٍ (۲/۹۶) ۔ ''کاش! اُسے ہزار سال تک جیتا رکھا جائے'' ۔ اَعْمَرَ الْاَرْضَ ۔ زمین کو آباد پایا ۔ اَلْعِمَارَۃُ ۔ جس سے جگہ کو آباد کیا جائے ۔ اَلْعُمْرَۃُ ۔ ملاقات ۔ کسی آباد جگہ جانا ۔ شرعاً حج کے علاوہ کعبہ کی زیارت اور طواف وغیرہ کرنے کو کہتے ہیں ۔ اِعْتَمَرَ (۲/۱۵۸) ۔ عمرہ کرنا تَعْمِیْرُ الثَّوْبِ ۔ کپڑے کی بناوٹ کا عمدہ کرنا ۔ اَلْعَمْرُ ۔ دین ۔ چنانچہ جہاں قرآن کریم میں ہے لَعَمْرُکَ اِنَّھُمْ لَفِیْ سَکْرَتِھِمْ یَعْمَھُوْنَ (۱۵/۷۲) تو اس کے معنی یہی ہیں کہ تیرا دین اس حقیقت پر شاہد ہے* ۔ (اگرچہ عرب عام طور پر لَعَمْرُکَ ۔ تیری حیات و بقاء کی قسم کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں) ۔

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔

قرآن کریم میں ہے مَا کَانَ لِلْمُشْرِکِیْنَ اَنْ یَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ (۹/۱۷) - مشرکین کا کام نہیں کہ وہ اللہ کی مساجد کو آباد کریں۔ مسجد، خدا کے نظام توحید کا مرکز ہے - یعنی اس نظام کا جس میں اطاعت صرف خدا کے قوانین کی کی جاتی ہے - لہذا جو لوگ ان قوانین کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو بھی شامل کریں وہ ان مراکز کی آبادی کا باعث کیسے بن سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس مسجد کو جو امت میں تفرقہ پیدا کرنے کی غرض سے بنائی گئی تھی، جہنم کا ایندھن بتایا - (۹/۱۰۷-۱۰۹)۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی رو سے فرقہ پرستی بھی شرک ہے (۳۰/۳۲) -

سورۃ طور میں وَ الْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ (۵۲/۴) آیا ہے - آباد کیا ہوا گھر - آباد رکھنے کی جگہ - وہ جگہ جو ہمیشہ آباد رہیگی - (یعنی خانہ کعبہ)۔

قرآن کریم میں آل عمران کا ذکر آیا ہے (۳/۳۳) - کہتے ہیں کہ عمران حضرت موسیٰ ؑ کے والد کا نام تھا - اس لئے آل عمران سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ اِمْرَاَتُ عِمْرَانَ (۳/۳۵) - آل عمران کی ایک عورت یا عمران کی بیوی - اِبْنَتَ عِمْرَانَ (۶۶/۱۲)۔ آل عمران کی ایک لڑکی (حضرت مریم ؑ) - یا عمران کی بیٹی -

ع م ق

اَلْعَمْقُ - اَلْعُمُقُ - اَلْعُمْقُ - کنویں وغیرہ کی گہرائی - راغب نے کہا ہے در اصل عَمْقٌ نیچے کی طرف دوری (گہرائی) کو کہتے ہیں - ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ جب عُمْقٌ راستے کی صفت ہو تو اس کے معنی دوری کے ہوتے ہیں اور جب کنویں کی صفت ہو، تو اس کے معنی گہرائی کے ہوتے ہیں* - (بحوالہ ابن فارس) -

قرآن کریم میں ہے مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ (۲۲/۲۷)۔ اسکے معنی ہیں ہر دور دراز راستے سے - صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلْعُمْقُ - اَلْعَمَاقَۃُ کے معنی لمبا ہونا - بعید ہونا - اور پھیلا ہوا ہونا، نیز گہرا ہونا ہیں** -

ع م ل

عَمَلٌ کے معنی کام کاج، ہنر مندی، مہارت اور ہوشیاری سے کام کرنا ہیں - بعض لغویین کا خیال ہے کہ عمل کا لفظ فعل سے زیادہ خاص ہے

*تاج و راغب - **محیط -

اس لئے کہ عمل ایک گونہ مشقت سے کسی کام کو کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ اسی لئے عَمِلَ کا لفظ خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا۔ فَعَلَ کا لفظ کیا جاتا ہے۔ (فَعَلَ اور عَمِلَ میں جو اور فرق ہیں اسے ف۔ع۔ل کے عنوان میں لکھا گیا ہے۔ علاوہ بریں) راغب نے کہا ہے کہ عَمَلٌ ہر وہ کام ہے جو کسی جاندار سے ارادۃً سرزد ہو، اسکے برعکس فِعْلٌ کا لفظ حیوانات کی طرف اُس وقت بھی منسوب ہو سکتا ہے جب ان سے کوئی کام بلاقصد سرزد ہو۔ حتیٰ کہ جمادات کی طرف بھی۔ عَمَلٌ کا لفظ ان کی طرف بہت کم منسوب ہوتا ہے*۔ صاحب محیط نے تو بعض اہل لغت کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ عَمَلٌ در حقیقت عِلْمٌ کی مقلوب شکل ہے۔ لہذا عَمَلٌ کے لئے علم لاینفک شرط ہے**۔ (جیسا کہ ف۔ع۔ل کے عنوان میں کہا گیا ہے) عَمَلٌ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کام محض ہنگامی طور پر سرانجام نہ دیا گیا ہو بلکہ وہ عام طور پر (ہمیشہ کے لئے) کیا جاتا ہو۔ عَامِلٌ۔ کام کرنے والا۔ (جمع عَامِلُوْنَ اور عَامِلِيْنَ) وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا (۹/۶۰)۔ ٹیکس وصول کرنے والے۔

قرآن کریم اَعْمَال کے نتائج بتاتا ہے۔ یعنی ان کاموں کے نتائج جنہیں انسان قصد اور ارادے کے ساتھ کرے۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۶/۹۷)۔ جو کوئی صلاحیت بخش کام کرتا ہے، مرد ہو یا عورت، اور وہ مومن بھی ہے، تو ہم بالضرور انہیں خوشگوار زندگی عطا کرینگے اور بالضرور انہیں باحسن طریق ان کے ان کاموں کا اجر دینگے جنہیں وہ کرتے رہے۔ قرآنی تعلیم کا نقطہ ماسکہ ہی ایمان اور عمل ہے۔ یعنی قوانین خداوندی (یا مستقل اقدار) کی صداقت پر یقین اور ان کے حصول اور بقا کے لئے مسلسل عمل، اس یقین کے ساتھ کہ ہر عمل اپنا نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ یہ ہے اسلام۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان اعمال پر استقامت کے ساتھ قائم رہا جائے، کیونکہ (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) عمل کی معنوی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کام ہمیشہ کے لئے کیا جاتا ہو۔

ع م م

اَلْعَمُّ۔ باپ کا بھائی۔ چچا۔ (اسکی جمع اَعْمَامٌ۔ عُمُوْمَةٌ۔ اور اَعُمٌّ آتی ہے)۔ اَلْعَمَّةُ۔ باپ کی بہن یعنی پھوپھی۔ اسکی جمع عَمَّاتٌ ہے۔

*تاج۔ **محیط۔

راغب نے کہا ہے کہ اس کی اصل عُمُوْمٌ ہے ہے جس کے معنی شامل ہونے کے ہوتے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی طول ، کثرت اور بلندی کے ہوتے ہیں - اَلْعَمِیْمُ - لمبے پودے کو کہتے ہیں - اور لمبے کھجور کے درخت کو عَمَّۃٌ کہتے ہیں - عَمَّ الشَّیْءُ عُمُوْمًا - شے عام ہو گئی - یعنی تمام افراد اس میں شامل ہوگئے - اَلْعَامَّۃُ - عام لوگوں کو کہتے ہیں - العِمَامَۃُ - ہر وہ چیز جسے سر پر لپیٹ لیا جائے *-

قرآن کریم میں عَمّٰتُکُمْ (۴/۲۳) باپ کی بہنوں (پھوپھیوں) سے نکاح حرام قرار دیا گیا ہے -

ع م ہ

عَمَہٌ کے معنی ہیں راستہ کھوکر، یا تحیر میں، ادھر ادھر پھرنا یا نگاہ دوڑانا لیکن یہ نہ معلوم ہونا کہ صحیح رخ کونسا ہے - اَرْضٌ عَمْہَاءُ اُس سر زمین کو کہتے ہیں جس پر راستہ دکھانے والے نشانات نہ ہوں - اور ذَھَبَتْ اِبِلُہٗ الْعُمَّہٰی اُسوقت کہتے ہیں جب کسی کے اونٹ اسطرح کھو جائیں کہ پتہ ہی نہ لگ سکے کہ وہ کدھر چلے گئے **-

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں راستہ کی طرف کم راہ نمائی ہونا اور حیرانگی - یعنی معاملہ پیش نظر کے متعلق انسان کی سمجھ میں نہ آئے کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے اور اسکی وجہ سے وہ حیران و پریشان ہو -

اس اعتبار سے بصیرت کے اندھے پن کو عَمَہٌ کہتے ہیں اور بصارت کے اندھے پن کو عَمًی *** - اگرچہ راغب اور زمخشری کے نزدیک عَمًی کا لفظ بصارت و بصیرت دونوں کے اندھے پن کیلئے بولا جاسکتا ہے اور یہی درست ہے - قرآن کریم میں ہے لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ (۲۴/۶۱) - یہاں اَعْمٰی سے مراد بصارت کا اندھا ہے - اور سورہ بقرہ میں ہے صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ (۲/۱۸) - یہاں عُمْیٌ سے مراد بصیرت کا اندھا ہے - عَمِہَ فُلَانٌ - اُسوقت کہتے ہیں جب کسی شخص کو اپنی بات ثابت کرنیکے لئے دلیل نہ مل سکے اور وہ اسطرح حیران رہ جائے ** -

سورہ بقرہ میں فِیْ طُغْیَانِہِمْ یَعْمَہُوْنَ (۲/۱۵) - راستہ کھو کر حیران و سرگرداں پھرنے کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے - سورہ المومنون میں پہلے کہا کہ یہ لوگ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰکِبُوْنَ (۲۳/۷۴) ہیں - یعنی

*تاج و راغب - **تاج و محیط - ***لطائف اللغۃ -

سیدھے راستہ سے ھٹ جانے والے ۔ اور اس کے بعد کہا فِیْ طُغْیَانِہِمْ یَعْمَہُوْنَ (۲۳/۲۵) ۔ اس سے عَمَہٌ کے معنی واضح ہو جاتے ھیں ۔ یعنی سیدھا راستہ کھو کر یا اس سے ھٹ کر صحیح راستہ نہ ملنے کی وجہ سے حیران و پریشان پھرنا ۔

ع م ی

عَمِیَ ۔ یَعْمٰی ۔ عَمًی کےمعنی ھیں دونوں آنکھوں سے نابینا ھوجانا ۔ اگر کوئی شخص ایک آنکھ سے اندھا ھو جائے تو اسے اَعْمٰی نہیں کہہ سکتے ۔ اگرچہ (جیسا کہ صاحب لطائف اللغۃ نے کہا ھے) بصیرت کے زائل ھونے کو عَمَہٌ کہا جاتا ھے اور بصارت کے چلے جانے کو عَمًی ، لیکن اَلْعَمٰی دل کی بصیرت کے زائل ھو جانے کو بھی کہتے ھیں (دیکھئیے عنوان ع ۔ م ۔ ہ) ۔ عَمِیَّۃٌ کے معنی ھیں گمراہ ھو جانا ۔ باطل پر مصر ھو جانا ۔ اَلْاَعْمَاءُ ۔ وہ افتادہ زمینیں جہاں آبادی کا نشان تک دکھائی نہ دے ۔ اَلْاَعْمَیَانِ ۔ سیلاب اور آتش زدگی کی تباھی کو کہتے ھیں کیونکہ جب یہ (دونوں) آتے ھیں تو نہ نیک کو دیکھتے ھیں نہ بد کو ۔ اندھا دھند آگے بڑھے چلے جاتے ھیں ۔ اَلْعَامِیُّ ۔ اس شخص کو کہتے ھیں جسے راستہ نہ مل سکے * ۔

عَمِیَ عَلَیْہِ الْاَمْرُ کے معنی ھیں اس پر فلاں معاملہ غیر واضح اور مشتبہ ھو گیا ** ۔ اَلْعَمَایَۃُ ۔ گمراھی ، بے راہ روی اور ھٹ دھرمی ۔ نیز ظلمت شب کے آخری باقیماندہ حصے کو بھی کہتے ھیں * ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی چھپانے اور ڈھانپنے کے ھیں ۔

صاحب لسان العرب کے نزدیک قَوْمٌ عَمُوْنَ اسوقت کہتے ھیں جب قوم تاریکی میں ھو اور حالات کا صحیح صحیح اندازہ لگا سکنے کے قابل نہ رھے *** ۔

قرآن کریم میں ھے وَمَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًا (۷۲/۱۷) ۔ جو شخص اس دنیا کی زندگی میں اندھا ھے وہ آخرت کی زندگی میں بھی اندھا ھوگا اور بالکل راہ گم کردہ ۔ فراء کا قول ھے کہ اس آیت میں اَعْمٰی کے معنی ھیں دنیاوی نعمتوں سے محروم ، اور آیت کا مطلب یہ ھے کہ جو قوم اس دنیا میں نعمتوں اور آسائشوں سے محروم ھے وہ مستقبل کی زندگی میں بھی نعمتوں سے محروم رھیگی ۔ وہ شاھراہ حیات سے اسقدر بھٹکی ھوئی ھوگی کہ صحیح راستہ سے بہت دور جا پڑے گی *** ۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔ ***لسان العرب ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں وَاَضَلُّ سَبِیْلًا کے ٹکڑے نے اَعْمٰی کا مفہوم واضح کر دیا ہے۔ جو شخص سیدھے راستہ سے بھٹک کر غلط راہوں میں دور نکل جائے، وہ بھوک پیاس خستگی اور واماندگی جیسی صدہا مشکلات سے دوچار ہوتا ہے اور زندگی کی نعمتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ اسے صحرائے حیات میں کوئی نشان راہ دکھائی نہیں دیتا۔ اسکی تشریح خود قرآن کریم نے دوسرے مقام پر کر دی ہے جہاں کہا ہے کہ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (٢٠/١٢٤)۔ جو ہمارے قانون حیات سے اعراض برتیگا تو اس کی معیشت تنگ ہو جائیگی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائینگے۔ لہذا قانون خداوندی کے چھوڑ دینے سے دنیاوی زندگی میں محتاجی اور ذلت نصیب ہوتی ہے، اور جس کی دنیاوی زندگی یوں ذلیل ہو اسکی آخرت بھی ذلیل ہوتی ہے۔

قرآن کریم میں صُمٌّ۔ بُکْمٌ کے ساتھ عُمْیٌ کا لفظ آیا ہے (٢/١٨) (نیز عُمْیَانًا۔ ٢٥/٧٣) جسکے معنی اندھے کے ہیں۔ عُمْیٌ اور عُمْیَانٌ اَعْمٰی کی جمع ہیں۔ سورہ "طٰہٰ" میں اَعْمٰی کے مقابلہ میں بَصِیْرٌ کا لفظ آیا ہے (٢٠/١٢٥)۔ اور سورہ انعام میں بتا دیا گیا ہے کہ جو وحی کی روشنی میں چلے وہ بَصِیْرٌ ہے اور جو اسکا اتباع نہ کرے وہ اَعْمٰی ہے (٦/٥٠)۔ سورہ حم السجدہ میں اَلْعَمٰی کے مقابلہ میں اَلْھُدٰی کا لفظ آیا ہے۔ (٤١/١٧)۔ یہاں اَلْعَمٰی کے معنی گمراہی (صحیح راستے سے بھٹک جانا) ہیں۔ (٢٧/٨١) میں ضلالت کو اندھا پن کہا گیا ہے۔ (١٣/١٩) میں ہے کہ جو شخص قرآن کریم کی حقیقت ثابتہ پر یقین نہیں رکھتا وہ اَعْمٰی ہے۔ سورہ قصص میں ہے فَعَمِیَتْ عَلَیْھِمُ الْاَنْبَآءُ (٢٨/٦٦) انپر معاملات مشتبہ ہو گئے۔ یہی معنی (١١/٢٨) میں فَعُمِّیَتْ عَلَیْکُمْ کے ہیں۔ یعنی ایسے واضح دلائل تمہیں صاف صاف دکھائی نہیں دیتے۔ سورہ حج میں اس کیفیت کو "دل کی آنکھوں کے اندھا ہو جانے" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (٢٢/٤٦)۔ یعنی حقائق کا آنکھوں سے اوجھل ہوجانا یا صاف صاف دکھائی نہ دینا۔

لہذا، قرآن کریم کی رو سے جسطرح انسان کے سر کی آنکھوں کے لئے سورج (یا چراغ) کی روشنی کی ضرورت ہے۔ یعنی اگر روشنی نہ ہو تو آنکھیں اندھی (بیکار) ہو جاتی ہیں۔ اسیطرح عقل کی آنکھ کیلئے وحی کی روشنی کی ضرورت ہے۔ وہی عقل، بینا قرار دی جا سکتی ہے جو وحی کی روشنی میں زندگی کے منازل طے کرے۔ نیز جو قومیں حقائق کا صحیح صحیح اندازہ

نہیں کرتیں اور اسطرح اندھی بن جاتی ہیں وہ دنیا کی نعمتوں اور آسائشوں سے محروم رہ جاتی ہیں ۔ اور جس قوم کا امروز تاریک اور بھیانک ہو اس کا فردا (مستقبل) بھی تاریک ہوتا ہے ۔ یہ تو ضرور نہیں کہ جس قوم کو اس دنیا کی آسائشیں اور نعمتیں میسر ہو جائیں اس کا مستقبل (حیات آخرت) بھی درخشندہ ہو ۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ مستقبل اسی قوم کا درخشندہ ہوگا جس کا امروز شاندار ہو ۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کسی قوم کی دنیاوی زندگی ذلت و رسوائیوں میں گذر رہی ہو اور وہ آخرت میں جنت کی آسائشوں کی مالک بن جائے ۔ ایمان اور عمل صالح کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی خوشگواریاں اور شادابیاں اور اس کے بعد کی زندگی کی درخشانیاں اور تابناکیاں ہیں ۔ یاد رکھئے ۔ مومن کا مقام ، آدم (آدمی) کے مقام سے اونچا ہے ۔ اس لئے جو کچھ آدمی کو میسر ہو مومن کو وہ کچھ بھی میسر ہونا چاھئے اور اس سے زیادہ کچھ اور بھی ۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ ملائکہ ، آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں ۔ لہذا مقام آدم یہ ہے کہ کائناتی قوتیں اس کے سامنے جھکی ہوئی ہوں ۔ وہ اشیائے فطرت کو مسخر کر لے ۔ اور مومن کا مقام یہ ہے کہ وہ اشیائے فطرت کو مسخر کرکے انہیں قوانین خداوندی کے مطابق صرف میں لائے ۔ لہذا اگر کسی قوم کا اشیائے فطرت پر تصرف نہیں تو وہ قوم مقام آدم تک بھی نہیں پہنچ سکی ، چہ جائیکہ اسے مقام مومن نصیب ہو ۔ جس قوم کو اس دنیا کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں نصیب نہیں اسے مقام آدم حاصل نہیں ۔ چہ جائیکہ مقام مومن ۔ اس لئے ایسی قوم کی آخرت کی زندگی کسطرح روشن ہو سکتی ہے ۔ لیکن جس قوم کو مقام آدم نصیب ہے لیکن مقام مومن نصیب نہیں تو اسکی اس دنیا کی زندگی پر آسائش ہوگی ۔ آخرت کی زندگی اسکی بھی تاریک ہوگی ۔ مومن کی دنیا اور آخرت دونوں کی زندگی تابناک ہوگی ۔

عَنْ (حرف)

عَنْ ۔ یہ بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً ۔

(۱) يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ (۲۴/۶۳) ۔ وہ اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ۔

(۲) ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ۔ منتقل ہونا ، ہٹ جانا جیسے عَنِ الصِّرَاطِ لَنَاكِبُوْنَ (۲۳/۷۴) ۔ وہ راستہ سے ایک طرف ہٹ جانے

والے ہیں۔ اور ذَهَبَ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ الرَّوْعُ۔ ابراہیمؑ سے خوف ہٹ گیا، چلا گیا اور دور ہو گیا (۱۱/۷۴)۔ سَافَرْتُ عَنِ الْبَلَدِ۔ میں نے شہر سے سفر کیا۔ وہاں سے کسی دوسری جگہ گیا۔

(۳) ”بدلے میں“ یا ”کی طرف سے“ کا مفہوم۔ يَوْمًا لَاتَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا (۲/۴۸) جس دن کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے بدلے میں کفایت نہیں کریگا۔ یا اس کی طرف سے جزا (معاوضہ) نہیں دے سکیگا۔

(۴) سبب ظاہر کرنے کے لئے (کی وجہ سے۔ کے سبب)۔ وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ (۱۱/۵۳)۔ ہم تیرے کہنے کی وجہ سے اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑنے والے۔

(۵) اوپر یا بعد کے معنوں میں۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴/۱۹)۔ تم ایک حالت سے اوپر دوسری حالت میں جاؤ گے۔ یا تم ایک حالت کے بعد دوسری حالت میں پہنچوگے۔

(۶) مِنْ (سے) کے معنوں میں۔ هُوَ الَّذِىْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ (۴۲/۲۵) اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے۔

(۷) ب۔ (سے) کے معنوں میں ؛ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (۵۳/۳)۔ وہ اپنے جذبات و خیالات سے بات نہیں کرتا۔ (”ساتھ، ذریعہ“ یا ”کی مدد سے“ کے معنوں میں بھی آتا ہے جیسے رَمَيْتُ عَنِ الْقَوْسِ یعنی رَمَيْتُ بِالْقَوْسِ۔ میں نے کمان کے ذریعہ تیر پھینکا)۔

(۸) فِیْ (میں) کے معنوں میں بھی آتا ہے۔

(۹) زائد بھی ہوتا ہے (یعنی کوئی معنی نہیں دیتا)

کتب لغت میں ان کی مثالیں دی ہوئی ہیں۔

ع ن ب

اَلْعِنَبُ۔ (واحد، عِنَبَةٌ)۔ انگور۔ یہ انگور کے پھل اور اس کی بیل کے لئے بھی بولا جاتا ہے*۔ اَعْنَابٌ (۲/۲۶۶)۔ عِنَبٌ کی جمع ہے۔ اَلْعِنَبُ۔ (انگور کی) شراب*۔

---

*تاج و راغب۔

ع ن ت

اَلْعَنُوْتُ ۔ وہ ٹیلہ جس پر چڑھنا دشوار ہو۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں مشقت ، توڑ پھوڑ اور تکلیف کا مفہوم ہے اور اس میں سہولت ، آرام اور درستی کا مفہوم نہیں ہے ۔ چنانچہ اس میں کمزوری اور شکستگی کے معنے بھی ہیں اور دشواری اور مشقت کے بھی* ۔ عَنِتَ الْعَظْمُ ۔ ہڈی کمزور ہو کر ٹوٹ گئی ۔ عَنِتَتْ یَدُہٗ ۔ اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا ۔ اور عَنَّتَہٗ کے معنی ہیں اس نے اسے مشکل میں ڈالا یا اس کے ذمہ ایسا کام لگا دیا جس کا کرنا اس کے لئے سخت دشوار ہوا* ۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ اِعْنَاتٌ کے معنی ہیں کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف کرنا* ۔ صاحب مفردات نے لکھا ہے کہ مُعَانَتَۃٌ کے معنی تقریباً مُعَانَدَۃٌ کے ہیں یعنی مسلسل عداوت و کشمکش کے ، لیکن معانتۃ بلیغ تر ہے کیونکہ اس میں خوف و ہلاکت کا پہلو بھی ہوتا ہے ۔ چنانچہ عَنِتَ فُلَانٌ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص ایسے معاملہ میں پھنس جائے جس میں ہلاکت کا ڈر ہو** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مشقت اور دشواری وغیرہ کے ہوتے ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے لَعَنِتُّمْ (۷/۴۹) ۔ تم مشقت میں پڑجاتے یا ہلاک ہوجاتے ۔ دوسری جگہ ہے وَدُّوْا مَاعَنِتُّمْ (۳/۱۱۷) وہ دل سے چاہتے ہیں کہ تم خطرناک مصیبت یا ہلاکت میں پڑجاؤ ۔ سورۃ نساء میں جنسی اختلاط کے احکام کے ضمن میں فرمایا ۔ ذَالِکَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ (۴/۲۵) ۔ یہ احکام اس کے لئے ہیں جو ہلاکت میں پڑنے سے ڈرتا ہے ۔ عَنَتٌ ایک جامع لفظ ہے جس کے معنوں میں فساد ۔ گناہ ۔ ہلاکت ۔ غلطی ۔ لغزش ۔ ظلم و زیادتی نیز سخت مشقت اور دشواری کا مقابلہ کرنا شامل ہیں* ۔

ع ن د

عَنَدَ (نون پر تینوں حرکتوں کے ساتھ) ۔ عُنُوْدًا ۔ عَنَدًا ۔ عَنِ الطَّرِیْقِ ۔ وہ راستہ سے دور ہوگیا ۔ ہٹ گیا ۔ الگ ہو گیا ۔ منحرف ہو گیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں حد سے آگے بڑھ جانے اور صحیح راستہ کو چھوڑ دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے ۔ عَنَدَتِ النَّاقَۃُ ۔ اونٹنی باقی اونٹوں سے الگ ہٹ کر تنہا چرتی رہی ۔ عَنَدَ الرَّجُلُ ۔ آدمی نے سرکشی کی اور

*تاج ۔ **راغب ۔

جان بوجھ کر حق کو رد کر دیا اور اس کی مخالفت کی۔ ایسا شخص عَنِیْدٌ کہلائیگا۔ اَلْعَانِدُ۔ وہ اونٹ جو راستہ سے ہٹ جائے۔ اَلْمُعَانَدَۃُ وَالعِنَادُ۔ الگ ہو جانا۔ مسلسل مخالفت کرنا۔ عَنَدَ الرَّجُلُ عَنْ اَصْحَابِہٖ۔ اس نے سفر میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیا، یا ان سے پیچھے رہ گیا۔ عَانِدَۃُ الطَّرِیْقِ۔ وہ راستہ جو سیدھے راستے سے ایک طرف کو ہٹا ہؤا ہو۔ اَلْعَنَدُ۔ آڑے آ جانا۔ حائل ہوجانا*۔

سورۃ مدثر میں ہے اِنَّہٗ کَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا (۷۴/۱۶)۔ وہ ہمارے قوانین سے سرکشی اختیار کرتا تھا۔ سورۃ ابراہیم میں ہے۔ وَخَابَ کُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ (۱۴/۱۵) ہر مستبد اور سرکش تباہ و برباد ہو گیا۔

عِنْدَ (ظرف)

عِنْدَ۔ ظرف ہے، بمعنی پاس۔ قریب۔ نزدیک۔ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ (۴۳/۸۵)۔ علم الساعت خدا کے پاس ہے۔ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ (۴/۷۸)۔ خدا کی طرف سے۔ اللہ کے پاس سے۔ قُلْ لَوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِہٖ (۶/۵۸) ان سے کہو کہ جس کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو وہ اگر میرے پاس ہوتا تو۔۔۔۔۔۔

ع ن ق

ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا بڑھنا اور پھیلنا بتائے ہیں، خواہ وہ اونچائی میں ہو یا زمین پر پھیلنا ہو۔ اَلْعُنُقُ (جمع اَعْنَاقٌ) گردن*۔ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ (۸/۱۲)۔ ان کی گردنوں کے اوپر (یعنی سروں پر) مارو۔ نیز اس کے معنے جماعت کثیر ہیں۔ الاَعْنَاقُ پیش پیش رہنے والے آدمی، نیز رؤسائے قوم کو بھی کہتے ہیں*۔ فَظَلَّتْ اَعْنَاقُھُمْ لَھَا خَاضِعِیْنَ (۲۶/۴)۔ ان کے اکابرین قوم عاجز و درماندہ ہوکر اس کے سامنے جھک جائیں۔ اکابرین کو ہمارے ہاں بھی ’’گردن فراز‘‘ کہتے ہیں۔

ع ن ک ب

اَلْعَنْکَبُوْتُ۔ مکڑی*۔ قرآن کریم نے مشرکین کے مسلک کو تارِ عنکبوت سے تشبیہ دی ہے (۲۹/۴۱) جو ذرا سے تنکے یا انگلی کے اشارے سے درھم برھم ہو جاتی ہے۔ یہ مسلک، دلیل و برھان اور علم و بصیرت کے

*تاج۔

بجائے توہم پرستی اور جہالت پر قائم ہوتا ہے، اس لئے علم و فکر کی ذرا سی جنبش اسے پارہ پارہ کر دیتی ہے ۔ شرک کا عملی مفہوم ہے کائنات میں ایک سے زیادہ ہستیوں کو صاحب اقتدار تسلیم کرنا اور یہ سمجھنا کہ یہاں ایک سے زیادہ قوانین نافذ ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام کائنات میں قانون صرف ایک خدا کا رائج ہے ۔ اس لئے انسانوں کی دنیا میں بھی صرف خدائے واحد کا قانون نافذ ہونا چاہئے ۔ یہ توحید ہے اور نہایت محکم نظریۂ حیات ۔ اس کے خلاف ہر نظریۂ زندگی ، تارِ عنکبوت ہے ۔

ع ن و

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کا نہایت توجہ اور شدید خواہش سے ارادہ کرنا ۔ (۲) عاجزی ۔ (۳) کسی چیز کا ظاہر ہونا اور نکلنا ۔ عاجزی کے اعتبار سے اَلْعَنْوُ ۔ اَلْعَنَاءُ کے معنی ہیں قید ہوجانا ۔ مطیع و فرمانبردار ہو جانا ۔ اَلْعَنْوَۃُ ۔ قہر اور زبردستی ۔ صاحب تاج العروس کے نزدیک اس پر اجماع ہے کہ عَنْوَۃً کے معنی کسی چیز کو زبردستی لے لینے کے ہیں ۔ لیکن ابن سیدہ نے اس کے معنی محبت کے بھی بتائے ہیں ۔ اس صورت میں یہ لفظ اضداد میں سے ہو جاتا ہے جو قہر و جبر کے علاوہ تسلیم و اطاعت کے معنوں میں بھی آئے گا* ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ عَنَا الشَّیْءَ کے معنی ہیں اس نے اس شے کو ظاہر کر دیا** ۔ عَنَتِ الْاَرْضُ بِالنَّبَاتِ تَعْنُو ۔ زمین نے پودے نمودار کئے* ۔

قرآن کریم میں ہے وَعَنَتِ الْوُجُوْہُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ ($\frac{۲۰}{۱۱۱}$) ۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی جھک جانے کے کئے ہیں اور بعض نے کھڑے ہو جانے اور کام کرنے کے* ۔ مطلب یہ ہے کہ لوگ نظام خداوندی کے قیام کے لئے بطیب خاطر کھڑے ہو جائیں گے اور قوانین الٰہیہ کی اطاعت دل کے پورے جھکاؤ سے کرینگے ۔ اس میں قانون کا غلبہ و قوت ، اور قانون ماننے والوں کی تسلیم و اطاعت ، دونوں پہلو آجاتے ہیں ۔ بلکہ ”ظاہر ہو جانے“ کے اعتبار سے یہ بھی کہ لوگوں کی مضمر صلاحیتیں اس مقصد کی تکمیل کے لئے ابھر کر سامنے آجائینگی ۔

ع ھ د

عَھِدَ الشَّیْءَ کے معنی ہیں کسی چیز کی مسلسل حفاظت اور خبر گیری کرنا ۔ اس کی پیہم نگہداشت کرنا ۔ ان بنیادی معنوں کی رو سے عَھْدٌ کا

---

*تاج ۔ **محیط ۔

استعمال اس پختہ وعدہ کے لئے بھی ہونے لگا جس کی نگہداشت ضروری ہو* ۔ جب اس لفظ کے بعد اِلٰی آئے تو اس کے معنی حکم کرنے کے ہوجاتے ہیں**۔ جیسے عَہِدْنَا اِلٰی اِبْرَاھِیْمَ (۲/۱۲۵) ۔ ہم نے ابراہیم کو حکم دیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اِلٰی کے ساتھ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کو اس بات کی ہدایت کرنا جس کی نگہداشت اس پر واجب کی جائے ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی سے عہد و پیمان لیکر اسے اس کے ایفاء کی تاکید کرنا ۔ ذمہ داری اور امان کو بھی عَھْدٌ کہتے ہیں** ۔ جیسے لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ (۲/۱۲۴) ۔ جو ہمارے قانون سے سرکش ہو جائے اس کے بارے میں ہماری یہ ذمہ داری پوری نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح اَوْفُوْا بِعَھْدِیْٓ اُوْفِ بِعَھْدِکُمْ (۲/۴۱) کے معنی ہیں تم اپنے اس عہد کو پورا کرو جو تم نے میرے ساتھ استوار کر رکھا ہے ، اور میں ان ذمہ داریوں کو پورا کرونگا جو میں نے تمہاری بابت لے رکھی ہیں ۔ عَھْدٌ وفاداری کو بھی کہتے ہیں ** ۔ وَمَا وَجَدْنَا لِاَکْثَرِھِمْ مِّنْ عَھْدٍ (۷/۱۰۲) ۔ ہم نے ان میں سے اکثر کو وفا شعار ، یعنی اپنے عہد کا پابند ، نہیں پایا۔ عَھْدَۃٌ کے معنی بھی ذمہ داری کے آتے ہیں** ۔ والیوں اور حکام کے لئے جو شاہی فرامین لکھے جاتے ہیں انہیں عَھْدٌ کہتے ہیں ۔ نیز عَھْدٌ کے معنی جان پہچان یا ملاقات کے بھی آتے ہیں۔ عَھِدَ الشَّیْءَ چیز کو پہچان لیا** ۔

ع ھ ن

اَلْعِھْنُ ۔ رنگین اون ۔ مختلف رنگوں سے رنگی ہوئی اون ۔ اَلْمُھْنَۃُ ۔ شاخ کا مڑجانا اور ٹوٹ جانا یا بغیر جدا ہوئے ٹوٹ جانا ۔

اَلْعَاھِنُ ۔ فقیر کو کہتے ہیں کیونکہ وہ شکستہ حال ہوتا ہے ۔ نیز اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے اعضاء ڈھیلے ڈھالے ہوں*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نرمی اور سہولت کے ہیں ۔ چنانچہ قَضِیْبٌ عَاھِنٌ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس میں خمیدگی اور شکستگی ہو۔

قرآن کریم میں ہے وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِھْنِ (۷۰/۹) ۔ پہاڑ رنگین (یا مختلف رنگوں والی) اون کی طرح ہوجائینگے۔ دوسری جگہ اَلْعِھْنِ الْمَنْفُوْشِ (۱۰۱/۵) آیا ہے ۔ دھنی ہوئی رنگین اون ۔ ٹکڑے ٹکڑے کی ہوئی مختلف رنگوں والی اون ۔ ان کی خستگی اور شکستگی کی طرف اشارہ ہے ۔

*محیط ۔ **تاج ۔ ***تاج و راغب ۔

ع و ج

عَوِجَ - یَعْوَجُ - ٹیڑھا ہونا - العِوَجُ فِی الْاَرْضِ - زمین کا ناہموار ہونا - عَاجَ عَنْہُ - اس سے لوٹ گیا - پلٹ گیا، باز آیا *- مَا اَعُوْجُ بِکَلَامِہٖ - میں اسکی بات کی طرف ملتفت نہیں ہوتا ہوں - اِنْعَاجَ عَلَیْہِ - وہ اسکی طرف مڑ گیا **- راغب نے لکھا ہے کہ اَلْعَوَجُ اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو آنکھ سے دیکھا جا سکے اور اَلْعِوَجُ اس ٹیڑھے پن اور ناہمواری کو جو عقل و بصیرت سے دیکھی جاسکے، جیسے معاشرہ کی ناہمواریاں اور نظام زندگی کا ٹیڑھا پن ***- ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْعَوَجُ اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو سیدھی اور کھڑی چیز (مثلاً دیوار یا لکڑی وغیرہ) میں ہو - اور اَلْعِوَجُ اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو بچھی ہوئی چیز یا کسی معاملہ میں ہو۔

سورہ کہف میں قرآن کریم کے متعلق ہے وَلَمْ یَجْعَلْ لَہٗ عِوَجاً (۱/۱۸) یہ ایسا ضابطہ زندگی ہے جس میں کہیں پیچ و خم نہیں - اس کے مقابلہ میں قَیِّماً آیا ہے (۲/۱۸) - اس کے مخالفین کے متعلق کہا کہ یَبْغُوْنَہَا عِوَجاً (۴۵/۷) - وہ چاہتے ہیں کہ اس کے راستہ میں ناہمواریاں اور خمیدگیاں پیدا ہو جائیں - لیکن جب وہ انقلاب آئیگا جسکی طرف قرآن کریم دعوت دیتا ہے تو ان بڑے بڑے لوگوں کی خود اپنی خمیدگیاں اور ناہمواریاں صاف کر دی جائینگی - ان کے بل نکل جائینگے - (۱۰۵-۱۰۷/۲۰) - یہ اسوقت اس داعی کے پیچھے پیچھے چلیں گے جس کی دعوت میں کوئی ٹیڑھا پن نہیں (۱۰۸/۲۰)۔

قرآن کریم جس صراط مستقیم کیطرف راہ نمائی کرتا ہے اس میں کوئی پیچ و خم نہیں - وہ بالکل صاف اور سیدھا راستہ ہے - لیکن مفاد پرست گروہ اس میں خواہ مخواہ پیچیدگیاں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

ع و د

اَلْعَوْدُ - لوٹنا - بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اَلْعَوْدُ کسی کام کو ابتداءً کرنے کے بعد دوبارہ کرنا ہوتا ہے - لیکن راغب اور زمخشری کی تحقیق ہے کہ یہ لفظ ابتداءً (پہلی مرتبہ) کسی کام کے کرنے پر بھی بولا جاتا ہے *- چنانچہ صاحب محیط نے بھی اسکی تائید کی ہے اور شہادت میں حضرت شعیبؑ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے مخالفین سے کہا کہ قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَی اللّٰہِ کَذِباً اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِکُمْ (۸۹/۷) -

*تاج - **محیط - ***راغب -

"اگر ہم نے تمہارے مسلک کو اختیار کر لیا تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ہم نے خدا کے خلاف جھوٹا اتہام باندھا"۔ اسمیں عُدْنَا کے معنی ان کی ملت میں دوبارہ جانا نہیں، کیونکہ حضرت شعیبؑ ان کی ملت (مذهب) پر کبھی تھے ہی نہیں۔ اسلئے اسکے معنی یہ ہیں کہ ہم تمہارے مشرب کو کبھی قبول نہیں کریں گے*۔ لیکن اس آیت میں ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ اس میں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ جواب جماعت (حضرت) شعیبؑ کیطرف سے ہے اور اس میں خود حضرت شعیبؑ شامل نہیں اگرچہ جواب انہی (حضرت شعیبؑ) کے الفاظ میں ہے۔ یعنی ان کا یہ جواب ان کی جماعت کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اگر یہ مفہوم لیا جائے تو پھر عُدْنَا کے معنی پلٹ کر واپس جانا ہونگے کیونکہ حضرت شعیبؑ کے ساتھی، پہلے ان مخالفین ہی کا مسلک رکھتے تھے۔

صاحب تاج العروس نے یہ بھی لکھا ہے کہ عاد کے معنی ویسے تو پلٹنے کے ہیں، لیکن بعد میں صَارَ کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے۔ یعنی "ہو گیا"۔ عام اس کے کہ وہ پہلے بھی ویسا تھا یا نہیں۔

سورہ مجادلہ میں ہے۔ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا (۵۸/۳) پھر وہ اپنی کہی ہوئی بات کی طرف پلٹتے ہیں۔ عَائِدٌ۔ لوٹ جانے والا، اسکی جمع عَائِدُوْنَ ہے (۴۴/۱۵)۔ أَعَادَ۔ يُعِيْدُ (۸۵/۱۳)۔ لوٹانا۔ نیز اسکے معنی منزل مقصود تک پہنچانے کے بھی ہوسکتے ہیں کیونکہ مَعَادٌ کے معنی ٹھکانا یا انجام** نیز آخری مقام کے بھی ہیں۔ سورہ قصص میں ہے لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ (۲۸/۸۵)۔ اسکے معنی (لوٹنے کی جگہ کے اعتبار سے) یہ کئے جاتے ہیں کہ آپ (نبی اکرمؐ) پھر اسی مکہ میں داخل ہونگے جہاں سے کفار نے آپکو نکالا تھا۔ اسکے معنی وطن اور جائے پیدائش کے بھی لئے جاتے ہیں***۔ لیکن اگر اس میں مَعَادٌ کے معنی منزل مقصود کے لئے جائیں تو وطن یا جائے پیدائش کی بہ نسبت "منزل مقصود" زیادہ مناسب ہونگے، اس لئے کہ ایک نبی، وطن کی نسبتوں سے بلند ہوتا ہے، اور وہ فضا جو اس کے مشن کے لئے زیادہ مساعد ہو اس کا وطن بن جاتی ہے۔ لہذا آپ کا مکہ کیطرف لوٹنا اپنے وطن کی طرف مراجعت نہ تھی بلکہ آپؐ کے مشن کی تکمیل تھی۔ بہرحال یہ واضح ہے کہ يُعِيْدُ سے مراد تکرار نہیں (یعنی بار بار لوٹانا نہیں) بلکہ ہر شے کو مختلف گردشیں دے کر (مختلف مراحل سے گزار کر)

*تاج و محیط۔ ** غریب القرآن۔ مرزا ابوالفضل۔ *** تاج۔

اسکی ابتدا سے آخری نقطہ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ ایسا کرنے والے کو رَبٌّ کہتے ہیں۔ اس ضمن میں (ر۔ج۔ع) کا عنوان بھی دیکھئے۔

اَلْعَائِدَةُ کے معنی احسان اور سلوک، مہربانی اور منفعت کے ہیں*۔ چنانچہ کہتے ہیں ھٰذَا الْاَمْرُ اَعْوَدُ عَلَیْکَ۔ یہ کام تمہارے لئے زیادہ منفعت بخش ہے۔ نیز یہ کہ فُلَانٌ مَایُبْدِیءُ وَمَایُعِیْدُ۔ فلاں آدمی کے پاس کوئی حیلہ اور تدبیر نہیں ہے۔ نہ وہ پہلی مرتبہ کوئی کام کرسکتا ہے نہ اسکی تکرار کرسکتا ہے*۔ اَلْمُعِیْدُ اسے کہتے ہیں جو اسکام کی طاقت رکھے جسکا وہ عادی ہوچکا ہے۔ دراصل مُعِیْدٌ اس نر اونٹ کو کہتے ہیں جو بار بار جفتی کھانے پر بھی تھکنے والا نہ ہو۔ نیز معاملات سے واقف اور تجربہ کار آدمی کو بھی کہتے ہیں*۔ اَعَادَ لِلْاَمْرِ۔ اسکام کی طاقت رکھی**۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ یُبْدِیءُ وَیُعِیْدُ (۸۵/۱۳) میں تکرار اور اعادہ ہی مراد نہیں بلکہ پوری قوت اور طاقت، تدبیر اور واقفیت سے آخری نقطہ (انجام) تک پہنچانا بھی مراد ہے۔ یہ ہے ہر شے کا مَعَادٌ۔ (مَبْدَاٌ اور مَعَادٌ کیلئے دیکھئے عنوان ب۔د۔أ)۔ اَلْعِیْدُ۔ وہ وقت جسمیں خوشی یا غم لوٹ کر آئے*۔ [اَلْعُوْدُ۔ ہر پتلی اور باریک لکڑی کو کہتے ہیں۔ نیز اس لکڑی کو بھی جس سے دھونی دی جائے]***۔

ع و ذ

عَائِذٌ۔ ہر وہ مادہ جس نے حال ہی میں بچہ دیا ہو۔ اسکی جمع عُوْذٌ ہے***۔ عَاذَتْ بِوَلَدِھَا کے معنی ہیں مادہ کا اپنے بچہ کے پاس کھڑے رہنا اور اسکی حفاظت کرتے رہنا جبتک وہ چھوٹا رہے*۔ اَلْمُعَوَّذُ اونٹوں کی اس چراگاہ کو کہتے ہیں جو مکانات کے آس پاس ہو (تاکہ اونٹ ہر وقت نگاہ میں رہیں)۔ ان معانی کے اعتبار سے تَعَوَّذَ اور اِسْتَعَاذَ کے معنی ہوتے ہیں کسی کی پناہ لینا۔ اسکی حفاظت میں محفوظ ہو جانا، اور عَاذَ بِالشَّیْءِ کے معنی ہیں کسی چیز کے ساتھ چمٹے رہنا۔ یعنی اسے لازم پکڑ لینا۔ مستقل طور پر اختیار کر لینا****۔

یوں تو نظام خداوندی قائم کرنے والی جماعت کو ہمیشہ اپنے نظام کی حفاظت کیلئے قوانین خداوندی کی تائید و نصرت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن

* تاج۔ ** محیط۔ *** ابن فارس۔ **** تاج و محیط۔

اس نظام کے قیام کی ابتدائی منازل میں ، جبکہ انکی اپنی قوت ہنوز کم اور مخالفین کی مخالفت شدید تر ہوتی ہے، انہیں ان قوانین کے ذریعے اپنی حفاظت و پرورش کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے (جیسے ایک نوزائیدہ بچے کو شروع شروع میں اپنی ماں کی حفاظت و پرورش کی ہر وقت ضرورت ہوتی ہے)۔ یہ ہے وہ مرحلہ جسمیں قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳/۱) ۔ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴/۱)۔ کی تعلیم دی گئی ہے ۔ یعنی ہر وقت قوانین خداوندی اور نظام کے ساتھ چمٹے رہنا ۔ اس سے ذرا دور نہ ہٹنا ۔ ذرا سے خطرے اور آہٹ کے وقت جھٹ سے اسکے آغوش میں آجانا اور اسطرح مخالفین کی سرکش قوتوں سے محفوظ ہو جانا ۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ قرآنی نظام کے قیام کی ابتدائی منازل میں تعوّذ کی ضرورت خاص طور پر زیادہ ہوتی ہے ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ قیام نظام کے بعد تعوّذ کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ قرآن کریم سے دور لے جانے والے میلانات و جذبات اور طاغوتی قوتوں سے پناہ جوئی کی ضرورت تو زندگی کے ہر سانس میں رہتی ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ نظام کے ابتدائی ایام میں چھوٹی سی باتوں کے لئے بھی مرکز کیطرف رجوع کرنا پڑتا ہے لیکن جب ایک طرف حقائق واضح ہو جائیں اور دوسری طرف نظام محکم ہو جائے ، تو پھر چھوٹے چھوٹے خطرات کا مقابلہ ازخود ہوتا جاتا ہے ۔

سورہ نحل میں ہے فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (۱۶/۹۸)۔ اس کے عام معنی یہ کئے جاتے ہیں کہ جب تم قرآن کریم پڑھنے لگو تو پہلے اعوذ پڑھ لیا کرو ۔ لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم سے متمسک رہنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے سرکش جذبات کے اثرات اور مستبد قوتوں کا آلۂ کار بننے سے محفوظ رہے ۔ چنانچہ اسکی تشریح اگلی آیت میں یہ کہکر کر دی گئی کہ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۱۶/۹۹)۔ شیطان (یا ان سرکش قوتوں) کا غلبہ ان لوگوں پر کبھی نہیں ہو سکتا جو ایمان رکھتے ہیں اور قوانین خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کرتے ہیں ۔ یہی وہ طریقہ تھا جس کے ذریعے حضرت موسےٰؑ نے فرعون کے استبداد سے حفاظت حاصل کی تھی جب کہا تھا کہ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ (۴۰/۲۷)۔ میں ہر متکبر (کے استبداد سے بچنے کے لئے) اپنے اور تمہارے نشو و نما دینے والے کی حفاظت میں جاتا ہوں ۔

یہ ہے تَعَوُّذ کا قرآنی مفہوم - یعنی خطرے کے وقت اپنے نظام سے اور زیادہ شدت سے متمسک ہو جانا اور قوانین خداوندی کی اور زیادہ پابندی سے اطاعت کرنا - اس کے برعکس ہمارے ہاں تَعَوُّذ سے مقصود صرف اتنا رہ گیا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے اَعُوْذُ پڑھ لیا جائے ، یا قرآن کریم کی آیات کے تَعْوِیْذ لکھکر گلے میں ڈال لئے جائیں - (ذرا تَعْوِیْذ کے مفہوم پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے ؟) - یہ ٹھیک ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت (پڑھنا) ضروری ہے (تاکہ اسے سمجھا جائے اور سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے) اور جسطرح ہر عبد مومن ہر کام کی ابتدا خدا کے تصور سے کرتا ہے اسی طرح ، قرآن کریم کی تلاوت کا آغاز بھی غیر خدائی قوتوں سے حفاظت خداوندی (تَعَوُّذ) کے احساس سے کیا جائے (اور اس کے لئے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ کے الفاظ کہہ لئے جائیں تو یہ انسان کے جذبات کے اظہار کا طریق ہو جائیگا)۔ لیکن یہ سمجھ لینا کہ مقصود صرف ان الفاظ کا دہرا لینا ہے ، ٹھیک نہیں - الفاظ ، اظہار مقصد کا ذریعہ ہیں - مقصود بالذات نہیں - اعوذ اور بسم اللہ درحقیقت قرآن کریم کی اس بنیادی تعلیم کا اعلان ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَهَا ($\frac{2}{256}$) - جو شخص ہر غیر خدائی قوت سے انکار کرے اور صرف خدا کے قوانین کو تسلیم کرے ، تو اس نے ایک ایسا محکم سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا -

ع و ر

اَلْعَوَرُ - ایک آنکھ کی بینائی کا جاتے رہنا - اَعْوَرُ - کانا - نیز کوّے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ عربوں میں کانا اور کوا دونوں منحوس شمار کئے جاتے تھے - اسی سے کمزور ، بزدل اور گاؤدی آدمی کو بھی کہتے ہیں جس سے کبھی کوئی بھلائی کا کام نہ ہو سکتا ہو - نیز وہ راستہ بتانے والا جسے خود بھی راستہ اچھی طرح معلوم نہ ہو - اَلْاَعْوَرُ مِنَ الْکُتُبِ - مٹی ہوئی کتاب - اَلْاَعْوَرُ مِنَ الطُّرُقِ - وہ راستہ جس پر کوئی نشان نہ ہو - اَلْعَائِرُ - ہر وہ چیز جو آنکھ کو تکلیف دے - اَلْعَوْرَةُ - ملک کی سرحد میں اس قسم کا خلل جہاں سے دشمنوں کے حملہ آور ہونے کا اندیشہ ہو - صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ عَوْرَةُ الْقَوْمِ اس مقام کو کہا جاتا ہے جہاں سے کسی قوم کو دشمن کے حملہ آور ہونے کا خطرہ ہو -

چنانچہ سورۃ احزاب میں جو ہے کہ اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَۃٌ (۳۳/۱۳) ۔ تو اس کے یہی معنی ہیں ۔ ابن فارس نے بھی لکھا ہے کہ اَلْعَوْرَۃُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے خالی ہونے کی وجہ سے اس کی نگہداشت ضروری ہو۔ اَعْوَرَ الشَّیْئُ ۔ کسی چیز کا اس طرح نمایاں ہو جانا کہ دوسرا اس پر حملہ کرسکے ۔ ان معانی کے اعتبار سے اَلْعَوْرَۃُ ہر اس شے کو کہتے ہیں جس میں کوئی ایسا خلل یا نقص ہو جس سے خوف کا امکان ہو ۔ نیز ہر وہ شے جس سے شرم و حیا کی جائے ۔ جو باعث عار ہو ۔ عورت یا مرد کے مقامِ ستر کو بھی کہتے ہیں* ۔

قرآن کریم میں عَوْرَاتِ النِّسَآءِ (۲۴/۳۱) آیا ہے جس کے معنی ہیں عورتوں کی جنسیات (Sex) کے متعلق باتیں جنہیں عام طور پر پوشیدہ رکھا جاتا ہے ۔ دوسرے مقام پر ہے کہ صبح کی نماز سے پہلے ۔ عشا کی نماز کے بعد ۔ اور دوپہر کے وقت جب تم کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹتے ہو ثَلٰثُ عَوْرَاتٍ لَّکُمْ (۲۴/۵۸) ۔ یہ تین ایسے اوقات ہیں جن میں تم کپڑے اتار کر بلا تکلف لیٹتے ہو ۔ تمہارا پورا پورا ستر نہیں ہوتا ۔ مطلب (Privacy) سے ہے ۔

ع و ق

اَلْعَوْقُ ۔ روک دینا ۔ لوٹا دینا ۔ واپس کر دینا ۔ نیز وہ آدمی جس میں کوئی بھلائی نہ ہو ۔ نیز وہ جو لوگوں کو بھلے کاموں سے روکے ۔ عَاقَنِیْ عَنِ الْاَمْرِ الَّذِیْ اَرَدْتُ ۔ اس نے مجھے اس کام سے روک دیا جس کا میں نے ارادہ کیا تھا ۔ اَلتَّعْوِیْقُ ۔ روکنا ۔ مُعَوِّقٌ ۔ روکنے والا* ۔ قرآن کریم میں اَلْمُعَوِّقِیْنَ (۳۳/۱۸) آیا ہے ۔ عَوَائِقُ الدَّھْرِ ۔ وہ حوادثِ زمانہ جو انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیں اور انہیں دوسری مصروفیتوں سے روک دیں* ۔

یَعُوْقُ ۔ قبیلہ کنانہ کے بت کا نام تھا ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ قوم نوح کے بت کا نام تھا* ۔ (۷۱/۲۳) ۔

ع و ل

اَلْعَوْلُ ۔ ہر وہ چیز جو انسان کو گرانبار کردے ۔ جس کے بوجھ تلے وہ دب جائے** ۔ عَالَ الشَّیْئُ فُلَانًا ۔ فلاں پر وہ چیز غالب آگئی اور اس پر بوجھ بن گئی جس کی وجہ سے وہ فکر مند ہوگیا ۔ اَلْعِیَالُ ۔ وہ افراد جن کے اخراجات کا انسان ذمہ دار ہو ۔ جن کے بوجھ کے نیچے وہ دبا ہوا ہو ۔ اسی سے

---

*تاج و محیط و راغب ۔ **راغب ۔

اَعَالَ الرَّجُلُ کے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ وہ آدمی کثیر العیال ہوگیا اور یہ بھی کہ وہ فقیر اور محتاج ہو گیا ۔ عَالَ الْمِیْزَانُ کے معنی ہیں ترازو میں کان ہوئی (یعنی اس میں پاسنگ کی ضرورت ہوگئی) اور اس کے پلڑوں کا وزن برابر نہ رہا ۔ یہاں سے اس کے معنی بے انصافی کرنے کے آتے ہیں۔ عَالَ فِی الْحُکْمِ ۔ اس نے فیصلہ کرنے میں ظلم کیا* ۔

سورۃ نساء میں جہاں معاشرہ کی ہنگامی حالت میں اجتماعی مشکل کے حل کے لئے ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دی گئی ہے اس کے ساتھ ہی کہا گیا ہے کہ اگر تم سمجھو کہ ان میں عدل نہیں کرسکوگے تو ایک ہی بیوی رکھو ۔ اس کے بعد ہے ذٰلِکَ اَدْنٰی اَلَّا تَعُوْلُوْا (۴/۳) ۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ یہ اس لئے کہا گیا ہے کہ تم حق سے نہ ہٹ جاؤ ۔ اور دوسرے معنی یہ کہ تم کثیر العیال ہوکر بوجھ کے نیچے نہ دب جاؤ**۔

(نوٹ ۔ ع ۔ ی ۔ ل کا عنوان بھی دیکھئے)۔

ع و م

اَلْعَوْمُ ۔ تیرنا ۔ اَلسَّبْحُ پانی کے اوپر تیرنے کو کہتے ہیں جس میں آدمی غوطہ نہ کھائے اور اَلْعَوْمُ اس تیرنے کو کہتے ہیں جس میں آدمی پانی کے نیچے بھی چلا جائے ۔ اَلْعَامَۃُ ۔ چھوٹی سی کشتی کو کہتے ہیں جس پر دریا عبور کیا جائے ۔ اَلْعَوَّامُ ۔ سبک رفتار گھوڑا**۔

قرآن کریم میں اجرام فلکی کے متعلق ہے کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (۳۶/۴۰) ۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں تیرتا پھر رہا ہے ۔ اسی تیرنے کی جہت سے اَلْعَامُ کے معنی سال ہوئے ۔ یعنی وہ مدت جس میں "آفتاب" تیر کر اپنا دورہ پورا کرلیتا ہے*** ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْعَامُ اور اَلسَّنَۃُ میں فرق یہ ہے کہ اَلسَّنَۃُ کا لفظ اکثر اس سال پر بولا جاتا ہے جس میں قحط سالی ہو اور اَلْعَامُ اس سال کے لئے جس میں فراخی اور فارغ البالی ہو**۔ لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں ۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلسَّنَۃُ شمسی سال کے لئے بولا جاتا ہے اور اَلْعَامُ عربی مہینوں (قمری سال) کے لئے ۔ اس لئے اَلْعَامُ ، سَنَۃٌ کے مقابلہ میں چھوٹا ہوتا ہے** ۔

سورۃ عنکبوت میں حضرت نوحؑ کے متعلق ہے فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا (۲۹/۱۴) ۔ اس میں سَنَۃٌ اور عَامٌ دونوں آگئے ہیں۔

---

*تاج نیز کتاب الاشتقاق ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔

راغب کی توجیہ کے مطابق سَنَۃٌ سختیوں کا دور ہے اور عَامٌ خوشحالی کا زمانہ* ۔ (اس کی مزید تشریح کے لئے عنوان س ۔ ن ۔ و (ہ) بھی دیکھئے) ۔

ع و ن

عَوْنٌ کے معنی ہیں مدد نیز مددگار** ۔ عَوَانٌ ادھیڑ کو کہتے ہیں ۔ یعنی جو جوانی اور کبرسنی کے درمیان ہو* ۔ (جیسے قرآن کریم میں ہے لَا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَالِكَ ۔ وہ سانڈ (یا گائے) نہ بوڑھا ہے نہ نوجوان ، بلکہ ان کے بین بین عَوَانٌ ہے ۔ یعنی ادھیڑ عمر کا ۔ (۲/۶۸) ۔ مُتَعَاوِنَۃٌ ۔ اُس عورت کو کہتے ہیں جو اگرچہ عمر میں زیادہ ہو لیکن اس کی جسمانی ساخت میں اعتدال ہو اور جسم ایسا بھرا ہوا ہو کہ نیچے کی ھڈیاں نظر نہ آئیں* ۔ یعنی اس میں نہ بچپن کا الھڑ پن ہو ۔ نہ جوانی کی تیزی اور تلون ۔ اور نہ ہی بڑھاپے کی کمزوریاں ہوں ۔ بلکہ اس میں درمیانی عمر کی پختگی آچکی ہو یہ تو اسکی ذھنی حالت ہو ، اور جسمانی ساخت میں اعتدال اور بھراؤ ہو ۔

اِسْتَعَانَ (۱/۴) کے معنی ہیں اپنی ذات کے لئے اعتدال کی خواھش کرنا اور اس مقصد کے لئے کسی کی مدد طلب کرنا ۔ اسی نہج سے اللہ کو اَلْمُسْتَعَانُ (۲۱/۱۱۲) کہا گیا ہے ۔ اَعَانَ (۱۸/۹۵) کے معنے ہیں کسیکی مدد کرنا ۔ اور تَعَاوَنَ (۵/۲) کے معنی ہیں ایک دوسرے کی مدد کرنا ۔

اِسْتَعَانَ کے ان معانی کو پیش نظر رکھئے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں ۔ اس سے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (۱/۴) کا مفہوم واضح ہوجائیگا ۔ یعنی ہم اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو قانون خداوندی کی متعین کردہ راہ میں صرف کرتے ہیں ۔ ان قوانین کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں ۔ (دیکھئے ع ۔ ب ۔ د) اور انہی کے ذریعے اپنی صلاحیتوں اور ذات میں اعتدال چاھتے ہیں ۔ اس قسم کا اعتدال کہ اس میں پختگی اور حسن دونوں صحیح صحیح توازن وتناسب لئے ہوں ۔ ان دونوں آرزؤں سے ایسا دائرہ بن جاتا ہے جس میں ساری زندگی ایک نہج پر چلتی ہے ۔ یعنی قوانین خداوندی کی اطاعت سے اپنی مضمر صلاحیتوں میں اعتدال پیدا کرنا ۔ اور ان صلاحیتوں کو قوانین خداوندی ہی کے مطابق صرف کرنا تاکہ ان سے کائنات کے حسن میں اضافہ ہو اور عالمگیر انسانیت صحیح اعتدال کی روش اختیار کرسکے ۔ آپ نے اس کا اندازہ کرلیا ہوگا کہ اس میں اطاعت اور اطاعت کے ساتھ استقامت

*تاج ۔ **محیط ۔

دونوں شرطیں آجاتی ہیں ۔ اسی کے لئے کہا گیا ہے کہ وَ اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ (۲/۴۵) ۔ صلٰوۃ اور استقامت کے ذریعے اپنی صلاحیتوں میں اعتدال اور پختگی طلب کرو ۔ یہی طریق تمہارا معین و مددگار ہوسکتا ہے۔ اس سے خدا کی معاونت حاصل ہوتی ہے ۔

نیز جہاں برّ و تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کی تاکید کی گئی ہے، وہاں تعاون سے بھی یہی مراد ہے ۔ یعنے کسی شخص میں جن امور کی کمی وہ گئی ہو، اس کمی کو پورا کرنے میں اس کی مدد کرنا تاکہ اس کا اعتدال برقرار ہو جائے اور اس کی خامی پختگی سے بدل جائے ۔

ع ی ب

اَلْعَیْبُ ۔ نقص ۔ برائی ۔ خرابی ۔ عَابَ الشَّیْءُ ۔ وہ شے عیب دار ہو گئی ۔ عِبْتُہٗ ۔ مینے اسے عیب دار بنا دیا ۔ یا مینے اس میں عیب نکالا * ۔ سورہ کہف میں ہے فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَھَا (۱۸/۷۹) ۔ مینے چاہا کہ اسے عیب دار بنا دوں۔

اَلْعَیْبَۃُ مِنَ الرَّجُلِ ۔ آدمی کے راز کی جگہ ۔ اَلْعِیَابُ ۔ سینے اور قلوب ۔ دھنیے کی وہ لکڑی جسے تانت پر مار کر وہ روئی دھنتا ہے * ۔ (اس سے نکتہ چینی اور عیب جوئی کا مفہوم ابھر کر سامنے آجاتا ہے ۔)

ع ی ر

اَلْعَیْرُ ۔ گدھا ۔ اَلْعِیْرُ ۔ قافلہ ۔ اونٹ جو غذائی سامان لاد کر لاتے ہیں ۔ وہ جانور جن پر غذائی سامان لاد کر لایا جاتا ہے خواہ وہ اونٹ یا گدھے ہوں یا خچر* ۔ سورہ یوسف میں ہے اَیَّتُھَا الْعِیْرُ (۱۲/۷۰) ۔ اے قافلہ والو! ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں ۔ (۱) کسی چیز کا ابھرا اور اوپر کو نکلا ہوا ہونا ۔ اور (۲) آنا جانا ۔ آمدو رفت ۔ اَلْعَیْرُ ابھری ہوئی ہڈی کو کہتے ہیں ۔ مثلاً شانے کے وسط کی ہڈی ۔ پاؤں کے پشت پر ابھری ہوئی ہڈی ۔ اسی سے بوجھ لادنے والے جانوروں کو اس لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ اور آمد و رفت کی جہت سے قافلہ کو۔

عیسیٰ (علیہ السلام)

عیسیٰ ۔ جوہری کا خیال ہے کہ یہ عبرانی یا سریانی لفظ ہے ۔ لیث کا خیال ہے کہ یہ ایشوع سے معدول ہے * ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ عَیْسٌ کی

---

* تاج ۔

بگڑی ہوئی شکل ہو۔ راغب کا خیال ہے کہ اگر یہ لفظ عربی الاصل ہے تو ہوسکتا ہے کہ یہ اَلْعِیْسُ سے ماخوذ ہو جس کے معنی ایسے سفید اونٹ ہیں جنکی سفیدی میں قدرے سیاہی کی آمیزش ہو**۔ لیکن تاج نے کہا ہے کہ جنکی سفیدی میں قدرے بھورا پن ملا ہوا ہو*۔ قرآن کریم میں یہ لفظ حضرت مسیحؑ کے نام کے لئے آیا ہے (۳/۵۲)۔ دوسرے مقام پر آپ کو اَلْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ (۳/۴۴) بھی کہا گیا ہے۔ آپ انبیائے بنی اسرائیل کے سلسلۃ الذھب کی آخری کڑی ہیں۔ جب قوم بنی اسرائیل کے انفرادی اور اجتماعی جرائم اپنی انتہا تک پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان میں بطور اتمام حجت، حضرت عیسیٰؑ کو مبعوث کیا۔ آپ نے انہیں اس آسمانی انقلاب کیطرف دعوت دی جو حضرت نوحؑ سے لیکر آخر تک تمام انبیائے کرام پیش کرتے چلے آرہے تھے۔ یعنی ملوکیت۔ پیشوائیت۔ سرمایہ داری کی لعنتوں کو مٹا کر معاشرہ کو قوانین خداوندی کے مطابق متشکل کرنے کے لئے۔ ظاہر ہے کہ یہ دعوت (مفاد پرست اور غلط ہیں) یہودی پیشواؤں کے بھی خلاف جاتی تھی اور رومی سلطنت کے بھی خلاف۔ چنانچہ انہوں نے ملکر سازش کی اور چاہا کہ حضرت عیسیٰؑ کو جرم بغاوت میں صلیب کی سزا دے دی جائے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس تدبیر کو ناکام کر دیا اور حضرت عیسیٰؑ ان کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے پہلے ہی ہجرت کرکے کسی اور مقام کی طرف تشریف لے گئے۔

جب یہودی اپنی اس تدبیر میں ناکام رہ گئے تو انہوں نے دوسری چال چلی۔ پال ایک متشدد یہودی تھا۔ اس نے مذہب عیسوی اختیار کیا اور رفتہ رفتہ سینٹ کے درجے پر پہنچ گیا ***۔ اس کے بعد اس نے بتدریج اس دین کے بجائے جو حضرت عیسیٰؑ نے پیش کیا تھا ایک نیا مذہب پیش کر دیا جس میں ابنیت مسیح۔ الوہیت مسیح۔ کفارہ کا عقیدہ۔ خانقاہیت کا مسلک، عیسائیت کے بنیادی عناصر قرار پا گئے۔ قرآن کریم نے آکر ایکطرف ان اتہامات اور الزامات کی تردید کی جو یہودی حضرت مریمؑ اور حضرت مسیحؑ کی طرف منسوب کرتے تھے اور دوسری طرف ان تمام باطل عقائد کی تکذیب کی جنہیں سینٹ پال (اور اس کے متبعین نے وضع کرکے) عیسائیت کا نقاب اڑھا رکھا تھا۔ تاریخی حقائق سے جوں جوں پردے اٹھتے جاتے ہیں ****یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی رہی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی زندگی اور تعلیم کے متعلق جو کچھ یہودی

---

* تاج۔ ** راغب۔ ***عیسائیت میں سینٹ مرنے کے بعد بنتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ سینٹ بنتا وہی ہے جو اپنی زندگی میں اس مقام تک پہنچ چکا ہو۔

**** حال ہی میں، بحر میت کے قریب غاروں سے جو قدیم دستاویزیں ملی ہیں وہ بھی اصلی حقیقت پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔

اور عیسائی مانتے چلے آرہے تھے (اور اب بھی مان رہے ہیں) وہ غلط ہے اور صحیح پوزیشن وہی ہے جسے قرآن کریم نے پیش کیا ہے (تفصیل ان تمام امور کی میری کتاب ''شعلۂ مستور'' میں ملیگی)۔

ع ی ش

عَاشَ ۔ یَعِیْشُ ۔ عَیْشًا ۔ مَعَاشًا ۔ مَعِیْشَۃً ۔ اس نے زندگی گزاردی ۔ اَلْعَیْشُ ۔ زندگی ۔ زندگی گزارنا ۔ چونکہ روٹی کے بغیر زندگی نہیں گزاری جاسکتی اسلئے آجکل اَلْعَیْشُ روٹی کو بھی کہتے ہیں ۔ اَلْمَعِیْشَۃُ ۔ کھانے پینے کی وہ تمام چیزیں جن پر زندگی بسر کیجاتی ہے ۔ سامان زیست*۔ (جمع مَعَایِشُ) قرآن کریم میں اَرْضٌ کے متعلق ہے وَ جَعَلْنَا لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ (۲۰ و ۲۰/۱۵) اس میں تمہارے لئے سامان زندگی پیدا کیا ۔ لہذا ہمارے دور میں جن چیزوں کو وسائل پیداوار (Means of Production) کہتے ہیں وہ سب اَرْضٌ کے اندر آجاتی ہیں ۔ (دیکھئے عنوان ارض) ۔ اَلْمَعَاشُ ۔ اسباب زندگی کے تلاش کرنے کا موقع* ۔ وَ جَعَلْنَا النَّھَارَ مَعَاشًا (۷۸/۱۱) ۔ عِیْشَۃٌ ۔ زندگی ۔ طریقۂ بود و ماند ۔ فَھُوَ فِیْ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ (۱۰۱/۷) ۔ تو اس کا طریق زندگی قوانین خداوندی سے ہم آہنگ ہے ۔ یا ایسا ہے جس سے وہ خوش ہے ۔

سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ آدم جس جنت میں تھا اس میں سامان زیست (روٹی ۔ کپڑا ۔ مکان وغیرہ) بڑی فراوانی سے ملتا تھا اور اسکے لئے اسے جگرپاش مشقتوں سے نہیں گزرنا پڑتا تھا (۲۰/۱۱۸ تا ۱۱۷) ۔ یہ انسان کی قدیمی زندگی تھی جس میں افراد کے باہمی مفاد میں تصادم نہیں ہوتا تھا ۔ اس کے بعد اس نے تمدن و معاشرت کی زندگی شروع کردی جس میں سامان زیست کے حصول کے لئے باہمی مقابلہ شروع ہوگیا اور انسان مشقتوں میں پڑگیا ۔ اس کا علاج یہ بتایا گیا کہ جو ضابطۂ قوانین خدا کی طرف سے ملے اس کا اتباع کرو ۔ اس سے رزق کی فراوانی ہو جائیگی (۲۰/۱۲۳) اس کے بعد ہے وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا (۲۰/۱۲۴) ۔ اور جو قوم ہمارے اس ضابطۂ قوانین سے اعراض برتیگی تو اس کی معیشت تنگ ہو جائیگی ۔ وَ نَحْشُرُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَعْمٰی (۲۰/۱۲۴) ۔ اور ہم اسے قیامت میں بھی اندھا اٹھائینگے ۔

کسقدر واضح ہے قرآن کریم کا یہ فیصلہ کہ جو قوم خدا کے قانون کے خلاف زندگی بسر کرتی ہے اس کی روزی تنگ ہوجاتی ہے ۔ اسے سامان زندگی کی

*تاج ۔

محتاجی ہوتی ہے ۔ وہ مفلس اور مفلوک الحال ہوجاتی ہے ۔ اور پھر اس کی عاقبت بھی خراب ہو جاتی ہے ۔ لہذا دنیاوی زندگی افلاس اور محتاجی کی گذارنا اور اپنے آپ کو یہ کہکر اطمینان دے لینا کہ ہماری ''روحانی ترقی'' ہورہی ہے قرآن کریم کی رو سے کھلا ہوا فریب ہے ۔ اس دنیا کی خوشگواریاں مومن کی زندگی کی لازمی شرط بلکہ ایمان و عمل کا لازمی نتیجہ ہیں ۔ اور یہاں کی محتاجی اور زبون حالی قرآن کریم کو چھوڑ دینے کی زندہ شہادت ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے انسان کی معاشی زندگی کو اس قدر اہمیت دی ہے اور اس کے لئے مکمل نظام عطا کردیا ہے ۔ یہی وہ نظام ہے جس سے وہ تمام مشکلات حل ہو جاتی ہیں جن میں اس وقت پوری انسانی دنیا گرفتار ہے ۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب ''نظام ربوبیت'' میں ملے گی) ۔ نیز دیکھئے عنوان (ع ۔ م ۔ ی) ۔

ع ی ل

اَلْعَيْلَةُ ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی فاقہ اور حاجت کے ہیں ۔ عَالَ ۔ يَعِيْلُ ۔ محتاج اور ضرورت مند ہو جانا ۔ عَائِلٌ ۔ ضرورت مند ۔ محتاج* ۔ وَ وَجَدَكَ عَائِلاً فَاَغْنٰى (۹۳/۸) ۔ خدا نے تجھے ضرورت مند پایا تو تجھے اتنا دیا کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا ۔ اَلْعَيْلَةُ ۔ محتاجی ۔ تنگ دستی (۹/۲۸) ۔ اَلْعَالَةُ ۔ فاقہ ۔ اَلْعِيَالُ (عَيِّلٌ کی جمع ہے) ۔ وہ لوگ جن کی کفالت کی جائے ۔ جن کا خرچ اٹھایا جائے* ۔

ع ی ن

عَيْنٌ کے بہت سے معنی آتے ہیں ۔ سو سے بھی اوپر ۔ اسکے اصلی معنی آنکھ کے ہیں ۔ باقی سب اس سے مستعار ہیں * ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ آنکھ ۔ چشمہ ۔ جاری پانی کیلئے اور مَعِيْنٌ ۔ سرسبز و شاداب (زمین) کے معنوں میں آیا ہے ۔ مثلاً عَيْنًا (۲/۶۰) بمعنی چشمہ ۔ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ (۲۱/۶۱) لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ۔ انکے روبرو ۔ سورہ المومنون میں ہے ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ (۲۳/۵۰) ۔ ہموار اور سرسبز و شاداب زمین ۔ سورہ کہف میں ہے تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ (۱۸/۸۶) یعنی جھیل یا سمندر میں ۔ كَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ (۳۷/۴۵) کے معنی ہیں جاری پانی سے لبریز پیالہ ۔ [مَعِيْنٌ کو اہل لغت عَيْنٌ سے بھی بتاتے ہیں

*تاج ۔

اور مَعْنٌ سے بھی ۔ اس لئے اسے م ۔ ع ۔ ن کے تحت بھی لکھ دیا گیا ہے ۔ مَاعُوْنَ کے لئے دیکھئے عنوان م ۔ ع ۔ ن ۔]

اَعْیَنُ کے معنی ہیں وہ مرد جس کی آنکھ جنگلی گائے کی آنکھ جیسی ہو* ۔ عربوں کے ہاں ایسی آنکھ بڑی خوبصورت سمجھی جاتی تھی اسکی جمع عِیْنٌ ہے ۔ یہ لفظ (۳۷/۴۸) میں آیا ہے ۔ نیز (۴۴/۵۴) میں حُوْرٍ عِیْنٍ آیا ہے ۔ (اسکے معنی کیلئے عنوان ح ۔ و ۔ ر دیکھئے) ۔ عِیْنٌ ۔ اَعْیَنُ کی بھی جمع ہے جو مذکر کے لئے بولا جاتا ہے اور عَیْنَاءُ کی بھی جو مؤنث کے لئے آتا ہے ۔ اسی طرح حُوْرٌ بھی مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے آتا ہے ۔

ع ی ی

عَیَّ الرَّجُلُ بِالْاَمْرِ ۔ آدمی کسی کام کو نہ کر سکا اور اسکے کرنے سے عاجز رہا ۔ عَیِیَ عَنْ حُجَّتِہٖ ۔ وہ اپنی دلیل و حجت پیش کرنے سے عاجز رہا یا اسے پختگی سے پیش نہ کر سکا ۔ اَعْیَا عَلَیْہِ الْاَمْرُ ۔ وہ کام اسپر دشوار ہو گیا ۔ اَعْیَا الْمَاشِیْ ۔ چلنے والا تھک گیا * ۔ اَلْاِعْیَاءُ ۔ کمزوری اور تکان جو چلنے سے پیدا ہو جائے ** ۔ سورہ احقاف میں ہے لَمْ یَعْیَ بِخَلْقِھِنَّ (۴۶/۳۳) اللہ (کائنات کی) تخلیق کے بعد تھک نہیں گیا یا اسکے بنانے سے عاجز نہیں رہا ۔ سورہ قؔ میں ہے اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ (۵۰/۱۵) ۔ کیا ہم پہلی تخلیق سے تھک گئے یا عاجز رہے (جو یہ لوگ خلق جدید کے متعلق شبہ میں ہیں) ۔ اس میں ضمناً بائبل کے اس تصور کی بھی تردید کر دی گئی جس کی رو سے اس میں کہا گیا ہے کہ خدا نے چھ روز میں زمین اور آسمان پیدا کئے اور ساتویں دن تھک کر آرام کیا ۔ (اسے یوم سبت کہا جاتا ہے جس میں یہودی کام کاج نہیں کرتے) ۔ خدا تھکتا نہیں ۔ نہ ھی اسے نیند یا اونگھ آتی ہے ۔ (۲/۲۵۵) ۔

---

* تاج ۔ ** راغب ۔

غ

غ ب ر

غَبَرَ الشَّیْءُ ۔ کوئی چیز باقی رہ گئی ۔ ٹھہر گئی ۔ اَلْغَابِرُ مِنَ اللَّیْلِ ۔ رات کا بقیہ ۔ اَلْغَبَرُ وَالْغُبَارُ وَالْغَبَرَۃُ ۔ مٹی ۔ گرد و غبار ۔ اَلْغِبْرُ ۔ کینہ (جو دل میں باقی رہ جاتا ہے) * ۔ دَاهِیَۃُ الْغَبَرِ ۔ باقی رہنے والی آفت جسکے ازالہ کی کوئی شکل نہ ہو سکے * ۔ وہ مصیبت جو گذر جانے کے بعد بھی اپنا اثر چھوڑ جائے ** ۔ سورہ اعراف میں حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق ہے کَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ (۷/۸۳) ۔ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی ۔

سورہ عبس میں ہے عَلَیْهَا غَبَرَۃٌ (۸۰/۴۰) ۔ چہروں پر گرد و غبار پڑا ہوگا ۔ بمقابلہ مُسْفِرَۃٌ ۔ ضَاحِکَۃٌ ۔ مُسْتَبْشِرَۃٌ (۸۰/۳۸-۳۹) ۔ یعنی درخشندہ متبسم اور نوید آمیز چہروں کے مقابلہ میں افسردہ ، غمناک اور حسرت آگیں چہرے ۔

غ ب ن

اَلْغَبْنُ ۔ کسی مشترکہ معاملہ میں اپنے ساتھی کے مفاد یا حقوق میں پوشیدہ طور پر کمی کرنا ۔ اگر یہ کمی مال میں ہو تو غَبَنَ فُلَانًا کہتے ہیں اور اگر یہ کمی رائے وغیرہ میں ہو تو غَبِنَ کہتے ہیں ۔ بعض نے کہا ہے کہ غَبْنٌ کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں اور اَلْغَبَنُ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز چھپائی جائے ** ۔ چنانچہ اَلْمَغَابِنُ بغل اور کنج ران کو کہتے ہیں ۔ غَبَنَہٗ فِی الْبَیْعِ غَبْنًا ۔ اس نے بیع میں اسے دھوکا دیا ۔ یعنی اسے چیز کم یا خراب دیدی * ۔ غَبِنَ رَاْیَہٗ ۔ اسکی ذکاوت اور فطانت کم ہو گئی *** ۔

---

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط ۔

قرآن کریم نے قیامت کو یَوْمُ التَّغَابُنِ (۶۴/۹) کہا ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس دن ظاہر ہو جائیگا کہ لوگوں نے جو معاملہ اپنے خدا کے ساتھ کیا تھا [یعنی اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھوں بیچ کر اسکے بدلے میں جنت لے لی۔ (۹/۱۱۱)] اس میں کس نے کسقدر کمی کی ہے۔ یا اس کے معنی ہیں وہ دن جب چیزیں ان مقادیر (پیمانوں) کے خلاف ظاہر ہونگی جن کے مطابق وہ دنیا میں اندازہ لگا رہے تھے*۔

قرآن کریم نے ظہور نتائج کے وقت کے متعلق کہا ہے کہ ہر شخص کو اپنے اعمال کا وزن معلوم ہو جائیگا اور نظر آجائیگا کہ کامیابی کے معیار تک پہنچنے کے لئے ان میں کسقدر کمی رہ گئی ہے (۱۰۱/۶-۸)۔ اس لئے یَوْمُ التَّغَابُنِ (۶۴/۹) کے معنی ہونگے وہ وقت جب تمام لوگوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں معلوم ہو جائیگا کہ کس میں کسقدر کمی رہ گئی ہے۔ اعمال کے وزن کی کمی درحقیقت ان صلاحیتوں کی کمی ہے جن کے پورا ہونے سے انسان زندگی کی اگلی منزل طے کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ لہذا یَوْمُ التَّغَابُنِ۔ ظہور نتائج کا وقت ہے جب ایک دوسرے کی کمی نمایاں ہو کر سامنے آجائیگی، خواہ وہ اس دنیا میں باطل کی قوتوں سے ٹکراؤ کا وقت ہو اور خواہ اس کے بعد کی زندگی میں انسانی صلاحیتوں کی جانچ کا وقت۔ اس زندگی میں تو قدم قدم پر تَغَابُنٌ کا مرحلہ ہوتا ہے۔

تَغَابُنٌ کے لفظی معنی ہیں باہم غبن کرنا۔ یعنی ایک دوسرے کے حقوق یا مال میں کمی کرنا۔ ایک دوسرے کی تغلیط کرنا۔ ایک دوسرے کو خفیہ طریق سے دھوکا دینا۔ قیامت کے دن (یعنی مرنے کے بعد ظہور نتائج کے وقت) مختلف افراد یا گروہوں کا ایک دوسرے پر الزام دھرنے (ایک دوسرے کو کم عقل بتانے) کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے، اس لئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے اس اعتبار سے یَوْمُ التَّغَابُنِ کہا گیا ہو۔ البتہ وہاں ایک دوسرے کے حقوق میں کمی کرنے یا دھوکا دینے کا موقع نہیں ہوگا۔ اس لئے ان معانی کے اعتبار سے بھی سمجھا جائیگا کہ لوگوں نے ایک دوسرے کو جو دھوکے پہلے دئے تھے ان کے نتائج وہاں سامنے آجائینگے۔

غ ث و

اَلْغُثَاءُ۔ جھاگ اور کوڑا کچرا۔ وہ کوڑا کرکٹ اور بوسیدہ پتے وغیرہ جسے سیلاب بہا کر لائے۔ گندی گلی سڑی چیز کو بھی کہتے ہیں**۔

---

*راغب **تاج و محیط۔

اور خس و خاشاک کو بھی جو کسی کام کا نہ رہے ۔ یہ ہر اس چیز کے لئے ضرب المثل ہے جو کس مپرسی کے عالم میں ضائع اور فنا ہو جائے اور اس کی کوئی پرواہ نہ کی جائے* ۔ قرآن کریم میں اس قوم کے متعلق جو مکافات عمل کی وجہ سے تباہ ہو چکی ہو کہا گیا ہے فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً (۲۳/۴۱) ۔ ہم نے انہیں خس و خاشاک بنا دیا ، اور اسطرح وہ تباہ و برباد ہو کر رہ گئے ، جیسا کہ سورہ الرعد میں ہے کہ سیلاب آتا ہے تو خس و خاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے (۱۳/۱۷)

یہ حالت تو اس قوم کی ہے جو یکسر تباہ ہو جائے ۔ لیکن ایسی قومیں بھی ہوتی ہیں جو دوسروں کی محکوم بنکر زندگی گزارتی ہیں ۔ ان کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے سیلاب کے ساتھ بہنے والا خس و خاشاک کہ وہ بالکل بے دست و پا ہوتا ہے اور اسے جسطرف سیلاب کی موجیں لے جانا چاہیں مجبوراً چلا جاتا ہے ۔

غ د ر

غَدْرٌ ۔ کسی چیز میں خلل واقع کر دینا اور اسے چھوڑ دینا ۔ اَغْدَرَهٗ وَ غَادَرَهٗ ۔ اس نے اسے چھوڑ دیا** ۔ قرآن کریم میں ہے فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا (۱۸/۴۷) ۔ ہم نے ان میں سے کسی کو نہ چھوڑا ۔

اَلْغُدَرُ ۔ بڑا عہد شکن اور بے وفا ۔

اَلْغَدِيْرُ ۔ تالاب یا پانی کا وہ حصہ جسے سیلاب چھوڑ جائے ۔

اَلْغَدْرُ ۔ کسی کا ساتھ چھوڑ دینا ۔ وفا کی ضد ہے ۔ یعنی بے وفائی** ۔ چنانچہ غَدِرَتِ الشَّاةُ کے معنے ہیں بکری دوسری بکریوں سے پیچھے رہ گئی*** ۔

غ د ق

اَلْغَدَقُ ۔ بہت زیادہ ۔ وافر ۔ فراواں**** ۔ ہمہ گیر بارش***** ۔ اَغْدَقَ الْمَطَرُ ۔ بارش بہت برسی ۔ غَدِقَتِ الْاَرْضُ ۔ زمین سرسبز ہو گئی ۔ هُمْ فِیْ غَدَقٍ مِنَ الْعَيْشِ ۔ وہ لوگ آسودگی و خوش حالی کی زندگی بسر کرتے ہیں ۔ انہیں وسعتِ رزق نصیب ہے***** ۔

---

* راغب ۔ ** تاج و راغب ۔ *** ابن فارس ۔ **** راغب نیز ابن فارس ۔

*****تاج نیز کتاب الاشتقاق ۔

قرآن کریم میں ہے لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّاءً غَدَقًا (۷۲/۱۶) - ہم انہیں رزق فراواں عطا کرتے - انہیں سرسبز و شاداب زندگی بسر کراتے -

غ د و

اَلْغُدْوَةُ - صبح سویرے - دن کا ابتدائی حصہ*** - غَدَا عَلَيْهِ غُدُوًّا - اسکے پاس صبح سویرے گیا* - وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ (۳/۱۲۰)-
اَلْغَدُ - کل (آنے والا - فردا) مستقبل کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے -
مَاقَدَّمَتْ لِغَدٍ (۵۹/۱۸) - "اس نے مستقبل کے لئے کیا کچھ آگے بھیجا ہے"-
غَدَاءٌ - دن کا کھانا ، جو صبح جلدی کھایا جائے - (۱۸/۶۳) -

غَدَا - فعل ناقص کے طور پر بھی مستعمل ہوتا ہے جس کے معنی صَارَ کے ہوتے ہیں** - سورۃ اعراف میں غُدُوٌّ (غُدْوَةٌ کی جمع) کے مقابلہ میں اٰصَالٌ آیا ہے (۷/۲۰۵) - اور سورۃ انعام میں غَدٰوةٌ کے مقابلہ میں عَشِيٌّ (۶/۵۲) - یعنی صبح - شام (لفظ غَدٰوةٌ کا واؤ نہیں پڑھا جاتا - نہ ہی اس پر کوئی حرکت ہوتی ہے - اس کا تلفظ غَدَاةٌ ہوگا) - سورۃ سبا میں غُدُوٌّ (مصدر) کے مقابل میں رَوَاحٌ آیا ہے (۳۴/۱۲) - یعنی صبح کا جانا اور شام کا آنا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی زمانہ پر دلالت کرتے ہیں -

غ ر ب

اَلْغَرْبُ - لغت عرب میں اس لفظ کے بہت سے معانی ہیں لیکن ان میں سے - (۱) مغرب (اسی کی طرف نسبت کرتے ہوئے غَرْبِيٌّ کہا جاتا ہے) - (۲) چلے جانا - (۳) علٰحدہ ہو جانا - زیادہ مشہور ہیں* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے کلمات کسی خاص قاعدہ اور قیاس کے ماتحت نہیں ہیں -
غُرُوْبُ الشَّمْسِ - سورج کا غائب ہو جانا - غَرَبَتِ الشَّمْسُ تَغْرُبُ - سورج غروب ہوا - مَغْرِبُ الشَّمْسِ نیز مَغْرِبَانُ الشَّمْسِ و مُغَيْرِبَانُهَا آفتاب غروب ہو جانے کی جگہ یا وقت* - (قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ شرق کے مقابلہ میں آیا ہے اس کے لئے دیکھئے عنوان ش - ر - ق) -

غَرَبَ فُلَانٌ غَرْبَةً و غَرْبًا - وہ شخص وطن سے دور چلا گیا* - اس سے غَرِيْبٌ - مسافر اور اجنبی کو کہتے ہیں اور غُرْبَةٌ مسافری اور اجنبیت کو - اسی سے اردو میں غریب الوطن بولا جاتا ہے - لیکن اردو میں جو

---

*تاج - **محیط - ***راغب -

''غریب'' کے معنی مفلس لئے جاتے ہیں یہ ہمارے ہاں کا اپنا استعمال ہے ۔ عربی میں اس کے معنی مسافر اور اجنبی کے ہونگے ۔

غُرَابٌ کوّے کو کہتے ہیں (۵/۳۱) ۔ اس لئے کہ وہ دور دور تک چلا جاتا ہے** ۔ اور اس کی رنگت کی وجہ سے غِرْبِیْبٌ سیاہ کو کہتے ہیں*۔ قرآن کریم میں ہے غَرَابِیْبُ سُوْدٌ (۳۵/۲۷) ۔ بہت زیادہ سیاہ ۔ کالے بجھنگ۔

سورۃ طٰہٰ میں طُلُوْعِ الشَّمْسِ کے مقابلہ میں غُرُوْبِھَا آیا ہے (۲۰/۱۳۰) ۔

غ ر ر

غَرَّهٗ ۔ یَغُرُّهٗ ۔ اسے فریب دیا اور بے بنیاد امیدیں دلائیں* ۔ چنانچہ اَلْمَغْرُوْرُ اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو کسی عورت سے یہ سمجھ کر شادی کر لے کہ وہ آزاد ہے لیکن بعد میں معلوم ہو کہ وہ تو لونڈی تھی* ۔ اسی سے غَرُوْرٌ ہر اس شخص یا چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان دھوکا کھا جائے یا جو انسان کو فریب میں مبتلا کردے ۔ غَارَتِ النَّاقَةُ کے معنی ہیں اونٹنی کا دودھ کم ہوگیا حالانکہ اس کے متعلق یہ گمان نہ تھا کہ اس کا دودھ کم ہو جائیگا ۔ گویا اونٹنی نے دھوکا دیا** ۔ لہذا اس مادہ میں غلط امیدوں کے ساتھ فریب دینے یا فریب کھا جانے کا مفہوم ہوتا ہے ۔ سورۃ آل عمران میں ہے وَ غَرَّهُمْ (۳/۲۴) ۔ ان کی افتراء پردازی نے انہیں دھوکا دے دیا ۔

سورۃ لقمٰن میں غَرُوْرٌ (۳۱/۳۳) کے معنی دھوکا دینے والا ہیں (ہر وہ چیز جس سے انسان دھوکا کھا جائے) ۔ اور سورۃ بنی اسرائیل میں غُرُوْرًا (۱۷/۶۴) کے معنی ہیں دھوکا ۔ یا دھوکا دیتے ہوئے ۔

سورۃ انفطار میں انسان کے متعلق ہے مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ (۸۲/۶) ۔ اس کے معنی ہیں تجھے اپنے رَبِّ کَرِیْم کے بارے میں کس بات نے دھوکا دے رکھا ہے ۔ مغالطے میں ڈال رکھا ہے ۔ لیکن صاحب محیط نے لکھا ہے کہ مَا غَرَّكَ بِفُلَانٍ کے معنی ہوتے ہیں تو فلاں پر کسطرح جری ہوگیا ۔ اس کے خلاف تجھے یہ جرأت کیسے ہوگئی* ۔ لہذا اس آیت (۸۲/۶) کے یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ تو نے جو خدا کی ربوبیت اعلیٰ کے خلاف اپنے قوانین خود بنا لئے تو تجھے کس بات نے اس قدر جرأت دلادی؟

*تاج ۔ **راغب ۔

اَلْغَرَّۃُ ۔ کپڑے کی تہ کو کہتے ہیں ۔ اَلْغُرَّۃُ ۔ ہر چیز کا بہترین حصہ ۔ سفیدی* ۔ (قرآن کریم میں یہ الفاظ استعمال نہیں ہوئے) ۔

غ ر ف

اَلْغَرْفَۃُ ۔ ایک مرتبہ (چلّو سے) پانی نکالنا ۔ اَلْغِرْفَۃُ ۔ چلّو میں پانی لینے کا انداز یا نوعیت و حالت ۔ اَلْغُرْفَۃُ ۔ (چلّو سے) جو کچھ نکالا جائے ۔ (اسکی جمع اَلْغِرَافُ ہے) ۔ اِغْتَرَفَ الْمَاءَ بِیَدِہٖ (۲۴۹) ۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے پانی نکالا ۔ نَاقَۃٌ غَارِفَۃٌ ۔ تیز رفتار اونٹنی ۔ اَلْغَرَّافُ ۔ ایسی ندی جس میں بکثرت پانی ہو ۔ اَلْغُرْفَۃُ ۔ (جمع غُرَفٌ وَغُرُفَاتٌ) اوپر کا کمرہ ۔ بالا خانہ**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے مختلف معانی کسی قاعدے اور قیاس کے تحت نہیں آتے ۔

سورۂ فرقان میں مومنین کے متعلق ہے اُولٰٓئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَۃَ بِمَا صَبَرُوْا (۲۵/۷۵) ۔ انہیں ان کی استقامت کے بدلہ میں اَلْغُرْفَۃُ دیا جائیگا ۔ اس میں فراوانی اور بلندی سب کچھ آگیا ۔ یعنی بلندیاں ۔ روانیاں ۔ فراوانیاں (نیز ۲۹/۵۸ ; ۳۴/۳۷ ; ۳۹/۲۰) ۔ مصافِ زندگی میں آگے آگے بڑھتے جانا اور ارتقائی منازل کا حسن و خوبی سے طے کرنا ۔ آپ غور کیجئے کہ اس ایک جامع لفظ سے قرآن کریم نے کیا کچھ بیان کردیا ہے ۔ سامانِ زیست کی فراوانیاں ۔ سرفرازیاں ۔ زندگی کی جوئے رواں کا یہاں (دنیا) سے وہاں (آخرت) تک مسلسل آگے بڑھتے، اور سطح زندگی کا بلند ہوتے چلے جانا ۔

غ ر ق

غَرِقَ ۔ یَغْرَقُ ۔ غَرَقًا ۔ پانی میں تہ نشین ہو جانا ۔ بعض نے کہا ہے کہ غَرَقٌ کے اصلی معنی ناک کے راستہ اتنا پانی بھر جانا ہیں جس سے دم گھٹ جائے اور اس طرح انسان مرجائے ۔ لیکن (جیسا کہ ابن فارس نے کہا ہے) اس مادہ کے اصلی معنی کسی چیز میں اس کے آخری حصہ اور انتہا تک پہنچ جانے کے ہیں ۔ مثلاً اَلْغَرِقَۃُ اُس زمین کو کہتے ہیں جو انتہائی سیراب ہو ۔ اَغْرَقَ النَّازِعُ فِی الْقَوْسِ کے معنی ہیں کمان کھینچنے والے نے کمان کو اس کی آخری حد تک کھینچا ۔ اِغْرَاقٌ کہتے ہیں کمان کو پوری طاقت سے آخری حد تک کھینچ دینا ۔ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا (۷۹/۱) ۔ میں غَرْقًا دراصل اِغْرَاقًا کی جگہ استعمال ہوا ہے**۔ یعنی آخری حد تک کھینچتے ہوئے ۔

---

*ابن فارس ۔ **تاج ۔

اَغْرَقَهُ اُسے ڈبو دیا * - سورۃ یونس میں فرعون کے متعلق ہے اِذَا اَدْرَکَهُ الْغَرَقُ (۱۰/۹۰) ''جب اسے غرقابی نے آ لیا'' - یہاں غَرَقٌ کے معنی پانی میں ڈوبنے کے ہیں - ڈبونے کے لئے سورۃ اعراف میں ہے فَاَغْرَقْنٰهُمْ (۷/۱۳۶) - سو ہم نے انہیں غرق کردیا - ڈبوئے ہوئے کو مُغْرَقٌ کہیں گے - اس کی جمع مُغْرَقُوْنَ اور مُغْرَقِیْنَ ہے (۴۴/۲۴)-

غ ر م

اَلْغُرْمِیْ - گراں بار عورت - اَلْغَرَامُ - دائمی شر - سختی اور مصیبت - وہ شدید مصیبت جو انسان کا پیچھا نہ چھوڑے اور اس سے نجات حاصل کرنا مشکل ہو جائے - اَلْغُرْمُ - تاوان - جرمانہ - بیگار کی چٹی جس کا ادا کرنا ضروری ہو - مفت کا جرمانہ - ایسی مصیبت جس سے چھٹکارا نہ ہو - اَلْغَرِیْمُ - مقروض اور قرض خواہ دونوں کے لئے آتا ہے - مقروض تو اس لئے کہ وہ قرض کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہوتا ہے - اور قرض خواہ اس لئے کہ اَلْمُغْرَمُ، اسیرِ محبت کو کہتے ہیں جو محبوب کے پیچھے پیچھے پھرتا رہے**- قرضخواہ کو اسی طرح مقروض کے پیچھے پیچھے پھرنا پڑتا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ساتھ ساتھ لگے رہنے اور چمٹے رہنے کے ہیں-

قرآن کریم میں اَلْغَارِمِیْنَ (۹/۶۰) آیا ہے - اس کے معنی مقروض کے بھی ہو سکتے ہیں اور مصیبت زدہ کے بھی، نیز وہ جس پر تاوان پڑ گیا ہو یا ویسے ہی کوئی نقصان ہوگیا ہو - کیونکہ غَرِمَ فِی التِّجَارَةِ کے معنی ہوئے ہیں تجارت میں نقصان ہؤا - اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر مَغْرَمًا (۹/۹۸) - آیا ہے جس کے معنی مفت کا تاوان یا جرمانہ ہیں - سورۃ واقعہ میں ہے اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ (۵۶/۶۶) - ہم پر مفت میں تاوان پڑ گیا - سورۃ فرقان میں عذاب جہنم کے متعلق ہے اِنَّ عَذَابَهَا کَانَ غَرَامًا (۲۵/۶۵) - اس کا عذاب ایسا ہے جو ہر وقت پیچھے لگا رہے گا - جس سے نجات حاصل کرنا مشکل ہوگا -

غ ر و

غِرَاءٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو دوسری چیز کے ساتھ چمٹا دیا جائے (مثلاً لئی - سریش وغیرہ)***- اسی سے اِغْرَاءٌ کے معنی ہیں کسی کو کسی کے پیچھے لگا دینا - اَغْرَی الْکَلْبَ بِالصَّیْدِ - کتے کو شکار کے پیچھے لگا دیا * - لہٰذا اس کے معنی کسی کے ساتھ یا پیچھے

*تاج - **تاج و محیط - ***راغب -

لگا دینے کے آتے ہیں ۔ سورۃ مائدہ میں ہے فَاَغْرَیْنَا بَیْنَھُمُ الْعَدَاوَۃَ (۵/۱۴)۔ ہم نے ان کے درمیان عداوت کو لازم کردیا ، پیوست کردیا۔ اَغْرَاہُ بِہٖ۔ اسے کسی چیز کا دلدادہ و شیفتہ بنانا ، اس پر ابھارنا اور اکسانا ، شوق دلانا**۔ اسے کسی کے پیچھے لگا دینا ، لپکا دینا *۔ یہ ان تمام معانی کے لئے آئے گا ۔ سورۃ احزاب میں ہے لَنُغْرِیَنَّکَ بِھِمْ (۳۳/۶۰) ۔ ہم تجھے ان کے خلاف اٹھا کھڑا کریں گے ۔ انہیں سزا دینے کے لئے تجھے ان کے پیچھے لگا دیں گے ۔

غ ز ل

غَزْلٌ ۔ روئی وغیرہ کاتنا ۔ غَزْلٌ کاتا ہوا سوت ***۔ قرآن کریم میں ہے نَقَضَتْ غَزْلَھَا (۱۶/۹۲) ۔ جس نے اپنے کاتے ہوئے سوت کے بل کھول دئے ، اسے ادھیڑ دیا ۔ اَلْغَزْلُ ۔ عورتوں سے دلبستگی کی باتیں کرنا ۔ اَلْغَزَالُ ہرنوٹا (یا عرنوٹی یعنی ہرنی کا بچہ) جبکہ وہ حرکت کرنے اور چلنے پھرنے لگے ۔ اَلْغَزَالَۃُ ۔ آفتاب کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی کرنوں کسو (سوت کی طرح) روئے زمین پر بکھیرتا ہے***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ تینوں اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں اور تینوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

سورۃ نحل میں ہے وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَھَا مِنْ بَعْدِ قُوَّۃٍ اَنْکَاثًا (۱۶/۹۲) ۔ دیکھنا ! کہیں تمہاری مثال اس عورت کی سی نہ ہو جائے جو نہایت محنت و مشقت سے سوت کاتتی ہے اور اس کے بعد اسے خود ہی ادھیڑ دیتی ہے ۔ غور کیجئے ، (وحی کے مقابلہ میں) عقل کے تجرباتی طریق کا نقشہ کس حسن و خوبی سے کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے ۔ عقل ایک نظریہ کو لیتی ہے ۔ ساری دنیا میں ڈنکا بج جاتا ہے کہ اس نظریہ میں انسانیت کی مشکلوں کا حل پا لیا گیا ہے ۔ وہ اس پر تجربہ کرتی ہے ۔ اس میں بےانتہا توانائی صرف ہوتی ہے ۔ وقت لگتا ہے ۔ کتنے انسان قربانی دیتے ہیں۔ کتنے مشقتیں اٹھاتے ہیں ۔ اس میں صدیاں لگ جاتی ہیں ۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا ۔ اس پر یہی عقل اپنے کئے کرائے کو خود اپنے ہاتھوں سے برباد کر دیتی ہے اور ایک اور نظریہ پر عمل کرنا شروع کر دیتی ہے ۔ (Trial and Error) کے اسی تجرباتی طریق سے وہ ہزاروں برس میں جا کر کہیں کسی صحیح نتیجہ پر پہنچتی ہے ۔ انسانی ترقی کی ساری تاریخ اسی ''ادھیڑ بن'' کی صبر آزما داستان ہے ۔ اس کے برعکس وحی براہ راست

*تاج ۔ **محیط ۔ ***تاج و محیط ۔

حقیقت کو سامنے لے آتی ہے اور انسان کو ان تمام جانکاہ مراحل سے بچالیتی ہے جن میں سے اسے عقل کے تجرباتی طریق کے ذریعے گذرنا ناگزیر تھا۔ وحی اور عقل میں یہی فرق ہے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

هر دو امیر کاروان ، هر دو به منزلے روان
عقل به حیله می برد۔ عشق برد کشاں کشاں

غ ز و

غَزَاهُ ۔ غَزْوًا ۔ اس کا ارادہ کیا ۔ اس کا قصد کیا ۔ اسے طلب کیا۔ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں ۔ یعنی قصد اور طلب ۔ غَزْوِیْ کَذَا ۔ میرا مقصد اس طرح کا ہے*۔ مَغْزَی الْکَلَامِ ۔ بات کا مقصد اور مطلب*۔ اسکے بعد اس سے مراد دشمن کے خلاف جنگ کے قصد کے ہوگئے۔ غَزَا الْعَدُوَّ ۔ وہ دشمن سے جنگ کرنے کے ارادے سے نکلا*۔

آپ نے دیکھا کہ غَزْوٌ میں مقصد و ارادہ کے ساتھ جنگ کا مفہوم شامل ہے ۔ جماعت مومنین کا قصد اور ارادہ : قوانین خداوندی کے تابع ہوتا ہے اس لئے ان کے غزوات دنیا سے ظلم و استبداد مٹانے کے لئے ہونگے ، نہ کہ کمزوروں کو ستانے اور لوٹنے کی خاطر۔

سورۃ آل عمران میں ہے اَوْ کَانُوْا غُزًّی (۳/۱۵۵) ۔ یا وہ جنگ میں شامل ہوں ۔ جنگ کر رہے ہوں ۔

غ س ق

اَلْغَسَقُ ۔ ابتدائے شب کی تاریکی*۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی سخت تاریکی کے ہیں**۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے تاریکی بتائے ہیں*۔ قرآن کریم میں ہے اِلٰی غَسَقِ اللَّیْلِ (۱۷/۷۸) ۔ یعنی (شروع) رات کی تاریکی تک ۔ اَلْغَاسِقُ ۔ چاند جبکہ وہ گہن لگ کر سیاہ ہو جائے ۔ تاریک رات*۔ قرآن کریم میں ہے مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (۱۱۳/۳) ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے مراد رات کے وقت پیش آنے والی مصیبت یا حادثہ کے ہیں ۔ جیسے طَارِقٌ رات کے وقت آنے والے کو کہتے ہیں**۔ نیز غَسَّاقٌ کے معنی ٹھنڈے کے ہوتے ہیں ۔ چنانچہ رات

* تاج ۔ ** راغب ۔

کو غاسِق* اسی لئے کہتے ھیں کہ وہ دن سے نسبتاً ٹھنڈی ھوتی ھے *۔
غَسّاق*۔ نہایت ٹھنڈی چیز۔ جس کی ٹھنڈ جلا دے۔ چنانچہ سورہ النّبا میں جہنم کے متعلق ھے کہ اس میں حَمِیْماً وَّ غَسَّاقاً (۷۸/۲۵) ھوگا۔ اس میں غَسّاق* کے معنی شدید ٹھنڈے کے ھیں۔ جسکی ٹھنڈ سُن کرکے رکھدے۔ یعنی جہنم میں شدت کی گرمی اور شدت کی ٹھنڈ ھے۔ یہ دونوں نشوو نما کے لئے ھلاکت کا موجب ھوتی ھیں۔ کھیتی کو جسطرح گرمی جھلسا دیتی ھے اسی طرح اسے پالا بھی مار دیتا ھے۔ نشو و نما کے لئے ضروری سامان، اور اس کے استعمال میں تناسب، دونوں لازمی ھوتے ھیں۔ پانی سے کھیتی پروان چڑھتی ھے لیکن یہی پانی جب زیادہ دیدیا جائے تو وہ گل سڑ جاتی ھے۔ ھوا سے درخت لہلہاتے ھیں لیکن جب یہی ھوا جھکڑ بن جائے تو وہ جڑوں سے اکھڑ جاتے ھیں۔ پودوں کی نشو و نما کے لئے حرارت ناگزیر ھے لیکن یہی حرارت جب تیز ھو جائے تو انہیں جھلسا دیتی ھے۔ لہذا جہنم، سامان نشوو نما سے محرومی ھی کا نام نہیں۔ سامان کی فراوانی کے ساتھ اگر صحیح صحیح توازن و تناسب نہ ھو تو اس کا نتیجہ بھی وھی ھوتا ھے، بلکہ اس سے بھی بدتر۔ ھم سامان سے محروم ھیں، مغرب والے اعتدال سے محروم۔ یہاں فالج ھے، وھاں سرسام۔ جہنم بہرحال دونوں جگہ ھے۔ سامان زیست کی فراوانی اور اس کی تقسیم اور استعمال میں صحیح صحیح تناسب، یہ دونوں خدا کے نظام ربوبیت سے حاصل ھو سکتے ھیں۔ اس سے یہ دنیا جنت بنتی ھے۔ جنتِ اُخروی میں بھی یہی کیفیت ھوگی۔

غ س ل

غَسَلَ۔ دھونا، پانی بہا کر کسی چیز کو میل کچیل سے پاک کرنا*۔ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ (۵/۶) اپنے چہروں کو دھوؤ۔ اِغْتَسَلَ۔ غسل کرنا*۔ (۴/۴۳)۔ مُغْتَسَلٌ*۔ وہ جگہ جہاں نہایا جائے یا وہ پانی جس سے نہایا جائے**۔ (۳۸/۴۲)۔

سورہ الحاقہ میں اھل جہنم کے متعلق ھے وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ (۶۹/۳۶)۔ اس کے عام معنی کئے جاتے ھیں، دھوون یا غسالہ۔ یا وہ پانی جس سے زخم دھویا گیا ھو۔ لیکن قاموس میں ھے کہ اس کے معنی ھیں انتہائی گرم***۔ (اس کے مفہوم کے لئے غ۔ س۔ ق کا عنوان بھی دیکھئے)

* تاج۔ ** راغب۔ *** بحوالہ غریب القرآن مرزا ابوالفضل۔

غ ش ی (و)

غَشِيَ کے معنی کسی چیز کو (پوری طرح سے) ڈھانپ لینا یا اس پر (بالکلیہ) چھا جانا ہیں۔ غِشَاوَةٌ اس پردے کو کہتے ہیں جو کسی کو ڈھانپ دے اور اس پر چھا جائے (۲/۷)۔ غَاشِيَةٌ اس جھلی کو کہتے ہیں جو دل پر بطور غلاف چڑھی ہوتی ہے۔ ایسے ہی اس چمڑے کو بھی کہتے ہیں جو تلوار کے نیام پر مڑھ دیا جاتا ہے۔ غُشِيَ عَلَيْهِ۔ اسوقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی بیہوش ہو جائے کیونکہ اسوقت اس کے ہوش و حواس بالکل مستور ہو جاتے ہیں۔ غَشِيَ فُلَانًا کے معنی ہیں وہ شخص فلاں آدمی کے پاس آیا۔ اور غَشِيَهَا اور تَغَشَّاهَا کے معنی عورت سے مجامعت کرنے کے آتے ہیں کیونکہ اس حالت میں مرد اسے ڈھانپ لیتا ہے*۔سورۃ اعراف میں ہے تَغَشَّاهَا (۷/۱۸۹)۔ سورہ نوح میں ہے وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ (۷۱/۷) انہوں نے اپنے دلوں کو ڈھانپ لیا۔ انہیں غلافوں میں بند کر لیا۔

قرآن کریم میں غِشَاوَةٌ (۲/۷) کے معنی پردہ ہیں۔ اور غَشِيَ کے معنی ڈھانپ لینا (۲۰/۷۸)۔ سورہ اعراف میں مِهَادٌ (بچھونے) کے مقابل میں غَوَاشٍ کا لفظ آیا ہے (۷/۴۱) جس کے معنی اوڑھنے کے ہونگے۔ اَلْغَاشِيَةُ (۸۸/۱) ہر طرف سے چھا جانے والی مصیبت۔ یعنی اعمال کے ان نتائج کا ظہور جو انسان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں [جیسے وَاللّٰهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ کہا گیا ہے۔ (۲/۱۹) یعنی خدا کا قانون مکافات کفار کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ یا اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ (۹/۴۹)۔ جہنم کفار کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے]۔

غ ص ب

غَصَبَهُ۔ يَغْصِبُهُ۔ غَصْبًا۔ کسی سے کوئی چیز ظلماً و قہراً چھین لینا۔ اصل میں غَصَبَ الْجِلْدَ کے معنی ہوتے ہیں کھال پر سے بالوں کو یا اون کو نوچ نوچ کر اتارنا**۔ (اسی لئے اس میں نوچنے اور کھسوٹنے کا پہلو ہوتا ہے)۔ غَصَبَ الرَّجُلُ الْمَرْاَةَ۔ مرد نے اس عورت کے ساتھ زبردستی زنا کیا***۔

سورہ کہف میں ہے۔ يَاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا (۱۸/۷۹)۔ وہ (بادشاہ) ہر ایک کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔ انسانوں کے خود ساختہ نظام

* تاج۔ نیز ابن فارس۔ ** تاج۔ *** محیط۔

حکومت میں ہوتا ہی یہ ہے کہ طاقتور، کمزوروں کے وسائل رزق کو زبردستی چھین لیتے ہیں۔ خدا کا نظام اس لئے آتا ہے کہ کمزوروں پر کسی قسم کا ظلم اور استبداد نہ ہونے پائے اور غصب و سلب (Exploitation) کا دور دورہ ختم ہو جائے۔

غ ص ص

اَلْغُصَّةُ۔ کھانے کی چیز کا حلق میں پھنس کر رہ جانا۔ (پینے کی چیز کے اٹک جانے کو شَرَقٌ کہتے ہیں اور ہڈی وغیرہ کے اٹک جانے کو شَجًا۔ لیکن بیشتر یہ فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا*)۔ غصہ کی وجہ سے بھی گلے کے بند ہو جانے کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے**۔ اَغَصَّ فُلَانٌ عَلَیْنَا الْاَرْضَ۔ فلاں آدمی نے ہم پر زمین کو تنگ کر دیا۔ فَغَصَّتْ بِنَا۔ چنانچہ زمین ہم پر تنگ ہو گئی*۔ اَلْغُصَّةُ۔ غم اور فکر کو بھی کہتے ہیں**۔

قرآن کریم میں جہنم کے متعلق ہے وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ (۷۳/۱۳)۔ حلق میں اٹک جانے والا کھانا۔ اس دنیا میں بے عزتی کی روٹی جسے انسان نہ نگل سکے نہ اُگل سکے۔ ناجائز کمائی جس سے شرف انسانیت کا گلا گھٹ جائے، اور اُخروی زندگی میں انسان آگے بڑھنے کے قابل نہ رہے۔ غور کیجئے! وہی رزق جو انسانی نشو و نما کا موجب ہوتا ہے، جب گلے میں اٹک جائے تو انسان کی موت کا باعث بن جاتا ہے۔ انسانی ذات کیلئے رزق حلال اور اکل حرام میں یہی فرق ہے۔

غ ض ب

غَضْبٌ کے معنے شیر ہیں۔ نیز سرخ یا ہر گہرے سرخ رنگ کی چیز*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی شدت و قوت بتائے ہیں۔ غَضَبٌ رِضًا کی ضد ہے۔ بعض نے اس کی تعریف "انتقاماً دل میں خون کا جوش مارنا" کی ہے۔ اللہ کے غضب سے مراد نافرمانی پر اس کی گرفت اور سزا ہے*۔ كِنَايَةٌ غَضِبَتِ الْفَرَسُ عَلَى اللِّجَامِ کے معنے ہیں گھوڑے نے غصے میں آکر اپنی لگام چبائی۔ اسی طرح آگ کے بھڑک اٹھنے پر بھی غَضَبٌ کا اطلاق ہوتا ہے۔ آنکھ کے بالائی پپوٹے پر نکلنے والا پیدائشی دانہ غَضْبَةٌ کہلاتا ہے۔ نیز ایک جلدی بیماری جس میں سارا بدن سرخ

---

* تاج۔ ** محیط۔

ہو جاتا ہے غِضَاب* کہلاتی ہے ۔ مَغْضُوْب* اسے کہتے ہیں جسے چیچک نکل آئے یا مذکورہ بالا بیماری ہو جائے ۔ غُضَاب* اس شخص کو کہتے ہیں جس کی کھال موٹی اور سخت ہو ۔ غَضَابِیٌّ اسے کہتے ہیں جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ تند مزاج اور تلخ کام ہو اور مخالفین کے ساتھ سخت* ۔ اَلْغَضْبَۃُ ۔ سخت چٹان کو کہتے ہیں اور اَلْغَضُوْبُ بڑے سانپ کو (ابن فارس) ۔

قرآن کریم نے غَضَب* کو نِعْمَۃ* کے مقابل میں لا کر (۱/۶) واضح کر دیا ہے کہ خدا کے غضب (یعنی اس کے قانون سے سرکشی اور انکار) کا نتیجہ کیا ہوتا ہے ۔ یعنی نِعْمَت کے ہر پہلو کی ضد ۔ سورۃ بقرہ میں ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْکَنَةُ کے بعد غَضَبٍ مِنَ اللّٰہِ (۲/۶۱) کہکر بتا دیا کہ ''اللہ کے غضب'' کا نتیجہ ذلت اور محتاجی ہوتا ہے ۔ دوسری جگہ اسے عَذَابٌ مُّهِیْنٌ (۲/۹۰) ۔ یعنی رسوا کن عذاب ، سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ سورۃ اعراف میں قوم عاد پر ''اللہ کے غضب'' کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے ۔ وَ قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا (۷/۷۱-۷۲) یعنی ہم نے اس قوم کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جو ہمارے قوانین کی تکذیب کرتی تھی ۔

اس سے واضح ہے کہ ''خدا کے غضب'' کا نتیجہ انفرادی اور اجتماعی تباہی اور بربادی ہے ۔ اس لئے کہ اس سے خدا کے قانونِ مکافات کی بے پناہ قوت کا مظاہرہ ہوتا ہے ۔ اسے سمجھ لینا چاہئے کہ جب خدا کی طرف غَضَب* کی نسبت ہوگی تو اس کا مطلب وہ ہیجانی کیفیت نہیں ہوگی جو انسان پر غصہ کی حالت میں طاری ہوتی ہے ۔ خدا ، انسانی جذبات اور ان کی پیدا کردہ کیفیات سے بہت بلند ہے ۔ اس لئے ''خدا کے غضب'' سے مراد اس کے قانون کی خلاف ورزی کے فطری نتائج ہیں ، جس طرح ''خدا کی خوشنودی'' کا مطلب اس کے قوانین کے مطابق چلنے کے خوشگوار نتائج ہیں ۔

سورۃ اعراف میں غَضْبَانَ آیا ہے (۷/۱۵۰)۔ یعنی غصہ میں بھرا ہوا ۔ پُر جوش ۔ اور سورۃ انبیاء میں مُغَاضِبًا آیا ہے (۲۱/۸۷) ۔ یعنی ناراض ہو کر ۔ لیکن یہ دونوں لفظ خدا کے متعلق نہیں ۔ پہلا حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے اور دوسرا حضرت یونسؑ کے متعلق ۔

---

*تاج ۔

غ ض ض

الغَضّ کے معنے ہیں کمی کرنا ، خواہ آنکھوں سے دیکھنے میں ہو ، خواہ آواز میں یا کسی برتن کی چیز میں* ۔ غَضَّ مِنْهُ یَغُضُّ ۔ اس نے اس میں سے کم کر دیا ۔ غَضَّ الْغُصْنَ ۔ اس نے شاخ کو توڑ دیا ۔ لیکن یہ اس طرح توڑنے کو کہتے ہیں کہ وہ اچھی طرح سے نہ ٹوٹے ۔ لہذا اس کے بنیادی معنوں میں جھکانا اور کم کرنا ہیں ۔ اَلْغَضِیْضُ مِنَ الطَّرْفِ ۔ وہ نگاہ جس میں پلکیں جھکی رہیں ۔ اَلْغَضُّ ۔ ایسی تر و تازہ چیز جس پر ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو ۔ اِنْغِضَاضُ الطَّرْفِ ۔ آنکھوں کا بند ہوجانا** ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی روکنا اور کم کرنا لکھے ہیں ، نیز تازگی و طراوت ۔

قرآن کریم میں یہ مادہ اَبْصَار کے لئے (۲۴/۳۰) میں آیا ہے جہاں اس کے معنے نگاہوں کو نیچا رکھنے ، یا آنکھ کو ان چیزوں کے دیکھنے سے روکنے کے ہیں جن کا دیکھنا اس کے لئے جائز نہیں*** ۔ اور صَوْت کے لئے (۳۱/۱۹) میں ۔ یعنی آواز کا پست رکھنا ۔ دونوں میں سرکشی اور بے باکی کے مقابلہ میں شرافت کے جھکاؤ کا پہلو ہے ۔ جھکانا ، کم کرنا ، سمیٹ کر رکھنا ، بے باک نہ ہونے دینا ، نگاہوں کو بھی اور آواز کو بھی ۔ یہ ہوگا قرآنی معاشرہ میں عورتوں اور مردوں کا انداز ۔ نہ چلنے پھرنے میں ان کی نگاہیں بیباک اور آوارہ ہونگی ، نہ بات چیت کرنے میں ان کی آواز اعتدال سے اونچی ہوگی ۔

غ ط ش

غَطَشَ ۔ یَغْطِشُ ۔ تاریک ہوا ۔ اَغْطَشَ یُغْطِشُ ۔ تاریک کیا ۔ لَیْلٌ غَاطِشٌ ۔ اندھیری رات ۔ فَلَاۃٌ غَطْشَاءُ ۔ ایسا صحرا جس میں راستہ نہ ملتا ہو ۔ اَلْغَطَشُ فِی الْعَیْنِ ۔ آنکھ کا چندھیا پن ۔ ایسے چندھے آدمی کو اَغْطَشُ کہتے ہیں**** ۔

قرآن کریم میں ہے اَغْطَشَ لَیْلَهَا (۷۹/۲۸) ۔ اس کی رات کو اس نے تاریک کر دیا ۔

غ ط و (ی)

اَلْغِطَاءُ ۔ وہ چیز جس کے ذریعے دوسری چیز کو ڈھانپ دیا جائے ۔ ڈھکنا ۔ راغب نے کہا ہے کہ غِطَاءٌ ۔ طباق وغیرہ کی قسم کی چیز کو

*راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔ ****تاج و راغب ۔

کہتے ہیں جو بطور ڈھکنے کے کام میں لائی جائے اور غِشَاءٌ، لباس کی قسم کی چیز کو کہتے ہیں جسے کسی دوسری چیز کے اوپر ڈال دیا جائے ۔ مصباح میں ہے کہ غِطَاءٌ پردے کو کہتے ہیں ۔ اَلْغِطَایَۃُ ۔ وہ اندرونی لباس (مثلاً بنیان وغیرہ) جس سے عورتیں اپنے جسم کو ڈھانپ کر ان کے اوپر دوسرے کپڑے پہنتی ہیں ۔ جوہری نے کہا ہے کہ جو چیز بلند ہو اور کسی دوسری چیز سے لمبائی میں اوپر آ جائے تو اس کے لئے غَطَا عَلَیْہِ کہتے ہیں ۔ اسی سے غَطَتِ الشَّجَرَۃُ کے معنے ہیں درخت کی شاخیں لمبی ہوگئیں اور زمین پر پھیل گئیں ۔ غَطَی اللَّیْلُ ۔ رات تاریک ہوگئی* ۔ قرآن کریم میں لفظ غِطَاء، پردے (جہالت) کے لئے آیا ہے ۔ کَانَتْ اَعْیُنُھُمْ فِیْ غِطَاءٍ عَنْ ذِکْرِیْ (۱۸/۱۰۱) ۔ ان کی آنکھیں میرے قوانین کیطرف سے پردے (تاریکی) میں تھیں ۔ یعنی اس کی طرف سے ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے تھے ۔ عَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ (۲/۷) ۔ ''ان کی آنکھوں پر پردہ ہے''

غ ف ر

غَفْرٌ ۔ صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے معنی کسی کو ایسی چیز پہنا دینا ہے جس سے وہ غلاظت وغیرہ سے محفوظ رہے** ۔ لہذا اس میں چھپانے اور محفوظ رکھنے کا مفہوم شامل ہوتا ہے ۔ غَفْرٌ ۔ چھپانا، پردہ ڈالنا ۔ غَفَرَ الْمَتَاعَ فِی الْوِعَاءِ ۔ سامان کو کسی برتن میں ڈال کر چھپا دینا*** (اور اسطرح اسکی حفاظت کر دینا) ۔ المِغْفَرُ وَالْغِفَارَۃُ ۔ زرہ کی طرح آہنی حلقوں سے بنی ہوئی جالی جو خود کے نیچے پہنی جاتی ہے اور جو گردن اور مونڈھوں کو ڈھانپ لیتی ہے تاکہ ان پر تلوار وغیرہ کا اثر نہ ہو اور اس کا پہننے والا حملہ آور کے وار سے محفوظ رہے ۔ اَلْغِفَارَۃُ ۔ ایک پٹی سی ہوتی ہے جسے عورتیں اسلئے سر پر باندھ لیتی ہیں کہ ان کی اوڑھنی تیل سے محفوظ رہے ۔ اس کے اوپر اَلْخِمَارُ (چادر) اوڑھتی ہیں ۔ اَلْجَمَّاءُ الْغَفِیْرُ ۔ وہ خَوْد جو سارے سر کو اپنے اندر لے لے اور اسطرح اسکی حفاظت کر دے*** ۔ اَلْغَفْرُ ۔ وَالْغُفْرَانُ ۔ ایک ہی معنی میں آتے ہیں (ابن فارس)

اس سے مَغْفِرَۃٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنی حفاظت ۔ جب کوئی قوم غلط روش اختیار کرتی ہے تو اس روش کے مضر اثرات مرتب

*تاج و راغب و محیط ۔ **محیط ۔ ***تاج ۔

ہونے شروع ہو جاتے ہیں ۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اثرات اس حد تک آگے بڑھ جائیں کہ ان کی ہلاکت یقینی ہو جائے ، اگر وہ قوم اس غلط روش کو چھوڑ کر قانون خداوندی کے مطابق صحیح روش اختیار کر لیتی ہے تو اس سے اس پر دوہرے اثرات مرتب ہونے شروع ہو جاتے ہیں ۔ ایک تو اسکی سابقہ روش کے مضر اثرات سے اس کی حفاظت ہو جاتی ہے اور دوسرے اسے زندگی کے خوشگوار نتائج ملنے شروع ہو جاتے ہیں ۔ ان نتائج کے استحکام کے لئے بھی حفاظتی پہلو کا ساتھ ساتھ رہنا نہایت ضروری ہوتا ہے ۔ یوں سمجھئے جیسے مرض کے علاج کے لئے پہلے حفاظتی تدابیر (Preventives) اور اس کے بعد اصلاحی تدابیر (Curatives) اختیار کی جاتی ہیں ۔ اسی طرح تندرست انسان کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے کہ وہ صحت کو خراب کرنے والے مضر عناصر سے محفوظ رہے اور اسے ایسی غذا ملتی رہے جس سے اسکی نشو و نما ہوتی چلی جائے ۔ لہذا ۔

(۱) اگر غلط روش پر چلنے والی قوم کسی مقام پر پہنچکر اپنے اصلاح حال کی فکر کرکے قانون خداوندی کی طرف رجوع کرتی ہے (جسے تَوْبَةٌ کہتے ہیں ۔ دیکھئے عنوان ت ۔ و ۔ ب) تو اس سے اس کے اندر ایسی توانائی پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے جس سے وہ اپنی سابقہ غلط روش کے مضر اثرات سے محفوظ ہو جاتی ہے ۔ یہ اسکی مَغْفِرَةٌ ہے ۔ اور

(۲) قانون خداوندی کے مطابق چلنے والی قوم ان تخریبی قوتوں کی مذموم کوششوں سے محفوظ رہتی ہے جو اس کی تباہی و بربادی کی تدابیر کرتی رہتی ہیں ۔ یہ ان کی مَغْفِرَةٌ ہے ۔ اور

(۳) قوانین خداوندی کے اتباع سے اپنی ذات کے اندر ایسی صلاحیت پیدا کرتے رہنا جس سے انسان تخریبی عناصر کے مضر اثرات سے محفوظ رہے ، اور اجتماعی طور پر ملت اور اس کے نظام کے استحکام کے لئے سامان حفاظت بہم پہنچاتے رہنا ، اِسْتِغْفَارٌ (مَغْفِرَت طلب کرنا) ہے ۔ چنانچہ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اَلْاِسْتِغْفَارُ کے معنی ہیں قول اور عمل سے کسی فساد انگیز بات کی اصلاح کی خواہش کرنا ۔ حفاظت چاہنا ۔ اور مَغْفِرَةٌ کے معنی ہیں بندہ کی لغزشوں سے تجاوز کرکے اس سزا سے اسکو بچا لینا جس کا وہ مستحق ہو چکا ہو* ۔ اور (تاج العروس میں ہے کہ) غَفَرَ الْاَمْرَ بِغُفْرَتِہٖ کے معنی ہیں اس نے اس معاملہ کو اسطرح درست کر دیا جسطرح اسے درست کرنا چاہئے تھا** ۔

---

* محیط ۔ ** تاج ۔

ہمارے ہاں مَغْفِرَةٌ کے معنی لئے جاتے ہیں "خدا کا بندے کے گناہوں کو بخش دینا" (اللہ مغفرت کرے۔" یا "خدا بخشے" ۔ ہم روز بولتے ہیں)۔ "بخشش" کا تصور قرآن کریم کے پیش کردہ قانون مکافاتِ عمل کے خلاف ہے ۔ قانون مکافات کی رو سے انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے ۔ غلط عمل مضر نتائج پیدا کرتے ہیں اور صحیح عمل خوشگوار نتائج ۔ غلط اعمال کے مضر نتائج کا "بخش دینا" بے معنی سی بات ہے ۔ "بخشش" کا یہ تصور ملوکیت کی فضا کا پیدا کردہ ہے جس میں بادشاہ خوش ہو کر مجرموں کے گناہ بخش دیا کرتا تھا ۔ قرآن کریم کی رو سے "جنت" انسانی اعمال کا فطری نتیجہ ہے ۔ یہ کسی سے "بخشش" کے طور پر نہیں مل سکتی ۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ حسنِ عمل سے انسان کے اندر وہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ تخریبی قوتوں کے مضر اثرات سے محفوظ رہتا ہے ۔ یہ ہے مَغْفِرَت کا قرآنی مفہوم ۔ ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ جو شخص کمزور ہو جاتا ہے اس پر ہر بیماری فوراً حملہ کر دیتی ہے ۔ اس میں قوت مدافعت باقی نہیں رہتی ۔ وہ جراثیم کا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اس میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ وہ ان جراثیم کا مقابلہ کر سکے ۔ اس قسم کی طاقت کا اپنے اندر پیدا کر لینا اِسْتِغْفَارٌ ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ چیز تسبیح کے دانوں پر اَسْتَغْفِرُ اللہ ۔ اَسْتَغْفِرُ اللہ کے الفاظ دہرانے سے حاصل نہیں ہو سکتی ۔ یہ ایسے کام کرنے سے حاصل ہوسکتی ہے جس سے انسانی صلاحیتوں میں نشوونما پیدا ہو جائے ۔ خدا غَفُوْرٌ ہے ۔ یعنی اس کے قانون پر عمل پیرا ہونے سے اس قسم کی قوتِ مدافعت اور سامان حفاظت مل جاتا ہے ۔ اور مومنین کا شیوہ اِسْتِغْفَارٌ ہے ۔ یعنی اس قسم کی قوت اور حفاظت کا طلب کرتے رہنا ۔ اس کے لئے جدو جہد کرتے رہنا ۔ لہذا قرآن کریم میں مَغْفِرَةٌ (۲/۲۲۱) اور غُفْرَانٌ (۲/۲۸۵) کے معنی ہونگے حفاظت اور پناہ ۔ غَافِرٌ (۴۰/۳) غَفُوْرٌ (۳۵/۳۰) اور غَفَّارٌ (۲۰/۸۲) کے معنی ہونگے حفاظت دینے والا ۔ محفوظ رکھنے والا ، اس فرق کے ساتھ کہ غَافِرٌ اسم فاعل ہے اور غَفُوْرٌ وَ غَفَّارٌ اسم مبالغہ ۔ اِسْتِغْفَارٌ (۳/۱۷) کے معنی ہونگے حفاظت طلب کرنا ۔

جیسا کہ (ع ۔ ف ۔ و) کے عنوان میں بتایا جاچکا ہے ، عَفْوٌ کے معنی ہیں سزا کے بعد اس کے اثرات کو مٹا دینا ۔ لیکن مَغْفِرَةٌ کے معنی ہیں شروع ہی سے ان اثرات سے محفوظ رکھنا ۔ اسی لئے قرآن کریم میں مَغْفِرَةٌ ۔ عَذَابٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۲/۱۷۵ ؛ ۳/۱۲۸) ۔ سورہ بقرہ میں مَغْفِرَةٌ بمقابلہ فَقْرٌ آیا ہے (۲/۲۶۸) ۔ یعنی احتیاج و افلاس سے محفوظ رکھنا

غ ف ل

غَفَلَهٗ' تَغْفِیْلاً - اس کو ڈھانپ دیا - چھپا دیا - اس پر پردہ ڈال دیا* - یہ اسکے بنیادی معنی ھیں - اَغْفَلَهٗ' - اس کو غافل کیا - قرآن کریم میں ھے لَقَدْ کُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ ھٰذَا فَکَشَفْنَا عَنْکَ غِطَآءَکَ (۵۰/۲۲) - تم اس سے '' غافل '' تھے سو ھم نے تمھارے پردوں کو اٹھا دیا - غَفْلَةٌ - کسی چیز کو چھوڑ دینا اور اسکو بھول جانا - راغب نے کہا ھے کہ غفلت اس سہو کو کہتے ھیں جو قلت احتیاط و تحفظ کی بناء پر ھوتا ھے* - دراصل اس کا مطلب کسی چیز کے متعلق (یا کسی کی طرف سے) لاپرواہ (Un-mindful) ھو جانا ھے - چنانچہ اَلْغَفُوْلُ اس اونٹنی کو کہتے ھیں کہ جو بچہ چاھے اس کا دودھ پی جائے اور جو آدمی چاھے اس کا دودھ دوہ کر لے جائے اور وہ اس کا کچھ خیال نہ کرے* - اَلْغُفْلُ وہ شخص جس سے نہ بھلائی کی امید ھو نہ شر کا اندیشہ - وہ تیر جس پر کوئی نشان نہ ھو (جوئے میں ایسے تیر کا کوئی حصہ نہیں ھوتا تھا - یعنی نہ اس سے کوئی فائدہ ھوتا تھا نہ نقصان) - وہ راستہ جس پر نشان راہ نہ ھوں - وہ زمین جس پر کوئی آبادی نہ ھو - وہ مویشی جس پر شناخت کا نشان نہ ھو - وہ شخص جس کا حسب نہ ھو - وہ شعر جس کا کہنے والا معلوم نہ ھو* - ان معانی سے اس لفظ کا اصل مفہوم سامنے آجاتا ھے - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے معنی بھول کر کسی چیز کو چھوڑ دینے کے ھیں ، اور کبھی کبھی یہ عمداً چھوڑ دینے کے لئے بھی بولا جاتا ھے -

لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ بے خبری اور ناواقفیت کے لئے بھی آیا ھے جس میں مذمت کا کوئی پہلو نہیں - مثلاً سورہ یوسف میں ھے کہ ھم تجھے وحی کے ذریعے داستان یوسف بتاتے ھیں وَاِنْ کُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغَافِلِیْنَ (۱۲/۳) - اگرچہ تو اس سے پہلے اس سے باخبر نہ تھا - اسی طرح قرآن کریم میں اکثر مقامات پر ھے - وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲/۷۴) - اللہ تمھارے اعمال سے بے خبر نہیں - سورہ نور میں اَلْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ (۲۴/۲۳) ان باعصمت خواتین کے متعلق آیا ھے جو بدکرداری کی باتوں سے واقف تک نہ ھوں - غَافِلٌ - غَفَلَ سے اسم فاعل ھے -

سورۃ انبیاء میں کفار کے متعلق ھے کہ وہ کہینگے - قَدْ کُنَّا فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ ھٰذَا - (۲۱/۹۷) - ھم اس سے لاپرواہ رھے - یعنی جس بات کو

* تاج -

ھمیں ھر وقت دھیان میں رکھنا چاھئے تھا اسے ھم نے دھیان میں نہ رکھا۔ لغت میں غَفْلَةٌ کے معنی یہ بھی ھیں۔

غ ل ب

غَلَبَةٌ کے اصل معنی ھوتے ھیں کسی کی گردن کے موٹے حصے کو بڑی مضبوطی سے پکڑ لینا *۔ چنانچہ غَلِبَ۔ یَغْلَبُ کے معنی ھیں وہ موٹی، چھوٹی، اور ایکطرف کو جھکی ھوئی گردن والا ھوا۔ نَاقَةٌ غَلْبَاءُ۔ موٹی گردن والی اونٹنی کو کہتے ھیں **۔ اس سے غَلَبَةٌ کے معنی قہر و بالا دستی، کسی پر مستولی اور قابض ھو جانے یا کسی کو شکست دیدینے کے آتے ھیں۔ یہ غَلَبَ کا مصدر ھے۔ سورہ کہف میں ھے۔ اَلَّذِیْنَ غَلَبُوْا عَلٰی اَمْرِھِمْ (۱۸/۲۱)۔ وہ لوگ جنھوں نے انکے معاملہ پر غلبہ پا لیا۔ سورہ روم میں ھے مِنْ بَعْدِ غَلَبِھِمْ (۳۰/۳)۔ اپنے مغلوب ھوجانے کے بعد۔ مَغْلُوْبٌ (۵۴/۱۰)۔ جس پر دوسرا غالب آجائے۔

اَلْغَلْبَاءُ۔ (اسکی جمع غُلْبٌ ھے) گھنا باغیچہ **۔ وَحَدَائِقَ غُلْبًا (۸۰/۳۰) گھنے باغات۔

غ ل ظ

اَلْغِلْظَةُ (غین کی تینوں حرکتوں کے ساتھ اگرچہ کسرہ زیادہ مشہور ھے) موٹاپا۔ سختی۔ شدت۔ اَغْلَظَ الثَّوْبَ۔ اس نے کپڑے کو موٹا پایا *۔ غَلِیْظٌ کے معنی سخت، موٹے کے علاوہ گاڑھا بھی ھیں۔ یعنی ایسی چیز جس کے منتشر اجزاء سمٹ کر کم جگہ میں جمع ھو جائیں اور اسطرح ان کی قوت بڑھ جائے۔ اَلْغَلَظُ۔ سخت اور ناھموار زمین کو کہتے ھیں (یعنی جو پتھریلی تو نہ ھو لیکن اس کے باوجود سخت ھو)۔ یہاں سے اس کے معنی سختی اور درشتی کے ھو گئے *۔ قرآن کریم میں ھے کہ جماعت مومنین کو ایسا طاقتور ھونا چاھئے کہ مخالفین ان میں سختی محسوس کریں۔ وَلْیَجِدُوْا فِیْکُمْ غِلْظَةً (۹/۱۲۳)۔ لیکن ان کے مزاج میں سختی اور بد خلقی نہیں ھونی چاھئے۔ انہیں غَلِیْظَ الْقَلْبِ نہیں ھونا چاھئے (۳/۱۵۸)۔ مخالفین کے مقابلہ میں بہت مضبوط، محکم اور سخت ھونا چاھئے اور ان کی شدت سے روک تھام کرنی چاھئے۔ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ (۹/۷۳)۔ اسی طرح جیسے خدا کے قوانین مکافات اعمال کے نتائج مرتب کرنے میں غِلَاظٌ شِدَادٌ واقع ھوئے ھیں (۶۶/۶)۔

* راغب۔ ** تاج۔

اِسْتَغْلَظَ - کسی چیز کا موٹا اور سخت اور مضبوط ہو جانا (جو بالعموم کسی چیز کے کمال پر پہنچنے سے ہوتا ہے) دراصل یہ فعل گیہوں وغیرہ کے خوشوں میں دانوں کے موٹے ہو کر سخت ہو جانے پر بولا جاتا ہے* - قرآن کریم میں اسلام کے شجرِ طیب کے متعلق ہے - فَاسْتَغْلَظَ (۴۸/۲۹) - وہ مضبوط، سخت اور موٹا ہو گیا -

غ ل ف

اَلْغِلَافُ - محافظ - وہ چیز جو کسی دوسری چیز پر چھائی ہوئی ہو - مثلاً انڈے کا چھلکا - کلی کے اوپر کا سبز خول - (جمع) غُلُفٌ و غُلُفٌ - سَیْفٌ اَغْلَفُ - تلوار جو غلاف میں ہو - اَلْغَلَفُ - کثرت سے سرسبزی * -

قرآن کریم نے یہودیوں کا قول نقل کیا ہے - قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ (۲/۸۸) - یہ اَغْلَفُ کی جمع ہے - یعنی غلافوں میں بند ہیں - راغب نے لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں اس لئے ہم پر قرآن کریم کی باتوں کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا - اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل خود علوم و معارف کے بھرے ہوئے برتن (اور مخزن) ہیں اس لئے ہمیں کسی نئے علم کی ضرورت نہیں - ہم تمہارے علوم سے بے نیاز ہیں ** - مطلب دونوں کا ایک ہی ہے کہ ہم اس نئی دعوت کو درخور اعتناء ہی نہیں سمجھتے - ہمیں اسکی ضرورت ہی نہیں - یعنی بجائے اس کے کہ کسی دعوت یا نظریہ کے رد و قبول کا فیصلہ فکر و بصیرت اور غور و تدبر کے بعد کیا جائے اس کے متعلق بلا دیکھے بھالے کہدینا کہ ہمیں اسکی ضرورت ہی نہیں - ظاہر ہے کہ ایسا طرز عمل علم و بصیرت کی بارگاہ میں کبھی قابل ستائش قرار نہیں پاسکتا - اور قرآن کریم ہے ہی سرتاپا علم و بصیرت -

غ ل ق

اَغْلَقَ الْبَابَ یُغْلِقُهٗ - اس نے دروازہ بند کیا - بَابٌ غَلَقٌ - بند دروازہ *** - سورہ یوسف میں عزیز کی بیوی کے متعلق ہے - وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ (۱۲/۲۳) - راغب نے کہا ہے کہ غَلَّقَ اسوقت بولا جائیگا جب بہت سے دروازوں کو بند کیا گیا ہو - یا ایک ہی دروازہ کو بار بار بند کیا ہو - یا دروازہ کو بڑی مضبوطی سے بند کر دیا ہو *** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز میں پھنس جانا یا اٹک جانا ہیں -

* تاج - ** راغب - *** تاج و راغب -

غ ل ل

غَلَلٌ کے اصلی معنی ھیں کسی چیز کا درمیانی خلاؤں میں چلے جانا ۔ چنانچہ غَلَلٌ اس پانی کو کہتے ھیں جو درختوں کے درمیان سے بہہ رھا ھو۔ اَلْغُلُّ اس چیز کو کہتے ھیں جس کے ذریعہ کسی کو قید کر دیا جائے کیونکہ اس طرح قیدی کے اعضاء اسکے بیچ میں آجاتے ھیں ۔ اسکی جمع اَغْلَالٌ آتی ھے *۔ (۷/۱۵۷)۔ غَلَّ ۔ اسے غُلٌّ کے ذریعہ قید کر دیا *۔ مَغْلُوْلٌ ۔ بندھا ھوا ، مقیّد (۵/۶۴)۔ اَلْغِلُّ ۔ دل میں چھپی ھوئی دشمنی کو کہتے ھیں **۔ (۵۹/۱۰)۔ نیز دھوکا اور فریب (جو چھپا کر کیا جاتا ھے)۔ یعنی اس میں چھپانے کا پہلو غالب ھوتا ھے ۔ چنانچہ کہتے ھیں لَا یَذْھَبُ کَلَامٌ مِنَّا غَلَلًا۔ ھماری بات لوگوں سے مخفی نہیں رھنی چاھئے **۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا درمیان سے گزرنا اور کسی چیز کا جم جانا ھیں ۔ غَلَّ یَغِلُّ کے معنے ھیں کینہ رکھنا اور غَلَّ یَغُلُّ کے معنے ھیں خیانت کرنا *۔

سورہ آل عمران میں ھے وَمَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَغُلَّ (۳/۱۶۰)۔ اس کے معنی عام طور پر یہ کئے جاتے ھیں کہ کسی نبی کے شایان شان نہیں کہ وہ (مال غنیمت میں) خیانت کرے۔ لیکن صاحب المنار نے بعض مفسرین کے حوالہ سے لکھا ھے کہ اس سے مراد غنیمت میں خیانت کرنا نہیں بلکہ وحی میں سے کچھ مخفی رکھنا ھیں ۔ یہاں مفسرین نے غُلُوْلٌ کے معنی کِتْمَانٌ (چھپانے) کے کئے ھیں ۔ مطلب یہ ھے کہ نبی کا کام تبلیغ رسالت ھے ۔ جو وحی اسکی طرف بھیجی جاتی ھے وہ بلا کم و کاست اسے لوگوں تک پہنچا دیتا ھے ۔ اب اگر اس میں کوئی بات ایسی ھے جو کسی کے معتقدات یا مفاد کے خلاف جاتی ھے تو اس میں رسول کا کوئی قصور نہیں ۔ وہ یہ کر ھی نہیں سکتا کہ وحی کا کچھ حصہ چھپا کر رکھ لے اور کچھ حصہ ظاھر کردے۔ وہ وحی کو بہ تمام و کمال ظاھر کردیگا ۔ وہ اس میں کوئی تبدیلی بھی نہیں کر سکتا (۱۰/۱۵)

نبی اکرمؐ کے متعلق ھے یَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلَالَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ (۷/۱۵۷)۔ وہ ان بوجھوں کو اتار دیگا جن کے نیچے نوع انسانی دبی ھوئی چلی آرھی تھی اور ان زنجیروں کو توڑ ڈالیگا جن میں انسانیت جکڑی ھوئی تھی ۔ یعنی وہ نوع انسان کو، جسم اور قلب و دماغ

*راغب ۔ **تاج۔

کی ہر قسم کی غلامی سے آزاد کرکے انہیں فقط قوانین خداوندی کی اطاعت پر لے آئیگا اور اسطرح انہیں صحیح آزادی عطا کر دیگا ۔ کسقدر بلند تھا مقصد بعثتِ نبوی ؐ کا اور کسقدر کامیاب اور حسین تھا وہ طریق جس سے حضور ؐ نے اس بلند مقصد کو پورا کیا ۔ لیکن اس کے بعد مسلمانوں کو دیکھئے کہ انہوں نے ان زنجیروں کے ایک ایک ٹکڑے کو (جنہیں قرآنی نظام نے اس حسن و خوبی سے توڑ کر رکھ دیا تھا) مژگانِ عقیدت سے اکٹھا کیا اور ان اغلال و سلاسل کو انتہائی تعظیم کے ساتھ اپنے گلے میں ڈال لیا ۔ اُس ابتداء کی یہ انتہاء کسقدر عبرت ناک اور تاسف انگیز ہے !

غ ل م

اَلْغُلْمَۃُ ۔ جنسی خواہش کی شدت کو کہتے ہیں ۔ قَدْ غَلِمَ الرَّجُلُ ۔ اسوقت کہتے ہیں جب آدمی جنسی خواہش سے مغلوب ہوجائے ۔ اَغْلَمَ الْبَحْرُ کے معنی ہیں دریا پرجوش ہو گیا اور موجیں مارنے لگا * ۔ اِغْتَلَمَ الشَّرَابُ ۔ شراب تند و تیز ہو گئی ** ۔ اس اعتبار سے اَلْغُلَامُ اس لڑکے کو کہتے ہیں جسکی مسیں بھیگ چکی ہوں *** ۔ لیکن صاحب تاج العروس کے نزدیک پیدائش سے لیکر جوان ہونے تک بچے کو غُلَامٌ ہی کہتے ہیں ۔ نیز کبھی (بڑے بوڑھے اپنے بیٹوں کو خواہ وہ) ادھیڑ عمر کے ہی کیوں نہ ہوں غُلَامٌ کہدیتے ہیں * ۔ صاحب فقہ اللغۃ نے بھی کہا ہے کہ اگرچہ جنین سے لیکر بالغ ہونے تک بچے کے لئے مختلف الفاظ آتے ہیں لیکن بہ ہیثیت مجموعی اسے غُلَامٌ ہی کہتے ہیں ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ محض بیٹے کے معنوں میں بھی آیا ہے ۔ مثلاً ($\frac{3}{39}$) ۔ اور نوجوان کے معنوں میں بھی ($\frac{18}{80}$) ۔ غِلْمَانٌ کا لفظ خدمت گار لڑکوں کے لئے آیا ہے ۔ ($\frac{52}{25}$) ۔ یعنی وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ($\frac{56}{17}$) ۔ ہو سکتا ہے کہ ان سے مراد اہل جنت کے بیٹے ہی ہوں ۔ کیونکہ جنت میں آباء و ازواج و ذریّت بھی تو ساتھ ہونگے بشرطیکہ وہ بھی صالح ہوں ($\frac{13}{23}$) ۔ (جنت کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ج ۔ ن ۔ ن ۔)

غ ل و (ی)

غُلُوٌّ کے اصلی معنی حد سے بڑھ جانے اور تجاوز کرنے کے ہیں ۔ اگر یہ حد سے تجاوز اشیاء کے نرخ میں ہو تو اسے غَلَاءٌ کہتے ہیں ۔ اور

---

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** راغب ۔

قدر و منزلت میں ہو تو غُلُوٌّ ۔ اور تیر میں ہو (یعنی وہ اپنی مقررہ حد سے آگے نکل جائے) تو غَلْوٌ ۔ اَلْمِغْلٰی ۔ اس تیر کو کہتے ہیں جسے کمان کے ذریعہ ہاتھ کو خوب تان کر انتہائی حد سے آگے جانے کے لئے پھینکا جائے*۔ اَلْغَلْوَۃُ ۔ اُس انتہائی حد کو کہتے ہیں جس تک تیر پھینکا جا سکے**۔ اَلْغَلَیَانُ ۔ ہانڈی کے ابال اور جوش کھانے کو کہتے ہیں***۔ سورہ دخان میں ہے یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ کَغَلْیِ الْحَمِیْمِ ($\frac{44}{45-46}$) " وہ پیٹ میں کھولیگا ابلتے ہوئے پانی کے کھولنے کی مانند " (واضح رہے کہ یہ یائی ہے ۔ واوی نہیں۔ بعض علمائے لغت کی طرح ہم نے بھی اسے واوی کے تحت ہی لکھدیا ہے ۔)

اِغْتَلَی الْبَعِیْرُ کے معنی ہیں اونٹ تیز چلا اور اونچا ہو کر چلا حتیٰ کہ وہ رفتار کے حسن کی حد سے گزر گیا*۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب قرآن کریم نے کہا کہ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ ($\frac{4}{171}$) ۔ تو اس کا کیا مطلب ہے ؟ دین سکھاتا یہ ہے کہ انسان اپنی مختلف قوتوں میں کسطرح صحیح توازن و تناسب پیدا کرے اور اسطرح اپنے معاشرہ کو بھی متوازن و متناسب رکھے۔ اسی کو حُسْنٌ کہتے ہیں ۔ کیونکہ حسن نام ہی صحیح تناسب کا ہے (دیکھئے عنوان ح ۔ س ۔ ن) ۔ توازن ، افراط اور تفریط دونوں سے بگڑ جاتا ہے ۔ لہذا دین میں غلو سے اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے ۔ اسی لئے دوسری جگہ کہا ہے کہ وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْ اَسْمَآئِهٖ ($\frac{7}{180}$) ۔ جو لوگ خدا کی صفات میں کسی ایک طرف کو جھک جائیں (یا نکل جائیں) ہیں ان کو چھوڑ دو۔ اس لئے کہ خدا اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کا مالک ہے۔ اس کی تمام صفات میں انتہائی درجہ کا توازن اور حسن ہے ۔ اس لئے ان میں نہ افراط جائز ہے نہ تفریط ۔ غُلُوٌّ خواہ عقائد میں ہو خواہ عمل میں ، حسن کو بگاڑ دیتا ہے ۔ دوسری جگہ آیات خداوندی میں الحاد (ایکطرف نکل جانے) سے روکا گیا ہے ($\frac{41}{40}$) ۔ ہر شے کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا ، ہر بات کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنا ، اور ہر عمل میں حسن پیدا کرنا اور اسے برقرار رکھنا ، یہ ہے اعتدال کی راہ ۔ یہ چیز صرف وحی کی روشنی میں ہو سکتی ہے ۔ اس کے بغیر نہیں ۔

غ م ر

اَلْغَمْرَۃُ ۔ اسکے بنیادی معنی اس چیز کے ہوتے ہیں جو کسی چیز پر چھا جائے اور اسے ڈھانپ لے** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس چھپانے

---

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** راغب ۔

میں قدرے سختی اور شدت کا پہلو ہونا ضروری ہے - عربوں میں قاعدہ تھا کہ جب سفر میں پانی کم رہ جاتا اور اسے رفقائے سفر میں ماپ ماپ کر تقسیم کرنا پڑتا تو ایک پیالے میں چھوٹا سا پتھر رکھدیتے اور اس میں پانی ڈالتے - جتنے پانی سے پتھر ڈوب جاتا اسے ایک حصہ قرار دیتے - اس پانی کو غَمْرَةٌ کہتے تھے** - اور اُس پیالہ کو اَلْغُمَرُ** - اس سے کثیر پانی کو بھی غَمْرٌ کہنے لگے ، اس لئے کہ وہ اپنے اندر جانے والے کو چھپا لیتا ہے اور اس پر چھا جاتا ہے - اسی سے مَوْتٌ اَلْغَمِیْر - ڈوب کر مرنے کو کہتے ہیں** - غَمَرَاتٌ - شدائد اور سختیاں* - ناگواریاں - غَمْرَةُ الشَّیْءِ - کسی چیز کی شدت اور اس کا ہجوم** - قرآن کریم میں غَمَرَاتُ الْمَوْتِ آیا ہے (۶/۹۳) - سورہ مومنون میں ہے - فَذَرْهُمْ فِیْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰی حِیْنٍ (۲۳/۵۴) - جن چیزوں میں یہ لوگ ڈوبے ہوئے ہیں (جن مفاد پرستیوں میں یہ منہمک ہیں) انہیں سردست انہی میں چھوڑ دو - وقت آنے پر سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا - راغب نے کہا ہے کہ یہاں غَمْرَةٌ کے معنی جہالت کے ہیں جو آدمی پر چھا جاتی ہے* -

غ م ز

غَمْزٌ کے معنی ہیں کسی چیز کی عیب جوئی کرتے ہوئے اس کیطرف ہاتھ یا آنکھ سے اشارہ کرنا* - اور غَمَزَ الْکَبْشَ کے معنی ہوتے ہیں اس نے مینڈھے کو ہاتھ سے دبا کر دیکھا کہ اس میں چربی ہے یا نہیں** - صاحب محیط نے غَمْزٌ کے معنی چبھونے ، دبانے اور بھینچنے کے لکھے ہیں*** - اَلتَّغَامُزُ کے معنی ہیں باہم کسی کے کمزور پہلوؤں کیطرف آنکھوں یا ہاتھوں سے اشارہ کرنا ** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز میں دوسری چیز سے ٹھوکے مارنا - اس کے بعد استعارةً کسی کی عیب جوئی کرنے کے لئے استعمال ہونے لگا -

قرآن کریم میں ہے اِذَا مَرُّوْا بِهِمْ یَتَغَامَزُوْنَ (۸۳/۳۰) - جب وہ ان کے پاس سے گزرتے تو ایک دوسرے کو آنکھوں سے اشارہ کرتے - چشمکیں کرتے -

غ م ض

اَلْغَامِضُ - بہت نشیبی زمین - اَغْمَضَ النَّظَرَ - اس نے باریک بینی اور تعمق نظر سے کام لیا ، گہری نظر ڈالی* - جب کوئی شخص عمدہ اور

*راغب - ** تاج - *** محیط -

ٹھیک رائے دے تو اس کے لئے کہتے ھیں قَدْ اَغْمَضَ النَّظَرَ ۔ ابن فارس نے اسکے معنے نشیب اور اندر کو گھس جانا بتائے ھیں ۔ اَلْغُمْضُ ۔ نیند کا جھونکا ۔ بقول ابن فارس ، اتنی مقدار جس میں آنکھیں بند کر لی جائیں ۔ غَمَضَ عَيْنَهٗ وَاَغْمَضَهَا : اس نے اپنی آنکھ بند کی ۔ اسی بناء پر اِغْمَاضٌ کے معنی ڈھیل دینا ، نرمی برتنا ، تغافل و تساھل اور چشم پوشی کے ھو گئے ۔ اور اَلتَّغْمِيْضُ عَنِ الْاِسَاءَةِ ۔ کسی کے برا کرنے پر چشم پوشی کر لینا ۔ الاِغْمَاضُ فِى الْبَيْعِ یعنی خرید و فروخت میں کسی عیب دار یا ردی چیز کو خریدتے وقت یہ مطالبہ کرنا کہ اسکی قیمت کم کر دی جائے کیونکہ اس میں فلاں نقص ھے*۔ ($\frac{۲}{۲۶۷}$) میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ھوا ھے ۔ یعنی انفاق فی سبیل اللہ میں ایسی ردی چیزیں نہ دو کہ جنہیں تم خود بھی لینا پسند نہ کرو اور اگر کہیں لینی بھی پڑ جائیں تو ان کے نقص کی وجہ سے ان کی قیمت گھٹا کر دو ۔

غ م م

غَمَّ الشَّيْئَ غَمًّا ۔ اسے ڈھانپ لیا ۔ چھپا لیا ۔ یہ اس کے بنیادی معنی ھیں ۔ غُمَّ الْهِلَالُ ۔ چاند بادل کے نیچے آگیا اور دیکھا نہ جاسکا ۔ اَلْغَمَامَةُ ۔ بدلی یا سفید بدلی کو کہتے ھیں ۔ اسکی جمع غَمَامٌ ھے ۔ ($\frac{۲}{۵۷}$) ۔ اَغَمَّتِ السَّمَاءُ ۔ آسمان ابر آلود ھو گیا ۔ اَلْغِمَامَةُ ۔ اس چھینکے کو کہتے ھیں جو اونٹ وغیرہ کے منہ پر چڑھا دیتے ھیں تاکہ وہ کچھ کھا نہ سکے ۔ نیز اس کپڑے کو جس سے اونٹنی کی آنکھیں باندھ دی جاتی ھیں ۔ اس سے اَلْغُمَّى اس مصیبت کو کہتے ھیں جس سے انسان نکل نہ سکے ، نیز وہ پیچیدہ مسئلہ جس کا حل نہ نظر آئے ۔ اور اَلْغَمَّى ۔ غبار اور تاریکی کو ۔ نیز جنگ کی شدت جو قوم پر چھا جائے ۔ لہذا اَلْغَمّ کے معنی ھیں حزن و کرب (جو چار سُو سے کسی پر چھا جائے)۔ سورہ آل عمران میں یہ لفظ اَمَنَةً کے مقابلہ میں آیا ھے ($\frac{۳}{۱۵۴}$) ۔ اَلْغُمَّةُ ۔ تحیر و التباس کو کہتے ھیں، نیز تاریکی و تنگی کو**۔ سورہ یونس میں ھے لَايَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ($\frac{۱۰}{۷۱}$) ۔ تمہارا معاملہ تم پر مشتبہ اور حیران کن نہ رھے ۔

غ ن م

اَلْغَنَمُ ۔ بکریاں ۔ (اس کا واحد شَاةٌ ھے جو اس مادہ سے نہیں آتا)۔ صاحب محیط نے لکھا ھے کہ اس کا اطلاق بھیڑوں اور بکریوں دونوں پر

---

*تاج و راغب ۔ **تاج و محیط ۔

ھوتا ھے **۔ (۲/۱۸) ۔ اَلْغَنِیْمُ ۔ اَلْغَنِیْمَۃُ ۔ اَلْغُنْمُ ۔ مال غنیمت جو جنگ میں ھاتھ آئے *۔ چونکہ عربوں کے معاشرہ میں مویشی ھی سب سے بڑی دولت تھی اس لئے جنگ میں بھی زیادہ تر یہی ھاتھ آتے تھے ۔ اس اعتبار سے اس مال کو غَنِیْمَۃٌ* کہنے لگے ۔ غَنِمَ ۔ کسی چیز کو بطور مال غنیمت پا لینا ۔ کسی چیز کو بغیر بدل و مشقت کے حاصل کر لینا *۔ اَنَّمَا غَنِمْتُمْ (۸/۴۱) اَلْمَغْنَمُ ۔ جمع مَغَانِمُ ۔ مال غنیمت (۴/۹۴) ۔

(مال غنیمت کے سلسلہ میں عنوانات (ف ۔ ی ۔ ا) اور (ن ۔ ف ۔ ل) بھی دیکھئے)

غ ن ی

اَلْغِنٰی ۔ حاجات سے بے نیازی ۔ تونگری ۔ آسودگی ۔ یہ فقر (محتاجی) کی ضد ھے ، احتیاج نہ ھو، غَنِیٌّ کہلاتا ھے ۔ نیز آسودہ ، خوش حال ، تونگر بھی ۔ (۲/۲۶۳) و (۴/۶)۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کافی ھونا ھیں ۔ اَلْغَانِیَۃُ اس عورت کو کہتے ھیں جو اپنے ذاتی حسن و جمال کی وجہ سے خارجی زیبائش و آرائش سے مستغنی ھو*۔ اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (۲۹/۶)۔ خدا کو بندوں کی اطاعت کی ضرورت نہیں ۔ ان کی اطاعت خود انکی اپنی ذات کے نفع کے لئے ھے ۔ خدا کو کائنات میں کسی چیز کی احتیاج نہیں ۔ اَغْنٰی ۔ مستغنی کردینا (۹۳/۸)۔ اَغْنٰی عَنْہُ غَنَاءَ فُلَانٍ ۔ اسکی جگہ لی ، قائم مقامی کی ، اسکے جیسا کام دیا ۔ اَغْنٰی عَنْہُ کَذَا ۔ اس کے لئے فلاں چیز کافی ھوئی ، اس نے اسے فائدہ پہنچایا ۔ مَآ اَغْنٰی عَنْہُ مَالُہٗ (۱۱۱/۲) ۔ اسکے مال نے اسے کچھ فائدہ نہ پہنچایا ۔ اس کے کسی کام نہ آیا ۔ لَا یُغْنِیْ عَنْکَ شَیْئًا (۱۹/۴۲) ۔ جو تیرے کسی کام نہیں آسکتا ۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (۵۳/۲۸) ۔ یقیناً حق کے مقابلہ میں باطل کوئی کام نہیں دے سکتا ۔ باطل ، حق سے قطعاً بے نیاز نہیں کر سکتا ۔ سورہ عبس میں ھے لِکُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْھُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْہِ (۸۰/۳۷) ۔ اسدن ھر شخص اپنے اپنے دھندے میں اسقدر مشغول ھوگا کہ وہ کام اس کی ساری توجہات جذب کر لینے کے لئے کافی ھوگا ۔ یا دوسروں سے بے نیاز کر دیگا ۔ اَلْمُغْنِیْ (اسم فاعل) وہ جو کفایت کرے ۔ کام آئے ۔ فائدہ پہنچائے ۔ اسکی جمع مُغْنُوْنَ ھے ۔ سورۃ ابراھیم میں ھے کہ عذاب کو دیکھکر متبعین اپنے لیڈروں سے کہینگے فَھَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ (۱۴/۲۱)۔ "کیا تم خدا کے عذاب کے

*تاج ۔ **محیط ۔

مقابلہ میں ہمارے کسی کام آسکتے ہو یا کفایت کر سکتے ہو؟ ۔ لیکن آغْنیٰ عَنْہُ کذا کے معنے اس سے کسی چیز کو ہٹا دیا ، دور کر دیا بھی ہیں** ۔ اس لحاظ سے اس آیت کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ''کیا تم ہم سے اللہ کے عذاب میں سے کچھ بھی دور کر سکتے ہو؟'' ۔ (نیز ۲۱؍۱۴)۔ اِسْتَغْنٰی ۔ بے نیاز ہو جانا (۵؍۸۰ ؛ ۹؍۹۶)۔ غَنِیَ بِالْمَکَانِ وَ فِیْہِ ۔ اس نے اس جگہ طویل مدت تک اقامت کی ۔ کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْہَا (۶۸؍۱۱ ؛ ۹۲؍۷)۔ گویا وہ ان مکانات میں کبھی بسے ہی نہ تھے ۔ اس مادہ کے بنیادی معنوں کی رعایت سے اس جگہ معنے صرف طویل مدت تک اقامت کرنا ہی نہیں بلکہ آسودگی و خوش حالی کی زندگی بسر کرنا بھی ہیں ۔ اَلْغَنَاءُ ۔ کفایت ۔ پوری صلاحیت و استعداد کے ساتھ کسی کی جگہ لے لینا اور اس کا سا کام دینا ۔ اَلْغِنَاءُ ۔ گانا ۔

غ و ث

اَلْغَوْثُ وَالْغِیَاثُ ۔ مدد ۔ اِسْتَغَاثَنِیْ فُلَانٌ فَاَغَثْتُہٗ ۔ فلاں نے مجھے مدد کے لئے پکارا تو میں نے اسکی مدد کی ۔ اَلْاِسْتِغَاثَۃُ ۔ طلب غوث ۔ مدد طلب کرنا * ۔ اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ (۸؍۹) ۔ جب تم اپنے رب کو مدد کے لئے پکارتے تھے ۔ سورہ کہف میں ہے وَاِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ کَالْمُہْلِ (۱۸؍۲۹) ۔ راغب کہتا ہے کہ یہ غَوْثٌ سے بھی ہو سکتا ہے (مدد مانگنا) اور غَیْثٌ سے بھی (پانی مانگنا) ۔ اسی طرح یُغَاثُوْا میں بھی دونوں معنی ہو سکتے ہیں*** ۔ [دیکھئے عنوان غ ۔ ی ۔ ث]

غ و ر

اَلْغَوْرُ ۔ ہر چیز کی گہرائی ۔ عمق ۔ بُعد ۔ رَجُلٌ بَعِیْدُ الْغَوْرِ ۔ گہرا آدمی جو بڑا علم و تجربہ رکھتا ہو ۔ اَلْغَوْرُ ۔ اَلْغِیَارُ ۔ کسی چیز کے اندر گھس جانا ۔ پانی کا زمین کے اندر اتر جانا**** ۔ قرآن کریم میں ہے اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُکُمْ غَوْرًا (۶۷؍۳۰) ۔ اگر تمہارا پانی زمین کے بہت نیچے اتر جائے (اور اوپر ہی نہ آئے تو تم کیا کرلو) ۔ اَلْغَارُ ۔ غار ۔ (۹؍۴۰)۔ اَلْمَغَارَۃُ ۔ غار ۔ اس کی جمع مَغَارَاتٌ ہے ۔ (۹؍۵۷) ۔ ''اندر تک گھس جانے'' کے اعتبار سے اَغَارَ تیز رفتار ہونے کے لئے بولا جاتا ہے اور فَرَسٌ مِغْوَارٌ نہایت تیز رفتار گھوڑے کو کہتے ہیں ۔ اَلْغَارَۃُ ۔ حملہ آور

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****تاج و کتاب الاشتقاق ۔

سواروں کا دستہ ۔ نیز حملہ ۔ آغَارَ عَلَی الْقَوْمِ ۔ قوم پر حملہ کیا* ۔ قرآن کریم میں ہے فَالْمُغِیْرَاتِ صُبْحًا (۱۰۰/۳) ۔ حملہ کرنے اور دشمن کی صفوں کے اندر جا گھسنے والے گھوڑے ۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) گہرائی اور (۲) کسی کے مال کو جبراً اور قہراً لینے کے لئے اقدام کرنا ہیں ۔

غ و ص

اَلْغَوْصُ ۔ اَلْمَغَاصُ ۔ پانی کے نیچے اترنا ۔ غوطہ لگانا ۔ اَلْمَغَاصُ غوطہ لگانے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں ۔ اَلْغَوَّاصُ ۔ غوطہ خور** ۔ قرآن کریم میں حضرت سلیمانؑ کے تذکرہ میں ہے وَ مِنَ الشَّیٰطِیْنِ مَنْ یَّغُوْصُوْنَ لَہٗ (۲۱/۸۲) ۔ وہ سرکش اقوام کے لوگ جنہیں (حضرت) سلیمانؑ نے اپنا فرمانبردار بنا لیا تھا اور وہ اس کے لئے غوطہ خوری کرتے تھے ۔ انہی کو دوسری جگہ غَوَّاصٌ کہا گیا ہے (۳۸/۳۷) ۔ اسکے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ بڑی بڑی مہموں میں درّانہ گھس جاتے تھے ۔

جو شخص کسی گہرے اور پیچیدہ معاملہ کی تہ تک پہنچ جائے اور اسے حل کرلے یا نیچے کی جگہ سے کوئی چیز نکال لائے ، اسے بھی غَائِصٌ کہتے ہیں*** ۔ اصل میں اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں نشیب کی طرف تیزی سے جانا*** ۔ اس سے یہ لفظ ، ہر چیز کے اندر داخل ہونے کے لئے بولا جانے لگا ۔

غ و ط

اَلْغَوْطُ ۔ اَلْغَائِطُ ۔ نشیبی ، اور وسیع زمین ۔ چونکہ اہل عرب قضائے حاجت کے لئے نشیبی زمین تلاش کرتے تھے تاکہ اوٹ میں ہوکر رفع حاجت کرلیں ، اسی لئے بیت الخلاء کو بھی غَائِطٌ کہتے لگے ۔ نیز ایسی نشیبی زمین ہی میں وہ فضلہ پھینکتے تھے اس لئے انسانی فضلہ کو بھی غَائِطٌ کہنے لگے* ۔ (۴/۴۳) ۔ میں جَآءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِّنَ الْغَائِطِ سے مراد ہے جائے ضرور سے فارغ ہوکر آنا ۔

غَاطَ ۔ یَغُوْطُ ۔ داخل ہوجانا ۔ اندر چلے جانا ، دھنس جانا ، اَلْغَوْطُ ۔ کھودنا***** ۔ بِئْرٌ غَوِیْطَۃٌ ۔ گہرا کنواں* ۔

---

*تاج ۔ **تاج و محیط ۔ ***راغب ۔ ****ابن فارس ۔ *****محیط ۔

غ و ل

غَالَ ۔ اس کے بنیادی معنی دھوکے سے پکڑنے یا کسی کو بے خبری کی حالت میں گرفتار کرنے کے ہیں ۔ اَلْغَوْلُ ۔ میدان یا ریگستان کی وسعت یا دوری کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں سے گزرنے والا اس طرح ہلاک ہوجاتا ہے کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا ۔ (ابن فارس)۔ اس بناء پر اَلْغَوْلُ ۔ ہلاکت ۔ مصیبت و آفت کو بھی کہتے ہیں ۔ غَالَتْہُ غَوْلٌ ۔ ہلاکت نے اسے برباد کر دیا ۔ غَالَ الشَّیْئَ ۔ اس نے اس چیز کو تباہ کردیا ۔ اَلْغَوْلُ ۔ درد سر ۔ مستی ۔ ہر وہ شے جس سے عقل جاتی رہے ۔ اَلْغَوَائِلُ ۔ مصائب ۔ تباہیاں ۔ غُوْلٌ ۔ عرب بھوت ، چڑیل کو کہا کرتے تھے ۔ نیز سانپ کو* ۔

قرآن کریم میں "جنت کی شراب" کے متعلق ہے لَا فِیْھَا غَوْلٌ (۴۷/۳۷) ۔ اس میں نہ مستی ہوگی نہ سرگرانی ۔

غ و ی

غَوَیٰ غَیًّا ۔ بھٹک جانا ۔ دھوکا کھا جانا** ۔ بھٹک جانے اور گمراہ ہو جانے کے اعتبار سے غَیٌّ کا لفظ رُشْدٌ کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (۲/۲۵۶) "صحیح اور غلط راستے نکھر کر الگ الگ ہوگئے" ۔ اور دھوکہ کھا جانے کے معنوں میں مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوَیٰ (۵۳/۲) ۔ "تمہارا رفیق نہ تو تلاش حقیقت میں سرگرداں ہے اور نہ ہی اس نے دھوکا کھایا ہے" ۔ نیز تباہ اور برباد ہوجانا** ۔ جیسے وَعَصٰی آدَمُ رَبَّہٗ فَغَوَیٰ (۲۰/۱۲۱) ۔ راغب اور لسان العرب میں اس کے معنی فَسَدَ عَیْشُہٗ لکھے ہیں*** ۔ یعنی معیشت کا تنگ ہو جانا ۔ زندگی خراب ہو جانا ۔ روزی کا درہم برہم ہوجانا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) صحیح سمت کی طرف راہ نمائی نہ ہونا ۔ کسی معاملہ کا تاریک ہونا ۔ اور (۲) کسی چیز میں فساد ہونا ۔ سورۃ مریم میں جو ہے فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا (۱۹/۵۹) ۔ تو اس میں راغب کے نزدیک غَیًّا کے معنی عذاب یا تباہی کے ہیں** ۔ یعنی اتباع شہوات اور اضاعت

---

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج و راغب ۔ ***بحوالہ غریب القرآن ۔ مرزا ابوالفضل ۔ لیکن تاج میں فَسَدَ عَیْشُہٗ کی بجائے فَسَدَ جَوْفُہٗ ہے یعنی اسکا پیٹ خراب ہوگیا ۔

صلٰوۃ کا خمیازہ۔ غَوٰی ۔ غلط رو*۔ (۲۰/۱۲۱)۔ تباہ و برباد ہو جانے والا۔ غَاوٍ (جمع غَاوُوْنَ) بھٹک جانے والے*۔ (۲۶/۹۴)۔ اَغْوَیٰ۔ گمراہ کرنا (۱۵/۳۹)۔ لیکن (۱۱/۳۴) میں جو ہے یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَکُمْ۔ تو صاحب تاج العروس اور راغب دونوں کے نزدیک اس کے معنی اعمال کے نتیجہ میں تباہ و برباد کر دینے کے ہیں*۔ اَلْغَوَیٰ۔ بد هضمی ۔ پیاس*۔ اَلْغَاوِیْ۔ ٹڈی دل*۔

سورۃ شعراء میں ہے وَالشُّعَرَاءُ یَتَّبِعُھُمُ الْغَاوُوْنَ (۲۶/۲۲۴)۔ اس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ شاعروں کے پیچھے لگنے والے فریب خوردہ ہیں۔ اس لئے کہ (جیسا کہ عنوان ش۔ ع۔ ر میں بتایا جاچکا ہے) شاعری اس ذہنیت کا نام ہے جس میں حقائق کی بجائے صرف جذبات سے کام لیا جاتا ہے اور زندگی کا کوئی غیر متبدل نصب العین سامنے نہیں رکھا جاتا۔ اس لئے ایسے لوگوں کے پیچھے لگنے والے (جو ان جذبات پرستیوں کو حقائق سمجھ لیتے ہیں) فریب خوردہ ہوتے ہیں۔ لیکن پیاس کی جہت سے اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کی پیاس کبھی نہیں بجھ سکتی، کیونکہ پیاس کی تسکین صرف مثبت حقائق سے ہو سکتی ہے۔ مشتعل جذبات سے نہیں۔ اسی لئے خود شاعروں کو بھی یَھِیْمُوْنَ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے (۲۶/۲۲۵)۔ یعنی پیاسے اونٹ کی طرح سخت پریشانی میں مبتلا اور سارے سارے پھرنے والے (دیکھئے عنوان ھ۔ ی۔ م)۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ خود شاعروں کو بھی اپنے مدح سراؤں سے دھوکا لگ جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ فی الواقعہ ہمارے متبعین ہیں حالانکہ وہ محض ٹڈی دل کی طرح ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں لاکھوں، لیکن بالکل بغیر کسی نصب العین کے۔ ان سب کا آخری نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ ''بدهضمی'' کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ شعراء کا اتباع کرنے والوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ حاصل کرتے ہیں وہ ان کی فکر کا جزو نہیں بنتا بلکہ یونہی بلا نتیجہ ضائع ہو جاتا ہے۔ چند الفاظ جو ذہن کو وقتی لذت دیکر موجب تباہی بن جاتے ہیں۔

اَلْغَیَایَۃُ۔ غبار آلودگی اور تاریکی جو چھا جائے۔ اَلْغَایَۃُ جھنڈے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں پر سایہ کرتا ہے۔ پھر کسی چیز کی انتہا کو بھی غَایَۃٌ کہنے لگ گئے کیونکہ جھنڈا فوج کا آخری سہارا اور ان

*تاج و راغب

کی ھستی کا آخری نشان ھوتا ھے - (ابن فارس) - [واضح رھے کہ غایۃ غ - ی - ی سے ھے لیکن اسے اسی باب میں لکھ دیا گیا ھے] - غَوِیَ الْفَصِیْلُ، وَغَوَیَ غَوَایَۃً وَ غَوًی کے معنے ھیں اونٹ کے بچے نے بہت زیادہ دودھ پی لیا جس سے اسے بد ھضمی ھو گئی اور اس کا پیٹ بگڑ گیا* - اس سے بھی غَوَایَۃ کی تباھی کا اندازہ ھو سکتا ھے جس کا شکار مُتْرَفِیْن ھوتے ھیں - اسکے برعکس غَوِیَ الْجَدْیُ کے معنی ھیں بکری کے بچے کو دودھ سے روک دیا گیا حتی کہ وہ لاغر اور مرنے کے قریب ھو گیا* - اس سے بھی مکافاتِ عمل کی وجہ سے تباھی اور بربادی کا تصور سامنے آجاتا ھے (نیز دیکھئے عنوان ع - ذ - ب) -

قرآن کریم میں اس مادہ کے الفاظ جس جس مقام پر آئے ھیں ، ان میں ایک چیز بقدر مشترک ملیگی - یعنی اس میں ، قوانین خداوندی کے اتباع کے بجائے ، انسان اپنے مفاد ، خیالات اور جذبات کے پیچھے چلتا ھے اور حق کی راہ چھوڑ کر دوسری طرف جھک جاتا ھے - صحیح راستے سے بھٹک جاتا ھے - دھوکا کھا جاتا ھے - اس میں یہ تمام باتیں آجاتی ھیں -

غ ی ب

ھر وہ چیز جو نگاھوں سے اوجھل ھو ، غَیْبٌ کہلاتی ھے - اگر وہ چیز تصور میں موجود ھے لیکن نگاھوں سے پوشیدہ ھے تو پھر بھی غَیْبٌ ھی کہلائیگی - غَیْبٌ نشیبی زمین کو بھی کہتے ھیں - غَابَۃٌ - ایسی نشیبی زمین جس سے پہلے اونچی زمین آجائے اور اس لئے وہ نگاھوں سے اوجھل ھو جائے - غَابَۃٌ - گھنے جنگل کو بھی کہتے ھیں جس میں درختوں کی وجہ سے زمین نظر نہیں آتی - گڑھے اور کنوئیں کی ترائی اور گھرائی ، نیز ھر چیز جو کسی کو چھپا لے ، اسی لئے غَیَابَۃٌ کہلاتی ھے $(\frac{12}{10})$ - غَیِّبَاتُ الشَّجَرِ - درختوں کی ان جڑوں کو کہتے ھیں جو زمین کے اندر پھیلی ھوئی ھوں اور نظر نہ آئیں** -

قرآن کریم نے غَیْبٌ کے مقابلہ میں شَھَادَۃٌ کا لفظ لا کر $(\frac{59}{22})$ اس کے معنی واضح کر دئے ھیں - یعنی غَائِبٌ وہ ھے جو مشاھدہ میں نہ آیا ھو - جو مشہود نہ ھو -

فَرَسٌ غَائِبٌ اس گھوڑے کو کہتے ھیں جو دوڑ میں اپنی کچھ قوت چھپا کر (Reserve) رکھ لے - اور فَرَسٌ شَاھِدٌ وہ جو ساری قوت کو نمایاں طور پر سامنے لے آئے*** -

---

*تاج - محیط - راغب - **تاج - ***لین -

غَیْبٌ کے لئے ضروری ہے کہ وہ کہیں موجود ضرور ہو لیکن آنکھوں سے اوجھل ہو۔ جب غَیْبٌ آنکھوں کے سامنے آجائیگا تو مَشْہُوْدٌ ہو جائیگا۔ اگر اس کا کہیں وجود ہی نہیں تو پھر اسے غَیْبٌ نہیں کہا جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ غِیْبَۃٌ کسی کی عدم موجودگی میں اس کے کسی ایسے برے وصف کے ذکر کرنے کو کہتے ہیں جو اس میں موجود تو ہو لیکن اس کا ذکر کرنا اسے ناگوار گزرے۔ اگر وہ بات اس میں سرے سے موجود ہی نہ ہو تو اسے غِیْبَت نہیں بلکہ تُہْمَت کہا جائیگا *۔ غیبت کرنے کے لئے فعل اِغْتَابَ آتا ہے (۴۹/۱۲)۔

قرآن کریم نے اللہ کے لئے عَالِمُ الْغَیْبِ کہا ہے (۵۹/۲۲)۔ اس لئے ایمان بالغیب (۲/۳) کے معنی ''ان دیکھے خدا پر ایمان'' ہی نہیں۔ اس سے ایک تو مراد ہیں انسانی اعمال کے وہ نتائج جو مرتب تو اسی وقت ہونے شروع ہو جاتے ہیں جب وہ عمل سرزد ہو لیکن مشہود ہو کر سامنے اپنے وقت پر آتے ہیں۔ اسی طرح نظام خداوندی کے خوشگوار نتائج اس کے اندر تو ہر وقت موجود ہوتے ہیں لیکن جب تک اس نظام کو متشکل نہ کیا جائے وہ مشہود ہو کر سامنے نہیں آتے۔ مومنین کی جماعت اس نظام کے ان دیکھے نتائج پر یقین محکم رکھتی ہے اور اس یقین کے ماتحت اس نظام کے قیام کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دئے جاتی ہے۔ اگر انہیں اس نظام کے ان دیکھے نتائج پر ایمان نہ ہو تو وہ اس کے لئے ایک قدم بھی نہ اٹھائیں۔ لہذا اس نظام کو عملاً متشکل کرنے کے لئے اس کے ان دیکھے نتائج پر ایمان اولین شرط ہے۔ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (۲/۳)۔ ایک کسان، سردی۔ گرمی۔ دن رات۔ مسلسل محنت کرتا ہے، صرف اس لئے کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ بیج جسے اس نے بویا ہے ایک دن ثمربار ہو کر رہے گا۔ اگر اسے اس کا یقین نہ ہو تو وہ اس کھیتی کے لئے ایک دن بھی محنت نہ کرے۔ جو جماعت نظام خداوندی کو متشکل کرنے کے لئے پہلے پہل اٹھتی ہے اس کے سامنے اس نظام کے نتائج موجود نہیں ہوتے۔ یہ نتائج اس وقت سامنے آنے والے ہوتے ہیں جب وہ نظام متشکل ہو جائے۔ وہ اس نظام کی تشکیل کے لئے صرف اسی بناء پر قربانیاں دئے جاتے ہیں کہ انہیں اس کی بار آوری پر یقین محکم ہوتا ہے۔ اسی کو ایمان بالغیب کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے، اَلْغَیْبُ سے مراد وہ تمام اشیاء یا حقائق ہیں جو عالم محسوسات سے ماوراء ہیں۔ اس اعتبار سے اس میں خود ذات خداوندی بھی آجاتی ہے۔

سورہ ھود میں ہے وَلِلّٰہِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۱/۱۲۳)۔ اس سے مراد ہیں کائنات کی تمام وہ چیزیں اور قوتیں جو ہنوز انسان کی نگاہوں

---

* تاج۔

سے پوشیدہ ہیں لیکن مستقبل میں سامنے آجانے والی ہیں ۔ انہی کو مَفَاتِحُ الْغَيْبِ (۶/۵۹) اور غَائِبَةٌ (۲۷/۷۵) کہا گیا ہے ۔ زمانہٗ مستقبل کے لئے یہ لفظ (۱۶/۱۹) میں آیا ہے اور گذشتہ زمانہ کی ان باتوں کے لئے جو لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نہیں آئی تھیں (۳/۴۳) میں ، جہاں کہا ہے کہ ذَالِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ ۔ سورہ یوسف میں ہے ۔ لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ (۱۲/۵۲) ۔ میرے پیٹھ پیچھے اسکی خیانت نہیں کی ۔ غَيَابَةٌ (۱۲/۱۰) ۔ کنوئیں کی گہرائی ۔

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ کے سوا غیب کا علم کسی کو نہیں ۔ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ... (۲۷/۶۵) ۔ ” ان سے کہو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں اللہ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں جو غیب جانتا ہو“ ۔ حتی کہ رسولوں کو از خود غیب کا علم نہیں ہوتا ۔ ان کا اعلان ہوتا ہے کہ لَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ (۶/۵۰) ” میں غیب نہیں جانتا “ ۔ البتہ اللہ تعالیٰ انہیں غیب کی بعض باتوں کا علم وحی کے ذریعے عطا کر دیتا ہے ۔ جیسا کہ سورہ آل عمران میں ہے ذَالِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهِ اِلَيْكَ (۳/۴۳) ” یہ غیب کی ان باتوں میں سے ہے جنہیں اللہ نے تیری طرف وحی کیا ہے ۔ چونکہ وحی تمام تر قرآن کریم کے اندر آگئی اور اس کے بعد اس کا سلسلہ ختم ہو گیا اس لئے اب کسی شخص کو غیب کا علم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اس قسم کا دعوےٰ قیاس آرائیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا ۔ اسے قرآن کریم نے رَجْمًا بِالْغَيْبِ (۱۸/۲۲) کہکر پکارا ہے ۔ یعنی یونہی اندھیرے میں تیر چلانا ۔ اٹکلیں دوڑانا ۔ قیاس آرائیاں کرنا، جن میں سے کبھی اتفاقاً کوئی ٹھیک بھی نکل آتی ہے ۔ البتہ تحقیقات کے ذریعے فطرت کی پوشیدہ قوتوں کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے ۔ جب تک وہ قوتیں دریافت نہیں ہونگی ” غیب “ سے متعلق ہونگی ۔ جب دریافت ہو کر، محسوس طور پر سامنے آجائینگی ، مشہود ہو جائینگی ۔ لیکن بعض ” غیب “ ایسے ہیں جنہیں محسوسات کے دائرے میں لانا انسان کے حیطۂ امکان سے باہر ہے ۔ مثلاً ذات خداوندی یا مرنے کے بعد کی زندگی کی کنہ وحقیقت ۔ وغیرہ ۔

[نیز دیکھئے عنوان ش ۔ ہ ۔ د]

غ ی ث

اَلْغَيْثُ ۔ بارش ۔ وہ بارش جو دور دور تک ہو اور جو بڑی منفعت بخش ہو ۔ وہ گھاس جو اس بارش سے پیدا ہو ۔ غَاثَ اللّٰهُ الْبِلَادَ ۔ خدا نے

شہروں پر پانی برسایا ۔ فَرَسٌ ذُوْ غَیِّثٍ ۔ گھوڑا جو اپنی رفتار کو یکے بعد دیگرے نکالتا رہے اور اسکی رفتار کی تیزی بڑھتی جائے ۔ بِئْرٌ ذَاتُ غَیِّثٍ ۔ وہ کنواں جس کے اندر چشمہ ہو*۔

قرآن کریم میں ہے وَ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ (۳۱/۳۴)۔ خدا بارش برساتا ہے ۔ سورہ کہف میں ہے وَاِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا (۱۸/۲۹)۔ راغب کہتا ہے کہ یہ غَوْثٌ (مدد مانگنا) سے بھی ہو سکتا ہے اور غَیْثٌ (پانی مانگنا) سے بھی ۔ اسی لئے ہم نے اسے عنوان (غ ۔ و ۔ ث) میں بھی لکھ دیا ہے ۔

غ ی ر

غَیْرٌ ۔ عام طور پر سوا ، بجز اور علاوہ کے معنوں میں آتا ہے*۔ مَالَکُمْ مِنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ (۷/۵۹) ۔ تمہارے لئے خدا کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ۔

غَیَّرَ ۔ بدل دینا ۔ تبدیل کر دینا *۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ (۱۳/۱۱) ۔ اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا (جب تک .....)۔ تَغَیَّرَ ۔ بدل جانا*۔ لَمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُہٗ (۴۷/۱۵)۔ جس کا مزہ نہیں بدلا جاتا ۔

قرآن کریم میں قوموں کے عروج و زوال کے متعلق اہم اصول یہ بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (۱۳/۱۱ ؛ ۸/۵۳)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک کوئی قوم خود اپنی نفسیاتی کیفیت نہیں بدلتی اس کی حالت میں تبدیلی نہیں آتی ۔ لیکن اس میں ایک باریک پہلو ہے ۔ عرب اونٹوں پر سفر کرتے تھے ۔ انہی پر اپنا مال وغیرہ لادتے تھے ۔ اونٹ پر کجاوہ باندھا ہو یا مال لدا ہو، چلتے چلتے وہ ضرور ڈھیلا ہو جاتا ہے ۔ کبھی کبھی ان چیزوں کو یا ان کی رسیوں کو مرمت کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے ۔ چنانچہ وہ لوگ چلتے چلتے اس بات کو ہمیشہ نگاہ میں رکھتے کہ کونسی رسی ڈھیلی ہو گئی ہے ۔ کونسا کجاوہ اپنی حالت پر نہیں رہا ۔ جہاں ضرورت سمجھتے فوراً اونٹ کو بٹھاتے اور اس کا کجاوہ یا بوجھ درست کر دیتے ۔ اسے وہ کہتے غَیَّرَ عَنْ بَعِیْرِہٖ ۔ اس نے اونٹ پر سے کجاوہ اتارا اور اسے درست کر (کے پھر باندھ) دیا **۔ یَاتَرَکَ الْقَوْمَ یُغَیِّرُوْنَ ۔ اس نے لوگوں کو اس حالت میں چھوڑا کہ وہ اپنے اونٹوں کے کجاووں (سامان سفر) کی دیکھ بھال کر رہے تھے تاکہ ہر چیز کو ٹھیک ٹھاک کرکے چلیں **۔

* تاج و محیط ۔ ** تاج ۔

قوموں کی زندگی میں بھی یہی حالت ہے ۔ جو قوم اپنے سفر زندگی میں اپنے سازو سامان پر نگاہ رکھتی ہے اور ساتھ کے ساتھ اس کی مناسب مرمت اور (Adjustment) کرتی جاتی ہے وہ حسن و خوبی سے منزل مقصود تک پہنچ جاتی ہے ۔ لیکن جو اس سے غافل ہو جاتی ہے " اس کے اونٹ کا بوجھ" راستے میں گر پڑتا ہے ۔

ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے دو بنیادی معنی ہیں (۱) دو چیزوں کے درمیان اختلاف ۔ اور (۲) اصلاح اور منفعت ۔ چنانچہ غَارَهُمُ اللّٰهُ بِالْغَيْثِ کے معنی ہیں خدا نے بارش سے ان کی حالت کو درست کر دیا ۔ اور اَلْغِيْرَةُ اس رسد یا سامان خوراک کو کہتے ہیں جس سے اہل و عیال کی حالت سدھاری جائے ۔ اس بنا پر اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ..... میں تبدیلی بغرض اصلاح ہوگی ۔ غَارَ ۔ يَغَارُ (عَلَيْهِ) ۔ کے معنی ہیں غیرت کھانا ۔ غَيْرَةٌ اسی سے اسم ہے ۔ یعنی جو چیز اپنی ہو اس میں جب کوئی دوسرا دخیل ہو تو اس کے خلاف اپنی حفاظت کے لئے جو جذبہ پیدا ہوتا ہے اسے غَيْرَةٌ کہتے ہیں ۔

غ ی ض

غَاضَ ۔ يَغِيْضُ ۔ غَيْضًا ۔ کسی چیز کا کم یا ناقص ہو جانا، نیز کسی چیز کو کم کر دینا (لازم و متعدی) ۔ غَاضَ الْمَاءُ ۔ پانی جذب ہوگیا یا خشک ہو گیا ۔ اَلْغَيْضُ ۔ وہ نا تمام حمل جو ساقط ہو جائے * ۔ ابن فارس نے اس کے معنے کسی چیز میں کمی ہونا اور اس کا تہ نشین ہوجانا بتائے ہیں ۔ قرآن کریم میں ہے مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ($\frac{13}{8}$) ۔ رحم جس جنین کو تکمیل تک نہیں پہنچاتے بلکہ نا مکمل گرا دیتے ہیں ۔ یا جنہیں وہ بڑھاتے ہیں ۔ اس سے وہ جنین مراد لئے جا سکتے ہیں جو معینہ مدت (نو ماہ) سے کم میں پیدا ہوجاتے ہیں اور وہ جنین جو معینہ مدت (نوماہ) سے زیادہ مدت لیتے ہیں ۔ نیز شکم مادر میں ایک بچہ یا اس سے زائد بچوں کا وجود بھی مراد لیا جا سکتا ہے ۔ راغب نے مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ کے معنے کئے ہیں ، وہ جسے رحم بگاڑ کر ضائع کر دیتے ہیں ۔ سورۂ ہود میں طوفانِ حضرت نوح ؑ کے ضمن میں ہے وَغِيْضَ الْمَاءُ ($\frac{11}{44}$) ۔ پانی کم ہو گیا ۔ یا خشک ہو گیا ۔

---

* تاج و راغب ۔

غ ی ظ

اَلْغَیْظُ - غضب کو کہتے ہیں * - راغب نے کہا ہے کہ غَیْظٌ شدید ترین غضب کو کہتے ہیں یعنی وہ حرارت جو انسان اپنے دل کے دورانِ خون تیز ہونے پر محسوس کرتا ہے ** - بعض نے کہا ہے کہ ابتدائی غضب یا جوش غضب کو غَیْظٌ کہا جاتا ہے - دوسروں کا خیال ہے کہ غَیْظٌ چھپا ہوا غصہ ہوتا ہے اور غَضَبٌ ظاہر - یا یہ کہ غَضَبٌ صاحب قدرت آدمی کے غصے کو کہتے ہیں اور غَیْظٌ عاجز آدمی کے غصے کو * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اُس کرب اور بیچنی کے ہوتے ہیں جو کسی کو دوسرے کی طرف سے پہنچے - غَاظَہٗ - اسے غصے میں لایا - برہم کیا - ($\frac{۲۲}{۱۵}$)- غَائِظٌ - وہ جو کسی کو غصے میں لائے - اسکی جمع غَائِظُوْنَ ہے ($\frac{۲۶}{۵۵}$) - اَلتَّغَیُّظُ - اظہار غیظ جو کبھی ایسی آواز کے ساتھ ہوتا ہے جو سنائی دے **- یعنی جوش و خروش - ($\frac{۲۵}{۱۲}$) -

---

*تاج **راغب -

ف

فَ (حرف)

فَ - به حسب ذیل مفہوم پیدا کرتا ہے :—

(۱) ترتیب کے لئے۔ یعنی یہ ہوا - پھر یہ ہوا - پھر یہ ہوا - جیسے ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا . . . . (۲۳/۱۴)۔ پھر ہم نطفہ کو لوتھڑا بناتے ہیں، پھر لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا، پھر گوشت کے ٹکڑے (میں) ہڈیاں پیدا کرتے ہیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھاتے ہیں - لیکن یہ کلیہ نہیں کہ فَ - ہر حال میں ترتیب کے لئے آتا ہے - بعض اوقات ترتیب نہیں بھی پائی جاتی - مثلاً سورہ اعراف میں ہے وَكَمْ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا فَجَاءَهَا بَأْسُنَا بَيَاتًا أَوْ هُمْ قَائِلُونَ (۷/۴) - اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا سو ہمارا عذاب ان پر رات کے وقت آیا ، یا اس وقت جب وہ دوپہر کے وقت آرام کر رہے تھے - اس میں ترتیب نہیں ہے -

(۲) تعقیب کے لئے۔ یعنی ایک واقعہ کے بعد جتنی مدت میں دوسرا واقعہ ہونا ہو وہ اس مدت میں واقع ہوجائے تو اس کا بھی۔ فَ - سے اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً - تَزَوَّجَ فَوُلِدَ لَهُ - اس نے شادی کی - پھر مدت صحیح کے بعد اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا - اگر وہ مدت کم و بیش ہو تو پھر- فَ - نہیں لایا جائے گا -

سورہ مریم میں ہے۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا - فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹/۱۶-۱۸). . . . فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا - فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَىٰ جِذْعِ النَّخْلَةِ . . . . . (۱۹/۲۲-۲۳) فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا أَلَّا تَحْزَنِي . . . . . . (۱۹/۲۴-۲۵) - '' اور قرآن کریم میں قصہ مریم کو

بیان کر ۔ جب وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر جانب مشرق ایک جگہ چلی گئی۔ پس اس نے ان سے پردہ کر لیا۔ سو ہم نے اپنی ''روح '' کو اس کی طرف بھیجا۔ تو وہ اسے ایک صحیح سالم انسان کی شکل میں متمثل ہو کر دکھائی دیا . . . . پھر مریم کو اس (بچہ) کا حمل ہوا۔ سو وہ اسکے ساتھ الگ ہو کر دور چلی گئی۔ پھر دردِ زہ اسے کھجور کے درخت کی طرف لے آیا . . . . پھر اسے نچلی سمت سے ایک آواز آئی کہ غم نہ کر . . . '' ان آیات سے مطلب یہ نہیں کہ یہ تمام واقعات ، یکے بعد دیگرے ، مسلسل ، ایک ہی وقت میں ہوتے چلے گئے ، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ایک واقعہ کے بعد دوسرے واقعہ کے لئے جسقدر مدت درکار ہوتی ہے ، ٹھیک اس مدت کے بعد دوسرا واقعہ ہوا۔

(۳) ایک واقعہ کا دوسرے واقعہ کے لئے سبب بن جانا ۔ مثلاً میں نے اسے تھپڑ مارا تو اسے غش آ گیا ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ فَوَكَزَهٗ مُوسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ (۲۸/۱۵) ۔ پس موسیٰؑ نے اسے مارا اور اس کا کام تمام کر دیا ۔ یعنی اس کی موت حضرت موسیٰؑ کی مار سے واقع ہوئی ۔

(۴) واو عاطفہ (اور) کے معنوں میں— فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ (۲/۳۶) پس شیطان نے ان دونوں کو اس سے پھسلا دیا اور اس طرح انہیں وہاں سے نکال دیا جس میں وہ تھے ۔ (اگرچہ فَاَخْرَجَ میں ف ، سبب کے لئے بھی ہو سکتا ہے ۔)

(۵) جب یہ اِنْ (اگر) کے بعد آئے تو اس کے معنی۔ تو۔ کے ہوتے ہیں۔ جیسے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ (۳/۳۱) اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو ۔ یا مثلاً (اِنْ) کے بغیر ہی ۔ تو ۔ کے معنوں میں ۔ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ (۳/۱۱۵) اور جو کچھ وہ عمل خیر کریں گے تو اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی (اس کا بدلہ ضرور دیا جائے گا)۔

(۶) بعض اوقات یہ زائد بھی ہوتا ہے ۔ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ (۳۹/۶۶) بلکہ اللہ ہی کی محکومی اختیار کرو ۔

(۷) بعض اوقات یہ قسم کی تاکید کے لئے آ جاتا ہے ۔ مثلاً قَالَ فَبِعِزَّتِكَ (۳۸/۸۲) اس نے کہا تیرے غلبہ و اقتدار کی قسم ۔ (یہاں ف کو زائد بھی کہا جا سکتا ہے ۔ یعنی یہ محض بات کے تسلسل کے لئے آیا ہے)۔

ف أ د

فَاَدَ الْخُبْزَ يَفْاَدُهُ - روٹی کو بھوبھل میں سینکا - فَاَدَ اللَّحْمَ بِالنَّارِ - گوشت کو آگ میں بھون لینا - اَلْخُبْزُ الْمَفْئُوْدُ - بھوبھل میں پکائی ہوئی روٹی - اَلْفَئِيْدُ - آگ* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بخار - شدت اور حرارت کے ہیں -

قرآن کریم میں دل کے لئے قَلْبٌ اور فُؤَادٌ (جمع اَفْئِدَةٌ) آیا ہے (۶/۱۱۱) - اگرچہ ان دونوں کے استعمال میں کوئی خاص خطِ امتیاز نہیں کھینچا جاسکتا ، لیکن (جیسا کہ راغب نے لکھا ہے) دل کو فُؤَادٌ اس وقت کہینگے جب اس میں بھڑکنے کے معنے پائے جائیں** - تاج نے لکھا ہے کہ فاد کے اصلی معنی ہلنا اور ہلانا ہیں - اس سے فؤاد دل کو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بہت ہلتا اور دھڑکتا رہتا ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انسانی جذبات کی طرف اشارہ ہوگا تو فُؤَادٌ آئے گا اور جب انسانی فکر کے متعلق بات ہوگی تو قَلْبٌ - چنانچہ فَاَدَ زَيْدًا کے معنی ہیں زید کے دل پر چوٹ لگائی - فَاَدَ الْخَوْفُ فُلَانًا - فلاں آدمی کو خوف نے بزدل بنا دیا* - ان چیزوں کا تعلق جذبات سے ہے -

لیکن (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) - قَلْبٌ اور فُؤَادٌ کی یہ تقسیم عمومی ہے - ورنہ ان دونوں کا استعمال دل کے معنوں میں ہوتا ہے - قرآن کریم میں سیاق و سباق کے رو سے دیکھنا چاہئیے کہ کس مقام پر عقل وفکر مراد ہے اور کس مقام پر جذبات - اسی فرق کی رو سے قَلْبٌ اور فُؤَادٌ کے معنی کرنے چاہئیں - ہمارے ہاں کے لفظ ''دل'' کے مقابلہ میں انگریزی کا لفظ (Mind) زیادہ جامع ہے -

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ - اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶) ''جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو - یاد رکھو - سماعت - بصارت - اور فؤاد ان میں سے ہر ایک کی بابت پوچھا جائے گا'' - اس میں سمع اور بصر، حواس(Sense Perceptions) کے ذرائع ہیں اور فؤاد سے مراد (Mind) ہے یا جذبات - (Mind) اس لئے کہ حواس کے ذریعے جو اطلاعات بہم پہنچتی ہیں وہ ان سے نتیجہ نکالتا ہے - اور ''جذبات'' اس لئے کہ اگر

*تاج - **راغب -

ان اطلاعات کو جذبات متاثر کر دیں تو انسان کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا ۔ اسی لئے قرآن کریم نے ایمان کے لئے حواس اور فؤاد دونوں کی ضرورت بتائی ہے ۔ یعنی ان حقائق کو عقل و فکر سے پرکھا جائے اور دل کے جھکاؤ سے قبول کیا جائے (۶/۱۱۱-۱۱۳) ۔

سورۃ ھود میں ہے کہ انبیائے سابقہ کے احوال و کوائف اس لئے بیان کئے جاتے ہیں کہ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ (۱۱/۱۲۰) ۔ اس سے ہم تیرے دل کو مضبوط کرتے ہیں ۔ سورۃ قصص میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے جب بچے کو دریا میں بہا دیا تو اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا (۲۸/۱۰) تو اس کا دل صبر و ضبط سے خالی ہوگیا ۔ اس کے بعد ہے لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا (۲۸/۱۰)۔ اگر ہم اس کے قلب کو مضبوط نہ کر دیتے تو وہ اپنی بےچینی کا اظہار کر دیتی۔ (اس کے ساتھ ق ۔ ل ۔ ب کا عنوان بھی دیکھئے)

ف أ و

اَلْفِئَةُ ۔ جماعت ۔ اس جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد ایک دوسرے کی طرف تعاون و تناصر کے لئے رجوع کریں۔ نیز اس جماعت کو بھی کہتے ہیں جو فوج کے پیچھے ٹھہری ہوئی ہوتی ہے تاکہ شکست کے وقت اس کی طرف پناہ لی جاسکے* ۔ (۸/۱۶) ۔ اِنْفِيَاءٌ ۔ کھل جانا* ۔

ف ت أ

مَافَتَاَ ۔ مَافَتِیَٔ ۔ مَا اَفْتَاَ يَفْعَلُ كَذَا ۔ وہ (اس کام کو) برابر کرتا رہا ۔ اسے ہمیشہ کرتا رہا۔ فَتِیَٔ عَنِ الْاَمْرِ ۔ وہ اس بات سے رک گیا ۔ اہل لغت نے تصریح کی ہے کہ فَتِیَٔ سے پہلے ہمیشہ نفی آتی ہے**۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں ہے ۔ تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ (۱۲/۸۵) ۔ تو وہاں تَفْتَؤُ سے پہلے لَا محذوف ہے۔ یعنی یہ اصل میں لَاتَفْتَؤُ ہے ۔ اہل عرب اس سے عام طورپر حرف نفی محذوف کر دیتے ہیں** ۔ آیت کے معنی ہیں ''تم یوسف کی یاد سے کبھی باز نہیں آؤ گے ۔ اسے کبھی نہیں بھلاؤ گے ۔ ہمیشہ یاد کرتے رہو گے'' ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی تسلسل کے ہوتے ہیں ۔ یعنی کسی کام کو مسلسل کئے جانا ۔

*محیط و تاج ۔ **تاج و محیط و راغب ۔

ف ت ح

فَتَحَ ۔ یَفْتَحُ فَتْحًا ۔ کھول دیا۔ فَتَّحَ ۔ کھولنے میں شدت کے لئے آتا ہے ۔ اِنْفَتَحَ ۔ کھل گیا* ۔

اَلْفَتْحُ ۔ زمین کے بالائی حصہ پر بہتا ہؤا پانی۔ مدد ۔ نُصْرت ۔ دو جھگڑنے والوں کے درمیان فیصلہ کر دینا ۔ (یعنی بات کھول دینا کہ کون جیتا ہے)۔ فَتَحَ الْحَاکِمُ بَیْنَهُمْ ۔ حاکم نے ان کے درمیان فیصلہ کردیا ۔ اَلْاِسْتِفْتَاحُ ۔ کھلوانا چاہنا ۔ فیصلہ یا غلبہ طلب کرنا ۔ مدد طلب کرنا ۔ (۲/۸۹) ۔ اَلْمِفْتَحُ ۔ خزانہ ۔ اَلْفَتَّاحُ ۔ حاکم ۔ بڑا فیصلہ کرنے والا ، مشکل اور پُر پیچ معاملات کو کھولنے والا اور حقائق کو ظاہر کرنے والا ۔ خدا کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے ۔ (۳۴/۲۶) ۔ اَلْفَتْحُ ۔ رزق جسے خدا کسی کے لئے کھول دے* ۔

سورۃ بقرہ میں ہے ۔ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْکُمْ (۲/۷۶) ۔ وہ باتیں جنہیں اللہ نے تم پر واضح کیا ہے ۔ جن کے دروازے تم پر کھول دئے ہیں ۔

سورۃ اعراف میں ہے ۔ رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا (۷/۸۹) ۔ اے ہمارے نشو و نما دینے والے ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان آخری فیصلہ کن بات لے آ ۔ سورۃ ابراہیم میں ہے وَاسْتَفْتَحُوْا ۔ (۱۴/۱۵) ۔ انہوں نے آخری فیصلہ کن بات طلب کرلی ۔ سورۃ سجدہ میں اسی کو یَوْمَ الْفَتْحِ (۳۲/۲۹) کہا گیا ہے ۔ یعنی فیصلہ کن انقلاب کی گھڑی ۔ سورۃ قصص میں قارون کے خزانوں کے لئے مَفَاتِحُ کا لفظ آیا ہے (۲۸/۷۶) ۔ سورۃ نور میں ہے اَوْ مَا مَلَکْتُمْ مَفَاتِحَهٗ (۲۴/۶۱) جن کے مال واسباب کے تم نگہدار ہو ۔ یا جن پر تمہارا کنٹرول ہو ۔ (۳۵/۲) میں یہ مادہ اِمْسَاکٌ (روکنے) کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے ۔

سورۃ الفتح میں ہے ۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا (۴۸/۱) ۔ اسکے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ ہم نے تیرے لئے زندگی کی راہیں کھول دی ہیں ۔ یا علوم و معارف کے دروازے (وحی کے ذریعے) کھول دئے ہیں** ۔ یا ایک واضح ، فیصلہ کن انقلاب عطا کردیا ہے ۔ بہر حال ، قوانین خداوندی کی رو سے مشکلات کا رفع ہو جانا ، رکاوٹوں کا دور ہو جانا ، زندگی کی راہیں کھل جانا ، حقائق کا منکشف ہو جانا ، ایک فیصلہ کن انقلاب برپا ہوجانا اور اسطرح حق و باطل کا نکھر کر الگ الگ ہوجانا ، فَتْحٌ ہے ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

ف ت ر

فَتَرَ - یَفْتُرُ - فُتُوْراً - تیزی کے بعد ساکن ، سختی کے بعد نرم ، ہو جانا - کسی چیز کا دھیما پڑ جانا - اسکی شدت میں کمی آجانا - فَتَرَ الْمَاءُ - پانی کی گرمی کم ہو گئی - اَلْفَاتِرُ - نیم گرم پانی کو کہتے ہیں - فَتَرَ جِسْمُہٗ - اسکے جسم کے جوڑ بند ڈھیلے پڑ گئے - طَرْفٌ فَاتِرٌ - کمزور نگاہ - (یہ اچھی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے - جیسے چشم نیم باز) - اَفْتَرَ الشَّرَابُ - شراب خوار کے نشہ کی مستی ختم ہو گئی ، اور وہ کمزور ہونے لگا * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز میں کمزوری آجانا -

سورۂ انبیاء میں کائناتی قوتوں (ملائکہ) کے متعلق ہے - یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ (۲۱/۲۰) - وہ ہمیشہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں نہایت تیزی سے سرگرم عمل رہتی ہیں اور ان میں کبھی سستی نہیں آتی - فَتَّرَالْعَذَابَ - عذاب کو کم کیا یا اسکے زور کو ہلکا کیا - (۴۳/۷۵) -

نبی اکرمؐ کی بعثت کے متعلق ہے کہ آپ عَلٰی فَتْرَۃٍ مِّنَ الرُّسُلِ (۵/۱۹) تشریف لائے - یعنی اس زمانہ میں جبکہ گذشتہ انبیاء بنی اسرائیل کی رسالت کا اثر دھیما پڑ چکا تھا - رسول اللہؐ سے پہلے آسمانی تعلیم میں گرم جوشی پیدا کرنے کے لئے ایک نئے نبی کی ضرورت ہوتی تھی ، کیونکہ علاوہ دیگر وجوہ و عناصر) اس فَتْرَۃٌ کے زمانہ میں سابقہ نبی کا پیغام بھی اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہتا تھا - لیکن رسول اللہؐ کے بعد اس دعوت میں گرم جوشی پیدا کرنے کے لئے کسی نبی کی ضرورت نہیں رہی - اسلئے کہ حضورؐ کا پیغام قیامت تک اپنی اصلی شکل میں موجود رہیگا - لہذا اس میں گرم جوشی پیدا کرنے کے لئے اس پیغام (قرآن کریم) کو ابھار کر سامنے لانے کی ضرورت ہوگی ، اور یہ کام وارثینِ کتاب (امت محمدیہ) کے کرنے کا ہوگا - اس کا عملی طریقہ یہ ہوگا کہ پھر سے اسی نظام کو قائم کردیا جائے جسے نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کے مطابق قائم کیا تھا -

ف ت ق

فَتَقَہٗ - یَفْتِقُ - (یَفْتُقُ) - اس نے اسکو پھاڑ دیا * -

---

* تاج -

فَتَقَ الثَّوْبَ - کپڑے کو ادھیڑ دیا اور اسکے ٹکڑوں کو الگ الگ کر دیا**- اَلْفَتْقُ - دو ملی ہوئی چیزوں کو الگ کر دینا***- کسی چیز میں کھلاپن اور کشادگی پیدا ہو جانا (ابن فارس)- قرآن کریم میں ارض وسماوات کے متعلق ہے - كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (۲۱/۳۰) - پہلے یہ تمام کائنات ایک ہی ہیولیٰ تھی - بعد میں اس سے مختلف کُرے پیدا ہو گئے (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ر - ت - ق)-

ف ت ل

فَتَلَ - يَفْتِلُ - (رسی وغیرہ کو) بٹنا - بل دینا****- ابن فارس نے یہی اس کے بنیادی معنے بتائے ہیں - اَلْفَتِيْلُ - وہ باریک سی سفید چیز جو کھجور کی گٹھلی کے شگاف میں ہوتی ہے - عرب اس سے قلیل اور حقیر شے کی مثال دیا کرتے ہیں*- قرآن کریم میں ہے - وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (۴/۴۹)- ان کی ذات کی نشوونما میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کی جائے گی - انہیں پورا پورا بدلہ دیا جائے گا - (۱۷/۷۱)

ف ت ن

فَتْنٌ کے بنیادی معنی ہیں سونے یا چاندی کو آگ میں گلانا تاکہ اس کا کھوٹ الگ ہو جائے - چنانچہ وَرِقٌ فَتِيْنٌ جلائی تپائی ہوئی چاندی کو کہتے ہیں - اور دِيْنَارٌ مَفْتُوْنٌ وہ دینار جو آگ میں تپایا گیا ہو*- اسی سے اس کے معنی کسی چیز کی اصلیت کو ظاہر کرنے کے آتے ہیں - چنانچہ اَلْفَتَّانَةُ - کسوٹی کو کہتے ہیں جس پر سونا چاندی کو گھس کر انکی اصلیت کو ظاہر کیا جاتا ہے**- یہیں سے فِتْنَةٌ کے معنی تاؤ دیکر پرکھنے اور آزمائش کرنے کے آتے ہیں*-

نیز اس کے معنی جلانے کے بھی آتے ہیں - فَتَنَتِ النَّارُ الرَّغِيْفَ - آگ نے روٹی جلا دی - اس سے فِتْنَةٌ کے معنی عذاب، مصیبت اور جنگ کے بھی آتے ہیں - نیز گمراہ کر دینے کے*-

فَتَنَهُ - اَفْتَنَهُ کے معنی ہیں اسے پسند کر لیا - اسکو پسند آگیا - چنانچہ کہا گیا ہے کہ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۱۰/۸۵) کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان لوگوں کو ہم پر غلبہ حاصل ہو گیا تو یہ اس فریب میں مبتلا رہینگے کہ یہ ہم سے بہتر ہیں اس لئے اپنے کفر کو

* تاج - ** محیط - *** راغب - ****تاج و ابن فارس-

اور زیادہ پسند کرنے لگ جائیں گے *۔ یا اس کے معنی یہ ھیں کہ ھمیں اس قوم کا تختۂ مشق مت بنا۔

قرآن کریم میں یہ مادہ جنگ کے معنوں میں (۴/۹۱) آیا ھے۔ اور جنگ کے مصائب و مشکلات کے معنوں میں یُفْتَنُوْنَ (۹/۱۲۶) میں۔ صحیح راستے سے ھٹا کر غلط راستے پر لگا دینے کے معنوں میں یہ مادہ (۱۷/۷۳) میں آیا ھے۔ نیز فِتْنَۃٌ (۳۹/۴۹) میں اس کے معنی گمراھی کے ھیں۔ یہی معنی اس مادہ کے (۵/۴۹) اور (۱۷/۷۳) میں ھونگے جہاں اس سے مراد صحیح راستے سے ھٹا دینا ھیں۔ خَیْرٌ کے مقابلہ میں فِتْنَۃٌ (۲۲/۱۱) میں آیا ھے۔ سورۃ "طہ" میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ھے وَفَتَنّٰکَ فُتُوْنًا۔(۲۰/۴۰) ھم نے تجھے کئی کٹھالیوں میں سے گذار کر تیری تربیت کی اور اسطرح تجھے مقام نبوت کے شایان شان بنایا۔ یعنی فِتْنَۃٌ کے معنی ھیں ایسے مواقع بہم پہنچانا جن سے انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نمود ھو جائے اور انسان پر ظاھر ھو جائے کہ اس کی کس حد تک ربوبیت ھوئی ھے۔ جہانتک انسانی معاشرہ کا تعلق ھے اس کا قوانین خداوندی کے مطابق نہ رھنا، فِتْنَۃٌ ھے۔ نیز فتنہ انگیزی (۲/۱۹۳ ; ۸/۳۹)۔ بہ ھیئت مجموعی، یہ لفظ قرآن کریم میں ان رکاوٹوں کے لئے آیا ھے جو دین خداوندی کی راہ میں حائل کی جاتی ھیں۔

ایذا، مصیبت اور تکلیف کے معنوں میں (۲۲/۱۱) میں۔ عذاب (سزا) کے معنوں میں (۳۷/۶۳) میں۔ دھوکا اور فریب کے معنوں میں (۲/۱۰۲) میں۔ نیز المَفْتُوْنُ (۶۸/۶) میں بمعنی فریب خوردہ و گمراہ۔ سزا دینے کے معنوں میں یہ مادہ (۵۱/۱۳) میں آیا ھے اور (۶/۲۳) میں لفظ فِتْنَۃٌ معذرت اور حجت کے معنوں میں آیا ھے۔

ف ت ی

اَلْفَتَاءُ۔ جوانی۔ شباب۔ اَلْفَتِیُ۔ نوجوان۔ اس کے بعد یہ لفظ غلام کے لئے استعمال ھونے لگا، خواہ وہ کسی عمر کا ھو۔ یعنی فَتًی۔ غلام، اور فَتَاۃٌ لونڈی **۔

فَتًی۔ بمعنی نوجوان لڑکا (۱۸/۶۰) میں آیا ھے۔ اس کا تثنیہ فَتَیَانِ ھے (۱۲/۳۶)۔ فِتْیَۃٌ جمع ھے (۱۸/۱۰)۔ نیز فِتْیَانٌ بھی جمع آتی ھے۔ (۱۲/۶۲)۔ فَتَاۃٌ کی جمع فَتَیَاتٌ آتی ھے۔ (۴/۲۵)۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دو ھیں۔ (۱) تازگی اور نیا ھونا۔ شباب اور نوجوانی کا مفہوم اسی سے ھے۔ اور (۲) فیصلہ یا حکم کو واضح کر دینا۔

---

*تاج۔ **تاج و محیط۔

اَفْتٰی - کسی بات کا حکم بیان کر دینا - فتوی دیدینا - کسی سوال کا جواب دیدینا - کہتے ہیں کہ اسکی اصل فَتًی یعنی نوجوان ہے * جو قوت و تازگی رکھتا ہے - گویا فتوی دینے کے لئے علمی قوت و تازگی کی ضرورت ہے ، یا پھر یہ اَلْفُتُوَّۃُ سے ہے جس کے معنی سخاوت کے ہیں * - اَفْتٰی حکم دینا - قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْکُمْ (۴/۱۲۷) - اِسْتَفْتٰی - فتویٰ (حکم یا فیصلہ) طلب کرنا (۴/۱۲۷) -

ف ج ج

اَلْفَجُّ - دو پہاڑوں کے درمیان وسیع راستہ - فِجَاجٌ اسکی جمع ہے** - قرآن کریم میں ہے مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ (۲۲/۲۷) - " ہر دور دراز راستے سے " - اَلْفُجَاجُ بھی اسی کو کہتے ہیں - اَلْفَجُّ - دو چیزوں کے درمیان کشادگی کر دینے اور فاصلہ بڑھا دینے کو کہتے ہیں - اَلْفُجَّۃُ - دو پہاڑوں کے درمیان کشادگی** - قرآن کریم میں ہے وَجَعَلْنَا فِیْهَا فِجَاجًا (۲۱/۳۱)- ہم نے پہاڑوں میں کشادہ راستے بنائے -

ف ج ر

اَلْفَجْرُ کے اصلی معنی پھاڑنے اور شق کر دینے کے ہیں - نیز اس میں میلان اور جھکاؤ (ایک طرف ھٹ جانے) کا مفہوم بھی ہوتا ہے - چنانچہ پہلے مفہوم کی رو سے فَجَرَہٗ - یَفْجُرُہٗ کے معنی ہیں پانی کو پھاڑ کر بہایا - فَجَّرَہٗ تَفْجِیْرًا - شدت سے پانی کو پھاڑ کر بہایا - اَفْجَرَ الْیَنْبُوْعَ - چشمہ کو پھاڑ کر نکالا - اِنْفَجَرَتْ عَلَیْهِمُ الدَّوَاهِیْ - ان پر ہر طرف سے مصیبتیں پھوٹ پڑیں - اَلْفَجْرُ - صبح کی روشنی جو تاریکی کو پھاڑ کر باہر نکل آتی ہے - روشنی کے اعتبار سے طَرِیْقٌ فَجْرٌ واضح راستے کو کہتے ہیں اور پھٹنے کے مفہوم سے اَلْفِجَارُ خود راستوں کو کہتے ہیں* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی کسی چیز میں کشاد اور کھلا پن ہونے کے ہیں -

ایک طرف ھٹ جانے یا جھک جانے کے مفہوم سے فَجَرَ الرَّاکِبُ فُجُوْرًا کے معنی ہیں سوار اپنی زین سے ایک طرف ھٹ گیا - اور فَجَرَ عَنِ الْحَقِّ کے معنی ہیں وہ حق سے ھٹ گیا* - فَاسِقٌ وفَاجِرٌ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے -

---

*تاج و محیط - **تاج -

لیکن اَلْفَجْرُ کے معنی مال و دولت کی فراوانی اور جُود و سخا اور عطیہ کے بھی ہیں - اور اَلْفَاجِرُ - مال دار آدمی کو بھی کہتے ہیں - نیز فِجَارَاتُ الْعَرَبِ - عربوں کے مفاخرات کو - فَجَرَ الرَّجُلُ - آدمی سخی ہو گیا - تَفَجَّرَ بِالْکَرَمِ - اس نے بہت سخاوت کی*-

قرآن کریم میں پہاڑ سے چشمے پھوٹ نکلنے کے لئے یہ مادہ (۲/۶۰ ؛ ۷/۱۶۰) میں آیا ہے - زمین سے چشمے بہہ نکلنے کے لئے (۱۷/۹۰) میں - اور نہریں نکلنے کے لئے (۱۷/۹۱) میں -

سورۃ شمس میں نفسِ انسانی (انسانی ذات) کے متعلق ہے - فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (۹۱/۸) اس کے معنے یہ کئے جاتے ہیں کہ خدا نے انسان کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز کا علم رکھ دیا ہے - (یہ مفہوم کسطرح قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے اس کے لئے ل - ہ - م کا عنوان دیکھئے) - اس مقام پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اس آیت میں فُجُوْرَهَا اور تَقْوٰهَا کہا گیا ہے جو نفس انسانی (انسانی ذات Human Personality) کی دو کیفیتوں کا نام ہے - فَجَرَ کے معنی پھاڑ دینا ہیں - لہذا انسانی ذات کا فُجُوْرٌ اس کا منتشر (Disintegrate) ہو جانا ہے - اور تَقْوٰهَا چونکہ اس کے مقابل میں آیا ہے اس لئے اس کے معنے ہوں گے انسانی ذات کا تشتت و انتشار سے محفوظ رہنا - (Disintegrate نہ ہونا) - اسی وجہ سے دوسری جگہ مُتَّقِیْنَ کے مقابلہ میں فُجَّارٌ آیا ہے (۳۸/۲۸) - فَاجِرٌ کا لفظ (۷۱/۲۷) میں آیا ہے جس کے معنی ہیں خدا کی راہ سے ہٹا ہوا -

درحقیقت ، جو انسان خدا کی راہ سے ہٹتا (اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرتا) ہے اس کی ذات (Personality) میں انتشار (Disintegration) واقع ہو جاتا ہے - اس لئے فاجر وہ ہے جس کی ذات مستحکم ہونے کے بجائے منتشر ہو جائے - نشو و نما یافتہ ذات (Developed Personality) کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ (Integrated) ہوتی ہے - لہذا سورہ شمس کی مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ انسانی ذات میں بننے اور بگڑنے کی صلاحیت رکھدی گئی ہے - اب جو شخص چاہے قوانینِ خداوندی کی نگہداشت سے اپنی ذات کی نشو و نما کر کے اسے مستحکم کر لے - اور جو چاہے اس سے منحرف ہو کر اسے منتشر و متفرق (Disintegrate) کر دے - نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی صلاحیت انسانی ذات میں نہیں - اس کی تمیز صرف وحی کی رو سے ہو سکتی ہے -

*تاج و محیط -

یعنی وحی بتا سکتی ھے کہ خیر کسے کہتے ھیں اور شر کیا ھے ۔ وحی کی راہ نمائی کے بغیر انسان مطلق خیر و شر میں تمیز نہیں کر سکتا ۔ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو وحی کی روشنی کے بغیر خیر اور شر میں تمیز کر سکے۔

ف ج و

اَلْفَجْوَۃُ ۔ کشادگی ۔ دو چیزوں کے درمیان کھلی جگہ ۔ زمین کا وسیع حصہ ۔ فراخ جگہ ۔ وسیع میدان اور صحن ۔ فَجَا بَابَہٗ فَجْوًا ۔ اس نے اپنا دروازہ کھول دیا ۔ اَلْفَجَا ۔ دونوں رانوں یا گھٹنوں یا پنڈلیوں کے درمیان کا فاصلہ* ۔

قرآن کریم میں اصحاب کہف کے متعلق ھے ۔ وَ ھُمْ فِیْ فَجْوَۃٍ مِّنْہُ (۱۸/۱۷) ۔ وہ اس غار کے اندر ایک کھلی جگہ میں تھے ۔

ف ح ش

اَلْفَحْشُ ۔ حد سے بڑھ جانا ۔ زیادتی کر بیٹھنا ۔ کسی بات کا حد سے تجاوز کر جانا ۔ گفتگو میں آداب و احترام کے حدود پھاند جانا ۔ فَحُشَ الْاَمْرُ ۔ معاملہ حد سے تجاوز کر گیا ۔ اَلْفَاحِشُ ۔ حد سے تجاوز کر جانے والا** ۔ قرآن کریم میں فَحْشَاءُ ۔ عَدْلٌ کے مقابلہ میں آیا ھے (۱٦/۹۰) ۔ اور قِسْطٌ کے مقابلہ میں بھی (۷/۲۸-۲۹) ۔ سورۃ احزاب میں یہ لفظ قَنَتَ کے مقابلہ میں آیا ھے ۔ (۳۳/۳۰-۳۱) ۔ قَنَتَ کے معنی قوانین خداوندی کی اطاعت ھیں ۔ (دیکھئے عنوان ق ۔ ن ۔ ت) ۔ اس لئے فُحْشٌ کے معنی حدود خداوندی سے تجاوز اور سرکشی کے ھیں ۔ یعنی خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی فُحْشٌ میں داخل ھے ۔ یا کوئی ذلیل اور شرمناک حرکت (۳/۱۳۴) ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں برائی یا شناعت کے ھیں ۔

فَحْشَاءُ کے معنی بخل ھیں ۔ بخیل کو فَاحِشٌ کہتے ھیں** ۔ اَفْحَشَ اس نے بخل کیا*** ۔ ان معنوں میں یہ لفظ قرآن کریم میں فَضْلٌ کے مقابلہ میں آیا ھے ۔ (۲/۲٦۸) ۔ فَضْلٌ کے معنی ھیں رزق کی کشائش ، وسعت ۔ لہذا فُحْشٌ کے معنی ھونگے رزق کی تنگی ۔ کمی ۔ یا اس کے خرچ میں ھاتھ روک لینا ۔ اسی کو بخل کہتے ھیں۔ یا اس آیت (۲/۲٦۸) میں فَحْشَاءُ کے معنی ھونگے ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنا ۔

---

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

اَلْفَوَاحِشُ - فَاحِشَةٌ کی جمع ہے - اور اَلْفَحْشَاءُ، فَاحِشَةٌ کا اسم ہے* - یعنی حدود فراموشی -

سورۃ بنی اسرائیل میں زنا کو فَاحِشَةٌ میں شمار کیا گیا ہے (۱۷/۳۲) - لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں فَاحِشَةٌ کا لفظ آیا ہے وہاں اس کے معنی زنا ہی کے ہونگے - سورۃ انعام میں ہے ''وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ (۶/۱۵۲)- ''تم فواحش کے قریب مت جاؤ- جو ان میں سے ظاہر ہو اور جو چھپی ہوئی ہو'' - ان کے قریب مت جاؤ- لہذا فواحش میں ہر قسم کی حدود شکنی اور بے حیائی آجاتی ہے - اسی بنیاد پر سورۃ نساء میں جہاں فرمایا کہ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْکُمْ (۴/۱۵) - ''اور تمہاری عورتوں میں سے جو فاحشہ کی مرتکب ہوں تو ان کے خلاف اپنوں میں سے چار گواہ لاؤ'' - تو اس میں فَاحِشَةٌ سے مراد زنا نہیں - اس لئے کہ اول تو زنا کے لئے چار عینی شاہدوں کا ملنا ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ہے - دوسرے زنا کی سزا دوسرے مقام پر خود درّے لکھی ہے (۲۴/۲)- لیکن اس جگہ فَاحِشَةٌ کے جرم کی سزا صرف گھروں میں روک لینا کہا گیا ہے - اس لئے یہاں فَاحِشَةٌ سے مراد زنا سے ورے بے حیائی کی باتیں ہیں جنہیں اگر روکا نہ جائے تو وہ زنا تک منتج ہو سکتی ہیں - قوم لوط کے متعلق کہا گیا ہے اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ (۷/۸۰) - اور اس سے اگلی آیت میں بتا دیا ہے کہ اس سے مراد لواطت ہے (۷/۸۱) - نہ کہ زنا - اور جس طرح دو مردوں کا اختلاط فاحشہ ہے اسی طرح عورتوں کا باہمی اختلاط (سحاقت) بھی فاحشہ ہے -

نیز لفظ فَوَاحِش (بطور جمع) خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ فاحشۃ صرف زنا ہی نہیں، دوسرے بے حیائی کے کام بھی فاحشۃ میں داخل ہیں - حقیقت یہ ہے کہ (پیشہ ور عورتوں سے قطع نظر) فعل زنا کا ارتکاب یک لخت (فوری طور پر) ظہور میں نہیں آجاتا - اس کے لئے (غیر) مرد اور عورت باہمی (ملنے جلنے) کے تعلقات قائم کرتے ہیں - پھر ذرا بات آگے بڑھتی ہے تو ہم آغوشی وغیرہ کی نوبت آتی ہے - اس طرح رفتہ رفتہ جنسی اختلاط (زنا) تک بات پہنچتی ہے - قرآن کریم ان مبادیات کو روکنا چاہتا ہے تاکہ بات آگے بڑھنے نہ پائے - یہ وہ فواحش ہیں جن کا ذکر اوپر (۴/۱۵) میں آیا ہے-

*تاج -

ف خ ر

اَلْفَخُوْرُ - وہ اونٹنی یا بکری جس کے تھن تو بڑے بڑے ہوں لیکن ان میں دودھ بہت کم ہو* - اور دھار بھی پتلی ہو*** - اس سے اَلْفَخْرُ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں - یعنی باتیں بڑی بڑی کرنا لیکن جوہر ذاتی کا بہت کم ہونا - ایسی باتوں پر ناز کرنا جو انسان کے ذاتی جوہر نہ ہوں بلکہ اضافی ہوں - مثلاً حسب و نسب - دولت و حکومت وغیرہ* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی پرانی باتوں کو شمار کرنا ہیں - سورۃ نساء میں بخیل کو فَخُوْرٌ کہا گیا ہے ($\frac{۴}{۳۶}$) - یعنی جس کے تھن بڑے بڑے ہوں لیکن ان میں سے دودھ بہت کم نکلے - سورۃ حدید میں تَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ ($\frac{۵۷}{۲۰}$) آیا ہے - یعنی ایک دوسرے سے بڑا بننے کی کوشش ، ذاتی خصوصیات کے اعتبار سے نہیں بلکہ اضافی نسبتوں کی بنیاد پر - ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ انسان کے اندر ہے ، لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ یونہی نمائشی نسبتوں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کے بجائے جوہر ذاتی میں بڑھنے کی کوشش کرو - ($\frac{۲}{۱۴۸}$) -

اَلْفَخَّارُ - مٹی کے برتنوں کے ٹھیکرے - اصل میں فَخَّارٌ مٹکوں (ٹھلیوں) کو کہا جاتا ہے ** جو اندر سے خالی ہوتے ہیں لیکن بولتے بڑے زور سے ہیں - قرآن کریم میں ہے - خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ ($\frac{۵۵}{۱۴}$) - انسان کو ٹھیکری جیسی سوکھی ہوئی مٹی سے پیدا کیا - (تفصیل اس کی میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں ملیگی) -

ف د ی

فَدَاهُ - یَفْدِیْهِ - فِدَاءً وَفِدًی - اس نے کچھ خرچ کر کے اسے کسی مصیبت سے بچا لیا - تَفَادٰی مِنْهُ - اس سے بچا - اِفْتَدٰی بِهٖ بِکَذَا - اس نے خود کو مال کے عوض چھڑا لیا - فَادَاهُ مُفَادَاةً - اہل لغت نے فَادَاهُ کے مختلف معنی لکھے ہیں - یہ بھی کہ اس نے کچھ دیکر اسے چھڑا لیا - اور یہ بھی کہ اس نے کچھ لے کر اسے چھوڑ دیا - بعض نے کہا ہے کہ مُفَادَاةٌ یہ ہے کہ تم ایک آدمی دیکر اس کے عوض دوسرا آدمی چھڑا لو - اور فِدًی یہ ہے کہ تم روپیہ دیکر اسے خرید لو - لیکن بعض کا خیال ہے کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں **** - بہرحال اس میں کسی کو

*تاج - **راغب - ***ابن فارس - ****تاج و محیط -

بچا لینے کا پہلو بنیادی ہوتا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی یہی ہیں کہ کسی چیز کی حفاظت اور بچاؤ کے لئے اسکی جگہ کسی دوسری چیز کو دے دینا ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ قیدیوں کو کفارہ دیکر چھڑانے کے معنوں میں آیا ہے (۲/۸۵)۔ حضرت اسماعیلؑ کے متعلق ہے ۔ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (۳۷/۱۰۷)۔ یعنی ہم نے اسے ایک بہت بڑی قربانی کے لئے بچا لیا ۔ انہیں حضرت ابراہیمؑ کی چھری سے محفوظ کر لیا اور تولیت کعبہ کی خدمت عظیم ان کے سپرد کر دی (۲/۱۲۵) ۔ یہ بہت بڑی قربانی تھی جس میں تمام آرام اور چین چھوڑ کر اپنے آپ کو عمر بھر کے لئے اس مقصد عظیم کے لئے وقف کر دینا تھا ۔ *یہ تھی وہ قیمت جو اُن سے اُن کی جان کے عوض بطور فدیہ لی گئی تھی ۔*

جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآن کریم میں ہے ۔ فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً ۔ (۴۷/۴)۔ انہیں یا تو بطور احسان چھوڑ دو اور یا ان کا معاوضہ لیکر (قیدیوں کے عوض قیدی یا مال لیکر چھوڑ دو) بہرحال انہیں چھوڑنا ہوگا ۔ لہذا جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لینے کا خیال قرآن کریم سے کھلی ہوئی بغاوت ہے ۔ غلامی کا یہی ایک دروازہ تھا ۔ اسے قرآن کریم نے اسطرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان م ۔ ل ۔ ک)

واضح رہے کہ فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً سے یہ مراد نہیں کہ جنگ کے قیدیوں کو گرفتاری کے فوری بعد رہا کر دینا ہوگا ۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ انہیں غلام بنا کر نہیں رکھا جاسکتا ۔ بہ تقاضائے حالات انہیں قید میں رکھا جاسکتا ہے (فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۔ ۴۷/۴) اس کے بعد جب اثخان (غلبہ) حاصل ہوجائے تو پھر ان کی (Disposal) کا سوال سامنے آئیگا جس کا بہ تقاضائے حالات فیصلہ کیا جائیگا کہ انہیں احساناً چھوڑ دیا جائے یا فدیہ لیکر ۔

ف ر ت

اَلْفُرَاتُ ۔ نہایت شیریں پانی ۔ زمخشری نے کہا ہے کہ اسے فُرَاتٌ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ (یَفْرُتُ الْعَطَشَ) پیاس کو تسکین دیتا ہے *۔ اسکی تیزی کو توڑ دیتا ہے *۔ سورۂ مرسلٰت میں مَآءً فُرَاتًا (۷۷/۲۷) آیا ہے ۔ سورہ فرقان میں عَذْبٌ فُرَاتٌ (۲۵/۵۳) آیا ہے ۔ یعنی بہت شیریں ۔

---

* تاج ۔ راغب ۔ محیط ۔

ف ر ث

اَلْفَرْثُ ۔ غذا جب وہ اوجھڑی کے اندر رہے *۔ سورہ نحل میں ہے کہ تم دیکھو کہ جانور کے پیٹ میں فرث اور خون جیسی اشیاء میں سے کس طرح دودھ جیسی صاف اور لطیف غذا تیار ہوتی رہتی ہے ۔ (۱۶/۶۶) ۔ ویسے اَلْفَرْثُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو ریزہ ریزہ ہو گئی ہو (ابن فارس) فَرَثَ ۔ اس نے بکھیر دیا ۔ فَرَثَ الْحُبُّ کَبِدَہٗ ۔ محبت نے اس کے جگر کے ٹکڑے کر دئے ۔ لہذا فَرْثٌ، غذا کی وہ حالت ہے جس میں وہ معدہ میں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے ۔ اہل لغت نے اس سے گوبر مراد لیا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس سے مراد جانور کی خوراک کی وہ حالت ہے جس میں وہ ھضم ہونے کے لئے ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے ۔ (لین نے بھی تصریح کی ہے)۔

ف ر ج

اَلْفَرْجُ وَالْفُرْجَۃُ ۔ دو چیزوں کے درمیان شگاف یا کشادگی**۔ بَابٌ مَفْرُوْجٌ ۔ کھلا ہوا دروازہ ۔ تَفَارِیْجُ الْاَصَابِعِ ۔ انگلیوں کے درمیانی شگاف ۔ اَلْفَرْجُ ۔ شرمگاہ ، خواہ مرد کی ہو یا عورت کی ۔ نیز ہر خطرہ کی جگہ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ اِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۔ (۷۷/۹) جب آسمان پھٹ جائے گا ۔ کھولدیا جائے گا ۔ دوسری جگہ ہے ۔ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (۸۴/۱) ''جب آسمان شق ہو جائیگا'' ۔ سورۃ قٓ میں ہے مَالَهَا مِنْ فُرُوْجٍ (۵۰/۶) ۔ ان میں کہیں کوئی شگاف نہیں ۔ مطلب نقص اور خرابی سے ہے ۔ جیسا کہ دوسری جگہ ہے هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ (۶۷/۳) ۔ ''کیا تجھے کہیں کوئی خرابی نظر آتی ہے ؟''

قرآن کریم میں حفاظتِ عصمت پر بڑا زور دیا گیا ہے اور اس کے لئے بھی الفاظ آئے ہیں ۔ چنانچہ مردوں کے متعلق ہے ۔ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ (۲۴/۳۰) ۔ اور عورتوں کے متعلق ہے يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (۲۴/۳۱) وہ اپنی عصمت کی حفاظت کریں ۔ حضرت مریم کی پاک دامنی کا اظہار بھی انہی الفاظ سے کیا گیا ہے ۔ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (۲۱/۹۱) جس نے اپنی عصمت کا تحفظ کیا ۔

*تاج ۔ **راغب ۔ ***تاج و محیط ۔

ان مقامات سے ظاہر ہے کہ فَرْجٌ مقام مخصوص ہی کو نہیں کہتے بلکہ عربی محاورہ میں یہ لفظ عصمت کے لئے عام طور پر بولا جاتا ہے۔ برخلاف ہماری زبان کے جس میں فَرْجٌ کا لفظ صرف عورت کی شرمگاہ کے لئے آتا ہے۔ قرآنی آیات میں جہاں یہ لفظ آیا ہے، ان کے ترجمہ میں اس فرق کو ملحوظ رکھنا چاہئیے۔

ف ر ح

اَلْفَرَحُ۔ لسان میں ہے کہ یہ حُزْنٌ کی ضد ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ فوری یا عارضی لذت پر انشراحِ صدر کو کہتے ہیں۔ اور سُرُوْرٌ اس انشراح صدر کو جس میں دل کو فوری اور دیر پا دونوں قسم کا اطمینان حاصل ہو، لیکن کبھی (اس فرق کی رعایت کے بغیر) یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوجاتے ہیں *۔ سورہ یونس میں قرآن کریم کے متعلق ہے۔ فَبِذَالِکَ فَلْیَفْرَحُوْا (۱۰/۵۸)۔ انہیں چاہئیے کہ اس قرآن کریم کے ملنے پر خوشیاں منائیں۔

نیز اس کے معنی اترانے کے بھی ہیں *۔ سورہ نمل میں ہے۔ بَلْ اَنْتُمْ بِھَدِیَّتِکُمْ تَفْرَحُوْنَ (۲۷/۳۶)۔ تم اپنے اس تحفہ پر بڑا ناز کرتے ہو (کہ یہ بہت بڑی چیز ہے)۔ سورۃ قصص میں ہے کہ قارون سے (اسکی قوم کے لوگوں نے) کہا۔ لَاتَفْرَحْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ (۲۸/۷۶)۔ ان مقامات سے ظاہر ہے کہ اس میں اس اوچھے پن کے مظاہرے کی طرف اشارہ ہے جو کم ظرف انسان میں مال و دولت کے مل جانے سے پیدا ہوجاتا ہے۔

سورہ روم میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ تم نے کہیں ایمان لانے کے بعد پھر مشرک نہ بن جانا۔ یعنی فرقوں میں نہ بٹ جانا، جس میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَالَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۲) ہر فرقہ اپنے مسلک پر اتراتا ہے اور مگن ہو رہتا ہے کہ یہی مسلک حق ہے۔ باقی سب باطل پر ہیں۔ بس میرا فرقہ ناجی ہے باقی سب جہنمی ہیں۔

سورہ آل عمران میں یَفْرَحُوْا بِھَا کے مقابلہ میں تَسُؤْھُمْ آیا ہے (۳/۱۱۹)۔ یعنی برا لگنا۔ اور (۱۳/۳۶) میں اس کے مقابلہ میں یُنْکِرُ آیا ہے۔ یعنی ناگوار گزرنا۔ سورہ روم میں اس کے مقابلہ میں یَقْنَطُوْنَ آیا ہے (۳۰/۳۶)۔ ناامید ہو جانا۔ اور سورہ حدید میں تَاْسَوْا (۵۷/۲۳)۔ "افسوس کرنا"۔ اس تقابل سے فَرَحٌ کے معنی اور بھی واضح ہو جاتے ہیں۔

---

*تاج۔

ف ر د

اَلْفَرْدُ ۔ تنہا ۔ اکیلا ۔ زَوْجٌ جوڑے کو کہتے اور ان میں سے ہر ایک فَرْدٌ ہوتا ہے ۔ وہ چیز جس کی مثال و نظیر نہ ہو۔ نَاقَۃٌ فَارِدَۃٌ ۔ وہ اونٹنی جو چراگاہ میں سب سے الگ اکیلی چرتی ہو *۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْفَرْدُ اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کوئی دوسری چیز نہ ملائی گئی ہو۔ یہ لفظ وَتْرٌ سے عام اور وَاحِدٌ سے اخص ہے ۔ مُنْفَرِدٌ کے معنی یکتا (دوسروں سے الگ) ہونگے **۔ سورۂ انبیاء میں ہے کہ حضرت زکریاؑ نے دعا کی رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْداً (۲۱/۸۹)۔ اے میرے نشوو نما دینے والے مجھے تنہا نہ چھوڑ۔ لیکن چونکہ انہوں نے اولاد کے لئے دعا مانگی تھی اس لئے یہاں اس کے معنی ہے اولاد کے ہونگے ۔ سورۃ مریم میں ہے "کُلُّھُمْ اٰتِیْهِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَرْدًا" (۱۹/۹۵) ۔ یعنی اعمال کے ظہور نتائج کے وقت کوئی شخص کسی دوسرے کے نتیجہ میں شریک نہیں ہو سکے گا۔ نہ ہی اس کا کوئی حمایتی ہوگا۔ (اسے (۶/۹۵) میں دھرایا گیا ہے)۔ قانون مکافات کے سلسلہ میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ ہر نفس اپنے اعمال کے نتائج سے خود متاثر ہوتا ہے ۔ اس سے نفس انسانی (Self) کی یکتائی (Uniqueness) اور انفرادیت (Individuality) ثابت ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حریت (Freedom) اور یکتائی ، ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیات ہیں ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ (۶/۹۵) ” اور یقیناً تم ہمارے پاس اسی طرح انفرادیت لئے ہوئے آئے ہو جسطرح ہم نے تمہیں پہلی دفعہ منفرد حیثیت سے پیدا کیا تھا “۔ اس میں انسانی ذات کی انفرادیت کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ انسان اپنی مفاد پرستیوں کے لئے بہت سے لوگوں کو اپنا ساتھی بنا لیتا ہے اور بہت سے مال‌واسباب کو ان کے حصول کا ذریعہ۔ لیکن ان اعمال کا اثر اسکی اپنی‌ذات پر مرتب ہوتا ہے جس میں نہ کوئی دوسرا شریک ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کا مال و اسباب اسے اس سے محفوظ رکھ سکتا ہے ۔

قرآن کریم کا قانون مکافات ایک عظیم حقیقت ہے جسکی بنیادوں پر انسانیت کی ساری عمارت اٹھتی ہے ۔ ہر عمل کا اثر اس فرد کی اپنی ذات پر ہوتا ہے ۔ اس میں سے نہ آپ کوئی حصہ کسی دوسرے کی طرف منتقل کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی دوسرے کے عمل کا اثر آپ کی طرف منتقل ہو کر آسکتا ہے ۔ یہ انسانی ذات کی انفرادیت کی دلیل ہے ۔

---

* تاج ۔ ** راغب ۔

ف ر د س

اَلْفَرْدَسَةُ - وسعت اور فراخی - صَدْرٌ مُفَرْدَسٌ - وسیع اور کشادہ سینہ - رَجُلٌ فَرَادِسٌ - بڑی چوڑی چکلی ہڈیوں والا آدمی - اَلْفَرْدَوْسُ - کھانے میں برکت - ضیافت - کَرْمٌ مُفَرْدَسٌ - انگوروں کی بیلیں جو ٹٹیوں پر چڑھائی گئی ہوں - فِرْدَوْسٌ - سرسبز وادی - باغ اور بستان جس میں ہر قسم کے درخت ہوں - اہل شام بستانوں اور انگوروں کے باغات کو فَرَادِیْسُ کہتے ہیں - بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ رومی یا سریانی ہے - لیکن ابن القطاع نے کہا ہے کہ یہ عربی ہے اور اَلْفَرْدَسَةُ سے مشتق * -

قرآن کریم میں جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ (۱۸/۱۰۷) آیا ہے - یعنی وسیع اور فراخ ، سرسبز اور شاداب باغات - اس دنیا میں ایسا جنتی معاشرہ جس میں ہر قسم کی وسعتیں اور فراخیاں ، سرسبزیاں اور شادابیاں ہوں - اور اخروی زندگی میں ہر قسم کی وسعت اور شادابی -

ف ر ر

اَلْفَرُّ - اَلْفِرَارُ - کسی چیز سے ڈر کر بھاگنا ** - دراصل اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے کھولنے (کَشْفٌ) کے ہیں *** - فَرُّ کے بنیادی معنی جانور کے دانتوں کو کھولنا ہے - اس سے اِفْتِرَارٌ کے معنی ہیں ہنسنے میں دانتوں کا کھل جانا ****- ممکن ہے کہ کھل جانے سے ، بھاگ جانے کے معنی لئے گئے ہوں -

اَلْفَرُّ - بھاگنے والے- فَارٌّ کی جمع ہے- (خود اَلْفَرُّ بھی واحد کے لئے مستعمل ہے) - کَتِیْبَةٌ فَرٌّی - شکست خوردہ فوج جو بھاگ اٹھے *** - قرآن کریم میں یہ لفظ بھاگنے کے معانی میں استعمال ہوا ہے - سورۂ کہف میں فِرَارًا (۱۸/۱۸) آیا ہے - سورۂ مدثر میں ہے فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ (۷۴/۵۱) - شیر سے ڈر کر بھاگے ہیں - سورۂ نوح میں ہے فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآئِیْٓ اِلَّا فِرَارًا (۷۱/۶)- میں نے جتنا انہیں اپنی طرف بلایا یہ اتنا ہی مجھ سے دور بھاگے- سورۂ قیامة میں ہے اَیْنَ الْمَفَرُّ (۷۵/۱۰) - بھاگنے کی جگہ کونسی ہے ؟ یا بھاگ کر کہاں جانا ہے ؟ سورۂ ذاریٰت میں ہے فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ (۵۱/۵۰)- اس کے معنی رجعت الی اللہ - یا قانونِ خداوندی کی طرف لوٹنے کے ہیں - (مزید تشریح ر-ج-ع- کے عنوان میں دیکھئے)

*تاج و محیط - **تاج - ***محیط و ابن فارس ****راغب -

ف ر ش

فَرْشٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو بچھانا ۔ کسی چیز کو پھیلانا ۔ چنانچہ اَلْفَرْشُ اس فرش کو کہتے ہیں جو گھروں میں بچھایا جائے ، نیز کھیتی جو زمین پر خوب پھیل جائے ۔ اور وسیع اور کشادہ فضا کو بھی ۔ اَلْفَرِیْشُ ۔ اس بیل کو کہتے ہیں جو زمین پر پھیل جاتی ہے* ۔

اَلْفَرَاشَۃُ ۔ اُڑنے والے کیڑے مکوڑے کو کہتے ہیں (مثلاً پروانہ ۔ تتلی وغیرہ) ۔ اَلْفَرَاشُ اسکی جمع ہے ۔ ($\frac{۱۰۱}{۴}$) ۔ فِرَاشٌ ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو بچھائی جائے* ۔

سورۃ انعام میں ہے ۔ وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَۃً وَّ فَرْشًا ($\frac{۶}{۱۴۳}$) ۔ فراء نے کہا ہے کہ اس میں حَمُوْلَۃً سے مراد ایسے جانور ہیں جو بوجھ لادنے اور سواری کرنے کے قابل ہوں اور فَرْشًا سے مراد وہ چوپائے ہیں جو اس قابل نہ ہوں ۔* صاحب محیط نے کہا ہے کہ فَرْشًا سے مراد چھوٹی عمر کے اُونٹ ہیں** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ چوپائے ہیں جو ذبح کرنے اور کھانے کے لئے ہی موزوں ہوں ۔

سورۃ رحمٰن میں ہے مُتَّکِـِٔیْنَ عَلٰی فُرُشٍ ($\frac{۵۵}{۵۴}$) ۔ یہ فِرَاشٌ کی جمع ہے ۔ یعنی بچھائی ہوئی چیزیں ۔ سورۃ ذاریات میں ہے ۔ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰھَا ($\frac{۵۱}{۴۸}$) ۔ ہم نے زمین کو پھیلا رکھا ہے ۔ سورۃ واقعہ میں ہے ۔ وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَۃٍ ($\frac{۵۶}{۳۴}$) ۔ یہاں فُرُشٌ سے مراد بیگمات ہیں ۔ اور مَرْفُوْعَۃٍ کے معنے ہیں عالی مرتبت ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْفِرَاشُ ، میاں بیوی میں سے ہر ایک کو کہتے ہیں ، لیکن اس کا صحیح انطباق بیوی پر ہوتا ہے ۔

ف ر ض

اَلْفَرْضُ ۔ کے بنیادی معنی کسی سخت چیز کو کاٹنے کے ہیں ۔ چونکہ جس چیز کو کاٹا جاتا ہے اس کا پہلے اندازہ کیا جاتا ہے کہ اسے کہاں سے اور کیسے کاٹنا چاہئے اس لئے یہ لفظ اندازہ کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا ۔ اندازہ کرنے کے اعتبار سے اَلْفَرِیْضَۃُ مقررہ حصہ کو کہتے ہیں ۔ نیز ہر وہ چیز جسے معین و مقرر کر دیا جائے ۔ اَفْرَضَ لَہٗ ۔ اس کے لئے کسی چیز کو معین و مقرر کر دیا ۔ فَرَضَ لَہٗ فِی الدِّیْوَانِ ۔ اسکی

* تاج ۔ ** محیط ۔

تنخواہ کا رجسٹر میں اندراج کیا ۔ اِفْتَرَضَ الْجُنْدُ ۔ فوج نے اپنی تنخواہ یا واجبات وصول کر لئے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ چونکہ کاٹنے سے چیز نشان زدہ اور متعین ہو جاتی ہے اس لئے اَلْفَرْضُ کو فرض اسی جہت سے کہا جاتا ہے کہ اس کے حدود اور نشانات متعین ہوتے ہیں ۔

قرآن کریم میں عورتوں کے مہر کے لئے فَرِیْضَۃٌ کا لفظ آیا ہے (۲/۲۳۶) ۔ کیونکہ اس کی متعینہ مقدار اپنے اوپر لازم کر لی جاتی ہے ۔ ترکہ کے حصہ کو نَصِیْبًا مَفْرُوْضًا (۴/۷) کہا گیا ہے کیونکہ وہ بھی مقررہ حصہ ہوتا ہے ۔ سورہ توبہ میں جہاں صدقات کی تقسیم کا اصول بیان ہوا ہے اسے فَرِیْضَۃً مِنَ اللّٰہِ (۹/۶۰) کہا گیا ہے ۔ خدا کی طرف سے مقرر کردہ اصول تقسیم ۔ سورہ نور میں ہے سُوْرَۃٌ اَنْزَلْنٰھَا وَ فَرَضْنٰھَا ۔ (۲۴/۱) ۔ وہ سورۃ جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی اور اس میں درج شدہ احکام کو فرض ٹھہرایا گیا ۔ لیکن یہ چیز کسی ایک سورت کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ۔ سارے کا سارا قرآن اسی طرح فرض کر دیا گیا ہے ۔ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ (۲۸/۸۵) ۔ بےشک وہ ذات جس نے تجھ پر قرآن کریم کو فرض قرار دیا ہے ۔ یعنی یہ فرض قرار دے دیا ہے کہ اس کے تمام احکام پر پورا پورا عمل کیا جائے ۔

سورہ بقرۃ میں بنی اسرائیل کی گائے (یا سانڈ) کے متعلق ہے ۔ لَا فَارِضٌ وَّلَا بِکْرٌ (۲/۶۸) ۔ بِکْرٌ جوان کو کہتے ہیں ۔ یا چھوٹی عمر والی کو ۔ اس لئے فَارِضٌ کے معنی ہوئے بڑی عمر والی ۔ معمر و سن رسیدہ ۔ جوہری نے کہا ہے کہ بڑی چیز یا ہر پرانی چیز کو فَارِضٌ کہتے ہیں ، کیونکہ اسی درخت کو کاٹا جاتا ہے جو پرانا اور بڑا ہو چکا ہو* ۔

قرآن کریم نے جس کام کے کرنے کا حکم دیدیا ہے وہ فرض ہے اور جس سے روک دیا ہے وہ ممنوع ہے ۔ لہذا فَرْضٌ کے ساتھ دوسری اصطلاحات (مثلاً واجب ۔ مستحب وغیرہ) ۔ یا دوسری طرف ، حرام کے ساتھ اس قسم کے اصطلاحات (مثلاً مکروہ تحریمی ۔ مکروہ تنزیہی وغیرہ) فقہ کی اصطلاحات ہیں ، قرآنی نہیں ۔

سورہ تحریم میں ہے قَدْ فَرَضَ اللّٰہُ لَکُمْ تَحِلَّۃَ اَیْمَانِکُمْ (۶۶/۲) ۔ اس کے معنی ہیں کہ اللہ نے یہ فرض قرار دیا ہے کہ اس قسم کی قسمیں جن میں حلال کو حرام کر لیا ہو، (کفارہ دیکر) توڑ دی جائیں ۔ سورہ احزاب میں ہے مَا کَانَ عَلَی النَّبِیِّ مِنْ حَرَجٍ فِیْمَا فَرَضَ اللّٰہُ لَہٗ (۳۳/۳۸) ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جن باتوں کو اللہ نے رسول کے لئے معین

*تاج و محیط ۔

کر دیا ہو ان میں درحقیقت کوئی تنگی نہیں ۔ واضح رہے کہ یہ ایک عمومی بات ہے (جیسا کہ اگلی آیت سے ظاہر ہے)۔ اس کا سابقہ آیت (قصہ حضرت زید رضؓ) سے خصوصی تعلق نہیں ۔

ف ر ط

فَرَطَ ۔ اس مادہ میں اصل معنی سبقت کرنے اور آگے بڑھ جانے کے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اِس کے بنیادی معنی کسی چیز کو اسکی جگہ سے ہٹا دینے اور ایکطرف کر دینے کے ہیں ۔ سبقت کرنے والا، دوسروں کو پیچھے ہٹا کر خود آگے بڑھتا ہے ۔ اَلْفُرُطُ ۔ تیز رفتار گھوڑا جو دوسرے گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ کر سب سے آگے بڑھ جائے**۔ اِفْرَاطٌ اور تَفْرِیْطٌ میں فرق یہ ہے کہ اِفْرَاطٌ اس حد سے بڑھ جانے کو کہتے ہیں جو زیادتی اور کمال کی سمت میں ہو، اور تَفْرِیْطٌ اس حد سے بڑھ جانے کو کہتے ہیں جو کمی کی جہت میں ہو*۔ فَرَطَ عَلَیْہِ کے معنی ہیں کسی پر زیادتی کی ۔ جلدی میں اسکے ساتھ ناروا سلوک کیا**۔ قرآن کریم میں ہے ۔ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَا (۲۰/۴۵)۔ ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کرے۔ اسکے برعکس فَرَّطَ کے معنی ہیں کسی بات میں کمی کرنا ۔ کوتاہی کرنا ۔ اسے ضائع کر دینا ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے بھی کہا ہے کہ فَرَّطَ کے معنی ہیں کمی کرنا ۔ اور اَفْرَطَ کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا ۔ قرآن کریم میں ہے قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطْنَا فِیْہَا (۶/۳۱)۔ وہ کہیں گے ہمیں سخت ندامت ہے کہ ہم نے (قانون مکافات کے صحیح اندازہ لگانے میں) کسقدر کمی کی ۔ فَرَّطَ اور اَفْرَطَ کے معنی یہ بھی ہیں کہ کسی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور پھر اس کا خیال تک نہ کیا جائے ۔ فَرِطَتِ النَّخْلَۃُ ۔ کھجور اور اسکے خوشے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا ۔ اَفْرَطَ الْاَمْرَ ۔ وہ اس بات کو بھول گیا ۔ اس نے اس بات کو چھوڑ دیا*۔ قرآن کریم میں ہے وَ اَنَّہُمْ مُّفْرَطُوْنَ (۱۶/۶۲)۔ اور وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہونگے ۔ یعنی دوسرے لوگ ان سے آگے بڑھ جائینگے ۔ جنت اور جہنم میں یہ بنیادی فرق ہے ۔ یعنی جنت میں انسان زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے اور جہنم میں انسان کی نشوونما رک جاتی ہے ۔ اور وہ متحرک کی بجائے جامد ہو جاتا ہے اَلْاَمْرُ الْفُرُطُ ۔ وہ بات جس میں آدمی حد سے بڑھ جائے*۔ قرآن کریم

---

* محیط ۔ **تاج ۔

میں ہے وَ کَانَ اَمْرُہٗ فُرُطًا (۱۸/۲۸) ۔ اس کا معاملہ حد سے گزر چکا ہے ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْفَرْطُ ۔ قصداً آگے بڑھنے کو کہتے ہیں ۔ یعنی اس میں مقصد اور ارادہ کا ہونا ضروری ہے**۔

سورہ انعام میں کہا گیا ہے کہ زمین پر چلنے والے جانور اور ہوا میں اڑنے والے پرندے، تمہاری ہی طرح امم ہیں ۔ اس کے بعد ہے مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ (۶/۳۹) " ہم نے کتاب میں کسی شے کی کمی نہیں چھوڑی " ۔ سیاق کے اعتبار سے یہاں الکتاب سے مراد، کتاب فطرت ہو سکتی ہے ۔ لیکن اگر اس سے مراد خود قرآن کریم ہے تو بھی بات بالکل واضح ہے ۔ قرآن کریم میں جو کچھ بیان ہوا ہے مکمل طور پر بیان ہوا ہے ۔ اس میں کوئی کمی نہیں رکھی گئی ۔ اسکی تائید کئی ایک دیگر مقامات سے بھی ہوتی ہے ۔

ف ر ع

فَرْعُ کُلِّ شَیْءٍ ۔ ہر چیز کے بلند ترین حصے کو کہتے ہیں ۔ چنانچہ اَلْفَرْعَۃُ ۔ پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں ۔ فَارِعَۃُ الْجَبَلِ ۔ پہاڑ کا بلند ترین حصہ* ۔ بلندی کے علاوہ لمبائی کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے ۔ چنانچہ اَلْمُفْرِعُ ۔ ہر لمبی چیز کو کہتے ہیں* ۔ فَرْعُ الشَّجَرِ ۔ درخت کی شاخ کو کہتے ہیں** ، اس لئے کہ وہ اصل (جڑ) کے مُقابلہ میں اونچی ہوتی ہے اور ویسے لمبی بھی ہوتی ہے ۔ قرآن کریم میں آیا ہے اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ (۱۴/۲۴) ۔ اسکی جڑ مضبوط و محکم ہے اور شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں ۔

فرعون

قدیم شاہانِ مصر کا لقب ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان "موسیٰ" ۔

ف ر غ

فَرَغَ ۔ فُرُوْغًا ۔ خالی ہونا ۔ فَارِغٌ ۔ خالی* ۔ وَ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰی فٰرِغًا ۔ (۲۸/۱۰) موسیٰ کی والدہ کا دل صبر سے خالی ہو گیا ۔ (بیچین ہو گیا) ۔ فَرَغَ لَہٗ وَ اِلَیْہِ ۔ ہر طرف سے فارغ ہو کر کسی کی طرف توجہ دینا یا اس کام کا ارادہ کرنا* ۔ سورۂ رحمٰن میں سَنَفْرُغُ لَکُمْ اَیُّہَ الثَّقَلٰنِ (۵۵/۳۱) آیا ہے ۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اے ثقلان جب تمہاری باری آئیگی تو ہم تمہاری طرف توجہ کرینگے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی دوسرے کام میں اس طرح مصروف ہے کہ اسے ثقلان کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ہے ۔

*تاج ۔ **راغب ۔

اَلْفِرَاغُ - ڈول کی وہ سمت جدھر سے پانی انڈیلا جاتا ہے*۔ اَفْرَغَ انڈیلنا - بہانا*۔ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا (۲/۲۵۰) - ہم پر ہمت و استقامت فراوانی سے انڈیل دے۔ اَلْفِرَاغُ - چمڑے کا بڑا وسیع حوض یا برتن*۔

سورة الانشراح میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ اب جو تجھ سے ان تمام تفکرات کو دور کر دیا گیا ہے جن سے تیری کمر ٹوٹ رہی تھی (یعنی نظام خداوندی کے متشکل کرنے کی راہ میں جو مشکلات تھیں انہیں آسان کر دیا گیا ہے) تو اب اپنے پروگرام پر جم کر عمل کر۔ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (۹۴/۷) - یعنی آپ کے پروگرام کا پہلا حصہ جس میں قدم قدم پر مزاحمت ہوتی تھی، اور اس لئے تعمیری کاموں کے لئے یکسوئی نہیں ملتی تھی، ختم ہو گیا ہے۔ اب پورے اطمینان کے ساتھ اس پروگرام کے تعمیری حصہ پر تمام توجہات کو مرکوز کر دیں۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جب مشکلات کا دور ختم ہو جاتا ہے تو پھر انسان اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن نظام خداوندی میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب تخریبی پروگرام کے ابتدائی مراحل ختم ہوتے ہیں اور مخالفتوں پر قابو پا لیا جاتا ہے تو پھر اس پروگرام کا تعمیری حصہ شروع ہوتا ہے۔ اور اس میں پہلے سے بھی زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ تعمیری پروگرام، پوری انسانیت کی نشو و نما پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ کوئی چھوٹا کام نہیں۔

ف ر ق

اَلْفَرْقُ - سر کی مانگ جس سے دونوں طرف کے بال ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے ہیں۔ یہ ہیں اس کے بنیادی معنی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادے کے بنیادی معنی ایک چیز کو دوسری چیز سے جدا کرنا اور الگ کر دینا ہیں۔ اَلْمَفْرَقُ - مانگ نکالنے کی جگہ۔ مَفْرَقُ الطَّرِيْقِ - راستہ کی وہ جگہ جہاں سے اس میں سے نیا راستہ پھٹتا ہو۔ اَلْفَارِقُ - وہ بدلی جو دوسری چھائی ہوئی بدلیوں سے الگ ہو کر برسے۔ اَرْضٌ فَرِقَةٌ - وہ زمین جس کے پودے ایک دوسرے سے فاصلہ پر ہوں*۔

اس اعتبار سے اَلْفَرْقُ کے معنی ہوتے ہیں الگ الگ کرنا۔ فیصلہ کرنا۔ بات کو واضح طور پر الگ الگ کر کے بیان کرنا۔ فَرَقَ لَهُ الطَّرِيْقُ - اس کے لئے دو راستوں میں سے صحیح راستہ واضح ہو گیا۔ فَرَقَ لَهُ اَمْرٌ - بات واضح ہو گئی اور اچھی طرح اس کی سمجھ میں آ گئی*۔ فَرَقَهُ - اسے الگ کیا۔

---

*تاج۔

اَلْفَرْقُ اور اَلْفَرَقُ - ایک پیمانے کو کہتے تھے جو مدینہ منورہ میں مستعمل تھا - اس سے فَرِقَ کے معنی ہیں اس نے پیمانے (برتن) سے پانی پیا * - اَلْفَرِیْقُ - اس جماعت کو کہتے ہیں جو دوسروں سے الگ ہو جائے - تَفْرِیْقٌ کے معنی ہیں فساد کی غرض سے الگ الگ کر دینا - انتشار و تفرق پیدا کر دینا * - اَلْفِرْقُ - الگ ہو جانے والا ٹکڑہ (۲۶/۶۳) - اَلْفِرْقَةُ - جماعت - گروہ (۹/۱۲۲) -

قرآن کو فُرْقَانٌ - کہا گیا ہے (۳/۳) - اس اعتبار سے کہ یہ غلط اور صحیح (حق و باطل) کو بالکل الگ الگ کر دیتا ہے - اور یا اس لئے کہ یہ وہ پیمانہ ہے جس سے ہر شے کی قیمت ماپی جاتی ہے - یعنی مستقل اقدار کا مجموعہ - کتاب موسیٰؑ کو بھی فُرْقَانٌ کہا گیا ہے - (۲/۵۳ و ۲۱/۴۸) - خدا کی وحی فُرْقَانٌ ہوتی ہے - یعنی وہ حق و باطل میں فرق کر دیتی ہے - یَوْمُ الْفُرْقَانِ (۸/۴۱) - اس سے جنگ بدر کا دن مراد لیا جاتا ہے جس میں حق و باطل میں کھلا کھلا امتیاز ہو گیا تھا -

سورۃ انفال میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ اگر تم نے قوانین خداوندی کی نگہداشت کی تو یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (۸/۲۹) - اللہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کر دے گا - مومن ، دنیا میں امتیازی زندگی بسر کرنے کے لئے آتا ہے - ایسی بلند کردار کی زندگی جسے دیکھکر ہر شخص پکار اٹھے کہ یہ عام انسانوں سے ممتاز انسان ہے - مومن کی زندگی ، حق و باطل میں امتیاز کا معیار ہونی چاہئیے - دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان -

قرآن کریم میں ہے کہ خدا نے مسلمانوں کو ایک جماعت (ملت واحدہ) بنایا ہے - اسی جماعت میں الگ الگ فرقوں اور پارٹیوں کا وجود، قرآن کریم کے واضح الفاظ میں شرک ہے (۳۰/۳۲) - اور ایسا کرنے والے مشرکین ہیں (۳۰/۳۲) جن سے اللہ اور رسول کا کوئی واسطہ نہیں رہتا - (۶/۱۶۰) - قرآن کریم کے اس کھلے ہوئے فیصلے کے بعد فرقہ بندی اور پارٹی بازی کے متعلق کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی - وحدت خالق کا عملی ظہور وحدت امت (بلکہ وحدت انسانیت) کی شکل میں ہونا ضروری ہے - لہذا جسطرح الوھیت کے ٹکڑے کرنا شرک ہے اسی طرح وحدتِ اُمت کو پارہ پارہ کرنا بھی شرک ہے - امت کی وحدت کی بنیاد ایک خدا کے ایک ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے پر ہوتی ہے - امت میں تفرقہ کے معنی یہ ہیں کہ مختلف فرقے ، اپنی زندگی مختلف ضوابط کے ماتحت بسر کرتے ہیں ، اور یہ شرک ہے -

---

* تاج -

سورۃ توبه میں قَوْمٌ یَفْرَقُوْنَ آیا ہے (۹/۵۶) - راغب نے فَرَقٌ کے معنے خوف سے دل کا منتشر ہونا کئے ہیں - یعنی خوف سے بد حواس ہو جانے ہیں*- نیز اس کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ خوف زدہ لوگ ہیں جن سے امن نے مفارقت کرلی ہو۔

فَارَقَ - چھوڑ دینا - علیحدہ ہو جانا - فَارِقُوْهُنَّ (۶۵/۲) - ان سے الگ ہو جاؤ۔

ف ر ہ

فَرِهَ - یَفْرَهُ - حاذق اور ماہر ہونا - چست اور پھرتیلا ہونا - حسین و جمیل ہونا - اس سے اسم فاعل فَارِهٌ آتا ہے ، اس کی جمع فَارِهُوْنَ اور فَارِهِیْنَ ہے - اَلْفَارِهَةُ - حسین و ملیح نوجوان لونڈی - نیزبہت زیادہ کھانے والی کو بھی کہتے ہیں - فراء نے کہا ہے کہ فَرِهَ میں ھاء دراصل حاء کی جگہ ہے - یعنی فَرِحَ - جس کے معنے اکڑنا اور اترا کرچلنا ہیں**- قرآن کریم میں قوم ثمود کے متعلق ہے وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ (۲۶/۱۴۹) - اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ تم بڑی مہارت سے پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں محلات اور قلعے بناتے ہو ، اور دوسرے معنی یہ کہ تم پہاڑوں میں اتنے اتنے بڑے مکانات بناتے ہو جن پر تمہیں خاص طور پر فخر ہوتا ہے - اور اگر دونوں معانی کو یک جا سامنے رکھا جائے تو اس سے مراد ایسی حسین و جمیل عمارات ہونگی جنہیں نہایت صنعت کاری اور فخر کے ساتھ بنایا جائے۔

ف ر ی

اَلْفَرْیُ - کھال (یا کپڑے) کو کاٹنا (یا پھاڑنا) ، درست کرنے اور سینے کے لئے - اور اَلْاِفْرَاءُ - اسے خراب کرنے کے لئے کاٹنا یا پھاڑنا - اَلْاِفْتِرَاءُ - کتربیونت کرکے کچھ کا کچھ بنا دینا - یہ اصلاح اور فساد دونوں کے لئے آتا ہے، لیکن اس کا زیادہ استعمال خرابی ہی کے معنوں میں ہوتا ہے***- راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں افتراء جھوٹ ، شرک اور ظلم کے موقعوں پر استعمال کیا گیا ہے -

اَلْفَرِیُّ - گھڑی ہوئی بناوٹی بات - عظیم اور اہم بات - نیز حیرت انگیز اور عجیب سی بات کو کہتے ہیں - چنانچہ کہتے ہیں هُوَ یَفْرِی الْفَرِیَّ -

---

*راغب - **تاج و محیط و راغب - ***تاج و راغب

وہ حیرت انگیز اور تعجب خیز کام کرتا ہے* ۔ سورۃ مریم میں ہے کہ ہیکل کے پیشواؤں نے حضرت مریمؑ سے کہا کہ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا (۱۹/۲۷) ۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہوسکتے ہیں کہ انہوں نے حضرت مریمؑ سے کہا کہ تو نے یہ عجیب حرکت کی ہے کہ رسم و آئین خانقاہیت کے خلاف راہبہ بنکر متاہل زندگی بسر کرنا شروع کردی ۔ اور دوسرے معنی یہ کہ انہوں نے خود حضرت عیسیٰؑ سے متعلق کہا کہ وہ عجیب و غریب سا بچہ ہے جسے حضرت مریمؑ لیے کر آئی ہے ۔ اَلْفَرَىٰ ۔ حیران اور مبہوت ہو جانے کو کہتے ہیں (ابن فارس)۔ اَلْمُفْتَرِيْ ۔ افتراء کرنے والا ۔ کتربیونت کرکے کچھ کا کچھ بنا دینے والا ۔ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ (۱۶/۱۰۱)۔ اور مُفْتَرًى (۲۸/۳۶) بنایا ہوا ۔ افتراء کیا ہوا ۔ اِفْتَرَىٰ عَلٰى ۔ کسی کے خلاف بہتان تراشنا ۔ کوئی بات خود وضع کرکے اسے کسی اور کی طرف منسوب کر دینا ۔ (۳/۹۳) ۔

ف ز ز

فَزَّ فُلَانًا عَنْ مَوْضِعِہٖ ۔ فلاں آدمی کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا ۔ فَزَّ عَنْہُ ۔ وہ اس سے الگ ہو گیا ۔ ایک طرف ہٹ گیا ۔ فَزَّ الظَّبْیُ یَفِزُّ ۔ ہرن گھبرا گیا* ۔ اِسْتَفَزَّہٗ ۔ اسے اس کے گھر سے نکال دیا اور بے قرار کیا ۔ اسے ہلکا اور بے وزن سمجھا ، یا اسے ہلایا اور اپنے ساتھ رکھنا چاہا ۔ اِسْتَفَزَّہُ الْخَوْفُ ۔ اسے خوف نے پریشان کردیا ، اس کی جگہ سے ہٹا دیا اور اپنے ساتھ لئے لئے پھرا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہلکا ہونے کے ہیں ۔ لہٰذا اس لفظ کے معنوں میں دل کا اضطراب بھی شامل ہے اور محسوس طور پر اپنی جگہ سے ہٹ جانا بھی ۔ ہلکا ہو کر اپنے مقام سے اکھڑ جانا دونوں میں شامل ہوتا ہے ۔ یعنی کسی کو گڑبڑا دینا اور اس طرح اسے اس کے مقام سے اکھیڑ دینا ۔ قرآن کریم میں ابلیس سے کہا گیا ہے کہ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ (۱۷/۶۴) ۔ ان میں سے جس پر تیرا زور چل سکے اسے گڑبڑا کر اس کے صحیح مقام (یا راستہ) سے ہٹا دے ۔ فرعون کے متعلق ہے ۔ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (۱۷/۱۰۳) ۔ اس نے چاہا کہ انہیں گڑبڑا کر ان کے مقام سے اکھیڑ ڈالے** ۔ نیز اس کے معنے کسی کی تاک میں رہنے اور دھوکہ دے کر اسے ہلاکت میں ڈال دینے کے بھی آتے ہیں*** ۔

---

*تاج و محیط ۔ **تاج و راغب ۔ ***تاج ۔

ف ز ع

اَلْفَزَعُ۔ گھبراہٹ۔ ڈر۔ مبّرد نے اپنی کتاب کامل میں لکھا ہے کہ اصل میں فَزَعٌ خوف کو کہتے ہیں۔ پھر کنایۃً دشمن وغیرہ کے اچانک حملہ سے مدافعت کے لئے لوگوں کا تیزی سے باہر نکلنا بھی فَزَعٌ کہلانے لگا*۔ راغب نے کہا ہے کہ فَزَعٌ اس انقباض اور وحشت و پریشانی کو کہتے ہیں جو کسی خوفناک چیز کی وجہ سے واقع ہو**۔ اَلْفَزَعُ۔ کسی سے فریاد کرنا۔ اور کسی کی فریاد رسی کرنا۔ دونوں معنی آتے ہیں (اضداد میں سے ہے)۔ فَزِعَ اِلَیْھِمْ۔ اس نے ان سے فریاد کی۔ مدد مانگی۔ فَزَعَھُمْ۔ اس نے ان کی مدد کی۔ ان کی فریاد رسی کی۔ اَفْزَعَھُمْ کے بھی یہی معنی ہیں۔ نیز اس کے معنے انہیں ڈرایا اور ان سے ڈر کو دور کیا، بھی ہیں۔ فَزَّعَہٗ۔ اس نے اسے ڈرایا اور گھبرا دیا۔ فَزَّعَ عَنْہُ۔ اس سے خوف اور گھبراہٹ کو دور کر دیا*۔ (یعنی اس میں سلب ماخذ کا خاصہ ہے)

قرآن کریم میں ہے لَا یَحْزُنُھُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ (۲۱/۱۰۳)۔ سب سے بڑی گھبراہٹ بھی انہیں کبیدہ خاطر نہیں کر سکیگی۔ سورۃ النّمل میں ہے۔ وَھُمْ مِنْ فَزَعٍ یَوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ (۲۷/۸۹)۔ وہ اس دن گھبراہٹ سے محفوظ و مامون رہیں گے۔ اسی سورۃ میں ہے۔ فَفَزِعَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ (۲۷/۸۷)۔ کائنات کی ہر چیز گھبرا اٹھیگی۔ سورۃ سبأ میں ہے۔ حَتّٰی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِھِمْ (۳۴/۲۳)۔ جب ان کے دل سے گھبراہٹ دور کر دی جائے گی۔

ف س ح

اَلْفُسْحَۃُ۔ اَلْفَسَاحَۃُ۔ وسعت اور فراخی۔ فَسُحَ الْمَکَانُ۔ جگہ وسیع ہو گئی۔ اِنْفَسَحَ صَدْرُہٗ۔ اسکا سینہ کھل گیا۔ انشراح صدر ہوا۔ فَسَحَ لَہٗ فِی الْمَجْلِسِ۔ اس نے محفل میں اس کے لئے جگہ کر دی*۔ قرآن کریم میں ہے۔ اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ (۵۸/۱۱)۔ جب تم سے کہا جائے کہ مجالس میں کھل کر بیٹھو تو تم کھل کر بیٹھ جایا کرو۔ اللہ تمہارے لئے کشادگی اور وسعت پیدا کر دے گا۔

---

* تاج۔ ** راغب۔

ف س د

فَسَدَ الشَّیْءُ کے معنی ہیں کسی چیز کا مضمحل ہو جانا ۔ اس کا اپنی اصلی حالت پر باقی نہ رہنا ۔ لَحْمٌ فَاسِدٌ اس گوشت کو کہتے ہیں جو گل سڑ کر بدبودار ہو گیا ہو اور کسی کام کا نہ رہا ہو۔ فَسَادٌ درحقیقت صَلَاحٌ کی ضد ہے ۔ صَلَاحٌ کے معنی ہیں حالات کا مستقیم و متوازن رہنا ۔ لہذا فَسَادٌ کے معنی ہیں توازن کا بگڑ جانا ۔ بے ترتیبی (Disorder) پیدا ہو جانا * ۔ [اس کے واضح مفہوم کے لئے ص ۔ ل ۔ ح کا عنوان دیکھئے کیونکہ جب تک صَلَاحٌ کا صحیح تصور ذہن میں نہ آئے اس کی ضد (فَسَادٌ) کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا]۔

قرآن کریم نے مُفْسِدِیْنَ کے مقابلہ میں مُصْلِحِیْنَ کا لفظ استعمال کیا ہے (۲/۱۱) ۔ حرث و نسل کے تباہ کر دینے کو بھی فَسَادٌ قرار دیا ہے (۲/۲۰۵) ۔ ماپ تول کو پورا نہ رکھنا ۔ دوسروں کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دینا ۔ معاشی ناہمواریاں پیدا کر دینا ۔ لوگوں کے حقوق کو دبا لینا ۔ یہ سب فَسَادٌ ہے (۷/۸۵ ; ۲۶/۱۸۳) ۔ صالح نظام کو درہم برہم کر دینا ۔ صحیح ترتیب کو الٹ دینا بھی فَسَادٌ ہے ۔(۷/۵۶) ۔ ارتکاب جرم کو بھی فَسَادٌ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ (۱۲/۷۳) ۔ فَسَادٌ درحقیقت معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہونے کا نام ہے ، خواہ اسکی شکل کوئی بھی ہو۔ اس سے معاشرہ کا توازن بگڑ جاتا ہے ۔ دولت کے نشہ میں بدمست ہو کر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں ۔ (۲۷/۳۴) ۔ نیز ’’ حکمت فرعونی ‘‘ کا بھی یہی شیوہ ہوتا ہے کہ ملک میں مختلف پارٹیاں پیدا کرکے معاشرہ کے توازن کو بگاڑتے رہیں (۲۸/۴) ۔ منشائے خداوندی کے مطابق صحیح زندگی یہ ہے کہ خدا کے عطا فرمودہ رزق کے سرچشموں سے بقدر ضرورت لیا جائے اور اس سے زیادہ پر قبضہ کرکے معاشرہ کا توازن نہ بگاڑا جائے ۔ (۲/۶۰)۔

سورہ شعراء میں مُسْرِفِیْنَ کو مُفْسِدِیْنَ کہا گیا ہے (۲۶/۱۵۱-۱۵۲) اور سورہ قصص میں یہ لفظ اَحْسَنَ کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ (۲۸/۷۷)۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ ملائکہ نے کہا کہ آدم ارض میں فساد مچائیگا اور خون ریزیاں کریگا۔ اس کے برعکس، نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ (۲/۳۰)۔ ہم تیری مشیت کے پروگرام کو سزاوار حمد و ستائش بنانے کے لئے ہر وقت مصروف عمل رہتے ہیں اور اس کے لئے جہانتک بھی جانا پڑے جاتے ہیں ۔

*محیط ۔ تاج ۔ لین ۔

اس سے ظاہر ہے کہ اللہ نے جو پروگرام انسانوں کے لئے (بذریعہ وحی) تجویز کیا ہے، اسکی خلاف ورزی کرنا فَسَادٌ ہے۔ اس سے انسان کی اپنی ذات میں انتشار (Chaos) پیدا ہوتا ہے اور معاشرہ میں بد نظمی (Disorder) - کائنات کا یہ عظیم القدر اور محیرالعقول سلسلہ اس نظم و ضبط اور حسن و خوبی سے اس لئے چل رہا ہے کہ اس میں صرف ایک خدا کا قانون نافذالعمل ہے۔ اگر اس میں متعدد "خداؤں" کا اقتدار کار فرما ہوتا تو اس میں فساد برپا ہو جاتا۔ لَوْ كَانَ فِيْهِمَا آلِهَةٌ اِلَّا اللهُ لَفَسَدَتَا (۲۱/۲۲)۔ انسانی زندگی بھی اسی حسن و خوبی سے اسی صورت میں بسر ہو سکتی ہے جب یہ خدائے واحد کے ضابطہٗ واحد کے ماتحت بسر کی جائے۔

ف س ر

اَلْفَسْرُ۔ واضح کرنا۔ چھپی ہوئی چیز کو کھول دینا۔ فَسَرَ۔ يَفْسِرُ اور يَفْسُرُ۔ واضح کرنا۔ فَسَّرَ کے بھی یہی معنی ہیں، لیکن اس میں مبالغہ کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ اَلتَّفْسِرَةُ۔ قارورہ کا امتحان (Test) کرنا *۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے متعلق کہا ہے وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا (۲۵/۳۳)۔ اسکی نہایت عمدہ و ضاحت اور تشریح خود خدا نے کر دی ہے۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (۷۵/۱۹) اسے ظاہر اور واضح کرنا بھی ہمارے ہی ذمے ہے۔ قرآن کریم کی یہ تفسیر و توضیح، تصریف آیات کے ذریعے ہوتی ہے۔ یعنی ایک بات کو مختلف آیات میں پھیر پھیر کر بیان کرنے سے۔ (۶/۱۰۶، ۱۵/۱۰)۔ اس لئے قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن کریم ہی سے ہوگی۔ اور اس کے دعاوی کی تائید اور شہادت کائنات کے نظم و نسق اور تاریخی شواہد سے۔ یا اس کے نظام کو عملاً متشکل کرنے سے جو درخشندہ نتائج سامنے آئیں، ان سے۔

ف س ق

فِسْقٌ۔ دائرہ حق سے باہر نکل جانا۔ فَسَقَتِ الرُّطَبَةُ عَنْ قِشْرِهَا۔ گدری کھجور اپنے چھلکے سے باہر نکل گئی۔ کھجور کے پھل کے اوپر ایک چھلکا ہوتا ہے جس کے اندر وہ پھل نشو و نما پاتا اور پختگی تک پہنچتا ہے (یہی صورت ہر پھل کے ساتھ ہوتی ہے)۔ وہ چھلکا گویا اس پھل کا قالب (Pattern) ہوتا ہے جس کے اندر اس کی صلاحیتوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ پھل ایک طرف سے

*تاج۔ محیط۔ راغب۔

چھلکے سے باھر نکل جاتا ہے اور اس طرح اپنی پختگی تک نہیں پہنچتا ۔ عرب اس کیفیت کو بیان کرنے کے لئے فَسَقَتِ الرُّطَبَةُ عَنْ قِشْرِهَا کہتے تھے ۔ جاھلیت عرب میں یہ لفظ اسی مفہوم کے ادا کرنے کے لئے بولا جاتا تھا ۔ انسانوں کے لئے نہیں بولا جاتا تھا* ۔ قرآن کریم نے اسے انسانوں کے لئے استعمال کیا ۔ قرآن کریم ایک ایسا نظام معاشرہ یا زندگی کا قالب عطا کرتا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے افراد کی صلاحیتوں کی صحیح صحیح نشو و نما ہو جاتی ہے ۔ جو فرد (یا گروہ) اس نظام کے قالب سے باھر نکل جائے اسے فَاسِقٌ کہتے ہیں ۔ اس کی صحیح نشو و نما نہیں ہوسکتی۔ لہذا ہرشخص جو قانونِ خداوندی کے دائرے سے باھرنکل جائےوہ فاسق ہے۔ قرآن کریم میں جہاں یہ لفظ پہلی مرتبہ آیا ہے وہاں اسکی تشریح ان الفاظ سے کی گئی ہے ۔ اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ (۲/۲۶-۲۷) ۔ یعنی فاسقین وہ ہیں جواللہ سےپختہ عہد باندھ کر اسے توڑ دیتے ہیں اور جس رشتہ کو ملانے کا خدا نے حکم دیا ہے (یعنی نوع انسانی کا رشتہ) اسے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں ۔ اور انسان کی تمدنی زندگی میں ناھمواریاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ذرا آگے چل کر ظَالِمِيْنَ کو بھی فَاسِقِيْنَ کہا گیا ہے (۲/۵۹) ۔ اور کَافِرِيْنَ کو بھی (۲/۹۹) ۔ نیز معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے گریز کی راہیں نکالنے والوں کو بھی (۳/۸۱) ۔ سورۃ المائدہ میں فِسْقٌ کا لفظ احکام خداوندی کی خلاف ورزی کے لئے بولا گیا ہے خواہ وہ حکم چھوٹا ہو یا بڑا (۵/۳) ۔ یعنی ہر مجرم فاسق ہے ۔ اس لئے کہ کھجور کے چھلکے میں ذرا سا شگاف بھی پھل میں نقص پیدا کر دیتا ہے ۔ مومن اور فاسق ایک دوسرے کی ضد ہیں ۔ (۳/۱۰۹) ۔

سورۃ بقرہ میں ہے ۔ "لَا فُسُوْقَ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ" ۔ (۲/۱۹۷) ۔ اسکے عام معنی گالی گلوچ کئے جاتے ہیں ۔ لیکن اس کا مفہوم یہی ہے کہ حج میں کوئی بات بھی ایسی نہیں کرنی چاہئے جس سے انسان صحیح راستے سے ذرا بھی ادھر ادھر ہوجائے ۔ ایک دوسرے سے سخت کلامی اور سب و شتم بھی اس کے اندر آجاتے ہیں ۔

ف ش ل

فَشِلَ ۔ يَفْشَلُ ۔ کمزور اور بزدل ہو جانا * ۔ اصل میں اَلْفِيْشَلُ ھودج کے پردے کو کہتے ہیں جس کے پیچھےعورتیں بیٹھتی ہیں، یا وہ گدّا

---

*تاج و محیط ۔

جیسے ھودج میں بچھا کر اس پر عورتیں بیٹھتی ھیں - اسلئے فَشِلَ کے معنی ھوئے عورتوں کی طرح بزدل ھو جانا - اَلْیَدُ الْفَشْلَاءُ - بائیں ھاتھ کو کہتے ھیں جو عموماً (دائیں کی نسبت) کمزور ھوتا ھے ** - (یہ عوام کی بولی ھے ، فصیح نہیں) - اس لئے فَشَلٌ میں کمزوری کے ساتھ بزدلی کا مفہوم پایا جاتا ھے *** - قرآن کریم میں ھے - وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا (۸/۴۶) - آپس میں چھینا جھپٹی (تنازع اور جھگڑا) مت کرنے لگ جاؤ - اگر تم نے ایسا کیا تو اس کا نتیجہ یہ ھوگا کہ تم کمزور اور بزدل ھو جاؤ گے - عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر بیٹھ جاؤ گے -

ابن فارس نے کہا ھے کہ تَفَشَّلَ الْمَاءُ کے معنی ھیں پانی بہ پڑا - اس سے بھی کمزوری اور عدم استحکام کا مفہوم واضح ھے ، یعنی قوتوں کے بیکار ضائع ھو جانے سے کمزور ھو جانا -

ف ص ح

اَلْفَصْحُ - واضح اور ظاھر ھونا - آئمہ اشتقاق نے کہا ھے کہ اس ترکیب میں ''ظہور'' یعنی ظاھر ھونے کا مفہوم مضمر ھوتا ھے - ایسی زبان جس سے مطلب بالکل ظاھر اور واضح ھو جائے فَصِیْحٌ کہلائیگی - نیز وہ آدمی بھی فَصِیْحٌ کہلائیگا جو بات کو واضح اور کھول کر بیان کرے اور اس کے بیان میں کوئی نقص اور خامی نہ ھو - اَلْفَصَاحَۃُ بات کا واضح اور صاف ھونا - خوش بیانی - اَفْصَحَتِ الشَّاۃُ - (پیوسی - یعنی بچہ دینے کے بعد ایک دو دن تک جس قسم کا دودھ ھوتا ھے - اس کے بعد) بکری نے صاف دودھ دیا - اَفْصَحَ الصُّبْحُ - صبح روشن اور نمودار ھوگئی - فَصْحٌ اس دودھ کو بھی کہتے ھیں جس کے اوپر سے جھاگ اتار کر بالکل صاف کر لیا جائے - اس لئے کسی چیز کو ان چیزوں سے صاف کردینا جو اس میں بالعموم مل جاتی ھیں اَلْفَصْحُ کہلاتا ھے **** -

قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کا قول (حضرت ھارونؑ کے متعلق) ھے - ھُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ (۲۸/۳۴) - وہ مجھ سے زیادہ فصیح ھے -

ف ص ل

اَلْفَصْلُ - دو چیزوں کے درمیان روک جو یہ بتا دے کہ یہاں تک پہلی چیز ختم ھوگئی اور اسی کے بعد دوسری چیز شروع ھوگئی (لطائف اللغۃ) -

*تاج - **محیط - ***راغب - ****تاج و محیط و راغب -

دو چیزوں میں سے ایک کو دوسری سے اس طرح الگ کر دینا کہ ان کے درمیان فاصلہ ہو جائے اور اس طرح ایک دوسری سے الگ اور متمیز ہو جائے* ۔ اَلْفَاصِلَةُ ۔ اس موتی کو کہتے ہیں جو دو موتیوں کے درمیان امتیاز کے لئے ڈال دیا جائے ۔ اَلْمَفَاصِلُ ۔ جسم کے جوڑ ۔ نیز پہاڑوں کے درمیان کی جگہیں جن سے پانی بہتا ہے ۔ فَصْلُ الْخِطَابِ (۳۸/۲۰) ۔ فیصلہ کن بات ۔ اَلتَّفْصِیْلُ ۔ جدا جدا کردینا، واضح کردینا، متمیز کردینا ۔ آیَاتٌ مُفَصَّلَاتٌ ۔ واضح آیات ۔ اَلْاِنْفِصَالُ ۔ انقطاع ۔ جدا ہوجانا ۔ فِصَالٌ بچے کا دودھ چھڑانا* ۔ (۲/۲۳۳) ۔ فَصَّلَ الشَّیْئَ ۔ چیز کو الگ الگ حصوں میں متمائز کر دینا ۔ فَصَّلَ الْکَلَامَ ۔ کلام کو واضح کر دینا ۔ کھول کر بیان کر دیا** ۔ فَصِیْلَةُ الرَّجُلِ ۔ خاندان (۷۰/۱۳)* ۔ فَصَلَ مِنَ الْبَلَدِ ۔ وہ شہر سے روانہ (جدا) ہوگیا* ۔ (۲/۲۴۹) ۔

قرآن کریم کے متعلق تَفْصِیْلَ الْکِتَابِ (۱۰/۳۷) ۔ نیز اَلْکِتَابَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۵) کہا گیا ہے ۔ عام طور پر تفصیل کے معنی (Details) لئے جاتے ہیں اور مفصل کے معنی (Detailed) ۔ اس لئے جب قرآن کریم کو مُفَصَّلٌ کہا جاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اس میں تمام باتوں کی تفاصیل (Details) دی ہوئی ہیں ۔ لیکن ، جیسا کہ اوپر دیکھا جاچکا ہے ، تَفْصِیْلٌ کے معنی وضاحت ہیں اور مُفَصَّلٌ کے معنی واضح ۔ یعنی جس میں ہر بات نکھار کر اور الگ الگ کرکے (Distinctly) بیان کی گئی ہو*** ۔ قرآن کریم ایک واضح کتاب ہے جس کے مطالب میں کوئی ابہام (Confusion) نہیں ۔ لیکن اس میں تمام امور کی تفاصیل (Details) نہیں دی ہوئیں ۔ اس نے (بجز چند احکام کے) اصولی قوانین بیان کئے ہیں جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں ۔ ان اصولی قوانین کی تفاصیل و جزئیات قرآنی نظام کو قائم کرنے والی جماعت اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق ، باہمی مشاورت سے ، خود طے کریگی ۔ ان تفاصیل میں زمانہ کے تغیرات کے ساتھ ساتھ مناسب رد و بدل ہوتا رہے گا لیکن قرآن کریم کے اصول اپنی جگہ غیر متبدل رہیں گے ۔ یہی اَلدِّیْنُ الْقَیِّمُ ہے (۳۰/۳۰) اور یہی مستقل اقدار ۔ کُتُبٌ قَیِّمَةٌ (۹۸/۳) ۔

پھر سمجھ لیجئے کہ تَفْصِیْلٌ کے معنی توضیح اور تشریح کے ہیں اور مُفَصَّلٌ کے معنی واضح اور صاف ، متمیز ، نکھرا ہوا ۔ (Distinct) نہ کہ (Detailed) ۔ *یعنی ایسا جس میں ہر اصولی حکم کی جزئیات تک بھی دی گئی ہوں۔*

---

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔ ***ابن قتیبہ القرطین ج/۱ صفحہ ۲۰۷ ۔

ف ص م

فَصَمَ - کسی چیز کو اس طرح توڑ دینا کہ وہ دو ٹکڑے نہ ہو بلکہ جڑی رہے - یہ لفظ بالعموم ایسے موقعوں پر استعمال ہوتا ہے جب کسی کڑی یا حلقے کا منہ کھل جائے لیکن وہ ٹوٹے نہیں - ابو عبید نے کہا ہے کہ اَلْفَصْمُ یہ ہے کہ کوئی چیز صرف تڑخ جائے اور وہ جدا نہ ہو - اور اَلْقَصْمُ - اس طرح توڑنے کو کہتے ہیں کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے - اِنْفَصَمَ - ٹوٹ گیا - کٹ گیا* -

سورۃ بقرۃ میں خدا پر ایمان کے متعلق ہے کہ یہ اس قابل اعتماد قانون حیات پر ایمان ہے ، لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶) - جس کا ٹوٹنا تو ایک طرف اس میں تڑخ تک بھی نہیں آسکتی - اس پر پورا پورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے -

ف ض ح

اَلْاَفْضَحُ - ایسی سفید چیز جسکی سفیدی شدید نہ ہو - اَفْضَحَ الصُّبْحُ - صبح ظاہر اور روشن ہو گئی - چنانچہ اَلْفَضَحُ خود صبح کو کہتے ہیں - اس سے فَضَحَهُ فَضْحاً کے معنی ہوتے ہیں کسی کے عیب کو ظاہر کر دینا - اِفْتَضَحَ کے معنے ہیں آدمی کا کسی برے کام کو کرنا اور اس کے ساتھ مشہور ہو جانا - اسکی برائیوں کا کھل جانا - اَلْفَضِيْحَةُ - رسوائی کو کہتے ہیں - یعنی برائیوں کا کھل جانا ** -

قرآن کریم میں یہ لفظ رسوا کرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے - فَلَا تَفْضَحُوْنِ (۱۵/۶۸) - تم میری فضیحت نہ کرو - مجھے رسوا نہ کرو - یعنی لَا تُخْزُوْنِ (۱۵/۶۹) مجھے شرمندہ نہ کرو -

ف ض ض

اَلْفَضُّ - بکھیر دینا - مجتمع ہونے کے بعد متفرق کر دینا - توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دینا - اِنْفَضَّ - ٹوٹ کر بکھر جانا ، متفرق ہو جانا - فَضٌّ مِنَ النَّاسِ - متفرق لوگ * -

سورہ آل عمران میں ہے لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (۳/۱۵۸) - وہ تیرے ارد گرد سے بکھر جاتے - تجھ سے الگ ہو جاتے - سورۃ جمعۃ میں ہے ..... اِنْفَضُّوْا اِلَيْهَا (۶۲/۱۱) - (مجمع کو چھوڑ کر) اس چیز کیطرف متفرق و منتشر ہو کر چل دیتے ہیں -

---

*تاج - **تاج و محیط - *راغب -

فِضَّةٌ - چاندی (۳/۱۳) - فَضَّضَ الشَّیْئَ - کسی چیز پر چاندی چڑھائی -

ف ض ل

اَلْفَضْلُ - نقص (کمی) کی ضد ہے - راغب نے کہا ہے کہ فَضْلٌ کے معنی ہیں کسی چیز کا متوسط ضرورت سے زائد ہونا - فَضْلٌ زیادہ تر اچھی باتوں میں استعمال ہوتا ہے - اور فُضُوْلٌ بری باتوں میں - اَلْفَضِیْلَةُ کے معنی مرتبہ کی بلندی اور برتری کے ہیں - (یہ نَقِیْصَةٌ کی ضد ہے -) یعنی بھلائی کی کثرت اور زیادتی - تَفَضَّلَ عَلَیْهِ - وہ اس سے فضیلت و برتری میں بڑھ گیا - یا اس کے معنی ہیں اس نے اسپر احسان کیا اور اپنے زیادہ مال سے اسے دیدیا - فَوَاضِلُ الْمَالِ - مال کا منافع - مثلاً زمین کی پیداوار ، جانوروں کا کرایہ ، دودھ یا اون وغیرہ* -

قرآن کریم میں یہ مادہ باب تفعیل سے فضیلت دینے کے معنوں میں آیا ہے - وَفَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ (۲/۴۷) میں نے تمہیں تمہاری ہم عصر اقوام پر فضیلت اور برتری عطا کی - رسول اللہ کو وحی کے وہبی طور پر ملنے کو بھی فَضْلٌ کہا گیا ہے - (۲/۹۰) - لیکن عام طور پر یہ مادہ معاشی خوش حالی کے معنوں میں آیا ہے - مثلاً لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (۱۶/۱۲) کے معنی ہیں تلاش معاش - میدان جنگ کی فتوحات کو بھی فَضْلٌ کہا گیا ہے (۳/۱۷۴) - مصائب اور ناخوشگوار حوادث کے مقابلہ میں بھی یہ لفظ آیا ہے (۲/۲۷۰-۲۶۸) - اور فَحْشَاءُ (بخل) کے مقابلہ میں بھی (۲/۲۶۸) -

لہذا فَضْلٌ کا عمومی مفہوم زندگی کی خوش حالیاں اور معاشی فارغ البالیاں ہیں جن کے حاصل کرنے کی مؤمنین کو تاکید کی گئی ہے (۶۲/۱۰) - سورہ بنی اسرائیل کی آیات (۱۷/۲۱-۱۸) میں اس مفہوم کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے ، جہاں مختلف روش پر چلنے والی قوموں کیطرف اشارہ کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ - دیکھو ہم نے کسطرح ایک قوم کو دوسری قوم کے مقابلہ میں زیادہ خوش حالیاں عطا کی ہیں - یہ اس کا عمومی مفہوم ہے - خصوصی مفہوم ہر وہ نعمت ہے جو خدا کی طرف سے انسان کو ملے جس میں وحی بھی شامل ہے کیونکہ وہ سب سے بڑی نعمت ہے جو انسان کو عطا کی گئی ہے - تمام قومی امتیازات اور ملی سرفرازیاں خدا کا فضل ہیں - اور اپنی ہم عصر اقوام کے مقابلہ میں ممتاز پوزیشن کا حاصل ہو جانا بھی اسکی نعمت ہے (۲/۴۷) -

---

*تاج - **محیط -

سورۃ النحل میں ہے وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ۔ یعنی جہانتک رزق کمانے کی استعداد کا تعلق ہے وہ مختلف انسانوں میں مختلف ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جس شخص کو خدا نے زیادہ استعداد دی ہے وہ یہ سمجھ لے کہ وہ اس استعداد سے جسقدر زیادہ کمالے وہ اس کا مالک ہے اور اس میں کسی اور کا حصہ نہیں۔ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ۔ جن لوگوں کو زیادہ استعداد دی گئی ہے وہ زائد رزق کو اپنے ماتحتوں کی طرف نہیں لوٹاتے اس خیال سے کہ اسطرح رزق سے فائدہ اٹھانے کے معاملہ میں سب مساوی ہو جائینگے۔ ان لوگوں کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (١٦/٧١)۔ یہ لوگ خدا کی دی ہوئی نعمت سے انکار کرتے ہیں۔ یعنی زیادہ رزق کمانے کی استعداد، خدا کی طرف سے بلامعاوضہ ملی تھی۔ یہ لوگ اس استعداد کے ماحصل کو اپنی واحد ملکیت قرار دیکر اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے بلامعاوضہ ملی تھی۔

یہ آیت (اور اسی قسم کی دیگر آیات۔ مثلاً ٦/٤٦ : ٢٣/٤٢ : ٥٦/٦٣-٦٤ : ٢/١٠ وغیرہ) قرآن کریم کے معاشی نظام کی اساس و بنیاد ہیں۔ اس نظام کی رو سے ہر شخص صرف اپنی محنت کے ماحصل کا حقدار ہے۔ مؤمنین کا فریضہ یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرکے کمائیں اور اپنی ضرورت سے زائد رزق، دوسرے لوگوں کی پرورش کے لئے کھلا چھوڑ دیں۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب نظام ربوبیت میں ملیگی)۔

ف ض و

اَلْفَضَاءُ۔ صحن۔ وسیع زمین۔ وسیع جگہ *۔ اَلْفَضَاءُ۔ پانی جو زمین پر بہہ رہا ہو *۔ اَفْضٰى فُلَانٌ اِلٰى فُلَانٍ۔ فلاں آدمی فلاں تک پہنچ گیا *۔ اسی سے کنایۃً اَفْضَى الرَّجُلُ اِلَى الْمَرْاَةِ عورت سے جماع کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ اَلْاِفْضَاءُ درحقیقت آخر تک پہنچنے کو کہتے ہیں اور یہ کنایہ ہے خلوت اور مباشرت سے *۔ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ (٤/٢١) میں یہی مفہوم ہے۔ یعنی آزاد فضا میں بے روک ٹوک تم ایک دوسرے سے ملتے رہے۔

ف ط ر

اَلْفَطْرُ۔ پھاڑنا۔ شق کرنا۔ پہلی مرتبہ پھاڑنا۔ (پہلی مرتبہ کی خصوصیت اس کے بنیادی معنوں میں داخل ہے) چنانچہ ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ

*تاج۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کیا ہوتا ہے ، حتیٰ کہ میرے پاس دو اعرابی (بدو) آئے جو ایک کنویں کے متعلق جھگڑ رہے تھے ۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اَنَا فَطَرْتُھَا ۔ یعنی اس کے کھودنے کی ابتداء میں نے کی تھی ۔ لہذا فَطَرَ کے معنی ہیں کسی چیز کو پہلی مرتبہ کرنا ۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے اَنَا اَوَّلُ مَنْ فَطَرَ ھٰذَا ۔ میں وہ پہلا شخص ہوں جس نے اسکی ابتدا کی ہے*۔ اس لئے فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۶/۱۴) کے معنی ہیں وہ خدا جس نے پہلی مرتبہ کائنات کی تخلیق کی ہے ۔ اسی کو بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہا گیا ہے (۶/۱۰۲) ۔ سورہ بنی اسرائیل میں فَطَرَکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ (۱۷/۵۱) کہکر اسکی وضاحت کر دی ۔ لہذا فِطْرَۃٌ کے معنی ہوئے خدا کا قانون تخلیق ۔ وہ قانون یا طریقہ جس کے مطابق اس نے کائنات کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ۔ کائنات کی تخلیق کی ابتداء کی ۔

اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے ۔ فطرت کے معنی عام طور پر (Nature) کے لئے جاتے ہیں ۔ مثلاً کہتے ہیں انسان کی فطرت یہ ہے ۔ اس سے مراد ہوتی ہیں ایسی خصوصیتیں جو ہر انسان میں پیدائشی طور پر موجود ہوں اور جو بدلی نہ جاسکتی ہوں ۔ لیکن لفظ فطرت کا یہ مفہوم بعد کی پیداوار ہے ۔ جب یونانی فلسفہ عربی میں منتقل ہوا تو اس میں (Nature) کا لفظ آیا ۔ اس لفظ کا ترجمہ '' فطرت'' کے لفظ سے کیا گیا اور اسطرح جو مفہوم لفظ (Nature) کا تھا وہی مفہوم لفظ فطرت کا ہو گیا ۔

نیچر (Nature) کے بھی دو مفہوم ہیں ۔ ایک تو وہ قوانین جو کائنات میں جاری وساری ہیں ۔ انہیں قوانین فطرت (Laws of Nature) کہا جاتا ہے ۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں اور ہر شے کے اندر رکھ دیئے گئے ہیں ۔ مثلاً یہ کہ پانی کی فطرت یہ ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہتا ہے ۔ فطرت کے اس مفہوم میں کوئی حرج نہیں ۔ اس مفہوم کے روسے حیوانات کی جبلت (Instinct) کو بھی ان کی فطرت کہہ دیا جاتا ہے ۔ اس لئے کہ وہ بھی غیر متبدل ہوتی ہے ۔ مثلاً یہ کہ بکری گھاس کھاتی ہے اور شیر گوشت ۔ یہاں تک بھی کچھ مضائقہ نہیں ۔ انسان میں بہت سا حصہ حیوانی زندگی کا ہے ۔ یعنی اس کا جسمانی نظام کم و بیش وہی ہے جو حیوانات کا ہے ۔ لہذا جو قوانین اس کے جسمانی نظام سے متعلق ہیں انہیں قوانین فطرت کہدینے میں بھی کچھ حرج نہیں ۔ یعنی

*تاج ۔

وہ قوانین جن کے مطابق انسان کی طبعی زندگی کی مشینری چل رہی ہے اور جو غیر متبدل ہیں۔ مثلاً کھانا۔ پینا۔ سونا۔ افزائش نسل۔ بیماری۔ موت۔ وغیرہ۔

لیکن جب اس سے آگے بڑھ کر خود "انسان" کی فطرت کا تصور سامنے لایا جاتا ہے تو یہ چیز محل نظر اور قابل اعتراض ہو جاتی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اسلام اسی فطرت کے مطابق دین ہے۔ یہ خارجی اثرات کا نتیجہ ہے کہ بچہ بڑا ہو کر کسی دوسری روش پر چل پڑتا ہے۔ یعنی اگر کسی انسانی بچہ کو خارجی اثرات سے بالکل محفوظ رکھا جائے تو وہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کریگا۔ یہ بات بالبداھت غلط ہے۔ اگر آپ کسی بچے کو پیدا ہوتے ہی کسی ایسے جنگل میں چھوڑ دیں جہاں کوئی اور انسان نہ ہو اور وہیں اسکی پرورش ہو تو آپ دیکھیں گے کہ وہ بڑا ہو کر بالکل جانور بن جائیگا۔ چنانچہ اس قسم کے کئی بچے ملے ہیں جن کی پرورش جانوروں کے اندر ہوئی۔ وہ بالکل جانوروں کی مانند تھے۔ اسوقت (۱۹۶۰ میں) اس قسم کا ایک بچہ ہندوستان کے ایک ہسپتال میں زیر علاج اور زیر مشاہدہ ہے۔ یہ بالکل حیوانوں کی سی عادات و خصائل رکھتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر انسان کو اسکی "پیدائشی فطرت" پر چھوڑ دیا جائے تو وہ جانور ہوگا۔ لہذا اگر یہی وہ "فطرت اللہ" (خدا کی فطرت) ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے تو یہ تو کوئی قابل شرف بات نہیں۔ (نیز خود خدا کے متعلق یہ کہنا کہ اسکی بھی "فطرت" ہے بڑی گستاخی ہے)۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ خود قرآن کریم نے انسان کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کبھی "فطرت اللہ" کے مظاہرے نہیں ہو سکتے۔ (واضح رہے کہ قرآن کریم نے یہ کچھ اس انسان کے متعلق کہا ہے جو وحی کی راہ نمائی میں نہیں چلتا بلکہ اپنے جذبات کے پیچھے چلتا ہے)۔ مثلاً اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (۱۹/۷۰)۔ انسان بڑا ہی بے صبرا ہے۔ اسکی نیت ہی نہیں بھرتی۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۷۲/۳۳)۔ بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے۔ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ (۱۷/۸۰)۔ بڑا ہی ناشکرا ہے۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (۱۱/۱۷)۔ بڑا ہی جلد باز ہے۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (۵۴/۱۸)۔ اکثر باتوں میں جھگڑتا رہتا ہے۔ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ (۴/۱۶)۔ بڑا ہی جھگڑالو ہے۔ یہ کچھ قرآن کریم نے "الانسان" کے متعلق کہا ہے۔ اگر یہ مانا جائے

کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے ، تو اس سے خود "خدا کی فطرت" کے متعلق جو تصور سامنے آتا ہے وہ (نعوذ باللہ) بڑا گھناؤنا ہے۔ لہذا ، قرآن کریم کی رو سے یہ نظریہ صحیح نہیں کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ ہمارے ہاں یہ خیال اس قدیم تصور سے متاثر ہو کر پیدا ہوا جس کی رو سے کہا جاتا تھا کہ "خدا نے آدم کو اپنی شکل پر ڈھالا تھا"۔

اسی (غلط) تصور کی بنا پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان کے اندر ایک چیز ہے جو اسے نیکی اور بدی کا علم دیدیتی ہے۔ اسے "انسانی فطرت" کہتے ہیں۔ اور چونکہ انسانی فطرت خود خدا کی فطرت ہے اس لئے اس کے اندر کی آواز ، خود خدا کی آواز ہے۔ یہ تصور بھی غلط ہے۔ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو مطلق حق (Absolute right) اور مطلق باطل (Absolute wrong) میں تمیز کر دے۔ اگر یہ قوت ہر انسان کے اندر موجود ہوتی تو پھر انسانوں کے لئے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ چیز حیوانوں تک تو چلی آتی ہے۔ یعنی حیوانات وغیرہ کو ان کے فرائض اور وظائف زندگی کا علم جبلی طور پر دیا جاتا ہے۔ لیکن انسان کو وحی خارج سے ملتی ہے۔ یعنی ایک فرد (نبی) کے ذریعے باقی افراد کو۔ انسان کے اندر یہ امکانی قوت موجود ہے کہ وہ چاہے تو حق کو اختیار کر لے اور چاہے باطل کو اختیار کر لے۔ یہی اختیار انسان کی بنیادی خصوصیت ہے جو حیوانات کو حاصل نہیں۔ اگر انسان وحی کی راہنمائی کو اختیار نہ کرے تو اپنے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور تباہیاں خریدتا ہے۔ اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وَيَدْعُ الْإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ (۱۷/۱۱) وہ بھلائی کو بلانے کے بجائے شر کو آوازیں دیکر بلاتا رہتا ہے۔ اگر انسان کے اندر "خیر و شر" کی تمیز ودیعت کرکے رکھ دی جاتی تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا۔ اسے ایسا کرنے کی آزادی ہی نہ ملتی۔ جسطرح حیوانات کو اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اس روش کے خلاف چلیں جس پر چلنے کی تمیز ان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ (مزید تفصیل ل۔ ھ۔ م کے عنوان میں ملیگی)۔

لہذا ، یہ تصور غلط ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی "فطرت" پر پیدا کیا ہے اور اسلام دین فطرت ہے۔ یعنی اگر انسان کو علی حالہ چھوڑ دیا جائے تو وہ خود بخود اسلام کے مطابق زندگی بسر کریگا۔

ان حقائق کو سامنے رکھنے کے بعد اس آیت کی طرف آئیے جس سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ جسم

دیکھ چکے ہیں کہ عربی زبان میں (جس میں قرآن کریم نازل ہوا ہے) لفظ فِطْرَۃٌ کے معنی ہیں وہ قانون یا قاعدہ جس کے مطابق کسی چیز کی پہلی مرتبہ تخلیق کی جاتی ہے۔ خدا فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ہے۔ لہذا فطرت اللہ کے معنی ہوئے خدا کا قانونِ تخلیق۔ آیت یہ ہے فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ۔ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (۳۰/۳۰)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا وہ قانونِ تخلیق جس کے مطابق اس نے انسان کو پیدا کیا۔ یعنی جس طرح اس نے تمام ارض و سما (کائنات) کو ایک خاص قانون کے مطابق پیدا کیا اسی طرح اس نے انسان کو بھی پیدا کیا۔ اس کے قانونِ تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ ہے دین قیم یعنی محکم نظام۔ تم ہر طرف سے منہ موڑ کر اس قانون پر سیدھے چلتے جاؤ۔ فَاَقِمْ وَجْہَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا (۳۰/۳۰)۔ اور اس کی تفسیر یہ ہے مُنِیْبِیْنَ اِلَیْہِ۔ وَ اتَّقُوْہُ۔ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔ وَ لَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (۳۰/۳۱)۔ اس کی طرف توجہ کئے ہوئے۔ سو تم اس کے قوانین کی نگہداشت کرو۔ اور نظام صلٰوۃ کو قائم کرو۔ اور مشرکین میں سے مت ہو جاؤ۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ تصور کہ انسان کی ایک غیر متبدل فطرت ہے۔ وہ فطرت ''اللہ کی فطرت'' کے مطابق ہے۔ اور اس فطرت کی رو سے انسان خیر اور شر، حق اور باطل، میں از خود تمیز کر سکتا ہے۔ اور اسلام اس فطرت کا دین ہے۔ یہ سب غلط عمارت اسی بنیاد پر اٹھی ہے کہ ہم نے لفظ فطرت کے وہ معنی لے لئے جو یونانی لفظ نیچر کے معنی تھے۔ اگر اس لفظ کے وہ بنیادی معنی سامنے رکھے جائیں جو عربوں کے ہاں رائج تھے تو ساری بات واضح ہو جاتی ہے۔ یاد رکھئے! ان حیوانی رجحانات کے علاوہ جو انسان کی طبعی زندگی کا خاصہ ہیں، انسان کی کوئی غیر متبدل فطرت نہیں۔ اسے اپنی راہ نمائی وحی سے حاصل کرنی ہے۔ اور اس کا اسے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اس راہ نمائی کو قبول کر لے اور چاہے اس سے انکار کر کے اپنے لئے کوئی اور راہ اختیار کر لے۔ اختیار و ارادہ کی صلاحیت (The Capacity to Choose) وہ خصوصیت ہے جو صرف انسان کو دی گئی ہے۔ اور کسی کو نہیں دی گئی۔ اس میں ہر انسان، بہ حیثیت انسان ہونے کے شریک ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ کسی انسان کو دی گئی ہو اور کسی کو نہ دی گئی ہو۔ لیکن یہ خصوصیت مضمر شکل (Un - Developed Form) میں دی گئی ہے جس کی نشو و نما کی جا سکتی ہے۔ یہ ہے وہ خاص ساخت جس کے مطابق خدا نے انسان کو پیدا

کیا ہے اور جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ۔ اگر انسان کی کوئی ''فطرت'' ہوتی تو اسے اختیار و ارادہ کی صلاحیت کبھی نہ ملتی ۔ ''فطرت'' اور اختیار و ارادہ دو متضاد باتیں ہیں ۔ خارجی کائنات میں ہر شے کی ایک فطرت ہے اس لئے ان میں سے کسی کو اختیار و ارادہ کی صلاحیت حاصل نہیں ۔ انسان کو اختیار و ارادہ کی صلاحیت حاصل ہے اس لئے اس کی کوئی فطرت نہیں ۔ انسان کے اندر بہت سی امکانی قوتیں ہیں جنہیں نشو و نما دینا اور قانونِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا ، مقصد زندگی ہے ۔ (تفصیل اس اجمال کی میری کتاب ''سلیم کے نام خطوط'' میں ایک خط میں ملے گی) ۔

ہم نے دیکھا ہے کہ اِنْفَطَرَ کے معنی کھودنے ۔ پھاڑنے ۔ شق کرنے کے ہیں ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (۸۲/۱) ۔ جب آسمان پھٹ جائے گا ۔ نیز (۱۹/۹۰) ۔

مُنْفَطِرٌ ۔ پھٹ جانے والا ۔ (۷۳/۱۸) ۔ فُطُوْرٌ ۔ شگاف ۔ عیوب ، خلل ، (۶۷/۳) ۔

ف ظ ظ

اَلْفَظُّ ۔ اونٹ کی اوجھ میں جمع رہنے والا پانی جسے ، صحرا میں جہاں پانی نہ ملے اور جان کا خطرہ لاحق ہو جانے کی صورت میں ، اس کا پیٹ چاک کرکے نچوڑ لیا جائے اور ایسے ہی پیا جائے ۔ یہ پانی مجبوراً اور بادلِ ناخواستہ پیا جاتا تھا ، لہٰذا اس لفظ کو ایسے شخص کے لئے بھی استعمال کیا جانے لگا جس کے پاس خوشی سے نہ بیٹھا جائے بلکہ اشد ضرورت میں بادلِ ناخواستہ پہنچا جائے ۔ اسی سے یہ لفظ تند خو ، جفا پیشہ ، درشت مزاج شخص کیلئے بولا جاتا ہے ۔

اِفْتَظَّ الرَّجُلُ* کے معنی ہیں اس نے اونٹ کو پانی پلایا اور پھر اس کا منہ باندھ دیا تاکہ وہ جگالی نہ کرسکے ۔ پھر جب سفر میں پانی نہ ملا تو اس کا پیٹ چاک کرکے اس پانی کو پی لیا* ۔

قرآن کریم میں رسول اللہؐ کے متعلق کہا ہے کہ آپ اپنے رفقاء کے لئے نرم واقع ہوئے ہیں (لِنْتَ لَهُمْ) ۔ فَظًّا نہیں ہیں (۳/۱۵۸) ۔ یہی راہنما کی شان ہونی چاہئے کہ لوگ اس میں کشش و جاذبیت پائیں اور اسے اپنا بہترین مشیر اور اچھا رفیق سمجھیں ۔ نہ ایسا کہ وہ اپنی پیاس بجھانے کی خاطر اپنے رفقاء کا پیٹ چاک کرکے پانی نکال لے ۔

---

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔

صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلْفَظُّ اُس شخص کو کہتے ہیں جو سخت ، بد مزاج ، سنگدل ، درشت کلام ہو لیکن اس کے ساتھ ایسا بزدل بھی ہو کہ ڈرنے کے مقام پر ڈرنا تو ایک طرف ، جس جگہ کسی قسم کا خطرہ نہ ہو وہاں بھی ڈرے*** - ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنے ناپسندیدگی اور کراہت کے ہیں -

ف ع ل

فِعْلٌ* کے معنی انسان کا حرکت کرنا ہیں - اور اس کا مطلب ہے کوئی کام کرنا - فِعْلٌ* کی صحیح تعریف کرنے اور عَمِلَ اور صَنَعَ اور فَعَلَ کا فرق بتانے میں علمائے لغت نے بڑی بحث کی ہے - مثلاً صاغانی کہتا ہے کہ کسی چیز کو وجود میں لے آنا فعل ہے خواہ وہ عمل ہو یا غیر عمل - اس طرح یہ عمل سے زیادہ خاص ہے - المحکم میں ہے کہ یہ کنایۃً ہر کام اور عمل کے لئے بولا جاتا ہے خواہ وہ عمل متعدی ہو یا غیر متعدی - ابن الکمال کا کہنا ہے کہ کسی چیز پر اثر ڈالنے سے اثر ڈالنے والے پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اسے فعل کہتے ہیں* - راغب نے فعل کے معنے کسی اثر انداز کی طرف سے اثر اندازی کے لئے ہیں - اس میں عمومیت ہے ، یعنی خواہ وہ عمدگی سے کی جائے یا بغیر عمدگی کے - علم سے کی جائے یا بغیر علم کے - قصداً کی جائے یا بغیر قصد کے - اس میں انسان ، حیوان ، جمادات سب یکساں ہیں - وہ کہتا ہے کہ یہی مفہوم عمل کا بھی ہے اور صنع اس سے زیادہ خاص ہے** - محیط میں کلیات کے حوالہ سے سادہ ''عمل'' کے تحت ہے کہ عَمَلٌ* اس کام کو کہتے ہیں جو فکر و تدبر اور علم و ارادہ کے ساتھ سرزد ہو - فِعْلٌ* میں یہ شرط نہیں - نیز عَمَلٌ* ایسے کام کو کہتے ہیں جو طویل مدت تک ہوتا رہے - اس کے برعکس فعل ایک دفعہ بھی کسی کام کے کرنے کے لئے بولا جاتا ہے*** - (اس کے ساتھ ع - م - ل کا عنوان بھی دیکھئے) -

لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہو سکتا - اس لئے کہ قرآن کریم میں اللہ کے لئے فِعْلٌ* آیا ہے (عَمَلٌ* نہیں آیا) - اور اس کا ہر فعل ، علم و ارادہ پر مبنی ہوتا ہے اور بیشتر امور ایسے ہوتے ہیں جن میں استمرار اور دوام بھی ہوتا ہے - لہذا فِعْلٌ* کی وہ خصوصیات جو آئمہ لغت نے بتائی ہیں ، انسانوں تک تو درست ہو سکتی ہیں - افعالِ خداوندی کے لئے نہیں -

*تاج - **راغب - *** محیط -

مَنْ فَعَلَ (۲۱/۵۹) کس نے کیا ہے؟ فِعْلٌ (۲۱/۷۳) کام ۔ فَعْلَۃٌ (۲۶/۱۹) ایک حرکت ۔ ایک دفعہ کام کرنا ۔ فَاعِلٌ (۱۸/۲۳) کرنے والا ۔ فَعَّالٌ (۱۱/۱۰۷) بہت زیادہ کرنے والا ۔ زبردست کام کرنے والا ۔ کَانَ مَفْعُوْلاً (۴/۴۷) ۔ جو کام کیا جاچکا ہے ۔ جو مکمل ہو چکا ہے ۔

قرآن کریم میں یہ مادہ اس کثرت سے آیا ہے کہ اس کا احصاء اس مقام پر ممکن نہیں ۔ نہ ہی اس کی کوئی خاص ضرورت ہے ۔ جہاں یہ مادہ آیا ہے وہاں اس کا مفہوم خود بخود واضح ہوجاتا ہے ۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں جس کے لئے اس کی وضاحت یا تشریح کی ضرورت لاحق ہو ۔

ف ق د

فَقَدَ ۔ یَفْقِدُ ۔ فَقْدًا ۔ کسی موجود شے کو گم کر دینا* ۔ راغب نے فَقْدٌ اور عَدَمٌ کا فرق یہ بتایا ہے کہ فَقْدٌ تو کسی چیز کے وجود کے بعد اس کا نہ پایا جانا ہے، لیکن عَدَمٌ فَقْدٌ کو بھی کہتے ہیں اور کسی چیز کے سرے سے موجود ہی نہ ہونے کو بھی** ۔ سورۃ یوسف میں ہے ۔ مَاذَا تَفْقِدُوْنَ ۔ (۱۲/۷۱) تم نے کیا چیز کھودی ہے ۔ تم کیا چیز نہیں پارہے ہو؟ اِفْتَقَدَ وَ تَفَقَّدَ ۔ کسی گم گشتہ کا تلاش کرنا ۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ اَلتَّفَقُّدُ کے معنی ہیں یہ معلوم کر لینا کہ فلاں چیز گم ہو گئی ہے* ۔ لسان العرب میں ہے کہ اس کے معنی ہیں اس چیز کا طلب یا تلاش کرنا جو غائب ہو ۔ چنانچہ سورۃ نمل میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق ہے وَ تَفَقَّدَ الطَّیْرَ (۲۷/۲۰) ۔ اس کے یہ معنی ہونگے کہ حضرت سلیمانؑ نے تیز رفتار گھوڑوں کے ہرکاروں کو (جو اس وقت وہاں نہیں تھے) طلب کیا ۔ (دیکھئے عنوان ط ۔ ی ۔ ر)

ف ق ر

اَلْفِقْرَۃُ ۔ ریڑھ کی ہڈی کا ایک منکا ۔ اَلْفَقِیْرُ ۔ وہ شخص جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہو ۔ کمر شکستہ ۔ نیز اَلْفَقِیْرُ اُس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں کھجور کا پودا لگایا جاتا ہے* ۔ اسی طرح کنویں، نیز ہر گڑھے کو جس میں پانی بھر جاتا ہو فَقِیْرٌ کہتے ہیں ۔ اَلْفَقْرُ ۔ اَلتَّفْقِیْرُ ۔ گڑھا کھودنا ۔ نیز موتیوں میں سوراخ کرنا ۔ اونٹ کی ناک چھیدنا تاکہ اس میں نکیل ڈال دی جائے* ۔ اور ایسے اونٹ کو اَلْفَقِیْرُ کہتے ہیں* ۔ ان

*تاج ۔ **راغب ۔

معانی سے فَقْرٌ ۔ اور فَقِیْرٌ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ قرآن کریم میں فُقَرَاءُ اور مَسَاکِیْنُ کے الفاظ الگ الگ آئے ہیں (۹/۶۰) جس کی وجہ سے ائمۂ لغت اور فقہ نے ان کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن ان میں کوئی متعین خط امتیاز نہیں کھنچ سکا ۔ عام طور پر یہ کہا گیا ہے کہ فَقِیْرٌ وہ ہے جس کے پاس کچھ موجود ہو لیکن نہ اتنا کہ وہ اسکی ضروریات کو پورا کر سکے ۔ اسکی جمع فُقَرَاءُ ہے ۔ لیکن مِسْکِیْنٌ وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو ۔ مِسْکِیْنٌ کے معنی کے لئے دیکھئے عنوان س ۔ ک ۔ ن وہاں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک اپنے ہاں کے محتاج کو فَقِیْرٌ کہتے ہیں اور غیر قوم کا شخص جو اسلامی مملکت میں آ کر بس گیا ہو اور صاحب احتیاج ہو مِسْکِیْنٌ کہلاتا ہے ۔

قرآن کریم میں فَقْرٌ ۔ بمقابلہ غِنًی آیا ہے (۲/۲۷۳ ؛ ۳/۱۸۰) ۔ (غِنًی کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان غ ۔ ن ۔ ی) ۔ لہذا فَقْرٌ کے معنی احتیاج کے ہوں گے ۔ ضرورتوں کا کما حقہ پورا نہ ہو سکنا ۔ یعنی فُقَرَاءُ معاشرہ کے وہ افراد ہیں جو پوری پوری محنت کرنے کے بعد بھی اتنا نہ کما سکیں کہ وہ ان کی ضروریات کے لئے مکتفی ہو سکے ۔ اصحاب احتیاج (۲۲/۲۸) ۔ لیکن اس کے معنی صرف طبعی ضروریات کی احتیاج ہی نہیں بلکہ انسان کی نشو و نما کے لئے جن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہو ان کی احتیاج بھی فَقْرٌ ہے ۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے خدا سے عرض کیا تھا کہ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ (۲۸/۲۴) ۔ جو کچھ بھی تو نے میرے لئے خیر میں سے بھیجا ہے میں اس کی احتیاج رکھتا ہوں ۔ اس میں طبعی ضروریات اور شرف انسانیت کے اسباب و وسائل دونوں آجاتے ہیں ۔ اس اعتبار سے کائنات کی ہر شے اور ہر انسان اپنی نشو و نما اور تکمیل ذات کے لئے ربوبیت خداوندی کا محتاج ہے ۔ یَسْئَلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۵۵/۲۹) ۔ کائنات کی ہر شے اس کی محتاج ہے ۔ سورۂ فاطر میں تمام نوع انسان سے کہا گیا ہے کہ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰهِ ۔ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۔ (۳۵/۱۵) ۔ تم سب اپنی نشو و نما کے لئے عطایائے خداوندی کے محتاج ہو ، اور اللہ کسی معاملہ میں بھی تمہارا محتاج نہیں ۔ طبعی ضروریات کے لئے انسان ، فطرت کے عطا کردہ سامان پرورش کا محتاج ہے ۔ اور شرف انسانیت کی نشو و نما کے لئے وحی کی راہ نمائی کا محتاج ۔

قرآنی معاشرہ میں فُقَرَاءُ وہ ہونگے جو پوری پوری محنت کے باوجود اتنا پیدا نہ کر سکیں جو ان کی ضروریات کے لئے کافی ہو ۔ معاشرہ ان کی

ضروریات کے فراہم کرنے کا ذمہ دار ہوگا ۔ اور چونکہ ان کی سب ضروریات پوری ہوتی رہیں گی اس لئے اس معاشرہ میں در حقیقت فَقِیْرٌ (محتاج) کوئی نہیں رہے گا ۔ یہ صرف اسوقت تک ہونگے جب تک قرآنی معاشرہ وجود میں نہیں آئیگا ۔

فَاقِرَۃٌ ۔ کمر توڑ دینے والی مصیبت (۷۵/۲۵) ۔

ف ق ع

فَاقِعٌ ۔ ہر تیز رنگ کو فَاقِعٌ کہتے ہیں ۔ یا خالص اور صاف رنگ کو* (جس میں دوسرے رنگ کی آمیزش نہ ہو) ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ صَفْرَاءُ کے ساتھ آیا ہے (۲/۶۹) جس کے معنی ہیں گہرا زرد رنگ ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے الفاظ کسی قاعدہ اور قیاس کے ماتحت نہیں آتے ۔ چنانچہ فَوَاقِعُ الدَّھْرِ ۔ زمانہ کے مصائب و آلام کو کہتے ہیں ۔

ف ق ہ

اَلْفِقْہُ ۔ کسی چیز کو جان لینا اور سمجھ لینا* ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ لَایَفْقَھُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا (۴۸/۱۵) ۔ یہ بہت کم سمجھتے ہیں ۔ اصل میں یہ اس قسم کی سمجھ اور پہچان کو کہتے ہیں جس طرح حیوان اپنی جبلی استعداد (Instinct) سے اپنی پہچان اور تمیز میں کبھی غلطی نہیں کرتے ۔ چنانچہ فَحْلٌ فَقِیْہٌ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو صحیح طور پر پہچان لے کہ کونسی اونٹنی حاملہ ہے اور کونسی اختلاط کے قابل * ۔

راغب نے کہا ہے کہ اَلْفِقْہُ ۔ علم حاضر سے علم غائب کی طرف پہنچنے کو کہتے ہیں ** ۔ یعنی محسوسات کے مشاہدہ سے نتائج اخذ کرکے ان کے ذریعے مجرد حقائق (Abstract Truths) کا سمجھنا ** ۔ تَفَقُّہٌ فِی الدِّیْنِ (۹/۱۲۲) کا یہی طریقہ ہے ۔ یعنی زمانہ کے ٹھوس واقعات پر غور کرکے یہ سمجھنا کہ ان پر دین کے کون سے حقائق و قوانین کا اطلاق ہوتا ہے ۔ قرآن کریم نے تفقہ فی الدین کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ ہر مقام سے کچھ لوگ مرکز میں آئیں اور دین میں تفقہ حاصل کریں ۔ پھر یہ واپس جا کر باقی لوگوں کو اس سے آگاہ کریں (۹/۱۲۲) ۔ یعنی تفقہ فی الدین کسی خاص گروہ کا اجارہ (Monopoly) نہیں ۔ دین میں تفقہ حاصل کرنے کا یہ طریقہ ان حالات میں بتایا گیا تھا جو ابتدائے اسلام میں تھے ۔ ویسے از روئے قرآن کریم تفکر ۔ تدبر ۔ تفقہ ہر مؤمن کے لئے ضروری ہے ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

فقه ایک قانونی اصطلاح تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ قرآن کریم کے اصولوں کی روشنی میں زمانے کے تقاضوں (اور روز مرہ کے حالات کے مطابق) جزئی قوانین مستنبط کئے جائیں۔ یہ کام اسلامی نظام کا تھا۔ لیکن اب فقہ کے معنی ہیں کسی خاص امام کا مسلک۔ مثلاً فقہ حنفی کے معنی ہیں امام ابو حنیفہؒ کا مسلک۔ یا ان فقہاء کے فتاوی جو امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے پیرو تھے۔ اہل فقہ، اہل حدیث کے مقابلہ میں ایک فرقہ ہیں۔ غور کیجئے، قرآن کریم کی رو سے تفقہ فی الدین کا مفہوم کیا تھا۔ اور اب اس کا مفہوم کیا رہ گیا ہے! جب دین، ایک نظام اجتماعی کی بجائے انفرادی چیز بن جائے تو اس میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

ف ک ر

فَکَرَ۔ اَفْکَرَ۔ فَکَّرَ۔ تَفَکَّرَ فِیْہِ۔ کسی چیز یا (معاملہ) میں اطمینان سے (ایک خاص ترتیب کے ساتھ) غور کرنا اور عقل و نظر سے کام لینا* (اور اس سے صاف نتیجہ اخذ کرنا)۔ صاحب مفردات کے نزدیک ہم انہی چیزوں پر فکر کر سکتے ہیں جن کا کوئی تصور دل میں قائم ہوسکے۔ جن چیزوں کا تصور قائم نہ ہوسکے ان میں فکر نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ تَفَکَّرُوْا فِیْ آلَاءِ اللّٰہِ وَلَا تَفَکَّرُوْا فِی اللّٰہِ۔ اللہ کی قدرتوں (مظاہر فطرت وغیرہ) پر تو غور و فکر کرو، لیکن اللہ کی ذات کے متعلق کچھ نہ سوچو، کیونکہ اس کا تصور ہی ذہن انسانی میں نہیں آسکتا**۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ تَفَکَّرَ کے معنی عبرت حاصل کرنے کے لئے دل کو گھمانا اور ادھر ادھر پلٹنا ہیں۔

قرآن کریم کو شروع سے آخر تک دیکھتے جائیے۔ قدم قدم پر آپ کو غور و فکر کی دعوت ملے گی۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل و برہان کے ساتھ پیش کرتا اور اسے فکر و تدبر کے بعد ماننے کی تاکید کرتا ہے۔ اس نے غور و فکر پر کس قدر زور دیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ نبی اکرمؐ کی زبان سے کہلواتا ہے کہ قُلْ اِنَّمَا اَعِظُکُمْ بِوَاحِدَۃٍ (۳۴/۴۶) ان سے کہدو کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی تلقین کرنا چاہتا ہوں۔ غور کیجئے کہ اتنا بڑا جلیل القدر رسولؐ کہتا ہے کہ میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ بات جو کہی جائے گی کس قدر اہم ہوگی۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ بات ایسی نہیں کہ تم یونہی چلتے چلتے سن لو۔

*تاج۔ **راغب۔

اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى۔ (۴۶/۳۴) اس کے لئے ضروری ہے کہ تم جس سیلاب میں بہے جا رہے ہو اس میں بہے نہ جاؤ۔ کھڑے ہوجاؤ۔ یعنی پہلی بات جس کی تاکید کی جاتی ہے یہ ہے کہ یونہی اندھا دھند نہ چلے جاؤ، بلکہ رکو۔ تھمو۔ ٹھہرو۔ کھڑے ہو جاؤ۔ سب کے سب نہیں تو ایک ایک۔ دو دو کرکے کھڑے ہو جاؤ۔ لیکن خالصۃً للہ۔ دل میں کوئی اور خیال، جذبہ یا مقصد لئے ہوئے نہیں۔ اور پھر؟ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (۴۶/۳۴)۔ پھر تم سوچو۔ غور کرو۔ بس یہ ہے وہ بات جسکی میں تاکید کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہے مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ (۴۶/۳۴)۔ یہ دعوت فکر جو تمہیں دی جارہی ہے وہ اس داعی کے جنون کا نتیجہ نہیں۔

اس قدر تاکید تھی غور و فکر کی!

لیکن اب ہماری حالت یہ ہے کہ غور و فکر ہم پر حرام قرار پا چکا ہے۔ کوئی معاملہ ہو۔ کوئی مسئلہ ہو۔ قرآن کریم کی کوئی آیت ہو۔ اس کے متعلق پہلا سوال یہ ہوگا کہ اس کی بابت اسلاف نے کیا کہا ہے۔ اگر آپ غور و فکر کے بعد کوئی ایسی بات کہیں جس کی سند اسلاف کے ہاں سے نہ ملتی ہو۔ تو آپ فتنہ پرداز۔ ملحد۔ بے دین۔ قرار پا جاتے ہیں۔ یعنی زندگی کے معاملات، حتکہ قرآن کریم کے متعلق، جو کچھ سوچا سمجھا جانا تھا وہ سب سوچا سمجھا جاچکا ہے۔ اب ہمارا کام فقط یہ ہے کہ ہم اس کی اندھی تقلید کرتے جائیں۔ خود نہ کچھ سوچیں نہ سمجھیں۔ حالانکہ بات بالکل واضح ہے کہ قرآن کریم نے جو غور و فکر کا حکم دیا تھا تو وہ کسی خاص زمانے کے انسانوں تک محدود نہیں تھا۔ وہ تمام زمانوں کے انسانوں کے لئے یکساں حکم تھا۔ اس لئے (قرآن کریم کی رو سے) جس طرح ہم سے پہلے گزرے ہوئے لوگ (اسلاف) غور و فکر کے لئے مکلف تھے اسی طرح ہم پر بھی غور و فکر لازم ہے۔ اگر ہم غور و فکر نہیں کرتے تو یہ روش قرآن کریم کے واضح حکم کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے۔

لیکن ہم ہیں کہ غور و فکر کو الحاد اور بیدینی قرار دئے رہے ہیں! اصل یہ ہے کہ جب قومیں قوت عمل سے محروم ہوجاتی ہیں تو وہ اندھی تقلید ہی میں عافیت سمجھتی ہیں۔ غور و فکر بجائے خویش ایک عمل ہے جس میں ذہن کو بڑی محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے۔ پھر، غور و فکر سے زندگی کی نئی نئی راہیں سامنے آتی ہیں جنہیں حرکت و عمل ہی سے طے کیا جاسکتا ہے۔ بے عمل قوم اس سے بھی گھبراتی ہے۔ غور و فکر سے بھاگنے کی اصل وجہ

تو یہ ہوتی ہے لیکن انسان کی خوئے بہانہ سازی اسے ''سلفِ صالحین'' کا اتباع قرار دیکر جھوٹے اطمینان کا موجب بنا دیتی ہے ۔

یاد رکھئے ۔ جو قوم غور و فکر سے محروم رہ جاتی ہے وہ انسانیت کی سطح سے نیچے گر جاتی ہے ۔ انسان و حیوان میں فرق ہی یہ ہے کہ انسان کو غور و فکر کی استعداد دی گئی ہے اور حیوان اس سے محروم ہے ۔ ہم اپنے اسلاف کے غور و فکر کے نتائج سے مستفید ہوسکتے ہیں ، لیکن ان کا غور و فکر ہمارے لئے حرفِ آخر نہیں ہوسکتا کہ اس سے اختلاف ، الحاد و بیدینی قرار پاجائے۔ زمانے کی علمی اور فکری سطح بلند ہو رہی ہے ۔ اس لئے ہر آنے والی نسل سابقہ نسل سے ، علم و فکر میں آگے ہوتی ہے ۔ اور قرآن کریم چونکہ قیامت تک کے انسانوں کے لئے ضابطہ حیات ہے اس لئے اس پر مسلسل غور و فکر ہوتے رہنا ضروری ہے ۔ قرآن کریم میں غور و فکر کے لئے اس قدر کثرت سے تاکید آئی ہے کہ ان مقامات کا احاطہ کرنا مشکل ہے ۔ اس کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے ۔ جب آپ قرآن کریم کا مطالعہ کرینگے تو وہ تمام مقامات آپ کے سامنے آجائینگے اور ان سے آپ اندازہ کرسکینگے کہ اس میں غور و فکر نہ کرنے والوں کے خلاف کتنی سخت تنبیہات آئی ہیں ۔ (مزید تفصیل (ع ۔ ق ۔ ل) ۔ (ع ۔ ل ۔ م) ۔ (د ۔ ب ۔ ر) اور (ق ۔ ل ۔ د) کے عنوانات میں ملیگی) ۔

ف ک ک

فَكَّهُ ۔ يَفُكُّهُ ۔ فَكًّا ۔ اس نے اسے جدا کر دیا ۔ فَانْفَكَّ ۔ تو وہ اس سے جدا ہوگیا ۔ فَكَكْتُ الشَّيْءَ ۔ میں نے اس چیز کو چھڑا دیا ۔ اسے اس کی جگہ سے ہٹا دیا ۔ فَكَّ الْاَسِيْرَ ۔ اس نے قیدی کو چھڑا دیا ۔ فَكَّ يَدَهُ ۔ اس نے اپنا ہاتھ کھول دیا ۔ یعنی مٹھی میں جو چیز تھی اسے ظاہر کر دیا ۔ فَكَّ الْخَتْمَ ۔ اس نے مُہر کو توڑ دیا* ۔

قرآن کریم میں فَكُّ رَقَبَةٍ (۹۰/۱۳) آیا ہے جس کے لفظی معنی کسی گردن کا آزاد کرنا ہیں ۔ اس میں مظلوموں کو استبداد سے چھڑانے اور زبردستوں کو ظلم سے بچانے کے تمام پہلو آجاتے ہیں ۔

دوسرے مقام پر ہے ۔ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ (۹۸/۱) ۔ اہل کتاب اور مشرکین اپنے باطل عقائد و رسوم کی خود ساختہ زنجیروں

* تاج و راغب ۔

سے رہا نہیں ہو سکتے تھے جب تک ان کے پاس (اَلْبَیِّنَۃ) خدا کا یہ قانون نہ آتا ۔ اسی لئے رسول اللہؐ کے متعلق کہا ہے ۔ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ (۷/۱۵۷) ۔ یہ اس لئے آیا ہے کہ انسانوں نے اپنے اوپر جو (خواہ مخواہ کے) بوجھ لاد رکھے تھے اور اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا یہ انہیں ان سے آزادی دلائے ۔ قرآن کریم کا مقصد یہ تھا کہ نوع انسانی کو انسانوں کے ہر قسم کے (ذہنی و جسمانی) استبداد سے نجات دلائے ۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے ایسا کرکے دکھا دیا ۔ لیکن اس کے بعد ہم نے ان تمام زنجیروں کو جو آپؐ نے توڑی تھیں ، ایک ایک کرکے اکٹھا کیا اور پھر سے انہیں اپنی گردنوں میں ڈال لیا ۔ اب ہم ان جکڑ بندیوں کے ہاتھوں سخت نالاں ہیں، لیکن وہ ایسی مقدس بن چکی ہیں کہ انہیں اتار پھینکنے کی ہمت کسی میں نہیں پڑتی ۔ ان زنجیروں کو صرف قرآن کریم کی تعلیم توڑ سکتی ہے ، اور قرآن کریم کی طرف ہم آنا نہیں چاہتے ۔ نتیجہ ظاہر ہے ۔

ف ک ہ

فَکِہَ الرَّجُلُ ۔ وہ خوش مزاج ، ہشاش بشاش اور پُر مزاح ہوا ۔ ایسا شخص فَکِہٌ اور فَاکِہٌ کہلائیگا ۔ اَلْفَاکِهَۃُ ۔ ہر قسم کا پھل ۔ جمع فَوَاکِہُ (۲۳/۱۹) ۔

اَلْفُکَاهَۃُ ۔ دلچسپ اور دل کو شگفتہ کرنے والی باتیں ۔ خوش گپی ۔ مزاح ، فَاکَهَہٗ مُفَاکَهَۃً ۔ ایک نے دوسرے سے مزاح کیا* ۔

قرآن کریم میں اہل جنت کے متعلق ہے ۔ فِیْ شُغُلٍ فٰکِهُوْنَ (۳۶/۵۵) ۔ وہ کام میں لگے ہوئے خوش ہونگے ۔ ایک دوسرے سے نہایت خندہ پیشانی سے خوشی کی باتیں اور مزاح کرینگے ۔ یا فرحت و انبساط سے بھرے ہونگے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْمُفَاکَهَۃُ خوش مزاجی اور شیریں کلامی کو کہتے ہیں ۔

تَفَکَّهَ مِنْ کَذَا ۔ اس نے فلاں چیز سے تعجب کیا ۔ تَفَکَّهَ الرَّجُلُ ۔ وہ نادم ہوا* ۔ اَلْاُفْکُوْهَۃُ ۔ تعجب کی بات ۔ پُر مزاح بات ۔ سورۃ واقعہ میں ہے فَظَلْتُمْ تَفَکَّهُوْنَ (۵۶/۶۵) تم تعجب کرنے لگ جاؤ ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ عربی زبان میں ابتداءً یہ لفظ تَفَکَّنُوْنَ تھا ۔

*تاج و راغب و محیط ۔

بعد میں نون ھاء سے بدل گیا اور یہ تَفَکَّھُوْنَ بولا جانے لگا ۔ تَفَکَّنُوْنَ کے معنی ھیں شرمندہ ھونا ۔ اَلْفَکِہُ ۔ اترانے والا ۔ اکڑ فوں کرنے والا* ۔ قرآن کریم میں ہے اِنْقَلَبُوْا فَکِهِیْنَ (۸۳/۳۱) اترانے ھوئے لوٹتے ھیں ۔

ف ل ح

فَلْحٌ کے معنی ھیں پھاڑنا ۔ شگاف کرنا ۔ چاک کر دینا ۔ اسی لئے فَلَّاحٌ کاشتکار کو کہتے ھیں کیونکہ وہ کھیتی کے لئے زمین میں ھل چلا کر اسے پھاڑتا ہے ۔ فَلَاحَۃٌ ۔ کاشتکاری اور کھیتی باڑی کرنے کو کہتے ھیں** ۔

چونکہ فَلَّاحٌ (کسان) کی محنت کا صلہ یہ ھوتا ہے کہ فطرت ایک ایک دانہ کے بدلے سو سو دانوں سے اس کی جھولیاں بھر دیتی ہے ، اس لئے فَلَاحٌ کا لفظ کامیابی اور بقاء کے لئے استعمال ھوتا ہے ۔ (ابن فارس)

مُفْلِحُوْنَ ۔ وہ ھیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھ جائیں ۔ جن کی محنت ثمر بار ھو جائے ۔ جنہیں کامیابی اور بقاء نصیب ھو جائے ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ھوا ہے ۔ مومنین کے متعلق ہے ۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲/۵) ۔ یہی لوگ کامیاب ھیں ۔ نفس انسانی کے نشو ونما پا کر انسان کے کامیاب و کامران ھونے کے متعلق ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا (۹۱/۹) ۔ جس نے اس کی نشو و نما کی وہ کامیاب ھو گیا ۔

قرآن کریم نے انسانی سعی و عمل کا حاصل ''نجات'' نہیں بتایا ۔ نجات کے معنی ھوتے ھیں کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لینا ۔ یعنی یہ صرف سلبی (Negative) چیز ھوتی ہے ۔ ایک شخص اچھا بھلا بیٹھا ہے ۔ وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا ۔ اس کے بعد اس نے دوڑ دھوپ کی اور اسے اس مصیبت سے نجات مل گئی ۔ اس طرح وہ شخص پھر اپنی پہلی حالت میں پہنچ گیا ۔ اس دوڑ دھوپ سے اسے کوئی مثبت (Positive) فائدہ نہیں ھوا ۔ یہ قرآنی تصور نہیں ۔ یہ عیسائیت کا تصور ہے جو ھر انسانی بچہ کو پیدائشی طور پر گناہ گار قرار دیتی ہے ۔ اس کا ان گناھوں کی مصیبت سے چھوٹ جانا نجات (Salvation) ہے ۔ یا ھندوؤں کا تصور ہے جو یہ مانتے ھیں کہ ھر شخص اپنے سابقہ جنم کے گناھوں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا کے جیل خانے میں مُحبوس ہے ۔ اس قید و بند سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نام مکتی (نجات) ہے ۔ یہی تصور بدھ مت میں ہے ۔ ویدانت (تصوف) کی رو سے بھی انسانی سعی و کاوش سے یہی مقصود ہے ۔

---

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔

یعنی انسان کی روح اپنی اصل (ذات خداوندی) سے الگ ہو کر مادہ کے دلدل میں پھنسی ہوئی چیخ رہی ہے۔ اس کا اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنی اصل سے جا ملنا مقصود حیات ہے۔ لیکن قرآن کریم کا یہ تصور نہیں۔ اس کا تصور یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک صاف سلیٹ لے کر آتا ہے۔ وحی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے سے اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوو نما اور اس کی ذات کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس سے اُسے اس زندگی کی تمام خوشگواریاں بھی حاصل ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد کی زندگی میں آگے بڑھنے کی صلاحیت بھی۔ یہ سب مثبت نتائج ہیں، اس لئے انہیں فَلَاحٌ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی کھیتی کا پروان چڑھنا۔ اس کا ثمر بار ہونا۔ یا فَوْزٌ سے (دیکھئے عنوانات ف۔ و۔ ز اور ن۔ ج۔ و)۔

سورۃ بقرہ میں جماعت مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ اس نظام قرآنی کے آن دیکھے نتائج پر ایمان لاتے ہیں (۲/۳)۔ پھر وہ اس نظام کو عملاً متشکل کرتے ہیں اور جب اس کے مرئی و محسوس نتائج ان کے سامنے آجاتے ہیں تو ان کا ایمان بالغیب (یعنی کسی پر اعتماد کرکے اس کی بات مان لینا) یقین میں بدل جاتا ہے (۲/۴)۔ ان کی مثال اس کسان (فلاح) کی سی ہے جو اپنے ایمان محکم کی رو سے بیج کو مٹی میں ملا کر مہینوں اس پر محنت کرتا رہتا ہے اور بالآخر اس کی محنت کے نتائج فصل بن کر اس کے سامنے آجاتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (۲/۵)۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ اَلْفَلَاحُ کے معنی اَلْبَقَاءُ ہیں۔ یعنی ثابت اور محکم طور پر باقی رہنا۔ اور مُفْلِحُوْنَ کے معنی ہیں وہ لوگ جو عیشِ جاوداں کے مالک ہوں *۔ یاد رہے کہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جاچکا ہے) یہ کامیاب زندگی اس دنیا کی بھی ہے اور موت کے بعد کی بھی۔ اسی طرح ''آخرت'' سے مراد اس دنیا میں مستقبل کی زندگی بھی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی بھی۔

ف ل ق

فَلَقَ الشَّیْءَ۔ یَفْلِقُہٗ وَفَلَّقَہٗ۔ اس نے کسی چیز کو پھاڑ دیا۔ فَانْفَلَقَ۔ چنانچہ وہ چیز پھٹ گئی **۔ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ (۶/۹۶)۔ رات کی تاریکیوں کو پھاڑ کر صبح کو نمودار کرنے والا۔ زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی خَالِقٌ کے بھی ہو سکتے ہیں **۔ اَلْفَلَقُ۔ صبح۔ زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی صبح کا واضح ہو جانا ہیں۔ اس کے معنی

*القرطبین ج/۱ صفحہ ۱۳۔ **تاج و محیط۔

مخلوق کے بھی ھیں۔ نیز اس کے معنی مشکلات کے بعد حق کے واضح ھوجانے کے بھی ھیں*۔ چنانچہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ۔ (۱۱۳/۱) میں یہی مفہوم مراد ھے۔

کائنات میں سلسلۂ ارتقاء اس طرح جاری ھے کہ ایک چیز پھٹتی ھے تو اس میں سے نئی زندگی کی نمود ھوتی ھے جو آگے بڑھتی اور اوپر کو اٹھتی ھے۔ پھر اس میں سے اسی طرح ایک اور زندگی کی نمود ھوتی ھے۔ دانے میں سے کونپل نکلتی ھے۔ پھر اس میں سے شاخ پھوٹتی ھے۔ شاخ میں سے پتہ پھوٹتا ھے۔ پھر شگوفہ۔ پھر پھول۔ پھر اس میں پھل لگتا ھے۔ پھل میں بیج پیدا ھوتا ھے۔ بیج سے پھر ایک نئے درخت کا سلسلہ شروع ھو جاتا ھے۔ اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى۔ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ (۶/۹۶)۔ ''اللہ دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ھے۔ زندہ کو مردہ سے نکالتا ھے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ھے''۔ یہ ھے خدا کا متعین کردہ قانون حیات و ارتقاء۔ اور یہ ھے رَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳/۱)۔

ف ل ک

اَلْفَلَكُ۔ ھر چیز کا بڑا اور گول حصہ۔ سمندر کی مضطرب و متردد موج۔ ستاروں کا مدار**۔ قرآن کریم میں ھے كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ (۳۶/۴۰)۔ تمام کرے اپنے اپنے مدار (Orbit) میں نہایت تیزی سے تیرتے ھوئے چلے جاتے ھیں۔ اَلْفُلْكُ (۲/۱۶۴)۔ کشتی کو کہتے ھیں (مذکر و مؤنث دونوں طرح بولا جاتا ھے نیز واحد و جمع کے لئے یکساں مستعمل ھے)**۔

ف ل ن

فُلَانٌ وَفُلَانَةٌ۔ انسانوں کے ناموں کے لئے بطور کنایہ بولا جاتا ھے۔ اول الذکر مذکر کے لئے اور ثانی الذکر مؤنث کے لئے۔ اور الف۔ لام کے ساتھ (یعنی اَلْفُلَانُ وَالْفُلَانَةُ) انسانوں کے علاوہ دوسری چیزوں مثلاً بہائم وغیرہ کے لئے بطور کنایہ استعمال ھوتا ھے***۔

صاحب محیط نے کہا ھے کہ فُلَانٌ اور فُلَانَةٌ بغیر الف۔ لام کے ذوی العقول کے نام کی جگہ کنایۃً استعمال ھوتا ھے۔ اگر کسی ایسی چیز سے کنایہ مقصود ھو جو صاحب عقل وشعور نہ ھو تو فُلَانٌ اور فُلَانَةٌ پر الف۔ لام کا اضافہ کرلیتے ھیں****۔

---

*تاج و محیط۔ **تاج و ابن فارس۔ ***تاج۔ ****محیط المحیط۔

قرآن کریم میں ہے یٰوَیْلَتٰی لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا (۲۵/۲۸) ،، ہائے میری تباہی! کاش، میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا ،،۔ زجاج نے کہا ہے کہ یہاں فُلَانًا سے مراد شیطان ہے کیونکہ اس سے آگے ہے وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا (۲۵/۲۹)۔ ،، اور شیطان آخر انسان کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے ،،۔ لیکن [جیسا کہ ،، شیطان ،، کے باب (عنوان ش ۔ ط ۔ ن) میں بتایا جا چکا ہے] ہر شریر انسان شیطان ہے ۔ اس لئے اس میں سرکشوں اور شرارت پسندوں کی دوستی کیطرف اشارہ ہے ۔

ف ن د

اَلْفَنَدُ ۔ بوڑھا ہونا ۔ بڑھاپے یا بیماری کیوجہ سے عقل کا ناکارہ ہو جانا ۔ بات یا رائے میں غلطی کرنا ۔ سٹھیا جانا *۔ لسان العرب میں ہے کہ فَنَدٌ کے معنی جھوٹ کے ہیں *۔ راغب نے اس کے معنی کمزوری رائے بتائے ہیں **۔ فَنَّدَہٗ ۔ اسے جھوٹا، کمزور رائے والا یا فاترالعقل بتایا۔ اَفْنَدَ ۔ جھوٹ بولا ۔ بوڑھا آدمی جب بہت بوڑھا ہوجاتا ہے تو اسے کہتے ہیں قَدْ اَفْنَدَ ۔ کیونکہ وہ ایسی باتیں کرتا ہے جو صحت کی راہ سے ہٹی ہوتی ہیں ۔ لیکن بوڑھی عورت کو مُفْنِدَۃٌ نہیں کہتے کیونکہ (عربوں کے خیال کے مطابق) عورت جوانی کے زمانے میں کونسی صائب الرائے ہوتی ہے جو اسے بڑھاپے میں مُفْنِدَۃٌ کہا جائے ؟ اصمعی نے کہا ہے کہ جب بوڑھا ہونے کی وجہ سے آدمی بہت زیادہ باتیں کرنے لگے تو اسے مُفْنِدٌ کہتے ہیں *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بوجھل اور سخت ہونے کے ہیں ۔ نیز اس بڑھاپے کے بھی جس کے ساتھ عقل کا فتور شامل ہو۔

سورہ یوسف میں ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے لوگوں سے کہا کہ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (۱۲/۹۴)۔ اگر تم میرے متعلق یہ نہ کہو کہ بڑھاپے کی وجہ سے میری عقل میں فتور آگیا ہے اور میں بہکی باتیں کرنے لگ گیا ہوں تو ......

ف ن ن

اَلْفَنُّ (جمع فُنُوْنٌ وَاَفْنَانٌ) حالت ۔ قسم ۔ نوع ۔ عجیب معاملہ ۔ اَلْفَنَنُ اس شاخ کو کہتے ہیں جس میں تر و تازہ پتے ہوں ۔ (جمع اَفْنَانٌ

*تاج ۔ **راغب ۔

وأَفَانِيْنُ)۔ اَلْفُنُوْنُ۔ مختلف قبیلوں کے ملے جلے لوگوں کو کہتے ھیں۔ رَجُلٌ مِفَنٌّ۔ حیرت انگیز و تعجب خیز کام کرنے والا مرد۔ أَفَانِيْنُ الْكَلَامِ۔ کلام کے مختلف اسالیب اور طریقے*۔ اس سے علوم و فنون کا مفہوم واضح ھے۔

قرآن کریم میں جنت (بلکہ جَنَّتٰنِ) کے متعلق ھے کہ وہ ذَوَاتَا أَفْنَانٍ (۵۵/۴۸) ھے۔ جسکی مختلف شاخیں ھوں۔ جہاں مختلف علوم وفنون عام ھوں۔ قرآن کریم کی رو سے جنتی معاشرہ کی یہ بھی خصوصیت ھے کہ وہ مختلف فنون کی آماجگاہ ھوگا۔

ف ن ی

اَلْفَنَاءُ۔ بَقَاءٌ کی ضد ھے۔ بَقَاءٌ کے معنی ھیں کسی چیز کا اپنی اصلی حالت پر قائم رھنا۔ (دیکھئے عنوان ب۔ ق۔ ی)۔ یعنی اس کا تغیر پذیر نہ ھونا۔ لہذا اَلْفَنَاءُ کے معنی ھونگے کسی چیز میں تغیرات واقع ھوتے رھنا۔ اسکا اپنی اصل حالت پر نہ رھنا بلکہ اس میں تغیر و تبدل واقع ھوتے رھنا۔ قرآن کریم میں ھے كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ۔ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ (۵۵/۲۶-۲۷)۔ فَانٍ۔ اسم فاعل ھے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ایک وقت ایسا آئیگا کہ زمین پر جو کچھ ھے سب معدوم ھو جائیگا اور صرف خدا کی ذات باقی رہ جائیگی۔ اس کے معنی یہ ھیں کہ کائنات میں جو کچھ ھے اس میں ھر آن تغیرات واقع ھوتے رھتے ھیں۔ لیکن خدا کی ذات ایسی ھے جو تغیر پذیر نہیں۔

جسے ''تغیر'' (Change) کہا جاتا ھے، اگر غور سے دیکھا اور سمجھا جائے تو یہ کسی شے کے اندر تبدیلی نہیں ھوتی۔ اس طریق (Process) سے ھوتا یہ ھے کہ جس چیز میں تبدیلی آتی ھے وہ چیز معدوم ھو جاتی ھے اور اسکی جگہ ایک نئی چیز وجود میں آجاتی ھے۔ لیکن یہ دونوں کام اسطرح بیک وقت ھوتے ھیں کہ یہ پتہ ھی نہیں چلتا کہ پہلی چیز کب معدوم ھوئی اور اسکی جگہ دوسری چیز کب وجود میں آئی۔ (برگسان نے اس نکتہ کی بڑی عمدہ تشریح کی ھے) لیکن (برگسان کے فلسفہ کی رو سے) ذات (Personality) ایسی شے ھے جس میں نشوونما اور ارتقاء تو ھوتا رھتا ھے لیکن اس کے باوجود ایسا کبھی نہیں ھوتا کہ وہ معدوم ھو جائے (It does not cease to exist) اسی کو بارد یوئے (Changelessness in change) سے تعبیر کیا ھے۔ اور خدا چونکہ

*تاج و راغب۔

مکمل اور مطلق ذات ہے اس لئے اس میں تغیر اور معدوم ہو کر پھر سے متشکل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ ہمارے دور میں ہنوز فلسفہ یہیں تک پہنچا ہے ۔ لیکن اس سے بھی قرآن کریم کی مندرجہ صدر آیات (۵۵/۲۶-۲۷) کے مفہوم پر کافی روشنی پڑ جاتی ہے ۔

چونکہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) جس چیز میں تبدیلی آتی ہے وہ معدوم ہو جاتی ہے اور اسکی جگہ تبدیل شدہ چیز لے لیتی ہے ، اس اعتبار سے اَلْفَنَاءُ ۔ کسی چیز کے ختم ہو جانے پر بھی بولا جاتا ہے ۔ نیز اَلْفَانِیُّ ۔ بہت بوڑھے آدمی کو بھی کہتے ہیں جو قریب الختم ہوتا ہے ۔ اور فِنَاءُ الدَّار ۔ گھر کے سامنے کے وسیع میدان کو کہتے ہیں کیونکہ وہاں گھر کی عمارت ختم ہو جاتی ہے * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس باب کے کلمات کسی قیاس کے مطابق نہیں آتے ۔

ف ہ م

فَهِمَ ۔ یَفْهَمُ ۔ فَهْماً ۔ کسی چیز کو جان لینا اور دل سے پہچان لینا ۔ بعض لوگوں نے علم اور فہم میں یہ فرق کیا ہے کہ علم تو مطلق ادراک (کسی چیز کو جان لینے) کو کہتے ہیں اور فہم کہتے ہیں خارجی اشیاء پر غور کے بعد ذہن کا دوسری چیزوں کی طرف تیزی سے منتقل ہو جانا ۔ بعض نے کہا ہے کہ الفاظ سے جو تصور ذہن میں آتا ہے اُسے فَہْمٌ کہتے ہیں ۔ بعض کے نزدیک فَہْمٌ ذہن کی اس خوبی کو کہتے ہیں جس سے وہ مطالب کو تیزی اور عمدگی سے اخذ کر لیتا ہے ** ۔ فَہَّمْتُہٗ ۔ میں نے اسے سمجھا دیا ** ۔ قرآن کریم میں ہے فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ (۲۱/۷۹) ۔ ہم نے سلیمان کو معاملہ سمجھا دیا ۔

ف و ت

فَاتَہُ الْاَمْرُ ۔ وہ معاملہ اسکی گرفت سے جاتا رہا ۔ ہاتھ سے نکل گیا ۔ دسترس سے دور ہو گیا *** ۔ (۳/۱۵۲) ۔ دراصل فَاتَہُ الْاَمْرُ کے معنی ہیں اس کام کو کرنے کا وقت نکل گیا *** ۔ اَلْفَوْتُ کے معنی ہیں کسی چیز کا انسان سے اتنا دور ہو جانا کہ اس کا حاصل کر لینا اس کے لئے دشوار ہو **** ۔ (۳۴/۵۱) ۔ چنانچہ محاورہ ہے ہُوَ فَوْتَ فَمِہٖ اَوْ فَوْتَ رُمْحِہٖ ۔ وہ اسے نظر تو آ رہا ہے لیکن اسکی دسترس سے باہر ہے *** ۔ اَلْفَوْتُ ۔ شگاف ۔

*تاج و محیط ۔ **تاج و راغب ۔ ***تاج ۔ ****راغب ۔

نیز دو انگلیوں کے درمیانی خلا کو کہتے ہیں *۔ تَفَاوُتٌ کے معنی عدم مطابقت اور عدم تناسب کے ہوتے ہیں**۔ سورۃ الملک میں ہے۔ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ۔ (۶۷/۳)۔ تم خدا کی پیدا کردہ کائنات میں کہیں بھی عدم تناسب نہیں دیکھو گے۔ ہر جگہ توازن و تناسب نظر آئے گا۔

ف و ج

اَلْفَوْجُ۔ اَلْفَائِجُ۔ لوگوں کی جماعت۔ رؤساء کے متبعین۔ جمع اَفْوَاجٌ ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جمع ہونے اور اکٹھا ہو جانے کے ہیں۔ اَفَاجَ۔ وہ تیز رفتار ہوا۔ فَاجَ الْمِسْکُ۔ مشک کی خوشبو پھیل گئی۔ اس لئے اَلْفَوْجُ تیزی سے گزرنے والی جماعت کو کہتے ہیں***۔ قرآن کریم میں ہے۔ یَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ فَوْجًا (۲۷/۸۳)۔ ''جس دن (یا جس دور میں) ہم ہر اُمت میں سے ایک گروہ کو اکٹھا کرینگے''۔ یہاں اس کے معنی گروہ اور جماعت کے ہیں۔ سورۃ النصر میں ہے یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا۔ (۱۱۰/۲)۔ ''اللہ کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہوتے ہیں''۔ یہاں اس میں تیزی اور کثرت دونوں کا مفہوم ہے۔ نظام خداوندی کی تشکیل میں پہلا مرحلہ تو وہ ہے جس میں داعی الی الحق کی بڑی محنت اور مشقت کے بعد، اکا دکا کرکے، مدت مدید میں، کچھ افراد جمع ہوتے ہیں۔ پھر ان کی محنت شاقہ اور سعیٔ پیہم سے، اس نظام کے اولین مراحل طے ہوتے ہیں۔ یہ السابقون الاولون کی جماعت ہوتی ہے جنہیں قدم قدم پر سینکڑوں قسم کے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ان کی اس سعی مسلسل کے بعد، جب یہ کھیتی پروان چڑھتی ہے تو اس کے درخشندہ و تابناک نتائج کو دیکھ کر، لوگ جوق در جوق اس نظام میں داخل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے وہ منزل جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا۔

ف و ر

فَارَ۔ فَوْرًا۔ جوش مارنا۔ پھوٹ کر نکل پڑنا۔ فَارَتِ الْقِدْرُ۔ ہانڈی جوش کھانے لگی۔ اَلْفَوَّارَۃُ۔ وہ جگہ جہاں سے چشمہ جوش مار کر نکلے*۔ رَجُلٌ فَیُّوْرٌ۔ تیز مزاج اور جلد غصہ میں آجانے والا آدمی**۔

*تاج۔ **محیط۔ ***تاج و محیط و راغب۔

سورۃ ھود میں ھے - فَارَ التَّنُّوْرُ (۱۱/۴۰) - زمین میں سے جوش کے ساتھ چشمے ابل پڑے - سورۃ آل عمران میں ھے - وَ یَاْتُوْکُمْ مِنْ فَوْرِھِمْ (۳/۱۲۴) - وہ اپنے پورے جوش میں تم پر حملہ کریں - سورۃ ملک میں ھے - وَ ھِیَ تَفُوْرُ (۶۷/۷) - وہ جوش مار رھی ھوگی - ابن فارس کے نزدیک اس کے بنیادی معنی جوش مارنے کے ھیں -

فَوْرٌ کے معنی جلدی اور بغیر رکے کسی کام کو کرنے کے بھی ھیں - عربی زبان میں عَلَی الْفَوْرِ اور مِنْ فَوْرِہٖ اور اردو میں فوراً بولتے ھیں - عجلت کا مفہوم اس لئے پیدا ھوا کہ جوش میں عجلت ھی سے کام لیا جاتا ھے -

ف و ز

اَلْفَوْزُ - اگرچہ اس کے معنی کسی مصیبت سے چھٹکارا پا لینے کے بھی ھیں * - لیکن اس کا دوسرا مفہوم اپنی آرزو یا خیر کو حاصل کر لینا ، مقصود کو پا لینا ھے * - مصیبت سے رھائی پالینا محض ایک سلبی (Negative) چیز ھے لیکن قرآن کریم ، جنت کی زندگی کو ایک ایجابی (Positive) مقصد کا حصول (Achievement) قرار دیتا ھے - اس لئے وہ اھلِ جنت کو فَآئِزُوْنَ (۹/۲۰) کہتا ھے - یعنی وہ جو فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا (۳۳/۷۱) کے حامل ھیں - اس میں اس دنیا کا مال و متاع اور خوشگواریاں بھی شامل ھیں ، جیسا کہ قرآن کریم نے (۴/۷۳) میں خود واضح کر دیا ھے - دوسری جگہ اسے مَفَازًا کہا ھے - (۷۸/۳۱) - سورۃ آل عمران میں ھے کہ جو شخص تباھیوں سے محفوظ رھا اور ''جنت میں داخل ھوگیا'' - فَقَدْ فَازَ (۳/۱۸۴) تو یہ ھے جسے کامیاب کہا جائے گا - دیکھئے، اس میں دونوں پہلو موجود ھیں - تباھیوں سے بچنا اور زندگی کی خوشگواریوں کا حاصل ھوجانا - یہ ھے کامیابی - اسی کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ھے - یُنَجِّی اللّٰہُ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِھِمْ (۳۹/۶۱) - متقیوں کو اللہ تباھیوں سے بچاتا ھے، اُن کی کامیابی کے ساتھ - یعنی وہ تخریبی قوتوں کے شر سے بھی محفوظ رھتے ھیں اور اپنے مقاصد کو حاصل بھی کرتے ھیں -

دنیائے مذاھب میں زندگی کا مقصد ان مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کرلینا ھے - جن میں انسان گرفتار ھوتا ھے - لیکن قرآن کریم اس چیز کو مقصودِ حیات قرار نہیں دیتا - اس کے نزدیک ان تباھیوں سے بچ کر اپنے مقصد کو

*تاج نیز ابن فارس -

حاصل کرنے (Positive Achievement) کا نام کامیابی ہے - (دیکھئے عنوان ف - ل - ح اور ن - ج - و) - یہ مثبت کامیابی ، اس دنیا میں سربلندی اور سرفرازی کی زندگی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت - یہی فوزعظیم ہے -

ف و ض

فَوَّضَ اِلَيْهِ الْاَمْرَ تَفْوِيْضًا - اس نے معاملہ اس کی طرف لوٹا دیا ، اس کے حوالہ کردیا* - اس معاملہ کا فیصلہ اس کے اوپر چھوڑ دیا - اَلْمُفَاوَضَةُ کے معنے ہوتے ہیں ایک دوسرے کے برابر اور شریک کار ہونا- مَتَاعُهُمْ فَوْضٰى بَيْنَهُمْ - ان کا سامان اس طرح ان کے درمیان مشترک ہے کہ اس میں بلا تخصیص غیرے سب برابر کے شریک ہیں - اسلئے قَوْمٌ فَوْضٰى اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں تمام لوگ برابر ہوں- کوئی کسی پر حکم نہ چلائے ، نہ کوئی کسی سے مشورہ کرے - اور نہ ان کا کوئی حاکم اور لیڈر ہو* - ان لوگوں کو بھی کہتے ہیں جن کا معاملہ غیر واضح اور گڈ مڈ ہو - ان میں سے کوئی اپنی ذمہ داری کا احساس نہ کرتا ہو اور ایک دوسرے پر کام ڈالتا ہو - اسی سے آجکل فَوْضَوِيَّت انارکی (Anarchy) کو کہتے ہیں -

قرآن کریم میں ہے وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰهِ (۴۰/۴۴) - میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں - اسے اپنے معاملہ کا مختار بناتا ہوں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی پر تکیہ کرنا اور اس کے سپرد کر دینا ہیں - جماعت مومنین قوانینِ خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کرتی ہے اور اپنے معاملات کو انہی کے سپرد کردیتی ہے -

ف و ق

فَوْقٌ - تَحْتٌ کی ضد ہے - تَحْتٌ کے معنی نیچے اور فَوْقٌ کے معنی اوپر - قرآن کریم میں یہ لفظ اَسْفَلَ کے مقابلہ میں بھی آیا ہے (۳۳/۱۰) - فَاقَ فَوْقًا کے معنی ہیں کسی سے کسی بات میں زیادہ ہونا - فَوْقٌ کے معنے کبھی دُوْنٌ یعنی ورے اور کمتر کے بھی ہوتے ہیں - چنانچہ جب کوئی کہے کہ فُلَانٌ صَغِيْرٌ (وہ چھوٹا ہے) اور اس کے جواب میں کہا جائے وَ فَوْقَ ذٰلِكَ تو یہاں فوقَ سے مراد ہوگا اس سے بھی چھوٹا (جتنا تم

*تاج و محیط و راغب -

بتا رہے ہو)* ۔ (۲/۲۶) میں یہی مفہوم ہے ۔ لیکن بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ اس آیت میں بھی یہ اوپر ہی کے معنے رکھتا ہے ۔ یعنی مچھر سے بڑے مثلاً مکڑی وغیرہ ۔

اَلْفَائِقُ ۔ ہر چیز کا بہترین حصہ ۔ تَفَوَّقَ عَلٰی قَوْمِہٖ کے معنی ہیں وہ رتبہ میں اپنی قوم پر بلند ہوگیا ۔ اس اعتبار سے قرآن کریم میں لفظ فَوْقُ غلبہ و تسلط کے معنوں میں آیا ہے ۔ یَخَافُوْنَ رَبَّھُمْ مِنْ فَوْقِھِمْ (۱۶/۵۰) ۔ ان پر خدا کا جو غلبہ و تسلط ہے اس سے خائف رہتے ہیں ۔ اَفَاقَۃٌ ۔ فَوَاقٌ اور فُـوَاقٌ اس وقفے کو کہتے ہیں جو اونٹنی کے دو مرتبہ دودھ دوھنے کے درمیان ہو ۔ یا یہ کہ اونٹنی جنگل سے چر کر آئے تو اسے تھوڑی دیر آرام کرنے کےلئے چھوڑ دیا جائے اور اس کے بعد اس کا دودھ دوھا جائے* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے دوسرے بنیادی معنی لوٹ آنا بھی ہیں ۔ چنانچہ فَوَاقُ النَّاقَۃِ کے معنی ہیں دودھ دوھنے کے بعد دودھ کا پھر تھنوں میں لوٹ آنا ۔ سورۃ اعراف میں ہے ۔ فَلَمَّا اَفَاقَ (۷/۱۴۳) ۔ جب اسے غش کے بعد ہوش آیا ۔ جب اس میں سکون پیدا ہوا ۔ نیز فَوَاقٌ ہچکی کو کہتے ہیں* ۔ سورۃ ھود میں ہے مَالَھَا مِنْ فَوَاقٍ (۳۸/۱۵) ۔ اس میں وقفہ نہیں ہوگا ۔ ابن فارس نے اس کے معنے رجوع اور پلٹ کر آنا لکھے ہیں ۔ یعنی تکرار اور دوبارہ ہونا ۔ اَلْفَاقَۃُ ۔ فقر اور ضرورت کو کہتے ہیں ۔ اِفْتَاقَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں وہ آدمی فقیر اور حاجت مند ہوگیا* ۔

ف و م

اَلْفُوْمُ ۔ بعض کا خیال ہے کہ اس میں فاء، ثاء سے بدل دی گئی ہے اور اصل میں یہ لفظ ثُوْمٌ (بمعنی لہسن) ہے ۔ مگر صحیح یہ ہے کہ اَلْفُوْمُ گیہوں کو کہتے ہیں اور روٹی کو بھی ۔ نیز ان تمام غلوں کو کہتے ہیں جن کی روٹی پکائی جاتی ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلْفُوْمُ چنے کو کہتے ہیں** ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ (۲/۶۱) میں آیا ہے ۔

ف و ہ

فَاہٌ ۔ فُوْہٌ ۔ فِیْہٌ ۔ سب کے معنی مُنہ (فَمٌ) کے ہیں ۔ جمع اَفْوَاہٌ ۔ اَلْاَفْوَاہُ ۔ مسالے نیز وہ چیزیں جو خوشبو کے لئے ڈالی جائیں ۔ قسم قسم

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔

کے پھول اور کلیاں - انواع و اقسام کی چیزیں *- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں کھلن کے ہیں - (یعنی کسی چیز کا بند نہ ہونا بلکہ کھلا ہونا)

راغب نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں کسی کی بات (قَوْلٌ) کو فَمٌ یا فُوْہٌ کی طرف منسوب کیا ہے وہاں اس کے جھوٹ کی طرف اشارہ ہے - یعنی وہ صرف زبان سے ایسا کہتے ہیں - ان کے دل کی تائید اس کے ساتھ شامل نہیں** - یَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ (۳/۱۶۶) - وہ زبان سے ایسی باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں -

فِی (حرف)

فِیْ - (۱) ظرفِ مکان یا ظرفِ زمان کے لئے آتا ہے - جیسے ، مسجد میں - یا چند سال کے عرصہ میں - فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ (۲۸/۱۸) - پس وہ صبح کے وقت شہر میں آیا - یا غُلِبَتِ الرُّوْمُ ..... فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ (۳۰/۲-۴) رومی مغلوب ہو گئے ، (اور وہ مغلوب ہونے کے بعد غالب آجائینگے) چند سال کے عرصہ میں - یا ویسے ہی ''میں'' کے معنوں میں - مثلاً وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ (۲/۱۷۹) - تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے -

(۲) معیت (ساتھ) کے معنوں میں - قَالَ ادْخُلُوْا فِيْ اُمَمٍ (۷/۳۸) - ان سے کہیگا کہ تم (سابقہ) امم کے ساتھ (جہنم میں) داخل ہو جاؤ - یعنی انہی میں شامل ہو جاؤ -

(۳) سبب کے لئے - قالت فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ (۱۲/۳۲) - (عزیز کی عورت نے) کہا کہ یہی وہ ہے جس کی وجہ سے تم مجھے ملامت کرتی تھیں -

(۴) عَلٰی (اوپر) کے معنوں میں - وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ (۲۰/۷۱) - میں تمہیں کھجور کے تنوں پر صلیب دونگا -

(۵) اِلٰی (تک - کی طرف) کے معنوں میں - فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ (۱۴/۹) - تو وہ اپنے ہاتھ ان کے منہ تک لئے گئے -

(۶) مِنْ (سے) کے معنوں میں - وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا - جس دن (۱۶/۸۹) - ہم ہر امت میں سے شاہد کھڑے کرینگے -

*تاج - **راغب -

(۷) مقابلہ کے لئے - فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ (۹/۳۸) - متاع دنیا آخرت کے مقابلہ میں قلیل ہے -

(۸) کبھی یہ زائد بھی ہوتا ہے - قَالَ ارْکَبُوْا فِیْھَا (۱۱/۴۱) - اس نے کہا کہ اس (کشتی) میں سوار ہو جاؤ - فِیْ اس لئے زائد ہے کہ خالی ارْکَبُوْھَا کے بھی وہی معنی ہیں -

(۹) سورۂ عنکبوت میں ہے - وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹) - اس کے معنی ہونگے، جو لوگ ہمارے لئے یا ہماری راہ میں یا ہماری (متعین کردہ منزل) کی طرف آنے کے لئے جد و جہد کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستوں کی طرف راہ نمائی کر دیتے ہیں (یہ مثال لغت کی کسی کتاب میں نہیں ملی)۔

ف ی أ

فَیْءٌ - سایہ - محیط میں ہے کہ طلوع آفتاب سے لیکر زوال آفتاب تک کے سایہ کو ظِلٌّ کہتے ہیں، اور زوال آفتاب سے غروب آفتاب تک کے سایہ کو فَیْءٌ - چونکہ سایہ لوٹ کر آتا ہے اسی لئے فَاءَ کے معنی لوٹنے یا واپس آنے کے ہوتے ہیں اور اَفَاءَ کے معنے لوٹانے اور پلٹانے کے - فَیْءٌ کے معنی اچھی حالت کی طرف لوٹ آنے کے ہوتے ہیں - مال غنیمت اور خراج کو بھی فَیْءٌ کہتے ہیں، اسلئے کہ وہ کفار کی طرف سے مسلمانوں کی طرف لوٹ آتا ہے -

سورۂ نحل میں ہے - یَتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَالشَّمَآئِلِ (۱۶/۴۸) - اس کا سایہ دائیں بائیں لوٹتا رہتا ہے -

سورۂ حجرات میں ہے - حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ - (۴۹/۹) - تاوقتیکہ وہ قانون خداوندی کی طرف لوٹ نہ آئے -

قرآن کریم نے فیْ اور غنیمت کا الگ الگ ذکر کیا ہے - مال فیْ کے متعلق سورۂ حشر میں ہے وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْهِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِکَابٍ وَّلٰکِنَّ اللّٰهَ یُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ ..... (۵۹/۶) - " اور اللہ نے اپنے رسولؐ کو ان سے جو مال فیْ دلایا تو تم نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے تھے نہ اونٹ - لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے تسلط دیدیتا ہے " - اس سے ظاہر ہے کہ مال فیْ وہ ہے جو بغیر لشکر کشی کے حاصل ہو جائے - ہو سکتا ہے کہ

اس میں (دشمن سے حاصل کردہ مال کے علاوہ) وہ مال بھی شامل ہو جو صوبے، اپنی ضروریات سے فاضل، مرکز کیطرف بھیجدیں - مال فیؑ کی تقسیم کے متعلق فرمایا کہ یہ ''اللہ کے لئے اور رسولؐ کے لئے اور ذی القربیٰ - یتامٰی - مساکین اور ابن السبیل کے لئے ہے''۔ اس کے بعد ہے کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ - ''تاکہ یہ مال تم میں سے دولتمندوں کے اندر ہی گردش نہ کرتا رہے'' - یہ اصول قومی معیشت کے ایک بنیادی نکتہ کو بیان کرتا ہے - یعنی دولت کی گردش (Circulation) اوپر کے طبقہ ہی میں نہیں ہوتی رہنی چاہئے - اس کے بعد ہے وَمَا آتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَھُوْا (۵۹/۷) - ''جو کچھ تمہیں رسولؐ دے اسے لے لو - اور جس سے وہ تمہیں روکے اس سے رک جاؤ''۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگرچہ قرآن کریم نے مملکت کی دولت کے مصارف کی اصولاً نشاندہی کر دی ہے لیکن اس کی تفصیلی تقسیم کا حق مرکز کو دیا ہے جو مقتضائے حالات کے مطابق خرچ کریگا -

مالِ غنیمت کے متعلق سورۃ انفال میں ہے وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ... (۸/۴۱) - اور سمجھ لو کہ جو کچھ تمہیں بطور غنیمت ملے، تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے ہے، اور رسولؐ کے لئے اور ذی القربٰی کے لئے - یتامٰی - مساکین اور ابن السبیل کے لئے''۔

صدقات کے مصارف کے متعلق سورہ توبہ میں ہے کہ وہ ''فقراء - مساکین - اور صدقات کے کارکنوں کے لئے ہیں - اور ان کے لئے جنکی تالیف قلوب ضروری ہے - اور بندھنوں میں جکڑے ہوئے لوگوں کو آزاد کرانے کیلئے - اور مقروض و مصیبت زدوں کے لئے - اور ''اللہ کی راہ'' میں خرچ کرنے کے لئے اور ابن السبیل کے لئے ..... (۹/۶۰) -

مال فیؑ اور غنیمت کے مصارف میں ''ذی القربٰی'' کے متعلق استاذ محمدؐ عزّة دروزہ نے اپنی کتاب ''الدستورالقرآنی'' میں لکھا ہے کہ اس سے مراد ''رشتہ دار'' نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو اسلام میں پیش پیش رہے ہوں اور جنہوں نے اسلام اور ملت کے لئے مفید خدمات سرانجام دی ہوں۔ لیکن قرآن کریم کے دیگر مقامات سے اس مفہوم کی تائید نہیں ملتی - البتہ اس نے جو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد رسول اللہؐ کے رشتہ دار نہیں، تو یہ چیز قرآنی مفہوم کے مطابق ہے -

ف ی ض

فَاضَ السَّمَاءُ ۔ یَفِیْضُ ۔ فَیْضًا ۔ فُیُوْضًا ۔ کسی جگہ پانی کا بہت زیادہ جمع ہوکر وہاں سے نکل پڑنا اور بہہ نکلنا ۔ آنسوؤں کے بہنے کے لئے بھی آتا ہے (۵/۸۳) ۔ حَوْضٌ فَائِضٌ ۔ لبالب بھرا ہوا حوض ۔ بَحْرٌ فَائِضٌ ۔ پر جوش سمندر جس کا پانی اوپر سے اچھل کر نکل رہا ہو ۔ اَلْفَیْضُ دریا اور نہر کو کہتے ہیں ۔ فَیَّاضٌ ۔ بہت پانی والی نہر ۔ فَاضَ الْمَالُ یَفِیْضُ ۔ مال بہت زیادہ ہوگیا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آسانی سے بہنے کے ہیں ۔ یہیں سے یہ لفظ لوگوں کے کثیر تعداد میں ادھر ادھر جانے کے لئے استعمال ہونے لگا ۔ چنانچہ اَلْاِفَاضَۃُ کے معنی ہیں کثیر آدمیوں کا تیزی کے ساتھ چلنا ۔ یکبارگی چل پڑنا ۔ یکبارگی روانگی اور واپسی کو اِفَاضَۃٌ کہتے ہیں ۔ نیز باتوں میں بہ جانے (مشغول ہوجانے) کو بھی* ۔ در اصل الاِفَاضَۃُ کے معنے لنڈھانا ، اوپر سے گرانا اور بہانا ہیں (۲/۵۰) ۔

چل پڑنے کے معنوں میں قرآن کریم میں یہ لفظ (۲/۱۹۹) میں آیا ہے ۔ باتوں میں لگ جانے کے لئے (۴۶/۸) میں ۔ اور باتوں میں مشغول ہو جانے اور چرچا کرنے ، دونوں معنوں میں (۲۴/۱۴) میں ۔

ف ی ل

اَلْفِیْلُ ۔ ہاتھی* ۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ "پیل" سے معرب ہے ۔ اور جو لفظ فِیْلٌ عربی الاصل ہے اس کے معنی کمزوری کے ہوتے ہیں ۔ رَجُلٌ فِیْلُ الرَّاْیِ ۔ کمزور رائے والا آدمی ۔

قرآن کریم میں اَصْحَابُ الْفِیْلِ (۱۰۵/۱) آیا ہے ۔ اس کے متعلق تاریخ میں ہے کہ ابرهۃ الاشرم حبشی اپنی ہاتھیوں کی فوج لیکر کعبہ کو مسمار کرنے کے لئے مکہ پر چڑھ آیا تھا اور اس کے لئے اس نے پہاڑیوں کی اوٹ میں ، خفیہ راستہ اختیار کیا تھا ۔ لیکن گدھوں کے جھنڈ ، جو اپنی جبلی ذہانت سے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ فوج کسی طرف جا رہی ہے اس لئے ہمیں ان کے ساتھ جانے سے بہت سا سامان خوراک (لاشیں) ملینگی ، ان کے اوپر منڈلاتے ہوئے آگئے ۔ انہیں دیکھ کر قریش عرب نے بھانپ لیا کہ کوئی لشکر ادھر آرہا ہے ۔ چنانچہ وہ اپنی پہاڑیوں پر چڑھ گئے اور وہاں سے زور

*تاج ۔

کا پتھراؤ کیا ۔ کچھ تو خود ان پتھروں سے ، اور کچھ اس طرح کہ ان سے ہاتھی بھڑک اٹھے اور اپنی فوج کو کچلتے ہوئے بھاگے ، وہ فوج بھس کی طرح ہوگئی ۔ یہ سارا واقعہ سورۃ فیل میں بیان ہوا ہے ۔ واقعہ ایسا تھا جسے مخاطبین عرب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ، اس لئے وہ جانتے تھے کہ قرآن کریم کیا کہہ رہا ہے ۔ قرآن کریم کا اس سے مقصد یہ بتانا تھا کہ تم اس دین حق کی مخالفت چھوڑدو ورنہ تم بھی اسی طرح تباہ و برباد ہوجاؤ گے ۔

ق

قارون

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو فرعون ، ہامان اور قارون کی طرف بھیجا گیا تھا (۴۰/۲۴)۔ اور ان دونوں کی طرح قارون بھی ہلاک ہونے والوں میں سے تھا (۲۹/۳۹)۔ قارون قوم موسیٰؑ میں سے تھا اور سرمایہ داری کی لعنت کا مجسمہ ۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر اسی خصوصیت کے ساتھ کیا ہے (۲۸/۷۶-۸۲)۔ تورات میں ہے کہ قارون (قرح بن ظہار بن قیات بن لاوی) حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ کے لئیے اٹھا (گنتی ۱۶/۱-۳) ۔ یہودیوں کا مشہور مؤرخ جوزیفس ، اپنی تاریخ (Antiquity of the jews) میں لکھتا ہے کہ

> قارون جسکی شہرت اس کے نسب اور اسکی دولت دونوں وجہ سے تھی ، عبرانیوں کے مشاہیر میں سے تھا ۔ اسے حضرت موسیٰؑ سے حسد پیدا ہوا اور اس نے تمام بنی لاوی کو اور اپنے اہل خاندان کو ان کے خلاف ابھارا (حصہ ۴ ۔ باب ۳ ۔ فصل ۲)

جیوئش انسائکلوپیڈیا میں ہے

قرح کا نام بہ حیثیت غیر معمولی دولت کے مالک کے آتا ہے ۔ حضرت یوسفؑ نے جو خزانے مصر میں دفن کئیے تھے ان میں سے ایک خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا تھا ۔ تین سو خچروں کی ضرورت تو محض اس کے خزانے کی کنجیاں اُٹھانے کیلئے ہوتی تھی ۔ (جلد ۷ ۔ صفحہ ۵۵۶)۔

چونکہ حضرات انبیائے کرامؑ کی دعوت انقلاب ، نظام سرمایہ داری (Capitalism) کو مٹانے کیلئے ہوتی تھی اسلئیے قرآن کریم نے خصوصیت سے قارون کا ذکر کیا ہے ۔ سرمایہ پرست کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ (وہ سمجھتا ہے کہ) میں جو کچھ کماتا ہوں وہ میری اپنی ہنر مندی اور چابکدستی کا نتیجہ ہے اس لئیے وہ میری واحد ملکیت ہے جس میں کسی اور کا حق اور حصہ

نہیں ۔ میں جتنا جی چاہے جمع کروں اور اسے جسطرح جی چاہے صرف کروں۔ قارون (جسے قرآن کریم نے اس ذہنیت کے ایک ترجمان کی حیثیت سے پیش کیا ہے) یہی کہتا تھا۔ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (۲۸/۷۸)۔ ''وہ کہتا تھا کہ یہ سب کچھ مجھے اپنی ہنر مندی سے ملا ہے''۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ (۳۹/۴۹) یہ ان لوگوں کی بڑی غلط نگہی اور گمراہی ہے۔ جس چیز کو انسان اپنی ہنر مندی اور ذاتی صلاحیت کہتا ہے ذرا سوچئے تو سہی کہ اس میں کتنا حصہ اس کا اپنا ہے اور کتنا حصہ قدرت کا عطیہ۔ خود انسانی ذہن اور اسکی استعداد کو لیجئے۔ یہ کسی فرد کی نہ اپنی پیدا کردہ ہوتی ہے نہ زر خرید۔ یہ خالصۃً موہبت خداوندی (عطیہ فطرت) ہے۔ اس سے آگے وسائل پیداوار (زمین اور مافیہا) کو لیجئے تو یہ تمام کے تمام فطرت کے عطا کردہ ہیں۔ اس لئے اگر بغور دیکھا جائے تو انسان جو کچھ حاصل کرتا ہے اس میں محنت (Labour) اسکی اپنی ہوتی ہے، باقی سب کچھ خدا کا عطا کردہ۔ لہذا اس میں اسکا صرف حق المحنت ہوتا ہے۔ باقی سب کچھ خدا کا ہوتا ہے۔ خدا ''اپنے حصے'' کے متعلق کہتا ہے کہ اسے نوع انسانی کی عام پرورش (ربوبیت عامہ) کے لئے کھلا رکھنا چاہئے۔ لہذا قارونی (سرمایہ دارانہ) ذہنیت، قرآن کے نظام ربوبیت کی ضد ہے، اور اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی۔ اسی لئے قرآن کریم نے قارون کے اس قول کے بعد جسے اوپر درج کیا گیا ہے کہا ہے کہ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا (۲۸/۷۸)۔ ''کیا اسے علم نہ تھا کہ اللہ نے اس سے پہلے ایسی ایسی قوموں کو تباہ کردیا جو طاقت اور جمعیت میں اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ یعنی نظام سرمایہ داری کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے اس لئے یہ نظام کبھی پنپ نہیں سکتا۔

ق ب ح

اَلْقَبِيْحُ ۔ وہ چیز جسے نگاہ دیکھنا پسند نہ کرے اور وہ عمل جس سے انسان کا دل نفرت کرے۔ مَقْبُوْحٌ ۔ وہ شخص جسے ذلیل و خوار سمجھا جائے اور دھتکار دیا جائے۔ وہ چیز جسے بدنما بنا دیا گیا ہو۔ نیز جسے خیر سے دور رکھا جائے*۔ ابن فارس نے قَبَحَہٗ کے معنے اسے ہٹایا اور دور کر دیا لکھے ہیں، اور اس مادہ کے بنیادی معنے حسن کی ضد بتائے ہیں۔ نَاقَةٌ قَبِيْحَةُ الشَّخْبِ وہ اونٹنی جس کے تھنوں کے سوراخ بہت وسیع ہوں۔ قَبَحَ الْبَيْضَةَ ۔ اس

*راغب و تاج و محیط۔

نے انڈے کو توڑ ڈالا ۔ نیز ہر چیز کو توڑنے پھوڑنے کے لئے بھی یہ لفظ بول دیا جاتا ہے ۔ اَلْقُبْحُ ۔ حسن کی ضد ہے * ۔

قرآن کریم میں مجرمین کے متعلق ہے هُمْ مِنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ (۲۸/۴۲) ۔ وہ زندگی کی تمام خوشگواریوں سے محروم کر دئے جائیں گے ۔ وہ ذلیل و خوار ہوں گے ۔ ان کی صلاحیتیں ضائع چلی جائیں گی۔

ق ب ر

اَلْقَبْرُ ۔ میت کو دفن کرنے کی جگہ ۔ اَلْمَقْبَرَۃُ ۔ قبرستان ۔ قَبَرَہٗ ۔ یَقْبِرُہٗ وَ یَقْبُرُہٗ ۔ اس نے اسے دفن کر دیا * ۔ سورۂ عبس میں ہے ۔ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ (۸۰/۲۱) ۔ پھر خدا اسے مارتا ہے (موت دیتا ہے) اور اسے قبر میں رکھواتا ہے ۔ اس کے لئے قبر مہیا کرتا ہے یا اسے قبر میں دفن کرنے کا کہتا ہے ۔ یہاں قَبَرَہٗ نہیں کہا بلکہ اَقْبَرَہٗ کہا ہے ۔ کیونکہ قَبَرَہٗ اُس وقت کہتے ہیں جب کوئی کسی کو اپنے ہاتھ سے دفن کرے ۔ مَقْبَرَۃٌ کی جمع مَقَابِرُ آتی ہے ۔ سورہ تکاثر میں ہے زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۔ (۱۰۲/۲) ۔ قرآن کریم میں مَنْ فِی الْقُبُوْرِ (۲۲/۷ ; ۳۵/۲۲) کنایۃً ان کے لئے بھی آیا ہے جو زندگی کی شادابیوں سے محروم ہو چکے ہوں یا جہالت اور تعصب میں اس درجہ آگے بڑھ چکے ہوں کہ ان پر کوئی نصیحت کارگر نہ ہو ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے م ۔ و ۔ ت اور ح ۔ ی ۔ ی کے عنوانات)

واضح رہے کہ قرآن کریم نے مُردوں کے متعلق قبر یا مرقد وغیرہ کے جو الفاظ استعمال کئے ہیں (مثلاً مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۔ ۳۶/۵۲) ۔ تو اس سے مراد یہ نہیں کہ مردے کسی خاص مقام (قبروں) سے اٹھائے جائینگے ۔ اگر یہ مراد ہو تو ان مُردوں کی بابت کیا کہا جائیگا جنہیں دفن نہیں کیا جاتا ؟ دفن کرنا تو مُردوں کی (Disposal) کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے ۔ اس کے علاوہ مختلف اقوام کے ہاں اور طریقے بھی رائج ہیں ۔ قرآن کریم کا مقصد موت کے بعد کی زندگی کو بیان کرنا ہے ۔ عربوں کے ہاں چونکہ مُردے قبروں میں گاڑے (دفن کئے) جاتے تھے اس لئے قرآن کریم نے قبروں کا ذکر کیا ہے، ورنہ حیات بعد الممات کے لئے نہ کسی مقام کی خصوصیت ہے نہ اس جسم کی ضرورت جو موت کے ہاتھوں تلف ہوجاتا ہے ۔ موت کے بعد زندگی یقینی ہے لیکن اس زندگی کے لئے پیکر یا مظہر کس قسم کا ہوگا، ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس کا ادراک نہیں کر سکتے ۔ ویسے بھی اصل مقصد تو زندگی سے ہے، نہ کہ اس کے مظاہر سے ۔

* تاج و راغب و محیط ۔

ق ب س

اَلْقَبَسُ ۔ آگ کا شعلہ (یا چنگاری) جسے کسی بڑی آگ سے حاصل کیا جائے ۔ اَلْمُقْتَبَسُ ۔ آگ کی چنگاری* ۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے ۔ اٰتِیْکُمْ مِنْھَا بِقَبَسٍ (۲۰/۱۰) میں اس آگ سے تمہارے پاس شعلہ لے آؤں ۔ اِقْتَبَسَ ۔ اس نے بڑی آگ سے کچھ آگ لے لی* ۔ سورہ حدید میں ہے ۔ نَقْتَبِسْ مِنْ نُوْرِکُمْ (۵۷/۱۳) ۔ ہم تمہاری روشنی سے کچھ روشنی لے لیں ۔ تمہارے دیے سے اپنا دیا جلا لیں ۔ اس سے اِقْتَبَسَ الْعِلْمَ کے معنی ہیں کسی سے علمی استفادہ کرنا* ۔

ق ب ض

قَبَضَ عَلَیْہِ بِیَدِہٖ ۔ اس نے اسے اپنے پورے پنجے سے پکڑ لیا ۔ گرفت میں لے لیا ۔ قَبَضَ یَدَہٗ عَنْہُ ۔ اس نے اسے پکڑنے سے اپنے ہاتھ کو سکیڑ لیا ۔ یا کھینچ لیا ۔ دراصل قَبَضَ کے معنے کھینچ لینے یا سکیڑ لینے کے ہوتے ہیں** ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) کسی چیز کو لے لینا اور (۲) کسی چیز کا سکڑ اور سمٹ کر مجتمع ہو جانا بتائے ہیں ۔ یہ بَسَطَ کی ضد ہے (۲/۲۴۵) جس کے معنی پھیلانے اور وسیع کرنے کے ہیں ۔ سورۂ فرقان میں ہے ۔ ثُمَّ قَبَضْنٰہُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَسِیْرًا (۲۵/۴۶) پھر ہم اسے آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں ۔

قَبْضَۃٌ ۔ ملکیت ۔ سورۂ زمر میں ہے ۔ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ بِیَمِیْنِہٖ (۳۹/۶۷) ۔ آسمانی انقلاب کے دور میں معاش کے تمام ذرائع اسی خدا کی ملکیت میں ہونگے جس کے تصرف میں کائناتی نظام ہے ۔ یعنی اس وقت انسانی معاش بھی خدا ہی کے قانون کے تابع ہوگی ۔ یہ نہیں ہوگا کہ کائنات میں خدا کا قانون چل رہا ہو اور زمین (انسانی معاش) میں انسانوں کا خود ساختہ قانون ۔ یہ شرک ہے ۔

قَبْضَۃٌ ۔ اختیار کرنا ۔ سورہ طٰہٰ میں سامری کے متعلق ہے کہ اس نے کہا کہ فَقَبَضْتُ قَبْضَۃً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ (۲۰/۹۶) ۔ میں نے رسول (حضرت موسیٰؑ) کے نقش قدم (مسلک و مشرب) میں سے بہت تھوڑا سا اختیار کیا ۔ یعنی میں نے ان کی بہت تھوڑی سی پیروی کی ۔ فَنَبَذْتُھَا ۔ اور پھر اسے بھی چھوڑ دیا*** ۔

مَقْبُوْضَۃٌ ۔ قبضہ کی ہوئی ۔ ہاتھ میں لی ہوئی ۔ (۲/۲۸۳) ۔

---

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔ ***ابو مسلم اصفہانی بحوالہ غریب القرآن ۔ میرزا ابو الفضل ۔

سورۂ ملک میں پرندوں کے متعلق ہے - صٰفّٰتٍ وَّ یَقْبِضْنَ (۶۷؍۱۹) - اس کے عام معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے پر پھیلاتے ہیں اور سکیڑتے ہیں - لیکن صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ قَبَضَ الطَّائِرُ کے معنی ہیں پرندے نے اڑنے میں تیزی کی - اسی طرح فَرَسٌ قَبِیْضٌ اَلشَّدِّ کے معنی ہیں تیزی سے پاؤں اٹھانے والا گھوڑا* - ابن فارس نے بھی اس کے یہی معنی لکھے ہیں -

ق ب ل

قَبْلٌ - بَعْدٌ کی ضد ہے - قرآن کریم میں ہے لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ بَعْدُ (۳۰؍۴) - "پہلے اور پیچھے اللہ ہی کا امر ہے" - نیز قَبْلٌ کے معنی "بغیر" کے بھی ہوتے ہیں - قرآن کریم میں ہے قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیْ (۱۸؍۱۰۹) جس کے معنی ہیں "بغیراس کے کہ میرے رب کے کلمات پورے ہوسکیں***- (اگرچہ یہاں اس کے معنی "قبل اسکے" بھی ہوسکتے ہیں) - اَلْقُبُلُ اَلْقُبْلُ - (یہ الدُّبُرُ و الدُّبْرُ پیچھے کی ضد ہے - یعنی) آگے - سورۂ یوسف میں ہے وَ اِنْ کَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ (۱۲؍۲۶) - "اگر اس کی قمیص آگے سے پھٹی ہے" -

اَلْقُبُلُ - پہاڑ کا دامن (عرض میں) - اَلْقُبُلُ مِنَ الزَّمَنِ - زمانہ کا اولین حصہ - اَلْقُبْلَةُ - بوسہ - قَوَابِلُ الْاَمْرِ - کسی معاملہ کے ابتدائی امور - مبادیات - اَلْقَابِلَةُ - آنیوالی شب - نیز وہ عورت جو بچہ جنائے** -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا دوسری چیز کے آمنے سامنے ہونا ہیں - رہ گیا قَبْلُ کا لفظ جو بَعْدُ کی ضد ہے تو وہ اس بنیادی معنی کے تحت نہیں آتا - لہذا وہ خلاف قیاس ہے ، اگرچہ یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ جو چیز پہلے واقع ہوتی ہے وہ زمانہ کے سامنے آرہی ہوتی ہے - لیکن یہ توجیہ قرین قیاس نظر نہیں آتی*** -

قِبَلٌ کے معنی ہیں آمنے سامنے - نیز طرف ، جہت ، رخ ، سمت - یہ بمعنی عِنْدَ بھی آتا ہے - یعنی پاس ، نزدیک - اس کے معنی تاب و تواں اور طاقت کے بھی ہیں - سورۂ حدید میں ہے وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ (۵۷؍۱۳) - اس کے معنی "باہر کی جہت" یا باہر کی طرف ، سامنے سے عذاب ،

*تاج - **تاج و محیط - ***ابن فارس -

دونوں آسکتے ہیں ۔ اسی طرح سورۃ بقرہ میں قِبَلَ الْمَشْرِقِ (۲/۱۷۷) آیا ہے ۔
اس کے معنی مشرق کی سمت ہیں ۔ لیکن اگر قِبَلٌ کو قِبْلَۃٌ کی جمع تصور کرلیا جائے تو اس کے معنی ''مشرق و مغرب کے تمام قبلے'' ہونگے ۔ (تفصیل آگے چل کر آئیگی) ۔

تَقَبَّلَہٗ و قَبِلَہٗ ۔ اس نے اسے لے لیا ۔ منظور کر لیا ۔ قبول کر لیا*۔ قرآن کریم میں ہے وَھُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ (۴۲/۲۵) ۔ ''اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے'' ۔ دوسری جگہ ہے قَابِلِ التَّوْبِ (۴۰/۳) ۔ ''توبہ قبول کرنے والا'' ۔ تَقَبَّلَ ۔ کسی چیز کو اسطرح قبول کرنا کہ وہ اجر و ثواب کی مستحق ہو* ۔ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ (۵/۲۷) ۔ ''اللہ صرف متقین کا عمل قبول کرتا ہے'' ۔ ان آیات میں ''قبول کرنے'' سے مراد کسی چیز کا لے لینا ہیں (جیسے ہم کسی کا نذرانہ لے لیتے ہیں) ۔ مطلب یہ ہے کہ ان اعمال کا خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق عمدہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے جو اعمال اس کے مقرر کردہ قانون اور قاعدے کے مطابق سرزد ہوں وہی خوشگوار نتائج کے حامل ہوتے ہیں ۔

قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کے تذکرہ کے ضمن میں ہے ۔ فَتَقَبَّلَھَا رَبُّھَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ (۳/۳۶) ۔ ''خدا نے اسے اچھی قبولیت سے قبول کیا'' ۔
قَبِیْلٌ و قُبُلٌ ۔ کھلم کھلا ۔ رو در رو ۔ آمنے سامنے ۔ (نیز قَبِیْلٌ کے معنی ذمہ دار ۔ کفیل ۔ اور نمائندہ کے بھی ہوتے ہیں)* ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَحَشَرْنَا عَلَیْھِمْ کُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا (۶/۱۱۲) ۔ ''ہم سب چیزوں کو ان کے سامنے لا اکٹھا کرتے'' ۔ اَلْقِبَلُ ۔ طاقت اور قوت* ۔ فَلَنَاْتِیَنَّھُمْ بِجُنُوْدٍ لَا قِبَلَ لَھُمْ بِھَا (۲۷/۳۷) ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان میں ہمارے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوگی ۔ وہ ان کا مقابلہ کرنے پر قادر نہیں ہوسکینگے ۔ اَلْقَبِیْلُ ۔ شوہر ۔ نیز تین یا تین سے زیادہ آدمیوں کی جماعت جو مختلف قبیلوں اور قوموں یا ایک ہی جد اعلیٰ سے متعلق ہوں ۔ اَلْقَبِیْلَۃُ ۔ خاندان ۔ ایک باپ کی اولاد (جمع قَبَائِلُ ۔ ۴۹/۱۳) ۔ قَبَائِلُ الرَّاْسِ سر کی ہڈیاں جو ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتی ہیں ۔ زجاج نے کہا ہے کہ اولاد اسماعیلؑ کے لئے قَبِیْلَۃٌ کہتے ہیں اور اولاد اسحٰقؑ کے لئے سِبْطٌ (جمع اَسْبَاطٌ) ۔

اَلْقَبِیْلَۃُ ۔ کنوئیں کے منہ پر رکھی ہوئی بڑی چٹان ۔ اَقْبَلَ اِلَیْہِ ۔ وہ اس کی طرف آیا ۔ اَقْبَلَ الرَّجُلُ ۔ اسے حماقت کے بعد عقل آگئی ۔

*تاج و محیط ۔

قَابَلَهٗ ۔ مُقَابَلَۃً ۔ وہ اس کے آمنے سامنے ہوا ۔ رو بہ رو ہوا ۔ اَقْبَلَ عَلَیْهِ ۔ اس کی طرف متوجہ ہوا ۔ اَقْبَلَ عَلَی الْاَمْرِ ۔ وہ اس کام میں لگ گیا اور اسے چھوڑا نہیں ۔ اسے اپنے سامنے رکھ لیا ۔ تَقَابَلَا ۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئے* ۔ قرآن کریم میں ہے اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقَابِلِیْنَ (۱۵/۴۷)۔ یعنی وہ بھائیوں کی طرح تختوں پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہونگے ۔

اَلْقِبْلَۃُ ۔ اس لفظ کے اصل معنی جہت یا سمت کے ہوتے ہیں ۔ لیکن عرف عام میں اس جگہ کو کہتے ہیں جس کی طرف نماز میں رخ کیا جائے* ۔ جسے سامنے رکھا جائے ۔ جو ''پیش نظر'' رہے ۔ جو مقصودِ نگاہ یا نصب العین ہو ۔

دین کے نظام میں قبلہ کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔ ہر نظام ، ہر مملکت ، ہر حکومت کا ایک مرکز ہوتا ہے جس کی طرف تمام افراد معاشرہ کی نگاہیں اٹھتی ہیں ۔ جو ان میں وحدتِ فکر و عمل پیدا کرتا ہے ۔ یہ در اصل نشان (Symbol) ہوتا ہے اس نظام یا حکومت کا جسے ہر وقت پیش نظر رکھنا ہوتا ہے ۔ اسے پیش نظر رکھنے سے مقصود اس نظام یا حکومت سے اپنی وابستگی اور وفاشعاری کا اظہار ہوتا ہے ۔ حکومت خداوندی کا محسوس قبلہ ، اس مقام کے علاوہ اور کونسا مقام ہوسکتا تھا جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ (۳/۹۵) یعنی ـ دنیا کے بتکدہ میں پہلا وہ گھر خدا کا ـ جسے تمام اقوام عالم کے لئے راہ نمائی کا نشان بنایا گیا ۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ مَنْ دَخَلَهٗ کَانَ اٰمِنًا (۳/۹۶) ۔ ''جو اس میں داخل ہوگیا اسے دنیا جہاں کی آفات سے امن مل گیا'' ۔ قبلہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کے اتباع کو قرآن کریم نے دین کے اتباع سے تعبیر کیا ہے ۔ چنانچہ سورۃ بقرہ میں ایک جگہ ہے وَلَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ بِکُلِّ اٰیَۃٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَکَ ۔ وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَھُمْ وَمَا بَعْضُھُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَۃَ بَعْضٍ ...... (۲/۱۴۵) ۔ ''اگر تو ان لوگوں کے پاس جنہیں کتاب دی گئی ہے تمام آیات (دلائل) بھی لے آئے تو بھی وہ تیرے قبلہ کا اتباع نہیں کرینگے ۔ اور نہ تو ان کے قبلہ کے تابع ہوگا ۔ اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کے تابع ہیں ۔ دوسری جگہ ہے وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَھُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَھُمْ (۲/۱۲۰) ۔

*تاج و محیط ۔

''یہود اور نصاریٰ تجھ سے ہرگز راضی نہ ہونگے جب تک تو ان کی ملت (مسلک) کا اتباع نہ کریگا'' - اس سے ظاہر ہے کہ قبلہ ، در حقیقت ملت و مسلک (دین) کا محسوس نشان ہے اور اتباع قبلہ سے مراد اتباع دین ہے -

جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ وہ زندگی کے کسی شعبے اور دنیا کے کسی گوشے میں ہوں ، وہ اپنی توجہات کو اپنے دین کے مرکز (قبلہ) کی طرف مرکوز رکھیں - وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (۲/۱۵۰) - ''تم جہاں کہیں بھی ہو اپنے رخ اسی کی طرف رکھو'' - یعنی اپنی توجہات کو اس کی طرف مرکوز کرو - تمہارا نصب العین حیات ایک ہو اور یہی وحدت نصب العین تمہاری وحدت ملت کی بنیاد قرار پائے - اسی کی محسوس شکل، اجتماعات صلٰوۃ میں کعبہ کی طرف رخ کرنا ہے - یہ بھی اپنی جگہ ضروری ہے لیکن اسے مقصود بالذات نہیں سمجھ لینا چاہئے - یہی وہ حقیقت ہے جس کی تبئین کے لئے فرمایا کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ . . . . . (۲/۱۷۷) - ''کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق کی طرف کرلے ہو یا مغرب کی طرف'' - [اگر قِبَلَ کو قِبْلَةٌ کی جمع تصور کرلیا جائے تو اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ مشرق و مغرب میں جس قدر قبلے ہیں، وہ کسی قوم کے یا کسی مذہب کے ہوں ، ان کی ساری اہمیت اضافی ہے - ذاتی نہیں] - بات بالکل واضح ہے - جو چیزیں کسی نظام کے لئے محسوس نشانات کا کام دیتی ہیں جب تک وہ نظام قائم رہے ، ان نشانات کی اہمیت حتمی اور یقینی، اور ان کا احترام و التزام نہایت ضروری ہوتا ہے - (اسی کو دوسری جگہ شعائر اللہ کہا گیا ہے - دیکھئے عنوان ش - ع - ر) لیکن جب وہ نظام باقی نہ رہے تو ان نشانات کا احترام محض ایک رسم بنکر رہ جاتا ہے - یہ ہے وہ لطیف اور اہم نکتہ جس کی وضاحت کے لئے قرآن کریم نے ایک جگہ تاکیداً کہا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو اپنا رخ اپنے دین اور نظام کے محسوس مرکز کی طرف رکھو - اس سے معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری وفا شعاریوں کا مرکز کیا ہے - لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ اس مرکز کی طرف منہ کرنا مقصود بالذات ہے -

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب نظام گم ہو جائے اور قوم انفرادی زندگی بسر کر رہی ہو ، لیکن اس کے دل میں اس نظام کے قیام کی آرزو ہو ، تو اس وقت قِبْلَةً کسے بنایا جائے؟ یعنی اس وقت اجتماعی زندگی کی ابتدا کہاں سے کی جائے؟ قرآن کریم نے داستان بنی اسرائیل کے سلسلہ میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جہاں کہا ہے کہ ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی

کہ ایسے حالات میں وَ اجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ قِبْلَۃً وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (۱۰/۸۷) - یعنی ''اپنے گھروں کو اپنی توجہات کا مرکز بناؤ اور وہیں سے نظام صلٰوۃ کے قیام کی ابتدا کردو''۔ یعنی اس نظام کا آغاز اپنے اپنے گھروں سے (ایک خاندان کو وحدت (Unit) تصور کرکے) کرو۔ رفتہ رفتہ یہ نظام پوری کی پوری قوم کو محیط ہو جائیگا اور سب کے لئے ایک قبلہ قائم ہوجائیگا ۔

یہودیوں کے لئے یہ اجتماعی مرکز بیت المقدس تھا ۔ لیکن یہودیوں نے دین خداوندی کو اپنی نسل تک محدود کر لیا ، لہذا یہ مرکز بھی ان کا قومی مرکز بن کر رہ گیا ۔ عالمگیر انسانی برادری کا مرکز نہ رہا ۔ ایک یہود پر ہی کیا موقوف ، اُس وقت دنیا کے کسی مذہب اور کسی قوم کے سامنے بھی عالمگیر انسانیت کی وحدت کا تصور نہیں تھا ۔ ان کے برعکس ، قرآن کریم کے پیش نظر تمام نوع انسان کو ایک مرکز پر جمع کرنا تھا ، اس لئے وہ مختلف قومی مراکز میں سے کسی کو بھی اپنا مرکز قرار نہیں دے سکتا تھا ۔ وہ اس کعبہ کو مرکز قرار دے سکتا تھا جس کی بناء حضرت ابراھیم[ؑ] کے ھاتھوں اسی مقصد کے لئے رکھائی گئی تھی ۔ (۲/۱۲۷)۔ اس مقام کو مَثَابَۃً لِلنَّاسِ وَ اَمْنًا (۲/۱۲۵) قرار دیا گیا تھا ۔ یعنی تمام نوع انسان کے لئے مرجع اور پناہ گاہ ۔ یہ سَوَآءَنِ الْعَاکِفُ فِیْہِ وَ الْبَادِ (۲۲/۲۵) تھا ۔ یعنی وہاں کے باشندوں اور باھر سے آنے والوں ، سب کے لئے یکساں ۔ یہ بنایا ھی تمام انسانوں کے فائدے کے لئے گیا تھا (۳/۹۵) ۔ یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے کعبہ کو دین خداوندی کا مرکز (قبلہ) بنایا گیا ۔

جہاں تک خود امت مسلمہ کا تعلق ھے ، تعیین قبلہ کا مقصد یہ بتایا گیا ھے کہ وَ کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ یَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا (۲/۱۴۳)۔ ''اور اس طرح ھم نے تمھیں ایک بین الاقوامی امت بنا دیا تاکہ تم تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگران رھو اور رسول (تمہارا مرکزِ ملت) تمہارے اعمال کا نگران رھے''۔ اس آیۂ جلیلہ میں مسلمانوں کے مقصدِ حیات ، مقام اور طریقِ عمل کو ابھار اور نکھار کر سامنے لایا گیا ھے ۔ کعبہ کو قبلہ اس لئے بنایا گیا ھے کہ دین ، قومی دوائر سے نکل کر عالمگیر انسانیت کو محیط ھو جائے ۔ اس دین کی حامل اُمت کا فریضہ یہ ھے کہ وہ دیگر اقوامِ عالم کے اعمال کی نگران رھے کہ کونسی قوم (نوع انسان کے لئے) کیا کچھ کرتی ھے ۔ اس مقصد کے لئے اجتماعی نظم کی ضرورت ھے ۔ اس نظم کا مرکز رسول (اور رسول کے بعد اس کے

سچے جانشین) ھیں ۔ جب تک یہ نظام قائم رھا ، تعیین قبلہ کا منشأ پورا ھوتا رھا ۔ جب یہ نگاھوں سے اوجھل ھوگیا نہ اس اُمت کا وہ مقام رھا ، نہ اس کے قبلہ کی وہ حیثیت ۔

رہ گئی رسم اذاں ، روحِ بلالی نہ رھی

اس ''رسم'' میں روح پیدا کرنے کے لئے ضروری ھے کہ پھر سے اُسی نظام کو زندہ اور قائم کیا جائے ۔ قرآن کریم کی موجودگی میں اس نظام کا احیاء کچھ بھی مشکل نہیں ۔ قرآن کریم کو ھمیشہ کے لئے محفوظ اسی لئے رکھا گیا ھے کہ اس پر متفرع نظام ھمیشہ قائم رھے اور اگر یہ کسی وقت (بدقسمتی) سے موجود نہ رھے تو اس کی دوبارہ تشکیل کی جاسکے ۔ دنیا اب اپنی قوسی تنگناؤں سے دل برداشتہ ھوکر ، کسی عالمگیر نظام کی متمنی ھوتی جارھی ھے ۔ اس نظام کے لئے ایک مشترکہ ضابطۂ حیات کی ضرورت ھے ۔ یہ ضابطہ حیات ، قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی نہیں ھو سکتا ۔ جس دن دنیا نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ، عالمگیر نظام حکومت کے خواب کی تعبیر سامنے آجائیگی ۔ لیکن اس کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ھے کہ قرآن کریم پر ایمان رکھنے والی اُمت اپنے اندر وحدت پیدا کرکے اس قسم کے نظام کو متشکل کرکے دکھائے ۔ اگر اسی قوم کے ''قبلے'' مختلف رھے تو ساری دنیا کا ایک قبلہ کس طرح بن سکے گا ؟

ق ت ر

اَلْقَتْرُ ۔ اَلتَّقْتِیْرُ ۔ صرف گذر بسر کے قابلِ معیشت یا نفقہ ۔ قَتَرَ وَقَتَّرَ ۔ گذر بسر کے لئے ضرورت سے کم خرچ کرنا ، خرچ میں تنگی کرنا ۔ لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا ($\frac{25}{67}$) ۔ نہ ھی وہ بےجا خرچ کرتے ھیں اور نہ ھی مناسب خرچ میں تنگی کرتے ھیں ۔ اَلْمُقْتِرُ ($\frac{2}{236}$) تنگ دست ، بمقابلہ اَلْمُوْسِعُ ۔ صاحب وسعت ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ھے ۔ وَکَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ($\frac{17}{100}$) ۔ انسان (اگر وحی کے تابع نہ چلے تو) بخل کرتا ھے اور اپنی دولت کو نوعِ انسان کی منفعت کے لئے کھلا نہیں چھوڑتا ۔

اَلْقَتَرُ ۔ غبار ۔ سیاھی ۔ دھندلا ، دھوئیں جیسا رنگ ۔ مٹیالا رنگ* ۔ اَلْقَتَرَۃُ ۔ غبار بمعنی قَتَرٌ ۔ بقول بعض یہ قَتَرٌ کا واحد ھے ۔ تَرْھَقُهَا قَتَرَۃٌ ($\frac{80}{41}$ و $\frac{10}{26}$) انہیں (ذلت کی) سیاھی ڈھانپ لے گی ۔ ان پر افسردگی چھاجائے گی ۔ اَلْقَتِیْرُ ۔ زرہ کے حلقوں کے کنارے* ۔ رَجُلٌ قَاتِرٌ ۔ ضعیف آدمی** ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

ق ت ل

اَلْقَتْلُ ۔ ہتھیار کی ضرب ، یا پتھر ، یا زہر ، وغیرہ سے کسی کو مار ڈالنا ۔ جان نکال دینا ، قَاتَلَهٗ ۔ اس سے جنگ کی* ۔ ایک نے دوسرے کو قتل کرنا چاہا*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ذلیل و حقیر کرنے اور جھکا دینے کے بھی آتے ہیں *** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ذلیل کرنے اور مار ڈالنے کے ہیں ۔ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ (۸۰/۱۷) ۔ میں قوانین خداوندی سے انکار کرنے والوں کی ذلت و حقارت اور تباہی و بربادی ہی کا بیان ہے ۔ اسی طرح قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ (۹/۳۰) کے معنی ہیں خدا انہیں ذلیل و حقیر کرے ۔ خدا انہیں تباہ و برباد کرے ۔ خدا انہیں مغلوب کرے ۔ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ (۵۱/۱۰) کے بھی یہی معنی ہیں ۔ اسی طرح راغب نے لکھا ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ (۱۷/۳۱) نیز وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ (۶/۱۵۲) میں قتل اولاد سے مراد بچوں کو سچ مچ قتل کر دینا نہیں بلکہ انہیں علم و تربیت سے محروم رکھنا ہے ۔ اور اس کے مقابلہ میں ان کا اِسْتِحْيَاء (زندہ رکھنا) انہیں علم و بصیرت عطا کرنا ہے*** ۔ یعنی اس خیال سے بچوں کو تعلیم سے محروم رکھنا کہ اس کے اخراجات سے ہم غریب ہوجائینگے ۔

تذلیل و تحقیر کے مفہوم کی رو سے قرآن کریم کی ان آیات کا مطلب بھی صاف ہو جاتا ہے جہاں بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کا ذکر ہے ۔ (اس کے لئے دیکھئے عنوان ذ ۔ ب ۔ ح)۔

تذلیل و تحقیر کے اعتبار سے قَتْلٌ کے معنی ہیں کسی کو ایسا کردینا کہ اس کی بات پر کوئی دھیان نہ دے ۔ اس کی کوئی پرواہ نہ کرے ۔ اس کا کچھ اثر باقی نہ رہے ۔ وہ (Ineffective) ہو جائے ۔ اُقْتُلُوْا فُلَانًا کے معنی ہیں اُسے ایسا کر دو گویا وہ مُردوں میں شامل ہو چکا ہے ۔ یعنی اس کی موجودگی اور عدم موجودگی برابر ہو جائے ۔ قَتَلَ الشَّرَابَ کے معنی ہیں شراب میں پانی ملا کر اس کی تندی اور کیف آوری کو کم اور ہلکا کردیا* ۔

قَتَلَ الشَّیْءَ خُبْرًا ۔ اس نے اس چیز کا پورا پورا علم حاصل کرلیا ۔ اِنَّهٗ لَقَتُلٌ شَرٍّ ۔ وہ شر کو اچھی طرح جانتا ہے ۔ اسی نہج سے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق جو آیا ہے ۔ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا (۴/۱۵۷) ۔ تو اس کے

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

معنی یہ ہیں کہ انہیں حقیقت کا یقینی علم بالکل نہیں - یعنی مَاقَتَلُوْا عِلْمَهُمْ يَقِيْنًا* - اَلْبُسْتَان میں بھی مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا کے معنی لکھے ہیں لَمْ يُحِيْطُوْا بِهٖ عِلْمًا - اَلْمُقَتَّل اُس آدمی کو کہتے ہیں جو بہت تجربہ کار اور اشیاء کی حقیقت کا علم رکھنے والا ہو* -

لہذا قرآن کریم میں جہاں قَتْل کا لفظ آئے گا ہر جگہ اس کے معنی مار ڈالنے کے نہیں ہونگے - سیاق و سباق کے اعتبار سے اس کے معنی متعین کئے جائینگے - کہیں مار ڈالنا - کہیں ذلیل و حقیر کرنا - غیر موثر بنا دینا - تباہ و برباد کر دینا - کہیں علم و تربیت سے بے بہرہ رکھنا - اور کہیں پورا پورا علم حاصل کرنا ، وغیرہ - حتیٰ کہ انتہائی کوشش کرنا بھی، چنانچہ اِسْتَقْتَلَ فِی الْاَمْرِ کے معنے ہیں اس نے اس معاملہ میں جان کی بازی لگا کر کوشش کی* -

سورۃ بقرہ میں یہودیوں کے متعلق ہے - وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيِّيْنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ($\frac{2}{61}$) تو اس کے یہ معنی بھی ہونگے کہ وہ اپنے انبیاء کی تحقیر و تذلیل کرتے تھے اور یہ بھی کہ وہ ان کے درپے قتل ہوتے تھے یا قتل کر دیتے تھے - حضرت عیسیٰؑ کے متعلق دوسری جگہ ہے کہ انہیں یہودیوں نے قتل نہیں کیا تھا - نہ ہی آپؑ کو صلیب دی گئی تھی ($\frac{4}{157}$)- اسی سورت میں دوسری جگہ فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ ($\frac{2}{54}$) آیا ہے - اس کے معنی ہیں اپنے آپ کو قوانین خداوندی کے تابع لے آؤ - اس لئے کہ راغب نے کہا ہے کہ قَتَلْتُ فُلَانًا کے معنی ذَلَّلْتُهٗ آتے ہیں - یعنی اسے مطیع و فرمانبردار بنا لیا** -

سورۃ نساء میں ہے کہ ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ - اس کے بعد ہے وَ لَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ ($\frac{4}{29}$)- یعنی اس طرح اپنے آپ کو تباہ نہ کرو - یا ایک دوسرے کو تباہ و برباد نہ کرو - یا اپنی ذات کو ہلاک نہ کرو - جس معاشرہ میں لوگ ایک دوسرے کے مال کو ناجائز طریقوں سے کھانے لگ جائیں ، اس میں سب کچھ تباہ ہوجاتا ہے -

قرآن کریم میں جنگ کرنے کے لئے بالعموم قِتَال کا لفظ آیا ہے ($\frac{2}{216}$) لیکن ($\frac{3}{153}$) میں جو کہا ہے كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ - تو اس کے معنی ہیں وہ لوگ (جماعت مومنین) جن پر (قتل کرنا) جنگ واجب قرار دی گئی تھی - یہ معنی نہیں کہ ''جن کا قتل ہونا مقدر ہوچکا تھا'' - اول تو اس

*تاج - **راغب -

لئے کہ کُتِبَ عَلَی کے معنی کسی بات کو واجب قرار دینے کے ھیں ۔ دوسرے یہ کہ قَتْل کے معنی قتل ہونے ہی کے نہیں ۔ قتل کرنے کے بھی ھیں ۔ جیسے اَلْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ میں ھے (۲/۲۱۷) ۔ تیسرے یہ کہ اگر یہ مفہوم لیا جائے کہ "ان کے لئے قتل ہوجانا مقدر ہوچکا ھے" تو یہ تصور قرآن کریم کی ساری تعلیم کے خلاف جاتا ھے جس کی رُو سے انسان اپنے اعمال میں صاحب اختیار ھے ۔ مجبور نہیں ۔

(سزائے قتل کے لئے دیکھئے عنوان ق ۔ ص ۔ ص میں لفظ قصاص) ۔

ق ث أ

قِثَّاءٌ ۔ قُثَّاءٌ ۔ کھیرے کو کہتے ھیں** ۔

قرآن کریم میں قِثَّاءٌ (۲/۶۱) میں آیا ھے ۔

ق ح م

اَلْاِقْتِحَامُ ۔ کسی خوفناک اور شدید معاملہ کے اندر گھس جانا ۔ قَحَمَ الرَّجُلُ فِی الْاَمْرِ ۔ اس نے اپنے آپ کو اس معاملہ میں بے سوچے سمجھے یکبارگی ڈال دیا ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز پر ذرا سختی سے اقدام کرتے ہوئے پہنچنا ھیں ۔ تَقَحَّمَتْ بِہِ النَّاقَۃُ کے معنی ہوتے ھیں اونٹنی اسے لے کر وحشیانہ طور پر بھاگ کھڑی ہوئی ۔ قَحَّمَتْہُ الْفَرَسُ اسے گھوڑے نے منہ کے بل گرا دیا** ۔ راغب نے لکھا ھے کہ اس کے معنی ھیں گھوڑا ، سوار کو لیکر خوفناک مقام میں گھس گیا* ۔

ان معنوں میں یہ لفظ سورہ صٓ میں آیا ھے جہاں کہا ھے کہ ھٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَکُمْ (۳۸/۵۹) ۔ یہ ایک ایسی جماعت ھے جو اندھا دھند تمہارے ساتھ داخل ہونے والی ھے ۔ مَحَالَۃٌ قَحُوْمٌ ۔ اس چرخی کو کہتے ھیں جو تیزی کے ساتھ گھومتی ہو ۔ اِقْتَحَمَ الْمَنْزِلَ کے معنی ھیں وہ گھر میں گھس پڑا ۔ (اس میں سختی اور شدت کا پہلو ہوتا ھے) ** ۔ یعنی تیزی کے ساتھ کسی مقصد کی طرف آنا ۔ ان معنوں میں سورہ بلد میں ھے ۔ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَۃَ (۹۰/۱۱) ۔ انسان (خدا کے مقرر کردہ نظام ربوبیت کی) گھاٹی پر چڑھنے کے لئے (جس کی تفصیل اگلی آیت میں دی گئی ھے) تیزی

*راغب ۔ **تاج ۔

سے دوڑ کر نہیں آتا وہ اس میں ، ہر مخالفت کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہؤا درّانہ نہیں گھستا ۔ (حالانکہ اگر اسے حقیقت کا علم ہو جائے تو یہ وہ منزل ہے جس کی طرف اسے والہانہ آنا چاہئے) ۔

قَدْ ۔ (لَقَدْ) ۔ (حرف)

قَدْ ۔ (۱) ماضی کو ماضی قریب بنا دیتا ہے ۔ قَدْ ضَرَبَ ۔ اس نے مارا ہے ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَمَا لَنَا اَلاَّ نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَاءِنَا (۲/۲۴۶) ۔ اب ہمارے لئے کونسی وجہ باقی ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں جبکہ ہم اپنے گھر بار اور بال بچوں سے جدا کر دیئے گئے ہیں ۔

(۲) فعل ماضی کے ساتھ تحقیق کے معنوں میں ۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ (۲۳/۱) ۔ مومن یقیناً کامیاب ہیں (یا کامیاب ہونگے) ۔

(۳) مضارع کے ساتھ تحقیق کے لئے ۔ قَدْ یَعْلَمُ مَا اَنْتُمْ عَلَیْہِ (۲۴/۶۴) ۔ اللہ یقیناً جانتا ہے کہ تم کس حال میں ہو ۔

(۴) اکثر یا بکثرت کے معنوں میں ۔ قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْہِکَ فِی السَّمَاءِ ۔ (۲/۱۴۴) ۔ ہم نے تجھے اکثر (یا بار بار یا بکثرت) آسمان کی طرف نظر لگائے دیکھا ہے ۔

(۵) بعض اوقات یہ (الف) "کبھی کبھی" کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً ۔ قَدْ یَصْدُقُ الْکَذُوْبُ ۔ جھوٹا بھی کبھی کبھی سچ بول لیتا ہے ۔ یا (ب) قَدْ یَقْدُمُ الْغَائِبُ ۔ اسکی توقع ہے کہ جو اسوقت یہاں نہیں وہ آجائے گا ۔ یا (ج) قَدْ فَعَلَ ۔ وہ یہ کام پہلے ہی کر چکا ہے ۔ یا مثلاً (د) جب کوئی پوچھے کہ فلاں کا کیا حال ہے ۔ یا فلاں زندہ ہے یا مر گیا ۔ تو اس کے جواب میں کہا جائیگا ۔ قَدْ مَاتَ فلانٌ ۔ وہ تو مر چکا ہے ۔ وہ مر گیا ۔

(۶) لَقَدْ ۔ قَدْ پر لَ ۔ بڑھانے سے تاکید بڑھ جاتی ہے ۔ یعنی زیادہ یقین سے کہا جاتا ہے ۔

ق د ح

اَلْقِدْحُ ۔ تیر کی ڈنڈی جس میں ابھی نہ پر لگے ہوں نہ پھل ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) کسی چیز میں نقص

کی وجہ سے سوراخ ، شگاف یا گڑھا پڑ جانا ، اور (۲) کسی چیز کو چمچہ وغیرہ سے نکالنا ۔ اَلْقَدَحُ ۔ پیالہ (خالی پیالے کو قَدَحٌ اور بھرے ہوئے کو کَأْسٌ کہتے ہیں ۔) قَدَحَ بِالزَّنْدِ ۔ اس نے چقماق سے آگ نکالی ۔ قَدَحَ فِیْ فُلَانٍ قَدْحاً ۔ اس نے اس شخص میں طعن کیا ۔ اسکی عیب چینی اور تنقیص کی * ۔

قرآن کریم میں ہے فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحاً (۱۰۰/۲) ۔ یہ قَدَحَ بِالزَّنْدِ سے ہے ۔ یعنی وہ گھوڑے جو پتھروں پر اس طرح سُم ماریں کہ ان سے آگ کی چنگاریاں نکلیں ۔

ق د د

اَلْقَدُّ ۔ کاٹنا ۔ کسی چیز کو طول میں شق کرنا یا چیرنا ۔ میدان کو قطع کر لینا ۔ کلام کو قطع کر دینا ۔ نیز قد و قامت یا کسی چیز کی کاٹ تراش** ۔ سورہ یوسف میں ہے ۔ وَقَدَّتْ قَمِیْصَهٗ (۱۲/۲۵) ۔ اس عورت نے اسکی قمیص پھاڑ دی ۔ اَلْقِدَّةُ ۔ ٹکڑا ۔ فرقہ ۔ لوگوں کا گروہ ، ٹولی ۔ (اسکی جمع قِدَدٌ ہے) قرآن کریم میں ہے کُنَّا طَرَآئِقَ قِدَداً ۔ (۷۲/۱۱) ۔ ہم مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے ۔ ہم متفرق راستے اختیار کئے ہوئے تھے ۔ ایسے لوگ جو مختلف مقاصد رکھتے ہوں اور اس لئے ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہوں** ۔

ق د ر

قَدْرٌ کے بنیادی معنی ہیں اندازہ ۔ پیمانہ ۔ قَدَرْتُ الشَّیْءَ کے معنی ہیں میں نے اس چیز کو ماپا ۔ اس کا اندازہ کیا ۔ اس کی لمبائی چوڑائی جسامت ، کمیت وغیرہ کو متعین کیا ۔ بتایا کہ وہ کیسی ہے ، کتنی ہے ، اس کا تناسب کیا ہے ۔ اور قَدَرَ الشَّیْءَ بِالشَّیْءِ کے معنی ہیں اس نے ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ رکھکر ماپا اور اسطرح اندازہ کیا کہ وہ اس کے برابر ہے یا نہیں ۔ یا ان دونوں کا باھمی تناسب کیا ہے ۔ قَدَرْتُ عَلَیْهِ الثَّوْبَ کے معنی ہیں اس نے اس شخص کے ماپ کے مطابق کپڑے بنائے ۔ قَدَّرْتُ عَلَیْهِ الشَّیْءَ کے معنی ہیں میں نے اس چیز میں ایسی مناسب تبدیلیاں کر دیں کہ وہ اس پر بالکل فٹ آگئی ۔ لہذا تَقْدِیْرٌ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے مطابق بنا دینا ۔ اور مِقْدَارٌ

*تاج ۔ **تاج و کتاب الاشتقاق ۔

اس پیمانے یا ماڈل یا (Pattern) کو کہتے ہیں جس کے مطابق کوئی چیز بنائی جائے* ۔ قَدْرٌ کے معنی ہیں کسی شے کا اندازہ ۔ پیمانہ، حجم، جسامت ۔ طول، عرض، وغیرہ ۔ ھٰذَا قَدْرُ ھٰذَا کے معنی ہیں یہ چیز اس دوسری چیز کے اندازے، پیمانے، جسامت، وغیرہ کے بالکل برابر ہے ۔ اس کے عین مطابق ہے ۔ دونوں ایک ہی قالب میں ڈھلی ہوئی ہیں ۔ جَآءَ عَلٰی قَدْرٍ کے معنی ہیں وہ بالکل اندازے کے مطابق آیا ۔ اور جَاوَزَ قَدْرَہٗ کے معنی ہیں اس نے اپنے اندازے، حدود، پیمانے سے تجاوز کر لیا ۔ اس سے آگے نکل گیا ۔ اَقْدَرُ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو اپنی رفتار میں اس اندازہ اور توازن سے چلے کہ اس کے پچھلے پاؤں ٹھیک اس جگہ پڑیں جہاں اس کے اگلے پاؤں پڑے تھے ۔ قَدَارٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو مناسب اور معتدل قد کا ہو ۔ نہ زیادہ لمبا نہ چھوٹا ۔ اَلْمُقْتَدَرُ ۔ ہر چیز کے درمیانی حصہ کو کہتے ہیں ۔ کَمْ قَدَرَۃٌ نَخْلِکَ ۔ تمہاری کھجوروں کے درختوں کے درمیان کسقدر معین فاصلہ ہے* ۔ عوام کی بولی میں اَلْمُقَدِّرُ اس شخص کو کہتے ہیں جو کھیتی اور درختوں کا اندازہ کرکے بتائے کہ غلے کی کتنی مقدار پیدا ہونے کی امید ہے ۔ قِدْرٌ ۔ ہانڈی یا دیگ کو کہتے ہیں ۔ اسکی جمع قُدُوْرٌ ہے ۔ قَدِیْرٌ ۔ اس گوشت کو کہتے ہیں جو (مناسب مسالوں کے ساتھ) ہنڈیا میں پکایا جائے ۔ قَدَارٌ ۔ ایسا کھانا پکانے والے کو کہتے ہیں (نیز قصائی کو بھی)* ۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ قَدْرٌ اور تَقْدِیْرٌ کے معنی ہیں اندازہ اور پیمانہ ۔ یا کسی چیز کو اندازہ اور پیمانے کے مطابق بنا دینا ۔ نیز کسی چیز کے تناسب اور توازن کا ٹھیک ٹھیک قائم رکھنا ۔ متوازن اور معتدل رہنا ۔ ان بنیادی معنوں کو پیش نظر رکھنے سے قرآن کریم کے متعدد مقامات آسانی سے سمجھ میں آجائینگے ۔

(۲)　چونکہ کسی چیز کو کسی خاص پیمانے اور اندازے کے مطابق بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس چیز پر پوری پوری مقدرت حاصل ہو، اس لئے قَدْرٌ کے معنی کسی چیز پر اقتدار و اختیار رکھنے کے بھی ہیں ۔ قَدَرْتُ عَلَی الشَّیْءِ کے معنی ہیں مجھے اسقدر قوت حاصل تھی کہ میں اس چیز کو اپنی مرضی یا پیمانے کے مطابق بنا دیتا ۔ مَالِیْ عَلَیْکَ مَقْدُرَۃٌ (یا مَقْدَرَۃٌ ۔ یا مَقْدِرَۃٌ یا قُدْرَۃٌ) کے معنی ہیں مجھے تم پر کوئی

*تاج ۔ محیط ۔ ابن ۔ راغب ۔

اقتدار و اختیار حاصل نہیں ۔ اس بنا پر قَدَّرَ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو تیار و ہموار کرنے یا کسی معاملہ کو سرانجام دینے کے لئے اس پر غور و فکر کرنا ۔ اسی سے اس کے معنی فیصلہ کرنے کے آتے ہیں *۔

(۳) ایک چیز کو آپ بغیر ناپے تولے یونہی دیدیتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اس میں کشادگی یا فراخی کا پہلو ہوتا ہے ۔ لیکن دوسری چیز کو آپ ناپ تول کر دیتے ہیں ۔ اس میں تنگی کا پہلو ہوتا ہے ۔ اس لحاظ سے قَدْرٌ کے معنی تنگی کے بھی آتے ہیں ۔ یعنی کسی کو ماپ تول کر دینا *۔ نیز اس کے معنی تعظیم کرنے کے بھی آتے ہیں ۔ یعنی جس مقام پر کوئی ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ رکھنا *۔

سورہ رعد میں ہے ۔ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا (۱۳/۱۷) اللہ بادلوں سے بارش برساتا ہے تو ندی نالے اپنے اپنے ظرف (قَدَرٌ) کے مطابق بھر کر بہ نکلتے ہیں ۔ یہاں سے قَدَرٌ کے معنی اندازے ۔ یعنی ظرف اور پیمانہ کے واضح ہیں ۔ سورہ حجر میں ہے ۔ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵/۲۱) ۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس کے ہمارے ہاں خزانے موجود نہ ہوں لیکن ہم اسے ایک متعین اندازے اور پیمانے کے مطابق باہر لاتے رہتے ہیں ۔ سورہ سبا میں ہے کہ وحشی اقوام کے کاریگر ، حضرت سلیمانؑ کے لئے منجملہ دیگر اشیاء قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ (۳۴/۱۳) ۔ یعنی ایسی دیگیں جو ایک جگہ گڑی رہیں ، بنایا کرتے تھے ۔ یہاں قِدْرٌ کے معنی دیگ کے ہیں ۔

کسی پر غلبہ و اقتدار حاصل کر لینے کے معنوں میں سورہ مائدہ میں ہے ۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ (۵/۳۴) ۔ قبل اس کے کہ تم ان پر غلبہ حاصل کر لو ۔ سورہ انبیاء میں ہے ۔ فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ (۲۱/۸۷) ۔ اس نے خیال کیا کہ ہم اس پر قابو نہ پاسکیں گے ۔ یا اس سے کوئی مواخذہ نہ کر سکیں گے ۔

سورہ بنی اسرائیل میں ہے ۔ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ (۱۷/۳۰) ۔ یہاں قَدْرٌ ۔ بمقابلہ بَسْطٌ آیا ہے ۔ بَسْطٌ کے معنی ہیں فراخی اور کشادگی ۔ لہذا قَدْرٌ کے معنی ہیں تنگی یا کسی چیز کا تپا تلا ملنا ۔

تَقْدِيْرٌ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے عنوان (ش ۔ ی ۔ ا) میں مَشِيَّتٌ کے معنی دیکھئے اور ان تینوں گوشوں پر غور کیجئے جن کا وہاں

*تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔

ذکر کیا گیا ہے ۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ گوشۂ اول وہ ہے جہاں امر الٰہی کے مطابق ہر شے وجود میں آتی ہے اور اس کے لئے قواعد و ضوابط (قوانین) اور خواص متعین ہوتے ہیں ۔ یہی قواعد و ضوابط و خواص ان اشیاء کے پیمانے ہیں ۔ انہی کو ان کی ''تقدیریں'' کہا جاتا ہے ۔ آگ کی تقدیر یہ ہے کہ وہ حرارت پہنچاتی ہے ۔ پانی کی تقدیر یہ ہے کہ وہ سیال ہے ، نشیب کیطرف بہتا ہے ، ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچکر بھاپ بن جاتا ہے اور جب اسے ٹھنڈ پہنچائی جائے تو پتھر کی طرح سخت ہو کر برف بن جاتا ہے ۔ سورہ فرقان میں ہے خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (۲۵/۲) ۔ اللہ نے ہر شے کو پیدا کیا ۔ پھر ان کے لئے پیمانے اور اندازے مقرر کر دئے ۔ امام راغب نے اس پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ اشیاء کے متعلق تقدیر الٰہی (پیمانوں) کی دو شکلیں ہیں ۔ ایک تو یہ کہ کسی شے کو کامل طور پر یکبارگی بنا دے اور اس میں کوئی کمی بیشی واقع نہ ہو تاوقتیکہ خدا اسے فنا کرنا یا بدلنا نہ چاہے ۔ (جیسے سَمٰوٰتٌ) ۔ اور دوسری یہ کہ کسی شے میں کچھ بننے کی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں اور وہ رفتہ رفتہ اپنی انتہائی شکل تک پہنچ جاتی ہے اور اس کے سوا کچھ اور نہیں بن سکتی ۔ جیسے بیج میں درخت بننے کی صلاحیت ۔ یہی اسکی تَقْدِيرٌ ہے ۔

امام راغب نے جو پہلی بات لکھی ہے (کہ بعض چیزوں کو جو کچھ بننا تھا وہ بن چکی ہیں) سو وہ جس زمانے میں گذرے ہیں اس میں وہ یہی کچھ کہہ سکتے تھے ۔ ہمارے زمانے میں انکشافات جدیدہ کا رخ اس طرف ہے کہ جن چیزوں کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ ان میں کوئی تغیرات نہیں ہوتے ان میں بھی تغیرات ہوتے رہتے ہیں ۔ لیکن یہ تغیرات بڑے غیر محسوس اور غیر مرئی طریقہ سے واقع ہوتے ہیں ۔ بہر حال اس بحث سے قطع نظر تَقْدِيرٌ کے معنی ہیں کسی شے کو ترقی دیتے ہوئے اس قَدْرٌ (Pattern) کے مطابق بنا دینا جو اس کے لئے متعین ہے ۔ یعنی اس کی ممکنات (Potentialities) کا مشہود (Actualise) ہو جانا اور اس طرح اس کا اپنے آخری نقطہ تک پہنچ جانا ۔ مُدَوَّرٌ ۔ اس چیز کو کہتے ہیں جو رفتہ رفتہ اپنے پیمانے کے مطابق سامنے آتی رہے ۔

قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کے تذکار جلیلہ کے ضمن میں ہے کہ جب انہیں پہلی مرتبہ طور پر (نبوت سے سرفراز کرنے کے لئے) بلایا گیا تو ان سے کہا گیا کہ نبوت تمہیں یونہی اتفاقیہ نہیں مل گئی کہ آگ لینے کو آئے پیمبری مل جائے۔ اس کے لئے تمہیں شروع سے تیار کیا جارہا تھا۔

راغب

چنانچہ تم اس طرح پیدا ہوئے۔ اس طرح تمہاری پرورش ہوئی۔ اسطرح تم مدین کی طرف آئے ۔ اسطرح وہاں تم نے گلہ بانی کی ۔ اسطرح تمہاری تربیت ہوئی ۔ اور یوں ان مختلف منازل میں سے گذر کر ثُمَّ جِئۡتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوۡسٰى (۲۰/۴۰) ۔ تم ، اے موسیٰ! اس اندازے پر پہنچ گئے ۔ اس پیمانے کے مطابق بن گئے جو نبوت کے لئے مقرر کیا گیا ہے ۔ اور یہ سب خدا کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق ہوا* ۔ یہاں لفظ قَدَرٌ نے اپنا مفہوم بالکل واضح کردیا ۔

سورۃ اعلیٰ میں ہے ۔ اَلَّذِىۡ خَلَقَ فَسَوّٰى ۔ وَ الَّذِىۡ قَدَّرَ فَهَدٰى (۸۷/۲-۳) ۔ اللہ وہ ہے جو مختلف اشیائے کائنات کی تخلیق کرتا ہے ۔ پھر ان میں مناسب اعتدال پیدا کرتا ہے ۔ پھر ان کے لئے ان کے پیمانے اور اندازے مقرر کرتا ہے ۔ اور انکی اس راستے کی طرف راہ نمائی کر دیتا ہے جس پر چل کر وہ ان پیمانوں اور اندازوں کے مطابق بن جائیں ۔ یہ ہے خدا کا نظامِ ربوبیت جو کائنات میں جاری و ساری ہے اور جس کی رو سے کائنات کی ہر شے اپنی اپنی تَقۡدِيۡر تک پہنچتی چلی جاتی ہے ۔ انسان کے اندر بھی کچھ بننے کی صلاحیتیں (Potentialities) رکھ دی گئی ہیں ۔ لیکن اسے دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور نہیں کر دیا گیا کہ وہ صرف اس راستہ پر چلے جس پر چلنے سے اس کی یہ تمام صلاحیتیں نشو و نما پا کر تکمیل تک پہنچ جائیں ۔ اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو یہ راستہ اختیار کرے، اور چاہے دوسرا راستہ جس سے اس کی یہ صلاحیتیں دب کر رہ جائیں ۔ ان دونوں راستوں میں امتیاز، وحی کی رو سے ہوتا ہے ۔ (جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے) ۔ اب انسان جو راستہ اختیار کرے گا، یا اس راستے میں جس مقام پر ٹھہر جائے گا، اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جائے گا ۔ جسطرح مثلاً جب تک پانی سیال رہتا ہے تو اس پر سیالیت (Liquidity) کا قانون نافذ رہتا ہے اور جب منجمد ہو جاتا ہے تو پھر جمادیت (Solidity) کا قانون اس پر نافذ ہوجاتا ہے ۔ یعنی انسان جو کچھ بننا چاہے اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے ۔ ابتداء (Initiative) انسان کی طرف سے ہوتی ہے اور خدا کا قانون اس کا اتباع (Follow) کرتا ہے ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے ۔ فَلَمَّا زَاغُوۡۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ (۶۱/۵) ۔ جب انہوں نے ٹیڑھا راستہ اختیار کرلیا تو اللہ نے ان کے دلوں

*واضح رہے کہ حضرت موسیٰؑ کو اس کا کچھ علم نہیں تھا کہ انہیں کن مراحل میں سے گذارا جارہا ہے اور کس مقصد کے لئے گذارا جارہا ہے ۔ اس لئے کہ نبی کو نبی ہونے سے پہلے اس کا علم و احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ نبوت کے لئے تیار کیا جا رہا ہے ۔ نبوت وہبی ہوتی ہے ۔ کسب و ہنر سے حاصل نہیں کی جا سکتی ۔

کو ٹیڑھا کر دیا ۔ دوسری جگہ ہے ۔ يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ أُفِكَ (۹/۵۱) ۔ اس (صحیح راستے) سے اسی کو پھرایا جاتا ہے جو خود اس سے پھر جاتا ہے ۔ یعنی انسان جو راستہ اختیار کرتا ہے ، اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہوجاتا ہے ۔ انسان کی ممکنات (Realisable Possibilities) کا میدان بہت وسیع ہے ۔ اس لئے اس کے لئے تقدیرات (یعنی قوانین خداوندی) کے انتخاب کا میدان بھی لامحدود ہے ۔ یہ جیسا خود بن جائے گا ویسی اس کی ''تقدیر'' بن جائے گی ۔ اقبال کے الفاظ میں :—

حرفے باریکش بہ رمزے مضمر است   تو اگر دیگر شوی او دیگر است

خاک شو نذرِ ھوا سازد ترا   سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا

شبنمی ! افتندگی تقدیرِ تست   قلزمی ! پائندگی تقدیرِ تست

تم اگر کسی ایک حالت میں ہو اور اس کے مطابق قانونِ خداوندی کے نتائج تمہارے لئے ناخوشگوار ہیں تو تم اپنے اندر تبدیلی پیدا کرلو ۔ اس سے خدا کا دوسرا قانون (تقدیر) تم پر منطبق ہوجائیگا اور تمہاری تقدیر بدل جائے گی ۔

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر   خواہ از حق حکمِ تقدیرے دگر

تو اگر تقدیرِ نوخواہی روا است   زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہا است

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے تَقْدِيْرٌ کا مفہوم ۔ لہذا جب کہا جائے گا کہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کا قانون ہر شے پر حاوی اور غالب ہے اور اس شے کو اس کی آخری منزل تک لئے جارہا ہے ۔ انسان بھی جس مقام پر اپنے آپ کو رکھے گا اس کے مطابق خدا کا قانون (تَقْدِيْرٌ) اس پر حاوی ہوگا ۔ اب یہ بات انسان کے اپنے اختیار کی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کس مقام پر رکھنا چاہتا ہے ، اور اس طرح خدا کی کون سی تقدیر اپنے لئے منتخب کرتا ہے ۔ لیکن وہ اپنے آپ کو کسی مقام پر رکھے ، خدا کی تقدیر (قانون) سے اپنے آپ کو باہر نہیں لے جاسکتا ۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔

قرآن کریم کا یہ اہم اعلان کہ کائنات میں ہر شے کے لئے پیمانے (قوانین ، اندازے ، تناسب ، توازن) مقرر ہیں ، علمی دنیا میں ایک عظیم الشان حقیقت کا علمبردار ہے ۔ آج سائنس کی تحقیقات اور منکشفات قدم قدم پر اس کی شہادت

بہم پہنچا رہی ہیں کہ کائنات میں قانون کی کارفرمائی ہے ۔ یونہی اندھیر گردی نہیں ۔ یعنی تمام کائنات (Rational Basis) پر چل رہی ہے ۔ آپ (Rational) کے لفظ پر غور کیجئے ۔ اس کے معنی ہیں جو (Ratio) کے مطابق ہو ۔ اور (Ratio) قدر ، پیمانے ، اندازے ، تناسب ہی کو کہتے ہیں ۔ وَ كَانَ أَمْرُ اللهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳/۳۸) اللہ کا ہر معاملہ ایک خاص اندازے کے مطابق مقرر کردہ ہے ۔ یہاں ہر بات (Rational) ہے ۔ اندھی فطرت (Blind Nature) کارفرما نہیں ۔ نہ ہی انسان مجبور اور مقہور ہے ۔ ''پہلے سے لکھا ہوا'' صرف قانون ہے (کہ فلاں عمل کا نتیجہ یہ ہوگا)۔ انسان کی ''قسمت'' نہیں۔ اپنی قسمت ہر انسان (خدا کے قانون مکافات کے مطابق) خود بناتا ہے ۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ قانونِ خداوندی کو قرآن کریم نے قَدْرٌ کہہ کر پکارا ہے ۔ یہ قوانین جسطرح خارجی کائنات میں جاری و ساری ہیں (جنہیں قوانین فطرت یا Laws of Nature) کہا جاتا ہے) اسی طرح انسانی دنیا میں بھی کارفرما ہیں ۔ مستقل اقدار (Permanent Values) خدا کے بھی غیر متبدل قوانین ہیں جن کے مطابق انسانی اعمال نتیجہ خیز ہوتے ہیں ۔ نزولِ قرآن کریم سے مقصد یہ تھا کہ نوع انسان تک ان مستقل اقدار کو پہنچا دیا جائے ۔ اسی وجہ سے نزولِ قرآن کریم کی ''رات'' کو لَيْلَةُ الْقَدْرِ کہا گیا ہے (۹۷/۱) ۔ وہ ''شب'' (یا تاریک زمانہ جس میں وحی کی روشنی کہیں موجود نہیں تھی) جس میں دنیا کو نئی اقدار عطا ہوئیں۔ یہ مستقل اقدار ہی ہیں جن کے احترام اور پابندی سے انسان حیوانی سطح زندگی سے بلند ہو کر ، انسانیت کی سطح پر آتا ہے ، اور جب کسی مستقل قدر اور طبعی (حیوانی) زندگی کے تقاضا میں تصادم ہوتا ہے (Tie پڑتی ہے) تو وہ طبعی زندگی کے تقاضا کو ، بلند قدر کی خاطر قربان کر دیتا ہے ۔ حتی کہ عند الضرورت، جان تک کو بھی۔ دین، نام ہی قرآن کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار کے تحفظ کا ہے ۔

ق د س

قَدَسَ فِی الْاَرْضِ کے معنی ہیں وہ بہت دور تک چلا گیا * ۔ اس لئے قَدَّسَهٗ کے معنی ہیں اس نے اس سے تمام نقائص و اسقام کو دور کر دیا ۔ قرآن کریم میں جہاں ملائکہ نے کہا ہے کہ نُقَدِّسُ لَكَ (۲/۳۰) تو زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تیرے لئے خود بھی پاک و صاف

*لین ۔ بحوالہ بیضاوی ۔

ہوتے ہیں اور ہر اس شخص کو پاک اور صاف کرتے ہیں جو تیری اطاعت کرے* ۔ (لیکن ہمارے نزدیک اس کا مفہوم وہ ہے جو آگے چل کر درج کیا جاتا ہے) ۔ قُدُّوْسٌ (۵۹/۲۳) ۔ خدا کی صفت ہے ، جس کے معنی ہیں ہر قسم کے نقائص و اسقام سے دور ، منزہ ۔ اَلْقَدَاسُ ۔ گرانقدر اور محکم شرف ، نیز اُس پتھر کو بھی کہتے تھے جو حوض میں یا اس کے دہانہ میں لگا دیتے تھے تاکہ اس سے پانی کا اندازہ ہو جائے اور اس طرح وہ آپس میں پانی کی تقسیم کرلیں** ۔

سورۃ بقرۃ میں نُسَبِّحُ اور نُقَدِّسُ ساتھ ساتھ آئے ہیں (۲/۳۰) ۔ اس لئے اس کے ساتھ (س ۔ ب ۔ ح) کا عنوان بھی دیکھئے تاکہ مفہوم واضح ہو جائے۔ مختصر الفاظ میں اس کے معنی ہونگے ، خدا کے کائناتی پروگرام کو درخورِ حمد و ستائش بنانے کے لئے دور دور تک چلے جانا ۔ بڑی تگ و تاز کرنا ۔ انتہائی جد و جہد کرنا ۔

رُوْحُ الْقُدُسِ کے لئے دیکھئے عنوان (ر ۔ و ۔ ح) ۔

الْاَرْضُ الْمُقَدَّسَةُ (۵/۲۱) ۔ وہ سر زمین جہاں زندگی کے ہر طرح کے سامان و اسباب بافراط موجود ہوں ۔ با برکت زمین (دیکھئے عنوان ب ۔ ر ۔ ک) مصر اور فرات کا درمیانی حصہ** ۔ عام طور پر فلسطین کے علاقہ کو کہتے ہیں ۔

ق د م

اَلْقَدَمُ ۔ پاؤں (۸/۱۱) ۔ اسکی جمع اَقْدَامٌ ہے ۔ قَدَمَ ۔ آگے بڑھنا ۔ پہل کرنا ۔ مُقَدِّمَةُ الْجَيْشِ (دال کے زیر اور زبر سے) فوج کا ہراول دستہ ۔ مُقَدَّمَةٌ ۔ ہر شے کا ابتدائی حصہ ۔ قَدَّمَ ۔ آگے بڑھانا ۔ پیش کرنا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آگے بڑھنے اور سبقت کرنے کے ہیں ۔

سورہ حجر میں ہے ۔ مَاتَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ (۱۵/۵) ۔ اور سورہ اعراف میں ہے فَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۷/۳۴) ۔ قَدَمٌ کے معنی ہیں سبقت کرنا ۔ اور آگے بڑھتے چلے جانا ۔ یہ اُخَرٌ ۔ پیچھے کی ضد ہے ۔ اسی لئے دوسری جگہ مُسْتَقْدِمِيْنَ کے مقابلہ میں مُسْتَاْخِرِيْنَ (۱۵/۲۴) آیا ہے ۔

قرآن کریم میں مَاقَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ (۴/۶۲) متعدد مقامات میں آیا ہے ۔ اس کے معنی ہیں جو کچھ ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ۔ اس سے

*لین ۔ **تاج ۔

مراد اعمال انسانی ہیں ۔ چونکہ انسان کی موت اس کے ان تمام اعمال کے بعد ہوتی ہے جو اس سے اس دنیا کی زندگی میں سرزد ہوتے ہیں ، اس لئے اعمال انسان سے آگے آگے چلتے ہیں ۔ اس میں ماضی (Past) کا زمانہ پایا جاتا ہے ۔ نیز ہر عمل جو سرزد ہو جاتا ہے ، ماضی (گذرے ہوئے زمانے) سے متعلق ہوجاتا ہے ، اور انسان کی دسترس سے باہر ۔ اور چونکہ اعمال کے نتائج بھی ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتے رہتے ہیں اسی لئے ان نتائج کو بھی " پہلے بھیجے ہوئے ،، کہکر پکارا گیا ہے ۔ مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا (۳۸/۶۱) ۔ جس نے اسے ہمارے لئے آگے بھیجا ہے ۔ جس کی وجہ سے ہم پر یہ عذاب آیا ہے ۔ لہذا ، جنت اور دوزخ کو انسان خود اپنے ہاتھوں سے ساتھ کے ساتھ تعمیر کرتا جاتا ہے ۔ البتہ ان کی نمود اپنے وقت پر ہوتی ہے ۔ اس زندگی میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی ۔

سورہ یونس میں ہے ۔ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۱۰/۲) ۔ ایمان والوں کو بشارت دو کہ ان کے لئے ان کے نشو و نما دینے والے کے ہاں قَدَمَ صِدْقٍ ہے ۔ یہاں قَدَم کے معنی بزرگی ، شرف اور بلندی مدارج بھی ہیں ، اور سبقت بھی ۔ یعنی صلاحیتوں کی ایسی نشوونما جس سے انسان ، زندگی کے آئندہ مراحل طے کرنے (آگے بڑھنے) کے قابل ہو جائے ۔ نیز ثبات و استحکام ۔

قدیم اور حادث کی اصطلاحات قرآنی نہیں ۔ متکلمین کی ہیں ۔ البتہ قرآن کریم میں قَدِيْم کا لفظ پرانی ، یعنی اس چیز کے متعلق استعمال ہوا ہے جو پچھلے زمانہ سے چلی آرہی ہو ۔ مثلاً اَلْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ (۳۶/۳۹) ۔ خوشہ کی کہنہ اور خشک شاخ ۔ اِفْكٌ قَدِيْمٌ (۴۶/۱۱) ۔ وہ جھوٹ جو شروع سے چلا آرہا ہے ۔ اَلْاَقْدَمُوْنَ (۲۶/۷۶) اگلے زمانے کے لوگ ۔ آبا و اجداد ۔

سورہ فرقان میں ہے ۔ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا ۔ (۲۵/۲۳) ۔ اس کے معنی متوجہ ہونے کے ہیں ۔ یعنی آگے بڑھ کر لینا ۔ سورہ حجرات میں ہے ۔ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۴۹/۱) ۔ خدا اور رسول (نظام خداوندی) کے احکام کے مقابلہ میں اپنے آپ کو ترجیح نہ دو ۔ یا ان کی باتیں کاٹ کر نہ چلو ۔ ان کی اطاعت کرو ۔

سورہ فتح میں ہے مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ (۴۸/۲) ۔ وہ نازیبا باتیں جو ان لوگوں نے پہلے سے تیرے پیچھے لگا رکھی ہیں ۔ یعنی وہ باتیں درحقیقت

درست نہیں بلکہ ان لوگوں نے یونہی تہمت کے طور پر تمہارے پیچھے لگا رکھی ہیں (مثلاً ساحر ۔ مجنون ۔ شاعر ۔ کاذب ۔ مفتری ۔ وغیرہ) ۔ ذَنْبِکَ کے یہی معنی ہیں ۔ اس انداز بیان کی مثالیں قرآن کریم میں موجود ہیں ۔ مثلاً سورۃ نحل میں ہے ۔ اَیْنَ شُرَکَائِیَ الَّذِیْنَ کُنْتُمْ تُشَاقُّوْنَ فِیْھِمْ (۱۶/۲۷) ۔ یہاں شُرَکَائِیْ کے معنی '' میرے شریک '' نہیں ۔ اس کے معنی ہیں وہ معبود جنہیں تم بزعم خویش میرے شریک سمجھتے تھے ۔ (یا جو بزعم خویش میرے شریک بنتے تھے) ۔ شُرَکَاءُ کُمُ الَّذِیْنَ کُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (۶/۲۲) ۔ وہ جنہیں تم بزعم خویش خدا کے شریک قرار دیا کرتے تھے ۔ لہذا ذَنْبَکَ (۴۸/۲) کے معنی '' تیری نازیبا باتیں '' نہیں ۔ اس کے معنی ہیں وہ نازیبا تہمتیں جن سے یہ مخالفین تجھے مطعون کرتے رہتے ہیں ۔ (نیز دیکھئے عنوان ذ ۔ ن ۔ ب)۔

ق د و

اَلْقِدْوُ ۔ درخت کی اصل جس سے شاخیں نکلتی ہیں ۔ اسی سے اَلْقَدْوَۃُ کے معنی آگے بڑھنے کے ہیں ۔ اور چونکہ یہ شاخیں سیدھی نکلتی ہیں اس لئے تَقَدَّتْ بِہٖ دَابَّتُہٗ کے معنی ہوتے ہیں سواری کا جانور اسے لیکر سیدھے راستے پر چلتا رہا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے مطابق بن جانا اور اس سے رہنمائی حاصل کرنا ہیں ۔

اَلْقُدْوَۃُ ۔ وہ جس کی پیروی کی جائے ۔ جسکے پیچھے پیچھے چلا جائے * ۔ اِقْتَدٰی ۔ پیروی کرنا ۔ قرآن کریم میں تمام انبیائے سابقہ کے ذکر کرنے کے بعد رسول اللہؐ سے کہا گیا ہے ۔ اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ (۶/۹۱) ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے اپنی راہ نمائی (وحی) عطا کی تھی ۔ پس انہی کی راہ نمائی کی پیروی تو کر ، یعنی جو راہ نمائی انہیں دی گئی تھی اب وہی راہ نمائی اس قرآن کریم میں تجھے دی گئی ہے ۔ لہذا قرآن کریم کی راہ وہی ہے جس پر تمام انبیائے سابقہ چلتے رہے ہیں ۔ قرآن کریم پر چلنا انبیاء کی راہ پر چلنا ہے ۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کبریٰ کو واضح کیا ہے کہ اصل کے اعتبار سے تمام انبیاء کرام کو ایک ہی دین ملتا رہا ہے ۔ وہ دین اپنی اصل شکل میں باقی نہ رہا ۔ اب وہی اصول (جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے) اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم

*تاج ۔

میں دے دیئے گئے * ۔ اس لئے جو شخص قرآن کریم کا اتباع کرتا ہے وہ اسی راستے پر چلتا ہے جس پر انبیاء کرامؑ چلتے رہے ہیں ۔ یہی معنی فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ (۶/۹۱) کے ہیں ۔ اقتداء اس ہدایت کی ہے جو خدا کی طرف سے انبیاء کو ملتی رہی ہے ۔ اس کے خلاف دوسری راہ اشخاص کی اقتداء کی ہے جس کی مخالفت قرآن کریم نے جا بجا کی ہے ۔ (مثلاً ۴۳/۲۳) ۔ لیکن ہم وہی کچھ کر رہے ہیں جس سے قرآن کریم نے روکا تھا ۔ یعنی خدا کی طرف سے ملی ہوئی راہ نمائی (قرآن کریم) کے بجائے، زندہ اور مردہ اشخاص کی اقتداء ۔

ق ذ ف

قَذْفٌ ۔ تیر یا پتھر وغیرہ کو پھینکنا **۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنے دور پھینکنا ہیں***۔ اسی طرح یہ لفظ کسی بات کو منہ سے نکالنے اور پھینکنے، نیز کسی چیز کو ڈالنے کے لئے بولتے ہیں ۔ اور استعارۃً الزام یا تہمت لگانے کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے**، جیسے اس مفہوم کے لئے رَمْیٌ* کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ اسی طرح قَذْفٌ گالی دینے اور عیب جوئی کرنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے***۔ چنانچہ قَذَفَ الْمُحْصِنَةَ کے معنی ہیں اس نے پاکباز عورت پر بد چلنی کی تہمت لگائی ۔ اَلْقَذَّافُ ۔ منجنیق وغیرہ جس سے کوئی چیز دور پھینکی جائے** ۔

سورہ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ (۲۰/۳۹) ۔ اسے تابوت میں رکھدے اور پھر اس صندوق کو دریا میں بہا دے ۔

سورہ انبیاء میں ہے ۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ (۲۱/۱۸) ہم حق کو باطل پر مارتے رہتے ہیں ۔ حق اور باطل میں باہمی تصادم و تزاحم، باہمی کشمکش، ہوتی رہتی ہے ۔ تعمیری اور تخریبی قوتیں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں اور تعمیری قوتیں آخرالامر غالب آجاتی ہیں ۔

دور رکھنے کے معنوں میں سورہ الصّٰفّٰت میں ہے ۔ وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ (۳۷/۸) انہیں ہر طرف سے دور رکھا جاتا ہے ۔

---

*جن سابقہ احکام میں (اصول نہیں بلکہ ان اصولوں کی روشنی میں احکام ہیں) کسی رد و بدل کی ضرورت تھی ان میں رد و بدل کرکے نئے احکام قرآن کریم میں دے دئے گئے ہیں ۔ لہٰذا، اب اطاعت خداوندی صرف قرآن کریم کی رو سے ہو سکتی ہے ۔ اور کسی مبینہ آسمانی کتاب کی رو سے نہیں ہو سکتی ۔ نیز دیکھئے عنوان (ن ۔ س ۔ خ) ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔

ق ر أ

قَرْأٌ کے بنیادی معنی ہیں جمع کرنا (ابن فارس) ۔ اَقْرَأَتِ النَّاقَۃُ کے معنی ہیں نر کا مادہ منویہ اونٹنی کے رحم میں قرار پا گیا اور جمع ہو گیا۔ قَرَأَتِ النَّاقَۃُ ۔ اونٹنی حاملہ ہو گئی ۔ خون کے رحم میں جمع ہونے کو بھی قَرْءٌ کہتے ہیں ۔ اَقْرَأَتِ الْمَرْأَۃُ اس وقت کہتے ہیں جب عورت کو قَرْءٌ یعنی حیض آجائے*۔ قَرْءٌ کی جمع قُرُوْءٌ آتی ہے (۲/۲۲۸)۔ صاحب لطائف اللغۃ نے کہا ہے کہ یہ لفظ (قَرْءٌ) اس وقت بھی بولتے ہیں جب عورت حیض سے پاک ہو جائے ۔

زجاج نے کہا ہے کہ قُرْاٰنٌ بھی یہیں سے فُعْلَانٌ کے وزن پر مصدر ہے ۔ اس کے معنی جمع کرنے کے ہیں ۔ قُرْاٰنٌ کو قُرْاٰنٌ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ سورتوں کو جمع کرتا ہے ۔ اور انہیں ایک دوسرے سے ملاتا ہے ۔ ابن الاثیر نے کہا ہے کہ کتاب اللہ کو قرآن اس لئے کہتے ہیں کہ اس نے اپنے اندر قصص ، امر ، نہی ، وعدہ ، وعید ، اور آیات اور سورتوں کو باھمدگر جمع کر دیا ہے*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کا نام قرآن اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ خدا کی تمام نازل کردہ کتابوں کے ثمرہ کو اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہے ۔ بلکہ تمام علوم کے ماحصل کو اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہے**۔ قرآن کریم میں ہے ۔ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَ قُرْاٰنَہٗ ۔ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ (۷۵/۱۷-۱۸)۔ اس کا جمع کرنا اور حفاظت سے رکھنا (جسطرح رحم میں تخم حفاظت سے رکھا جاتا ہے) ہمارے ذمہ ہے ۔ سو جب ہم اسے جمع کر دیں (اور اسے تمہارے سینے میں محفوظ اور ثبت کر دیں) تو تم اس جمع شدہ وحی کی پیروی کرنا** ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ (۷۵/۱۹) ۔ پھر اس کا لوگوں کے سامنے کھول کر لانا (اس کی نمود اور ظہور) بھی ہمارے ہی ذمہ ہے ۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم خود رسول اللہؐ کی زندگی میں جمع ، مرتب اور محفوظ شکل میں وجود میں آچکا تھا ۔ یہ صحیح نہیں کہ رسول اللہؐ اسے منتشر شکل میں چھوڑ گئے تھے اور اسے بعد میں یک جا کیا گیا تھا ۔ علاوہ دیگر شواھد ، خود لفظ قرآن اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ جمع شدہ (کتاب کی) شکل میں تھا ۔

اَلْقِرَاءَۃُ ۔ حروف اور الفاظ کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانے اور جمع کرنے کو کہتے ہیں۔ ابن عباس نے فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ کے معنی اس پر عمل کرنے اور اس کی پیروی کرنے کے بتائے ہیں** ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔ نیز ابن قتیبہ ۔ القرطین ۔ ج/۱ صفحہ ۹۰ و ج/۲ صفحہ ۱۹۳ ۔

بعض کا خیال ہے کہ قَرَاَ عبرانی لفظ ہے جس کے معنی اعلان کرنے کے ہیں* ۔ اس اعتبار سے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ (٩٦/١) کے معنی ہونگے تو اپنے نشو و نما دینے والے کی صفت ربوبیت کا عام اعلان کردے ۔ یہ وہی چیز ہے جسے سورۃ مدثر میں قُمْ فَاَنْذِرْ۔ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ (٧٤/٢-٣) سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ اس سے قُرْاٰن کے معنی اعلانِ عام کے ہونگے ۔

قرآن کریم وہ الکتاب (ضابطہ حیات) ہے جس میں ہر بات یقینی ہے اور اس سے ہر قسم کا تذبذب اور نفسیاتی الجھن ختم ہو جاتی ہے (٢/٢) ۔ جو کچھ خدا نے حضورؐ پر وحی کیا تھا وہ قرآن کریم میں محفوظ ہے (٦/١٩) ۔ مومنین کو اسی کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور کے اتباع کی اجازت نہیں دی گئی (٧/٣) ۔ رسول اللہؐ کو بھی قرآن کریم ہی کے اتباع کا حکم تھا (١٠/١٠٩)۔ حضورؐ اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے (٥/٤٨)۔ جو اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا ، تو ایسے لوگ مومن نہیں کافر ہیں ۔ (٥/٤٤)۔ اس میں تعلیم خداوندی مکمل طور پر آگئی ہے اور کوئی شخص اس میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کر سکتا ۔ (٦/٣٤ و ٦/١١٦) ۔ یہ سابقہ تعلیمات کا مہیمن ہے (٥/٤٨) ۔ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (٤/٨٢) اور تمام اختلافات اسی سے رفع ہوسکتے ہیں (٤٢/١٠)۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی وضاحت خود خدا نے کردی ہے (٧٥/١٩) ۔ اسی لئے اسے تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (١٦/٨٩) کہا گیا ہے ۔ ایسا تصریف آیات کی رو سے کیا گیا ہے ۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانے سے (٦/١٠٦ و ١٧/٤١) ۔ رسول اللہؐ ہر اختلافی معاملہ کی وضاحت قرآن کریم سے کرتے تھے (١٦/٤٤) ۔ اور اسی سے لوگوں کو نصیحت کرتے تھے (٥٠/٤٥) ۔ یہ خود روشنی ہے (٥/١٥) جو اس لئے دی گئی ہے کہ انسان اس روشنی میں سفرِ حیات طے کرے (٦/١٢٣) ۔ اسی لئے اس میں تدبر و تفکر کا حکم دیا گیا ہے (٤٧/٢٤) ۔ یہ نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان ہے (٥٤/١٧) ۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے دل و دماغ کو انسانی خیالات سے پاک و صاف کرکے اس سے راہ نمائی حاصل کرنے کی کوشش کرے (٥٦/٧٩) ۔ قرآن کریم میں غیر قرآنی خیالات و نظریات و تصورات و معتقدات کی آموزش شرک ہے (٤٢/٢١)۔ لیکن جب انسان شخصیت پرستی کا شکار ہوجائے تو اسے یہی بات سخت ناگوار گذرتی ہے (١٧/٤٦ و ٣٩/٤٥ و ٤٠/١٢) ۔ چنانچہ جو شخص ان کے سامنے قرآن کریم پیش کرے تو وہ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں (٢٢/٧٢)۔ اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اس کی بات قطعاً نہ سنو اور شور مچاؤ تا کہ دوسرے لوگ بھی قرآن کریم کی آواز نہ سننے پائیں (٤١/٢٦) ۔ اس طرح وہ خود بھی قرآن کریم

*غریب القرآن مرزا ابوالفضل

سے دور رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کے قریب آنے سے روکتے ہیں (۶/۲۶)۔ قرآن کریم کی مثل کوئی چیز نہیں (۶/۹۲)۔ مخالفین چاہتے تھے کہ رسول اللہؑ قرآن کریم میں کچھ تبدیلی کر دیں لیکن حضورؑ ایسا نہیں کرسکتے تھے ۔ نہ حضورؑ نے ایسا کیا (۱۰/۱۵)۔

قرن اول کی جماعت مومنین کے شرف و عظمت کا راز تمسک بالقرآن میں تھا (۴۳/۴۴)۔ لیکن جب بعد میں آنے والوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا تو ذلیل و خوار ہو گئے ۔ یہی وہ شکایت ہے جو نبی اکرمؑ خدا سے کرینگے (۲۵/۳۰)۔ اس لئے کہ الدین وہی ہے جو قرآن کریم کے اندر تھا ۔ اسے چھوڑ دینے سے الدین ہی چھوٹ گیا ۔ آج پھر اسی الدین سے تمسک ہوسکتا ہے اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ الدین اور قرآن کریم ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں ۔ دین، قرآن کریم کے اندر ہے اور جو بات قرآن کریم کے اندر نہیں وہ دین نہیں ۔ اور قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خدا نے خود لے رکھا ہے (۱۵/۹)۔

ق ر ب

قَرِیْبٌ بمقابلہ بَعِیْدٌ (۲۱/۱۰۹)۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی بتائے ہیں ۔ اَلْقُرْبُ ۔ فاصلہ کے اعتبار سے کسی کے قریب ہونا ۔ بمقابلہ بُعد، اور اَلْقُرْبَۃُ ۔ رتبہ کے اعتبار سے کسی کے قریب ہونا ۔ اور اَلْقُرْبیٰ وَالْقَرَابَۃُ رشتہ کے اعتبار سے کسی کے قریب ہونا ۔ یعنی رشتہ داری ۔ ذِی الْقُرْبیٰ (۲/۸۳) کے معنی ہیں جس سے رشتہ داری ہو۔ یعنی رشتہ دار۔ سورۃ شوریٰ میں ہے ۔ قُلْ لَّا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبیٰ (۴۲/۲۳)۔ اس کے معنی عام طور پر کئے جاتے ہیں کہ (اے رسول) ان سے کہدو کہ میں پیغام رسالت پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، بجز اس کے کہ میرے رشتہ داروں سے محبت کرو۔ یہ معنی نہ صرف یہ کہ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہیں بلکہ خود لُغت کے بھی خلاف ہیں ۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، اَلْقُرْبیٰ کے معنی رشتہ داری ہیں، نہ کہ رشتہ دار۔ چنانچہ لسان العرب میں اس آیت کے معنی لکھے ہیں کہ اے پیغمبر! کہدو کہ میں تم سے رسالت کا اجر نہیں مانگتا مگر وہ حقوق تو ادا کرو جو میری قرابت داری کی وجہ سے تم پر عائد ہوتے ہیں*۔

اس کے ایک معنی اور بھی ہوسکتے ہیں ۔ اٰتِ ذَا الْقُرْبیٰ حَقَّہٗ (۱۷/۲۶) کے معنی ہیں ''تو اپنے رشتہ دار کو اسکا حق دیدے''۔ یعنی ذا قُرْبیٰ کا ۔

---

* تاج ۔

اسی طرح آتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی (۲/۱۷۷) کے معنی ہیں ''اس نے اپنے رشتے داروں کو مال دیا'' ۔ یعنی ذوی قُرْباہُ ۔ اس اعتبار سے لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی میں ''تمہارا اپنا رشتہ'' مراد ہوگا ۔ یعنی قُرْباکُمْ ۔ یعنی تم اپنے رشتے ناطے کے حقوق مؤدت ادا کرو تو یہی میرا اجر ہے ۔ یہ وہی بات ہے جس کے متعلق سورۃ سبا میں کہا گیا ہے کہ قُلْ مَا سَاَلْتُکُمْ مِنْ اَجْرٍ فَھُوَ لَکُمْ (۳۴/۴۷) ۔ ''ان سے کہدو کہ میں تم سے جو اجر مانگتا ہوں تو وہ خود تمہارے اپنے ہی فائدے کے لئے ہے'' ۔

بہر حال بات پہلی ہو یا دوسری ، حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہؐ لوگوں سے اجر رسالت قطعاً نہیں مانگتے تھے ۔ آپ قرآن کریم میں دیکھئے ۔ ہر ایک نبی کا پہلا اعلان یہ ہوتا تھا کہ میں تم سے اجرِ رسالت کچھ نہیں مانگتا ۔ (مثلاً ۲۶/۱۰۹ ; ۲۶/۱۴۵ ; ۲۶/۱۶۴ ; ۲۶/۱۸۰ ; ۳۸/۸۶ ; ۵۲/۴۰ ; ۳۶/۲۱) ۔

اَلتَّقَرُّبُ کے معنی ہیں کسی کے قریب ہونا چاہنا اور اس سلسلہ میں ذرائع اختیار کرنا * ۔ اَلْمُقَارَبَۃُ ۔ ایک دوسرے کے قریب ہو جانا ۔ اَلْقُرْبَانُ ۔ وہ چیز جس سے خدا کا قرب چاہا جائے* ۔

سورۃ مائدہ میں ''آدم'' کے دو بیٹوں کا ذکر ہے (یعنی دو آدمیوں کا) جن کے متعلق کہا کہ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِھِمَا (۵/۲۷)۔ ''جب انہوں نے کوئی قربانی پیش کی ۔ سو ان دونوں میں سے ایک کی قربانی قبول کر لی گئی'' ۔ قرآن کریم نے اس قربانی کی تفصیل نہیں دی کہ وہ کیا چیز تھی اور کس طرح پیش کی گئی تھی ۔ یہ کوئی چیز بھی ہوسکتی ہے جسے نذرانے کے طور پر پیش کیا گیا ہو ، یا کوئی عملِ خیر بھی جسے بغرض حصول قرب خداوندی کیا گیا ہو ۔

ہمارے ہاں عید الاضحیٰ کی تقریب پر جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں ان کے لئے قربانی کا لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا ۔

قُربِ الٰہی سے مراد فاصلہ اور مکان کے اعتبار سے خدا کے نزدیک ہونا نہیں ۔ اس لئے کہ خدا کسی خاص مقام پر نہیں جہاں سے قُرب اور بُعد ماپا جاسکے ۔ انسان جسقدر اپنے اندر خدا کی صفات منعکس کرتا جاتا ہے اسی قدر وہ ''خدا سے قریب'' ہوتا جاتا ہے ۔ اور صفاتِ خداوندی کا اپنے اندر منعکس کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان قوانین خداوندی کا اتباع کرے ۔ چنانچہ

سورۃ علق میں ہے لَا تُطِعْهُ وَ اسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (۹۶/۱۹) تو اس شخص کی بات نہ مان (جو گریز کی راہیں نکالتا ہے ۔ بلکہ خدا کے قوانین کی) اطاعت کر اور اسطرح (خدا کے) قریب ہوجا ۔ یعنی قوانین خداوندی کی اطاعت سے اپنے اندر صفاتِ خداوندی پیدا کئے جا ۔ اسی کا نام انسانی ذات کی بیداری اور اس کا استحکام ہے ۔ اسی کو قرب خداوندی کہتے ہیں جو ہر مومن کو حاصل ہوسکتا ہے ۔ اس لئے ''مقربین بارگاہ خداوندی'' کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا ، جس طرح ''اولیاء اللہ'' کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا بلکہ ہر مومن ولی اللہ ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ قوانین خداوندی کا اتباع معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے ایک نظام کے تابع ہوتا ہے ۔ تجرد کی خانقاہوں میں یا ویسے ہی انفرادی طور پر نہیں ہوسکتا ۔ نہ ہی خدا کا قرب کسی اور ''الٰہ'' کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے ۔ (دیکھئے ۲۶/۲۸) ۔ الٰہ ، صرف ایک ہے اور وہ خدائے واحد ہے ۔

قُرْبَةٌ ۔ جمع قُرُبَاتٌ (۹/۹۹) ۔ قرب حاصل کرنے کا ذریعہ ۔ عَرَضًا قَرِيْبًا (۹/۴۲) ۔ جلدی حاصل ہو جانے والا فائدہ ۔ پیش پا افتادہ مفاد ۔ مفاد عاجلہ ۔

زمانہ قدیم میں لوگ جانوروں کو ذبح کرکے اپنے معبودوں کے حضور پیش کرتے تھے تاکہ ان کی خوشنودی حاصل کریں ۔ یہودی ان ذبح شدہ جانوروں کو آگ میں جلا دیتے تھے۔ چنانچہ سوختنی قربانی کا ذکر اکثر تورات میں آتا ہے۔ سورۃ آل عمران میں بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ (۳/۱۸۲) سے اسی قسم کی قربانی کی طرف اشارہ ہے جس کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ اگر وہ قبول ہو جائے تو اسے آگ بھسم کر دیتی ہے ۔

(خدا کے انسان سے قریب ہونے کے متعلق عنوان د ۔ ع ۔ و دیکھئے) ۔

ق ر ح

اَلْقَرْحُ ۔ اَلْقُرْحُ ۔ ہتیار وغیرہ کا زخم ۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلْقَرْحُ زخم کے نشان کو کہتے ہیں اور اَلْقُرْحُ سوزش اور جلن نیز درد و الم جو زخم کی وجہ سے ہو ۔ چنانچہ کہتے ہیں بِہٖ قَرْحٌ مِنْ قَرْحٍ ۔ اسے زخم کی وجہ سے درد ہو رہا ہے * ۔ راغب نے اسکی تائید کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ خارجی اثر سے ہونے والا زخم قَرْحٌ اور اندرونی طور پر ہونے والا پھوڑا پھنسی قَرْحٌ ہے ۔

*تاج ۔ نیز ابن فارس ۔

قرآن کریم میں جنگ میں نقصان ہو جانے کے لئے یہ لفظ آیا ہے ۔ (۳/۱۳۹)۔ یا اس نقصان کی وجہ سے جو تکلیف اور پریشانی ہو۔ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے ۔

ق ر د

اَلْقَرَدُ ۔ جھڑ جانے والی یا الجھی ہوئی ، ردی اون * جو کاتی نہ جا سکے اور اس لئے اسے بیکار ہونے کی وجہ سے پھینکدیا جائے ۔ اس سے یہ لفظ حقارت اور ذلت کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

اَقْرَدَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں عاجزی و درماندگی کی وجہ سے وہ شخص ساکن ہوگیا۔ ذلیل ہوگیا اور جھوٹ موٹ مردہ بن گیا * ۔ اَلْقِرْدُ ۔ بندر کو کہتے ہیں ۔ اسکی جمع اَلْقِرَدَةُ ہے ۔ اور اَلْقُرَادُ ۔ چیچڑی کو کہتے ہیں جو اونٹوں وغیرہ کے چمٹ جاتی ہے * ۔

قرآن کریم میں ہے کہ جن یہودیوں نے سبت کے احکام کی خلاف ورزی کی تھی ** انہیں قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ بنا دیا (۲/۶۵)۔ (خَاسِیٔ کے معنی ہیں ذلیل۔ کمینہ ۔ بیکار ۔ دیکھئے عنوان خ ۔ س ۔ أ) ۔ سورہ نساء میں ہے کہ ان پر لعنت کی گئی تھی (۴/۴۷)۔ یعنی وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہوگئے تھے ۔ اسکی تشریح میں (۷/۱۶۳-۱۶۷) میں کہا ہے کہ اللہ نے حکم دیدیا کہ ان پر ایسے لوگ مسلط رہیں جو انہیں طرح طرح کا عذاب دیتے رہیں ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ وہی عذاب تھا جسے دوسری جگہ ذِلَّة اور مَسْکَنَة کا عذاب کہا ہے (۲/۶۱) ۔ سورہ مائدہ میں منافقین کو بھی قِرَدَة کہا ہے ۔ اور اسکی تشریح عَبَدَ الطَّاغُوْتَ سے کر دی گئی ہے (۵/۶۰)۔ یعنی غیر خدائی قوتوں کے غلام اور محکوم ۔ اسی چیز کو ان پر لعنت اور غضب کہا گیا ہے ۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ کُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ (۲/۶۵) کے معنی یہ نہیں کہ انہیں سچ مچ کے بندر بنا دیا گیا تھا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر ذلتوں اور رسوائیوں کی مار ماری گئی تھی ۔ یہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ وہ یک نگہی اور یک مرکزی کی زندگی بسر کرنے کی بجائے باھمی اختلافات کیا کرتے تھے ۔ (۱۶/۱۲۴)۔ اور یہ حالت ہر اس قوم کی ہو جاتی ہے جو آئین و قوانین کی خلاف ورزی شروع کر دے ۔ اس سے ان میں کیریکٹر ہی نہیں رھتا ۔ یہودیوں کا قواعد سبت کی پابندی سے گریز کی راہیں نکالنا اسی عدم کردار کا مظہر تھا۔

---

*تاج ۔ **سبت کے لئے دیکھئے عنوان س ۔ ب ۔ ت ۔

ق ر ر

اَلْقَرَارُ ۔ کسی چیز کا ٹھہرنا ، جمنا ۔ یا کسی چیز کے ٹھہرنے کی جگہ ۔ اَلْقَرَارَۃُ ۔ نشیبی زمین جہاں پانی ٹھہر جائے ۔ اس معنی میں قَرَارٌ بھی مستعمل ہے ۔ قَرَّ بِالْمَکَانِ ۔ کسی جگہ سکونت اختیار کرنا ، وہاں ٹھہر جانا اور جم کر رہنا ۔ اِسْتِقْرَارٌ ۔ ٹھہر جانا ، جم جانا ۔ اَقَرَّ کے معنی ہیں کسی چیز کو ٹھہرانا اور جما دینا ، نیز اس کے معنے اعتراف اور اقرار کرنے کے ہیں ۔ جیسے ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ (۲/۸۴) پھر تم نے اقرار کیا ۔ مُسْتَقَرُّ الْحَمْلِ ۔ رحم کا وہ آخری حصہ جہاں حمل قرار پا جاتا ہے* ۔ وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ (۲/۳۶) تمہارے لئے زمین میں قرار و ثبات کا مقام ہے ۔ تم کو یہاں ٹھہرنا اور رکنا ہے ۔ اس آیت میں اِلٰی حِیْنٍ (ایک وقت کے لئے) کے اضافہ نے یہ بتا دیا کہ زمین ابدی قیام گاہ نہیں ۔ صرف ایک وقت تک کے لئے ٹھہرنے اور رکنے کی جگہ ہے ** ۔ [مُسْتَقَرٌّ وَ مُسْتَوْدَعٌ (۶/۹۹) کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان و ۔ د ۔ ع] ۔ لِکُلِّ نَبَاٍ مُسْتَقَرٌّ (۶/۶۷) کے معنی ہیں ہر خبر کا ایک منتہٰی ہوتا ہے جہاں پہنچکر اسکی صداقت یا عدم صداقت آشکارا ہو جاتی ہے ۔ ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے ۔ ہر واقعہ ایک خاص حد تک جاتا ہے جہاں پہنچکر وہ رک جاتا ہے اور اس کے نتائج ظہور میں آجاتے ہیں ۔ یہی اس کا مستقر ہوتا ہے ۔ اَلشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (۳۶/۳۸) سورج (اپنی محوری گردش کے علاوہ) اپنے نظام کو لیے کر ایک مستقر (Destination) کی طرف تیزی سے جا رہا ہے ۔ اَلْقَرُّ ۔ کجاوہ اور زین کے بین بین ایک چیز جسے سواری پر رکھ کر اس میں مرد بیٹھتے ہیں ۔ نیز ہودہ کو بھی کہتے ہیں* جو عورتوں کے اونٹ پر بیٹھنے کی جگہ ہوتی ہے ۔

اَقَرَّ اللّٰهُ عَیْنَهٗ کے معنی ہیں خدا اسے اتنا مال دے دے کہ اسکی نگاہ ٹھہر جائے اور وہ اپنے سے زیادہ مالدار لوگوں کیطرف للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھتا پھرے* ۔ اس کا دوسرا مفہوم ہے ”خدا اُسے خوش رکھے“ ۔ اس سے آنکھوں کی ٹھنڈک مراد ہوتی ہے ۔ یعنی مطمئن و مسرور ۔ قُرَّۃُ الْعَیْنِ ۔ جس سے آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں ۔ قرآن کریم میں ہے قُرَّۃَ اَعْیُنٍ (۲۵/۷۴) ۔ وَقَرِّیْ عَیْنًا (۱۹/۲۶) ۔ اپنی آنکھ کو ٹھنڈک پہنچا ۔ اَلْقُرَّۃُ ۔

*تاج ۔ نیز ابن فارس ۔ ** اس کا یہ مطلب نہیں کہ ”آدم“ پہلے کسی اور جگہ (جنت میں) تھا اور اسے پھر زمین پر بھیجدیا گیا ، یہ ساری داستان اسی زمین (ارض) سے متعلق ہے ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ا د م میں لفظ آدم ۔

ٹھنڈ ۔ (اَلْقُرَّۃُ ۔ سردی کے موسم کی ٹھنڈ کو کہتے ہیں اور بَرْدٌ ہر ٹھنڈ کو کہتے ہیں خواہ سردی کی ہو یا گرمی کی*) ۔ قَرَّ عَلَیْہِ الْمَاءَ کے معنی ہیں اس پر پانی ڈال دیا ۔ اَلْقَارُوْرَۃُ ہر اس برتن کو کہتے ہیں جس میں شراب رکھی جائے ۔ بالخصوص شیشہ کا برتن ۔ اسکی جمع قَوَارِیْرُ ہے (۷۶ / ۱۵-۱۶)۔ پھرخود شیشے کو قَوَارِیْرُ کہنے لگ گئے ۔ (۲۷ / ۴۴) ۔ اہل عرب مجازاً عورتوں کو بھی قَوَارِیْرُ کہدیتے تھے* ۔ یعنی آبگینے ۔

ق ر ش

کتب لغت میں اس لفظ کے بہت سے معانی لکھے ہیں ۔ فرّاء کا قول ہے کہ قُرَیْشٌ کا لفظ قَرْش سے بنا ہے جس کے معنی ادھر ادھر سے چیزیں جمع کرنا اور سمیٹنا ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ قریش چونکہ حرم میں جمع ہوتے تھے اس لئے ان کا یہ نام پڑ گیا ۔ اسی سے تَقَرَّشَ الْقَوْمُ ہے ۔ یعنی لوگ اکٹھے ہوئے ۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ سامان تجارت خریدنے میں جلدی اور پہل کرتے تھے اس لئے قریش کہلائے ، کیونکہ تَقَرَّشَ کے معنی ہیں سامان تجارت کو پہلے خریدنا ۔ بعض نے کہا ہے کہ نضر بن کنانہ (قریش کے جد امجد) ایک دن کپڑے میں لپٹ کر سمٹ گئے اس لئے ان کا نام قریش پڑ گیا ۔ بعض کا خیال ہے کہ ایک دن نضر اپنی قوم کے پاس آئے تو لوگوں نے کہا کَاَنَّہٗ جَمَلٌ قُرَیْشٌ ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضبوط اونٹ ہے ۔ چنانچہ اس کا لقب قریش پڑ گیا ۔ بعض نے کہا ہے کہ قُصَیّ کو ”قرشی“ کہا جاتا تھا اور اس نے یہ نام قریش کو دیا ۔ یا یہ لفظ قِرْش نامی دریائی جانور (وہیل مچھلی) کی تصغیر ہے جس سے تمام سمندری جانور ڈرتے ہیں ۔ یا یہ نام ”قریش بن مخلد بن غالب بن فہر“ کی وجہ سے پڑا جو ان کے تجارتی قافلہ کا مالک تھا اور لوگ کہا کرتے تھے قَدِمَتْ عِیْرُ قُرَیْشٍ وَ خَرَجَتْ عِیْرُ قُرَیْشٍ“ ۔ قریش کا قافلہ آیا اور قریش کا قافلہ گیا ۔ ازہری وغیرہ نے کہا ہے کہ تجارت اور کاروبار اور تلاش رزق کے لئے سفر کرنے کی بنا پر ان کا نام قریش پڑا ہے ۔ بعض کا قول ہے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ ان کا دارومدار ہی تجارت پر تھا اور ان کے پاس گذارا کرنے کے لئے زمین اور مویشی نہیں تھے ۔ اس سے ہے فُلَانٌ یَتَقَرَّشُ الْمَالَ ۔ فلاں شخص مال جمع کرتا ہے* ۔

حضرت ابراہیم[ؑ] نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل[ؑ] کو تولیت کعبہ کے لئے سرزمین حجاز میں بسا دیا ۔ ان کے بارہ بیٹے تھے جن میں سے قیدار بڑا

*تاج العروس ۔

نامور تھا۔ بنو قیدار کی شاخ پھیلتے پھیلتے وسیع خاندانوں میں منقسم ہو گئی۔ ان میں قریش کا خاندان نہایت معزز اور ممتاز شمار کیا جاتا تھا۔ ان میں فہر (قریب ۲۰۰ء) اور قُصَیؓ بن کِلاب (قریب ۴۰۰ء) بڑے مشہور ہیں۔ نبیٔ اکرم اسی خاندان کے چشم و چراغ (اور تمام دنیا کے لئے سراج منیر) تھے۔

کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے قریش دور و نزدیک کے ممالک میں عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ تجارت ان کا کاروبار تھا۔ اس کے لئے مختلف قبائل واقوام نے ان سے معاہدے کر رکھے تھے کہ ان کے قافلے محفوظ رہینگے۔ قرآن کریم نے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ اٖلٰفِھِمْ رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ (۱۰۶/۱-۲)۔ "اُن عہد و پیمان کی وجہ سے جو (دوسری اقوام نے) قریش سے اس لئے کر رکھے ہیں کہ وہ کعبہ کے متولی ہیں) ان کے قافلے سردی گرمی میں محفوظ طور پر سفر کرتے ہیں"۔ اس کے بعد قرآن کریم نے کہا ہے کہ انہیں یہ مقام کعبہ کا متولی ہونے کی وجہ سے حاصل ہے، لہذا انہیں چاہئے کہ وہ رب کعبہ کے احکام و قوانین کی اطاعت کریں۔ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ الَّذِیْٓ اَطْعَمَھُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَھُمْ مِّنْ خَوْفٍ (۱۰۶/۳-۴)۔ وہ رب کعبہ جس نے انہیں بھوک میں کھانا دیا اور خوف سے امن عطا کیا۔

کیسی عمدہ دلیل ہے یہ۔ یعنی یہ لوگ خدا کے نام پر اتنے مفاد حاصل کرتے ہیں لیکن اطاعت خدا کو چھوڑ کر اوروں کی کرتے ہیں۔ یہ تو کچھ اچھی بات نہ ہوئی۔ اگر خدا کے نام سے مفاد حاصل کرتے ہیں تو خدا کے قوانین کی اطاعت بھی کریں۔ اور اگر اطاعت کسی اور کی کرنی ہے تو خدا سے اپنی نسبت ختم کریں۔

ق ر ض

اَلْقَرْضُ۔ قطع کرنا۔ کاٹنا۔ قَرَضَ الْمَکَانَ۔ وہ کسی جگہ سے کترا کر نکل گیا۔ قَرَضَ فِیْ سَیْرِہٖ۔ وہ چلنے میں دائیں بائیں جھکا*۔ (۱۸/۱۷) قَرْضٌ۔ کوئی چیز جو دی جائے، یا کوئی کام جو کیا جائے، اس امید پر کہ وہ چیز واپس مل جائیگی یا اس کام کا بدلہ ملیگا*۔ اَقْرَضَ۔ کوئی چیز دینا، یا کوئی کام کرنا، اس امید پر کہ وہ واپس مل جائیگی یا اسکا بدلہ ملیگا۔ عربوں کے محاورہ میں قَرْضٌ حَسَنٌ کے معنی اچھا سلوک اور معاملہ بھی ہوتے ہیں۔

*تاج۔

قرآن کریم میں بھی اس معنی میں یہ محاورہ آیا ہے (مثلاً ۲/۲۴۵) ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب نظام ربوبیت کے قیام کے لئے جدو جہد شروع کی جائے تو اسکی ضرورت ہوتی ہے کہ جماعت میں جس جس چیز کی کمی ہو اسے ملکر پورا کیا جائے ۔ ہر قسم کی کوشش ، ہر قسم کا جانی اور مالی ایثار جو درکار ہو ، اسے بطیب خاطر پیش کر دیا جائے ۔ یہ سب کچھ قَرْضٌ حَسَنٌ ہوگا ۔ لیکن اس کے ساتھ اگر قرض کے دیگر معنی بھی ملا لئے جائیں تو بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے ۔ اَلْقَرْضُ کے معنی ہیں چبانا * ۔ اَلْقَرِیْضُ ۔ چارے کا وہ گولہ جسے اونٹ اپنے پیٹ میں سے لوٹا کر منہ میں لاتا ہے ۔ پھر اسے چباتا رہتا ہے ۔ (جگالی کرتا ہے) اور جب وہ ہضم کے قابل ہوجاتا ہے تو اسے معدہ میں لوٹا دیتا ہے کہ وہ جزو بدن بن جائے* ۔ نظام ربوبیت کے قیام میں ، فرد جو کچھ معاشرہ کو دیتا ہے اسے یوں سمجھئے کہ وہ قَرِیْضٌ کی شکل میں ہوتا ہے ۔ معاشرہ اسے مناسب مقامات میں صرف کرکے اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ بہترین نتائج کا حامل بن جائے ۔ اسطرح افراد نے جو کچھ دیا تھا وہ بہترین شکل میں پھر افراد کی طرف لوٹ آتا ہے ۔ اسی لئے کہا ہے کہ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا کَثِیْرَةً ۔ (۲/۲۴۵) ۔ کوئی ہے جو اللہ کو "قرض حسنہ" دے تو وہ اسے اس کے لئے کئی گنا بڑھا دے ! یہ بڑھانا نتائج کے اعتبار سے ہے ۔ اللہ کو کوئی قرض نہیں دیا جاتا ، اس کے بندوں کو دیا جاتا ہے ۔ لہذا وہ معاشرہ جو اللہ کے قانون کے مطابق متشکل ہو وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے جو خدا نے بندوں کے متعلق اپنے اوپر لے رکھی ہیں ، اور ان واجبات کو وصول کرتا ہے جو خدا نے بندوں پر عائد کر رکھے ہیں ۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے افراد معاشرہ جو کچھ ایثار کریں اور جس حسن کردار کا ثبوت دیں ، وہ سب "اللہ کے لئے قرض حسنہ" ہوگا ۔

ق ر ط س

اَلْقِرْطَاسُ ۔ اَلْقِرْطِسُ ۔ اَلْقَرْطَسُ ۔ کاغذ ۔ ہر وہ چیز جس پر لکھا جائے** ۔ (جمع قَرَاطِیْسُ ۶/۹۱) ۔ اَلْقِرْطَاسُ اس کھال کو بھی کہتے ہیں جسے تیر اندازی کے لئے نصب کرتے تھے* ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلْقِرْطَاسُ اس وقت بولتے ہیں جب کہ اس پر کچھ لکھا ہو ، ورنہ بلا لکھے کو طِرْسٌ اور کاغَذٌ کہتے ہیں ۔ (اگرچہ اس کے برعکس بھی ہے)*** ۔

*تاج ۔ **تاج و راغب ۔ ***تاج و محیط ۔

قرآن کریم میں ہے وَ لَوْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِيْ قِرْطَاسٍ (۶/۷) ۔ اگر ہم تم پر کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی نازل کر دیتے ۔

ق ر ع

اَلْقَرْعُ ۔ ایک چیز کو دوسری چیز پر مارنا*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں ۔ قَرَعَ رَأْسَهُ بِالْعَصَا ۔ اس کے سر پر لاٹھی ماری ۔ قَرَعَ الْبَابَ قَرْعًا ۔ دروازہ کھٹکھٹایا ۔ اَلْقَرَّاعَةُ ۔ وہ پتھر (چقماق وغیرہ) جسے رگڑ کر آگ نکالی جائے ۔ اَلْمِقْرَاعُ ۔ ہتھوڑا وغیرہ جس سے پتھر توڑے جائیں ۔ یہاں سے اس مادہ میں شدت اور سختی یا مصیبت کے معنے پیدا ہو گئے ۔ چنانچہ اَلْقَرْعَاءُ اس باغیچے کو کہتے ہیں جسے جانوروں نے چر ڈالا ہو ۔ اور رِيَاضٌ قُرْعٌ ان باغات کو جن میں ہریاول قطعاً نہ رہی ہو ۔ اور اَلاَقْرَعُ عمدہ تیز تلوار کو** ۔

قرآن کریم میں قَارِعَةٌ کا لفظ سخت مصیبت کے لئے آیا ہے جو قوموں پر ان کی شامتِ اعمال سے (غلط روش کے تباہ کن نتیجہ کے طور پر) آتی ہے ۔ سورۃ رعد میں ہے . . . . تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ (۱۳/۳۱) ۔ ان کے اعمال کی وجہ سے انہیں کوئی نہ کوئی مصیبت پہنچتی رہے گی ۔ سورۃ حاقہ میں ہے ۔ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ (۶۹/۴) ۔ اس سے مراد وہ تباہی ہے جو قانونِ مکافات عمل کی رو سے ان پر آنے والی تھی ۔ یہی اَلْقَارِعَةُ تھی جو قریش کی سرکشی کی وجہ سے ان پر آئی اور یہی وہ قَارِعَةٌ ہے جو ہر سرکش قوم پر ان کے ظلم و استبداد کی بنا پر ہمیشہ آتی ہے ۔ اور جو آجکل قوموں کے باہمی تصادم (ٹکراؤ) سے آئے دن واقع ہوتی رہتی ہے ۔ سورۃ القارعۃ (۱۰۱) میں جو تفصیل دی گئی ہے اس سے اس دنیا میں واقع ہونے والے تصادمات کے علاوہ اُخروی زندگی کا محاسبہ بھی شامل ہے ۔

اَلْقُرْعَةُ ۔ حصہ ، نصیبہ ۔ اسی سے اِلْقَاءُ الْقُرْعَةِ قرعہ اندازی کو کہتے ہیں*** ۔ اس لئے کہ اس سے حصہ متعین ہوجاتا ہے ، یا پھر اس لئے کہ قرعہ اندازی میں کسی سخت چیز (پانسہ) کو دوسری چیز کے ساتھ ٹکرایا جاتا ہے ۔

قرآن کریم میں قرعہ اندازی کے لئے یہ لفظ (قرعہ) نہیں آیا ۔ قصہء حضرت مریمؑ کے ضمن میں ایک جگہ ہے اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ (۳/۴۳) ۔ ''جب

*راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

وہ اپنے تیر یا قلمیں ڈالتے تھے''۔ اس سے قرعہ اندازی مراد لی جاتی ہے۔ یہودی بہت سے امور کے فیصلے قرعہ اندازی سے کیا کرتے تھے۔ اس کا ذکر انجیل میں ملتا ہے۔ قرآن کریم، عقل و دانش اور فہم و تدبر سے فیصلے کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس تعلیم کی رُو سے، فیصلوں کے لئے ایسے طریق اختیار کرنا جس میں انسان اپنی عقل و فکر اور اختیار و ارادہ کو اتفاقات (Chances) کے سپرد کر دے، مستحسن عمل قرار نہیں پاسکتا۔

ق ر ف

اَلْقِرْفُ۔ درخت کی چھال۔ انار وغیرہ کا چھلکا۔ اَلْقِرْفُ مِنَ الْاَرْضِ۔ وہ مٹی جو سبزیوں اور ان کی جڑوں کے ساتھ زمین سے اکھڑ آئے۔ اَلْقِرْفَةُ۔ کمانے اور حاصل کرنے کے معنوں میں آتا ہے۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا خلط ملط ہوجانا اور کسی چیز کو اوپر ڈال لینا، پہن لینا، بتائے ہیں۔ اِقْتَرَفَ کے معنے کمانا ہیں۔ اِقْتَرَفَ الْمَالَ۔ اس نے مال جمع کر لیا۔ رَجُلٌ قِرْفَةٌ۔ کماؤ مرد*۔ راغب نے لکھا ہے کہ اِقْتَرَفَ کے معنے محنت سے کمانا اور کام کرنا ہیں، خواہ اچھا کام ہو یا برا، لیکن اس کا بیشتر استعمال برے کام کرنے کے لئے ہوتا ہے**۔

سورۃ انعام میں ہے۔ وَ لِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ (۶/۱۱۳) تاکہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ کئے جائیں۔ جن چیزوں میں لگے ہوئے ہیں ان میں لگے رہیں۔

ق ر ن

اَلْقَرْنُ۔ جانور کا سینگ۔ انسان کے سر کا وہ حصہ جہاں جانور کے سینگ ہوتے ہیں۔ سر کا بالائی حصہ۔ اَلْقَرْنُ مِنَ الْقَوْمِ۔ قوم کا سردار*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) وہ چیز جو قوت اور شدت کے ساتھ ابھر آئے اور (۲) ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ اکٹھا کر دینا۔

اَلْقَرْنُ۔ زمانہ معینہ۔ اس زمانہ کی مدت میں اختلاف ہے، لیکن عام طور پر ایک سو سال (صدی) کی مدت کو کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ زمانہ کا کچھ حصہ قَرْنٌ کہلاتا ہے جسکی حد نہیں مقرر کی جاتی*۔ یا ہمعصر

*تاج۔ **راغب۔

یا ایک امت جو ختم ہوچکی ہو۔ اَلْقِرْنُ ہم سر، ہم پلہ* ۔ سورۃ انعام میں ہے۔ اَلَمْ یَرَوْا کَمْ اَهْلَکْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ (۶/۶) ۔ اس کے معنی اقوامِ سابقہ ہیں ۔ قَرْنٌ کی جمع قُرُوْنٌ ہے ۔

اَلْقَرْنُ ۔ کسی چیز کو کسی چیز کے ساتھ باندھ دینا اور ملا دینا ۔ دو اونٹوں کو ایک رسی میں باندھ دینا*۔ قُرِّنَتِ الْاُسَارٰی فِی الْحِبَالِ۔ قیدیوں کو اکٹھا کرکے رسیوں سے باندھ دیا گیا** ۔ قرآن کریم میں ہے مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ (۱۴/۴۹)۔ زنجیروں میں اکٹھے جکڑے ہوئے۔

قَرْنُ الشَّیْطَانِ ۔ شیطان کی امت یا اس کی قوت*۔ اَقْرَنَ لِلْاَمْرِ ایسے معاملہ پر قدرت و طاقت حاصل رہی ۔ اس نے کسی کام کی طاقت رکھی*۔ قرآن کریم میں مُقْرِنِیْنَ (۴۳/۱۳) کے معنی ہیں طاقت اور اقتدار رکھنے والے ۔ اَلْقَرِیْنُ ۔ ساتھی ۔ رفیق ۔ ایک رسی میں بندھے ہوئے یا ایک جوئے میں جتے ہوئے*۔ قرآن کریم میں قَرِیْنًا بمعنی ساتھی اور رفیق آیا ہے (۴/۳۸) ۔ اَلْقَرِیْنَةُ ۔ بیوی کو کہتے ہیں** ۔

سورۃ کہف میں ذِی الْقَرْنَیْنِ کا ذکر آیا ہے ۔ (۱۸/۸۳) ۔ کتب لغت اور تفاسیر میں اس کے متعلق اتنے مختلف بیانات ملتے ہیں کہ کثرت تعبیر سے خواب پریشان ہو گیا ہے ۔ لیکن دورِ حاضر کی تحقیقات سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سے مراد شاہنشاہ کیخسرو (خورس یا سائرس) ہے ۔ اور اس کے دو سینگوں سے مراد میڈیا اور فارس کی دو سلطنتیں ہیں جن پر وہ حکمرانی کرتا تھا۔ کوئی سو برس کا عرصہ ہوا ، اصطخر کے کھنڈرات سے شاہنشاہ خورس کا ایک مجسمہ برآمد ہوا ہے جس کے سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں*** ۔ اس لئے کہ ایران میں مملکت کو قَرْنٌ (سینگ) سے تعبیر کیا جاتا تھا ۔ یہی وہ شاہنشاہ تھا جس نے یہودیوں کو بابل کی المناک اسیری سے نجات دلائی تھی اور جس کے ہاتھوں دانیال ، یسعیاہ اور یرمیاہ نبی کی پیش گوئیاں پوری ہوئی تھیں ۔ یہ پیش گوئیاں تورات میں آجکل بھی موجود ہیں ۔ دانیال نبی نے اپنے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک مینڈھا ہے جس کے دو بڑے بڑے سینگ ہیں ۔ جبریل نے انہیں اس خواب کی یہ تعبیر بتائی کہ یہ ، میڈیا اور فارس کی دو سلطنتوں کا شاہنشاہ ہے جس کے ہاتھوں یہودیوں کو اہل بابل کی غلامی سے نجات ملیگی۔ چنانچہ یہ نجات دہندہ یہودیوں کے ہاں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا ۔ یسعیاہ نبی کی پیش گوئی میں اس ''دو سینگوں'' والے کا نام

*تاج ۔ **محیط ۔ ***(Sir Percy Sykes) نے اپنی کتاب (A History of Persia) کی جلد اول کے شروع میں (Cyrus) کے اس مجسمہ کا فوٹو دیا ہے ۔

خرس لکھا ہے۔ چنانچہ جب خرس نے بابل فتح کر کے یہودیوں کو آزادی دلائی تو دانیال نبی نے اسے یسعیاہ نبی کی پیش گوئی دکھائی جو اس واقعہ سے قریب ڈیڑھ سو سال پہلے کی گئی تھی۔

یہ بادشاہ پہلے ایران سے مغرب کی طرف چلا اور خشکی کا تمام سفر طے کرتا ہوا لیڈیا (ایشیائے کوچک کی شمال مغربی مملکت) کے دار الحکومت سارڈس کو فتح کر کے سمندر کے کنارے تک جا پہنچا جہاں شام کے وقت سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے (۱۸/۸۶)۔ پھر اس نے مشرق کی سمت لشکر کشی کی اور باختر کے علاقہ کی طرف گیا (۱۸/۹۰)۔ اس کی تیسری لشکر کشی سلسلۂ کوہ کاکیشیا کی طرف تھی جہاں اس نے درۂ کوہ میں ایک دیوار بنائی تاکہ شمالی علاقہ کے وحشی قبائل ان لوگوں پر حملہ آور نہ ہوسکیں (۱۸/۹۴)۔ یہ شاہنشاہ زرتشت کا متبع تھا۔ قرآن کریم کی کشادہ نگہی دیکھئے کہ اس نے اس کی بلندئ سیرت و کردار کا کس خوبی سے اعتراف اور ذکر کیا ہے (۱۸/۹۸-۹۵)۔ (مزید تفصیل میری کتاب "برق طور" میں ذوالقرنین کے عنوان کے تحت ملاحظہ کیجئے)

بہر حال، جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے یہ وہ قیاسات ہیں جن تک دور حاضر کی تحقیق پہنچاتی ہے۔ ممکن ہے اس کے بعد مزید تحقیقات سے کچھ اور واقعات بھی بے نقاب ہوجائیں جو قیاسات کو یقین میں بدل سکیں۔ قرآن کریم نے جس مقصد کے لئے ذی القرنین کا ذکر کیا ہے وہ مقصد اس تعین کے بغیر بھی حاصل ہوجاتا ہے کہ اس سے کونسی تاریخی شخصیت مراد ہے۔

ق ر ی

اَلْقَرْيَةُ۔ بڑا شہر۔ شہر۔ وہ جگہ جہاں ٹھہرنے کے لئے بہت سے مکانات ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں*۔ بستی۔ اسکی جمع قُرًى ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ ہر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں لوگ جمع ہوجائیں۔ نیز خود جمع ہونے والے آدمیوں کو بھی کہتے ہیں***۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اَلْمَدِيْنَةُ اس شہر کو کہتے ہیں جس کے گرد شہر پناہ ہو۔ اور قَرْيَةٌ اور بَلْدَةٌ اسے کہتے ہیں جس میں یہ نہ ہو**۔ (لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں)۔ قَرْیٌ کے معنی جمع کرنے کے ہوتے ہیں۔ قَرَی الْمَاءَ فِی الْحَوْضِ۔ حوض میں پانی جمع کر دیا۔ اسی اجتماعیت کے اعتبار سے بستی کو قَرْيَةٌ کہتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی جمع کرنے اور مجتمع ہونے کے ہوتے ہیں۔

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔

سورہ بقرہ میں قَرْیَةٍ (۲۵۹/۲) بستی کے لئے آیا ہے ۔ اور سورہ انبیاء میں قَرْیَةٍ (۶/۲۱) سے مراد اہل قریہ (بستی کے لوگ) ہیں ۔ سورہ زخرف میں اَلْقَرْیَتَیْنِ (۳۱/۴۳) آیا ہے جس سے مراد مکہ اور طائف کی بستیاں ہیں ۔ اہل لغت نے اسکی تصریح کی ہے کہ قریش جب بھی اَلْقَرْیَتَیْنِ کہتے تو اس سے ان کی مراد مکہ اور طائف کی دونوں بستیاں ہی ہوتیں***۔

ق س ر

قَسَرَہٗ عَلَی الْاَمْرِ ۔ اس نے اسے اس بات پر مجبور کر دیا ۔ قَسَرَہٗ ۔ وہ اس پر غالب آگیا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی شدت کے ساتھ غلبہ اور تسلط کے ہیں ۔ اَلْقَسْوَرَةُ ۔ شیر کو کہتے ہیں ۔ نیز شکاری اور تیر انداز کو** ۔ قرآن کریم میں ہے فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۔ (۵۱/۷۴) شیر سے بھاگ رہے ہوں (کہ کہیں کھا نہ جائے)۔

ق س س

اَلْقَسُّ ۔ کسی چیز کو طلب کرنا ۔ اسکی تلاش کرنا ۔ فُلَانٌ قَسُّ اِبِلٍ ۔ فلاں آدمی اونٹوں کا عالم ہے ۔ یعنی جو اونٹوں کے ساتھ ہمیشہ رہے* اور ان کی عادات و اطوار سے خوب واقف ہو ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے اصلی معنی کسی چیز کی رات کے وقت جستجو کرنے کے ہیں** ۔ اَلْقِسِّیْسُ ۔ علم اور شریعت میں نصاریٰ کا سردار (۸۲/۵) ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ سریانی لفظ ہے ۔ اس کے معنی "شیخ" کے آتے ہیں ۔ کلیسا کے عہدوں میں اس کا درجہ اسقف (Bishop) سے نیچے ہوتا ہے***۔

ق س ط

اَلْقِسْطُ ۔ مبنی برعدل حصہ** ۔ حصہ، نصیبہ، مقدار*** ۔ تَقَسَّطُوْا الشَّیْءَ بَیْنَھُمْ ۔ انہوں نے اس چیز کو آپس میں برابر برابر تقسیم کرلیا**** ۔ چنانچہ قِسْطَاسٌ ترازو کو کہتے ہیں ۔ (۳۵/۱۷ ؛ ۱۸۲/۲۶) بلکہ (صاحب لطائف اللغۃ کے قول کے مطابق) سب سے زیادہ صحیح ترازو ۔ اَقْوَمُ الْمَوَازِیْنِ ۔ اَلْقِسْطُ عَدْلٌ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ چنانچہ سورہ مائدہ میں فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِالْقِسْطِ ۔ (۴۲/۵) اور سورہ اعراف میں قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ ۔ (۲۹/۷) اسی سے ہے ۔ اَقْسَطَ ۔ اس نے عدل کیا ، انصاف کیا ۔ سورہ حجرات میں ہے کہ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (۹/۴۹) ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔ ****تاج و محیط ۔

لیکن قَسَطَ یَقْسِطُ کے معنی ظلم کرنے اور حق سے ہٹ جانے کے بھی آتے ہیں *۔ (یعنی یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے)۔ آیت (۲۳/۱۵) میں قَاسِطُوْنَ کے معنی ظلم کرنے والے ہیں۔ اس کے مقابل میں مُسْلِمُوْنَ آیا ہے (۲۳/۱۴)۔ یعنی مسلم وہ ہے جو کبھی ناانصافی نہیں کرتا۔ اَلْقَسَطُ کے معنی ہوتے ہیں گردن کا سوکھ جانا۔

جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، قِسْطٌ اور عَدْلٌ دونوں کے معنی انصاف کے ہیں لیکن ان میں جو باریک فرق ہے اسے یوں سمجھئے کہ عَدْلٌ کے معنی ہونگے دو آدمیوں میں برابر برابر کا سلوک کرنا۔ اور قِسْطٌ کے معنی ہونگے کسی کے حقوق و واجبات کا پورا پورا ادا کر دینا۔ چنانچہ سورہ نساء میں جو آیا ہے کہ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی (۴/۳) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم دیکھو (تمہیں اس کا اندیشہ ہو کہ تم) یتیم بچوں اور بے شوہر کی عورتوں کے حقوق و واجبات کو پورا نہ کرسکوگے۔ (یعنی معاشرہ میں ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ان کے مسئلے کا منصفانہ حل نہ کر سکو۔ ان کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکو)۔ یعنی اس میں کسی دوسرے کے ساتھ تقابل کا سوال نہیں۔ خود اُن کے حقوق کو پورا کرنے کا سوال ہے۔ اس سے آگے ہے وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ (۴/۱۲۹) تمہیں اس کی استطاعت نہیں کہ عورتوں میں عدل کر سکو۔ یہاں مختلف عورتوں میں برابر کے سلوک کا سوال ہے، اس لئے عَدْلٌ کا لفظ آیا ہے۔

ق س م

قَسَمَ ۔ یَقْسِمُ ۔ کسی چیز کے حصے کر دینا۔ بانٹ دینا۔ فَانْقَسَمَ چنانچہ وہ حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ اَلْقِسْمَةُ ۔ تقسیم، بانٹ** ۔ قِسْمَةٌ ضِیْزٰی (۵۳/۲۲) ۔ بے انصافی کی تقسیم۔ قرآن کریم میں ہے نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (۴۳/۳۲) ۔ "ہم نے انکی دنیاوی زندگی میں ان کے درمیان ان کا سامانِ زیست تقسیم کیا ہے"۔ اس کے معنے یہ نہیں کہ خدا یونہی (معاذ اللہ) اندھا دھند رزق کی تقسیم کر دیتا ہے۔ اس کی تقسیم کے لئے اس کا قانون مقرر ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹) ۔ انسان کو وہی کچھ ملیگا جس کے لئے وہ

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔

کوشش کرے۔ یہ جو ہم دنیا میں اس اصول کے خلاف تقسیم رزق دیکھتے ہیں، تو یہ تقسیم، قانون خداوندی کے مطابق نہیں ہے۔ انسانوں کی خود ساختہ ہے۔

مَقْسُوْمٌ۔ تقسیم کیا ہوا (۱۵/۴۴)۔ مُقَسِّمٌ۔ تقسیم کرنے والا۔ (۵۱/۴)۔ اَلْمُقْتَسِمِيْنَ (۱۵/۹۰) آپس میں بانٹ لینے والے۔ اِسْتَقْسَمَ۔ تقسیم چاہنا۔ جاہلیت میں جانور کو ذبح کرکے، تیروں یا پانسوں کے ذریعے اس کے حصے کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم نے اس سے منع کیا ہے۔ اس لئے کہ اس سے انسان اپنے اختیار کو چھوڑ کر جبر کے طریقِ کار کو اختیار کرتا ہے۔ اور اپنی فہم و بصیرت کی رو سے فیصلے کرنے کے بجائے اپنے آپ کو اتفاقات (Chances) کے سپرد کر دیتا ہے جو وجہِ تذلیل انسانیت ہے۔ اسی لئے قرآن کریم کی رو سے قماربازی اور فال لینا ناجائز ہیں (قماربازی کے لئے دیکھئے عنوان ی۔ س۔ ر اور فال لینے کے لئے ز۔ ل۔ م)۔

قَسَمٌ*۔ دلیل و شہادت** جو حق اور باطل کو الگ الگ کرکے رکھ دے۔ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ (۵۶/۷۶) اگر تم سمجھ سکو تو یہ شہادت (جسے میں پیش کر رہا ہوں) ایک عظیم الشان شہادت ہے۔ اَقْسَمَ بِالشَّيْءِ۔ کسی چیز کو بطور دلیل و شہادت پیش کرنا (۹۰/۱)۔ لیکن یہی لفظ جب عام لوگوں کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنی قسم کھانے کے ہوجاتے ہیں۔ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ (۳۰/۵۵) مجرمین قسمیں کھائینگے۔ ابلیس کے متعلق ہے۔ وَ قَاسَمَهُمَآ (۷/۲۱)۔ اس نے ان دونوں سے قسم کھا کر کہا۔

مومنین کا شیوہ قسمیں کھانا نہیں بلکہ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل و شہادات پیش کرنا ہے۔ قسم توڑنے کا جو کفارہ مقرر کیا گیا ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ حتی الامکان قسمیں کھائی ہی نہ جائیں تاکہ بعد میں کفارہ ادا نہ کرنا پڑے۔

ق س و

قَسْوَةٌ* کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا سخت ہو جانا۔ پھر قَسْوَةٌ سے مراد قَسْوَةُ الْقَلْبِ ہوتی ہے، یعنی سنگدلی۔ حَجَرٌ قَاسٍ۔ ٹھوس اور سخت پتھر۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ ق۔ س۔ و کا خاصہ

*تاج۔ **غریب القرآن (مرزا ابو الفضل)۔

قوت اور اجتماع ہے**۔ آرْضٌ قَاسِيَةٌ۔ سخت زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہو۔ لَيْلَةٌ قَاسِيَةٌ۔ سخت اندھیری رات*۔

قرآن کریم میں ہے ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَالِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً (۲/۷۴)۔ ''پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ سو وہ پتھروں کی طرح ہیں بلکہ سختی میں ان سے بھی بڑھ کر''۔ اس میں قساوت کے معنی واضح ہیں۔ یعنی کَالْحِجَارَةِ۔ پتھر کی طرح سخت۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ سورۃ الحج میں ہے وَالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ (۲۲/۵۳)۔ جن کے دل سخت ہیں۔ سورۃ الزمر میں یہ کہکر اس کی تشریح کردی کہ یہ اُن لوگوں کی ضد ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ مَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (۳۹/۲۲)۔ اللہ جن کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ کردے۔ لہذا دل کی قساوت کے یہ معنی ہیں کہ بلا غور و فکر اپنی بات پر اڑے رہنے، اور دوسرے کی نہ سننے کی وجہ سے انسان میں حق کے سمجھنے اور اس کے قبول کرنے کی صلاحیت نہ رہے۔ اسی کا نام ضد، تعصب، ہٹ دھرمی ہے۔ (دیکھئے عنوان ش۔ ر۔ ح اور ص۔ د۔ ر)۔

ق ش ع ر

اَلْقَشَاعِیرُ وہ جو چھونے میں درشت اور کھردرا ہو*۔ اِقْشَعَرَّ جِلْدُهٗ۔ اس کی جلد پر کپکپی آگئی*۔ اقرب الموارد میں لکھا ہے کہ اس سے کنایۃً خوف بھی مراد لیا جاتا ہے۔

سورۃ زمر میں ہے تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ......(۳۹/۲۳)۔ اس سے ان کے بدن پر کپکپی چھا جاتی ہے۔

ق ص د

قَصْدٌ کے اصلی معنی ہیں ارادہ کرنا۔ توجہ کرنا۔ کسی چیز کی طرف بڑھنا اور اس کے لئے اُٹھ کھڑے ہونا۔ خواہ یہ اعتدال کے ساتھ ہو یا نہ ہو۔ اَلْقَصْدُ فِی الْاَمْرِ۔ کسی معاملہ میں میانہ روی اور اعتدال اختیار کرنا۔ مثلاً قَصَدَ فُلَانٌ فِیْ مَشْيِهٖ۔ اس نے اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کی۔ سَفَرًا قَاصِدًا (۹/۴۲) معتدل سفر۔ چنانچہ اَلْقَصْدُ و اَلتَّقْصِیْدُ کے معنی ہیں کسی چیز کو کاٹ دینا یا بیچ سے توڑ کر آدھا آدھا کر دینا*۔

---

*تاج۔ **العلم الخفاق۔

اِقْتَصَدَ فِیْ اَمْرِہٖ - وہ اپنے معاملہ میں مستقیم، معتدل اور میانہ رو رہا۔ ادھر اُدھر نہیں جھکا - اسی سے اَلْقَصْدُ کے معنی ہیں راستہ کا سیدھا اور واضح ہونا* - قرآن کریم میں ہے عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِیْلِ (۱۶/۹) - ٹھیک سیدھی اور مستقیم راہ کو واضح کرنا اللہ کے ذمے ہے - اس نے ایسا کردیا ہے اور وہی ایسا کرسکتا ہے - (لیکن لوگ اس سیدھی راہ کو چھوڑ کر ٹیڑھی راہیں اختیار کر لیتے ہیں) - اگر اس آیت میں علیٰ بمعنی الیٰ لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تک پہنچنے والا راستہ صرف درمیانی ہے - ادھر اُدھر کی ٹیڑھی راہیں نہیں -

راغب نے لکھا ہے کہ اَلْاِقْتِصَادُ دو طرح کا ہوتا ہے - ایک مطلقاً محمود ہوتا ہے جس میں افراط و تفریط کے دو سرے ہوتے ہیں اور ان کو چھوڑ کر درمیانی راہ اختیار کی جاتی ہے، جیسے - وَ اقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ (۳۱/۱۹) - اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو - یہ محمود ہے - اس لئے کہ رفتار میں نہ تیزی اچھی ہوتی ہے نہ سستی - لیکن دوسری قسم کے اقتصاد کے دو سروں میں سے ایک محمود اور دوسرا مذموم ہوتا ہے - مثلاً عدل اور ظلم کے بین بین رہنا۔ ایسے شخص کو جو ان دو سروں کے درمیان آتا جاتا رہے مُقْتَصِدٌ کہا جائیگا** -

راغب نے جو کچھ کہا ہے وہ ذرا وضاحت طلب بھی ہے اور غور طلب بھی - (مثلاً) ایک طرف اسراف ہے اور دوسری طرف بخل - یہ دونوں سرے (Extremities) مذموم ہیں - محمود راستہ ان دونوں کے بین بین ہے - یعنی جود و سخا - نہ بے جا اور فضول خرچ کرنا اور نہ ہی سب کچھ اپنی ذات کے لئے رکھ چھوڑنا - یہ اقتصاد (درمیانہ روی) قابلِ تعریف ہے - اب دوسری مثال لیجئے - ایک طرف حق ہے اور دوسری طرف باطل - ان میں سے صرف ایک سمت (حق) ہی محمود ہے - دوسری سمت (باطل) محمود نہیں - لہذا ان دونوں کے بین بین چلنا خوبی کی بات نہیں - قابل ستائش وہی ہے جو حق پر چلے، نہ وہ جو حق اور باطل کی درمیانی راہ چلے - حق اپنے مقام پر اٹل ہوتا ہے - جو شخص اس سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہٹ جاتا ہے وہ باطل پر چلا جاتا ہے -

ایک اور مثال لیجئے - ایک طرف عدل ہے اور دوسری طرف ظلم ہے - قابلِ ستائش وہ ہے جو عدل پر چلے - لیکن ایک شخص عدل اور ظلم کی درمیانی راہ چلتا ہے - یعنی کبھی عدل کرتا ہے کبھی ظلم کرتا ہے - یا نہ عدل کرتا ہے

*تاج - **راغب -

نہ ظلم کرتا ہے ۔ ایسے معاملات میں (Indifferent) رہتا ہے ۔ اس شخص کو اگر عدل کے پیمانہ سے ماپا جائے تو اس کا یہ عمل محمود نہیں ۔ لیکن اگر ظلم کے پیمانہ سے ماپا جائے تو یہ بہر حال ، ظالم سے بہتر ہوگا ۔ اس کی مثال ہمیں سورۃ فاطر میں ملتی ہے جہاں کہا ہے کہ ہم نے وراثت کتاب کے لئے اپنے بندوں میں سے ایک قوم کو چن لیا ۔ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۔ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ ...... (۳۵/۳۲) ۔ ''سو ان میں سے کوئی وہ ہے جو اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے ۔ کوئی میانہ رو ہے اور کوئی نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے'' ۔ (نیز دیکھئے ۵/۶۶) ۔ ظاہر ہے کہ ان تین گروہوں میں سے قابل ستائش (اور قرآنی معیار کے مطابق) سابق بالخیرات کا گروہ ہے ۔ اور ظلم کرنے والے بدتر ہیں ۔ لیکن ان کے بین بین ایک طبقہ ہے جو نہ بھلائی کے کاموں میں آگے بڑھتا ہے اور نہ ہی اس کا شمار گروہ اول میں ہوتا ہے ۔ یہ طبقہ ، گروہ اول سے ذرا اونچا ہوگا اور تیسرے گروہ سے بہر حال نیچے ۔ لیکن اس کی اس روش کو قرآن کریم کی رو سے قابل ستائش نہیں کہا جائیگا ۔ قرآنی معیار پر وہی پورے اترینگے جو ''سابق بالخیرات'' ہونگے ۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ یہ جو عام طور پر اسلام کے متعلق مطلقاً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اعتدال کا راستہ ہے اور اُمَّةً وَّسَطًا وہ قوم ہے جو درمیان کی راہ چلتی ہے، تو یہ صحیح نہیں ۔ اسلام، حق کا راستہ ہے، نہ کہ حق و باطل کی درمیانی راہ ۔ اور امۃ وسطًا ، حق پر چلنے والی جماعت ہے ، نہ کہ حق و باطل اور عدل و ظلم کے بین بین چلنے والی جماعت ۔ (وسط کے لئے دیکھئے عنوان و ۔ س ۔ ط) البتہ جہاں دونوں سمتیں مذموم ہوں (مثلاً اسراف اور بخل) وہاں اسلام درمیانی راہ کی تعلیم دیتا ہے کیونکہ وہی راہ محمود ہوتی ہے ۔

ق ص ر

اَلْقَصْرُ ۔ اَلْقِصَرُ ۔ طویل نہ ہونا ۔ کوتاہ اور مختصر ہونا ۔ اَلْقَصْرُ روکنا ، بند کرنا (کسی حد میں محدود رکھنا) ۔ قَصَرَ الشَّيْءَ ۔ کسی چیز کی لمبائی میں کمی کرنا ۔ قَصَرَ الشَّعْرَ ۔ بال چھوٹے کردئے* ۔ سورۃ نساء میں ہے اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ (۴/۱۰۱) تم صلٰوۃ کو مختصر کردو ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کا اپنی انتہا یا مقررہ حد تک نہ پہنچنا اور (۲) روکنا ۔ قید کرنا ۔ اِمْرَاَةٌ مَقْصُوْرَةٌ ۔ پردہ نشین عورت* ۔

*تاج و راغب ۔

اَلْمَقْصُوْرَۃُ ۔ محفوظ دیواروں سے گھرا ہوا وسیع گھر یا چھوٹا کمرہ*۔ قرآن کریم میں جنتی معاشرہ کی عورتوں کے متعلق ہے مَقْصُوْرَاتٌ فِی الْخِیَامِ (۵۵/۷۲) ۔ خیموں میں بہ حفاظت رکھی ہوئیں ۔ دوسری جگہ انہیں قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ کہا ہے (۳۸/۵۲) ۔ اپنی نظروں کو حیا کی وجہ سے سمٹا کر رکھنے والیاں* ۔ جو نگاہوں کو بے باک نہ ہونے دیں ۔ اَلْقَصْرُ ۔ موٹی موٹی (جلانے کی) لکڑیاں ۔ بڑے درختوں کی جڑیں* ۔ قرآن کریم نے جہنم کے شعلوں کو اس سے تشبیہ دی ہے (۷۷/۳۲) ۔ قَصَرَ عَنِ الْاَمْرِ ۔ کسی بات سے باز رہنا ۔ ابن السکیت نے کہا ہے کہ قَصَرَ عَنْہُ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص کسی کام کے کرنے سے عاجز ہو ۔ یعنی اسے کرنے کی قدرت نہ رکھے، اور اَقْصَرَ عَنْہُ ۔ جب اُسے کرنے کی قدرت تو رکھے لیکن اسکے باوجود باز رہے* ۔ سورۃ اعراف میں ہے ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ (۷/۲۰۲) ۔ وہ رکتے نہیں، کمی اور کوتاہی نہیں کرتے ۔

سورۃ فتح میں مُقَصِّرِیْنَ آیا ہے (۴۸/۲۷) ۔ یعنی بال کتروانے والے ۔ قَصَرَ سَہْمُہٗ عَنِ الْھَدَفِ ۔ اس کا تیر نشانے تک نہ پہنچ سکا* ۔ اس سے تَقْصِیْرٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں جس کا استعمال ہمارے ہاں عام طور پر ہوتا ہے ۔ اور ''قصور'' کے معنی بھی ۔

ق ص ص

قَصَّ اَثَرَہٗ یَقُصُّ قَصًّا وَقَصَصًا ۔ کسی کے پیچھے پیچھے اس کے نقوش قدم پر چلنا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا پیچھا کرنے اور جستجو کے ہوتے ہیں ۔ قرآن کریم میں دیکھئے (۱۸/۶۴ ; ۲۸/۱۱)

قَصَّ عَلَیْہِ الْخَبَرَ قَصَصًا ۔ اسے وہ خبر بتا دی ۔ اسے اس پر مطلع کر دیا* ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْکَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ (۱۲/۳) ۔ ہم تجھے بہترین انداز سے واقعات بتاتے ہیں ۔ اَلْقَاصُّ ۔ قصہ گو ۔ ایک حدیث میں ہے اِنَّ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ لَمَّا قَصُّوْا ھَلَکُوْا ۔ بنی اسرائیل جب قصہ گوئی میں پڑ گئے تو ہلاک ہو گئے ۔ یا جب انہوں نے (خدا کی سند کو چھوڑ کر) اسلاف کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا تو ہلاک ہو گئے* ۔ (یہی مسلمانوں کے ساتھ ہوا) ۔ اَلْقِصَّۃُ ۔ معاملہ ۔ خبر ۔ واقعہ* ۔

---

*تاج ۔

قَصَّ الشَّعْرَ ۔ اس نے بال کاٹے ۔ اَلْمِقَصُّ ۔ قینچی کو کہتے ھیں*۔

اَلْقِصَاصُ ۔ مجرم کا اسطرح پیچھا کرنا کہ اسے اس کے جرم کی سزا مل کر رہے ۔ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دیدینا ۔ قانون عدل کا مجرم کے پیچھے پیچھے چلنا ۔ راغب نے اس کے معنے خون کے پیچھے خون بہا (بدلہ) کا آنا کئے ھیں ۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو جرم قتل کی سزا کے سلسلہ میں استعمال کیا ہے ۔ چونکہ یہ ایک اہم موضوع ہے اس لئے اس کے متعلق ہم ذرا تفصیل سے گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ھیں ۔

قرآن کریم کی رو سے انسانی زندگی کو اسقدر اھمیت حاصل ہے کہ اس نے کہدیا کہ مَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً ۔ جس نے کسی متنفس کو مار ڈالا، بجز اس کے کہ اسے کسی جان کے بدلے (جرم قتل کی سزا میں) مارا گیا ھو یا ملک میں فساد برپا کرنے کی سزا کے طور پر، تو یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوع انسان کو قتل کر ڈالا ۔ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعاً (۵/۳۲)۔ اور جس نے کسی ایک متنفس کو موت سے بچا لیا تو اس نے گویا تمام انسانوں کو موت سے بچایا ۔ اس سے ظاھر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

(۱) قتل بہت بڑا سنگین جرم ہے ۔

(۲) جو شخص کسی دوسرے شخص کو قتل کر دے، یا ملک میں فساد برپا کر دے، اُسے قتل کیا جا سکتا ہے ۔

فساد فی الارض (بغاوت) کے متعلق (۵/۳۳) میں احکام دیئے گئے ھیں لیکن چونکہ یہ موضوع اس وقت زیر بحث نہیں اس لئے ہم اس سے آگے بڑھ کر انفرادی قتل کے جرم کیطرف آتے ھیں ۔

جرم قتل کے متعلق پہلی آیت سورہ بقرہ میں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى (۲/۱۷۸)۔ "تم پر مقتولین کے بارے میں قصاص فرض قرار دیا گیا ہے" ۔ اس آیت میں لفظ قصاص سے مراد عام طور پر سزائے موت لی جاتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، قِصَاصٌ کے معنی کسی کے پیچھا کرنے کے ھیں ۔ لہذا قصاص کا مطلب ہوا مجرم کا پیچھا کرنا ۔ اس کا تعاقب کرنا ۔ اسے ایسے ہی نہ چھوڑ دینا کہ وہ اپنے کئے کی سزا نہ پا سکے ۔ اس آیت میں خطاب

*تاج ۔

یـاآیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (جماعت مومنین) سے ہے۔ جس معاشرہ میں اجتماعی قوانین رائج نہ ہوں، اس میں جرائم اور اس کے بدلے کو افراد پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص نے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ اب یہ چیز مقتول کے وارثوں کے لئے ہے کہ وہ مجرم کا پیچھا کریں۔ اگر ان میں ہمت ہو تو اسے پکڑ کر اس سے بدلہ لے لیں۔ اور اگر مجرم ان سے بالادست ہو تو پھر صبر شکر کرکے بیٹھ رہیں۔ لیکن قرآن کریم ایک اجتماعی نظام پیش کرتا ہے اس لئے اس میں جرم کا بدلہ لینا افراد پر نہیں چھوڑا گیا۔ وہ معاشرہ سے کہتا ہے کہ جرم کا ارتکاب خود معاشرہ کے خلاف ہوا ہے (کسی فرد کے خلاف نہیں ہوا) اس لئے یہ معاشرہ کا فریضہ ہے (نہ کہ مقتول کے وارثین کا انفرادی کام) کہ وہ مجرم کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ معاشرہ پر فرض قرار دیاجاتا ہے کہ وہ مقتول کے بدلہ لینےکا انتظام کرے۔ دور حاضر کی اصطلاح میں کہا جائیگا کہ قرآن کریم نے جرم قتل کو "قابل دست اندازی پولیس" قرار دیا ہے جس میں مستغیث خود حکومت ہوتی ہے (Crown vs ....)۔ لہذا آیت کے اتنے ٹکڑے کے معنی یہ ہوئے کہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جرم قتل کے مرتکب کا پیچھا کرکے اس سے بدلہ لے۔

اس سے آگے ہے اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی۔ اس حصہ کا تعلق بھی سزا سے نہیں بلکہ اس میں اس اہم اصول کو بیان کیا گیا ہے کہ اس باب میں مجرم اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے۔ مجرم خواہ کتنا ہی بڑا اور مقتول کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، بدلے کے معاملہ میں دونوں کو یکساں سمجھا جائے۔ اس لئے کہ ہر انسانی زندگی (وہ مرد آزاد کی ہو یا غلام کی۔ عورت کی ہو یا مرد کی) یکساں قیمتی ہے۔

خونِ شہ رنگیں تر از مزدور نیست

اسے پھر دھرا دینا ضروری ہے کہ آیت کے اس حصے میں اسلام کا اصول مساوات بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اس سے یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی مرد آزاد (حُرّ) قتل کر دیا گیا ہے تو اس کے بدلے کسی مرد آزاد (حُرّ) کو قتل کیا جائے، خواہ قاتل کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر مقتول غلام ہے تو کسی غلام کو پھانسی چڑھایا جائے، خواہ قاتل، مرد آزاد ہی کیوں نہ ہو۔ یہ مفہوم بالبداہت غلط ہے۔ قرآن کریم نے یہاں ہام اصولِ مساوات پر زور دیا ہے اور اس کے لئے اصولی انداز بیان اختیار کیا ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ سزا کے معاملہ میں قاتل اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی خیال نہ کیا جائے۔

اس کے بعد ہے فَمَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنْ اَخِیْہِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَیْہِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِکَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَرَحْمَۃٌ ۔ جس شخص کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معاف دیدی جائے تو اسے چاہیئے کہ قاعدے کے مطابق اس کی پیروی کرے اور حسن کارانہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے۔ یہ تمہارے نشو ونما دینے والے کیطرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ ظاہر ہے کہ سزا کا اس میں بھی ذکر نہیں۔ سزا میں سے کچھ معاف کر دینے کا ذکر ہے۔ ''کچھ معاف کر دینا'' ۔ (شیءٌ) اس کی دلالت کرتا ہے کہ اس کا تعلق سزائے موت سے نہیں۔ اس لئے کہ سزائے موت میں سے ''کچھ معاف کر دینے'' (اور کچھ باقی رہنے دینے) کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ''کچھ معاف کر دینے''کی شکل اسی صورت میں پیدا ہوسکتی ہے کہ سزا، مال (جرمانہ) کی ہو۔ اسے دیت یا خون بہا کہا جاتا ہے۔

جرم قتل کی سزا کا ذکر سورہ نساء میں ہے جہاں جرم کی مختلف نوعیتوں اور ان کے مطابق سزا کا بیان ہے۔ ارشاد ہے مَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ یَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۔ کسی مومن کے یہ شایان ہی نہیں کہ کسی دوسرے مومن کو قتل کر ڈالے۔ ہاں غلطی سے ایسا ہو سکتا ہے۔ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ مُّؤْمِنَۃٍ وَّدِیَۃٌ مُّسَلَّمَۃٌ اِلٰٓی اَھْلِہٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّصَّدَّقُوْا ۔ ''اور جو کوئی غلطی سے کسی مومن کو مار ڈالے تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور خون بہا ادا کرے جسے اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائیگا۔ بجز اس کے کہ وہ معاف کر دیں۔ یہاں سے بات صاف ہو گئی کہ قتل خطا (غیر ارادی طور پر، بھولے سے قتل) کی سزا موت نہیں، بلکہ خون بہا ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے گا۔ خون بہا کی جو رقم عدالت مقرر کرے، مقتول کے وارثوں کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس میں سے کچھ (یا سب کا سب) معاف کر دیں۔ لہذا سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۸ میں جو فَمَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنْ اَخِیْہِ شَیْءٌ کہا گیا ہے تو وہ قتل خطا کی صورت میں ہے جس کی سزا خون بہا ادا کرنا ہے۔

سورہ نساء کی آیت ۹۲ کے باقیماندہ حصہ میں بتایا گیا ہے کہ اگر مقتول اس قوم سے متعلق ہو جو تمہاری دشمن ہو یا اس سے جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس صورت میں کیا سزا ہوگی (سزا اس صورت میں بھی خون بہا ہی مقرر کی گئی ہے)۔

اس سے اگلی آیت میں ہے وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُہٗ جَہَنَّمُ خٰلِدًا فِیْہَا وَغَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَلَعَنَہٗ وَاَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیْمًا ۔ (۴/۹۳) اور جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کر ڈالے تو اس

کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہیگا اور اس پر اللہ کا غضب ہے ، اور اس کی لعنت ۔ اور اس کے لئے سخت سزا تیار کی گئی ہے "۔ یہاں قرآن کریم نے قتل عمد کے لئے انتہائی سزا بتائی ہے۔ اس میں دیت (خون بہا) نہیں ہے ۔ البتہ قتل عمد میں بھی جرم کی نوعیتیں مختلف ہو سکتی ہیں ۔ مثلاً ایک شخص نہایت ٹھنڈے دل سے سوچتا ہے کہ اگر فلاں آدمی کو قتل کر دیا جائے تو اس کی تمام جائیداد مجھے مل جائیگی ۔ وہ اس کے لئے اسکیم بناتا ہے اور سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق اسے قتل کر دیتا ہے ۔ اس قسم کے (Cold-Blooded Murder) کی سزا سخت ترین ہونی چاہیئے ۔ اس کے برعکس ایک شخص دیکھتا ہے کہ کسی نے اس کی بیوی کی عصمت پر حملہ کیا ہے ۔ وہ غیرت میں آکر اسے فوراً قتل کر دیتا ہے ۔ قتل عمد یہ بھی ہے لیکن اس میں اور اول الذکر میں بڑا فرق ہے ۔ اس لئے ہر قتل عمد کی سزا ایک جیسی نہیں ہوگی ۔ جرم کی نوعیت اور احوال و ظروف (Circumstances) کے اختلاف سے سزا میں اختلاف ہوگا ۔ اس سے قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ قرآن کریم نے قتل عمد کی سزا میں جَزَاؤُهٗ جَهَنَّمُ کے بعد اللہ کا غضب ۔ اس کی لعنت ۔ اور سخت سزا کا جو ذکر کیا ہے تو یہ سزاؤں کی مختلف نوعیتیں ہیں ۔ مثلاً عبور دریائے شور ۔ قید تنہائی ۔ قید بامشقت ۔ معاشرہ کے حقوق سے محروم کر دینا (Disqualify) (لعنت کے بھی معنی ہیں) وغیرہ وغیرہ ۔

ممکن ہے کہدیا جائے کہ یہاں سزائے جہنم کا ذکر ہے (جس کا تعلق آخرت سے ہے اس دنیا سے نہیں) ۔ لیکن دوسری جگہ قرآن کریم نے اس کی صراحت کر دی ہے کہ قتل عمد کی سزا بالعموم ، موت (قتل) ہے ۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے فَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۔ جس جان کا مارنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے (یعنی بے گناہ کا قتل) اُسے قتل مت کرو ۔ بجز اس کے کہ انصاف کا تقاضا ایسا ہو ۔ فَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا ۔ جو ظلم سے قتل کیا جائے تو قاتل یہ نہ سمجھے کہ مقتول کے وارثوں کا کوئی حمایتی اور مدد گار نہیں ، اس لئے میں اب جس طرح جی چاہے دندناتا پھروں ، مجھے کوئی پوچھنے والا ھی نہیں ۔ اسے اس زعم باطل میں نہیں رہنا چاہیئے ۔ مقتول کے ورثاء کے لئے ہم نے معاشرہ کو "سلطان" بنایا ہے ۔ معاشرہ (نظام حکومت) کا غلبہ و اقتدار (سلطان) مقتول کے وارثوں کا پشت پناہ ہوگا ۔ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (۱۷/۳۳) ۔ اس طرح یہ معاشرہ خود مقتول کی (اور اس کے وارث کی) مدد کرے گا اور قاتل سے بدلہ لے کر چھوڑے گا ۔ لیکن معاشرہ کو اس کی بھی تاکید کر دی گئی ہے کہ

قاتل کو سزائے موت دینے میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ۔ مثلاً ایک شخص نے جان بوجھ کر کسی شخص کے خاندان کے چار پانچ افراد کو بے رحمی سے قتل کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اثبات جرم کے بعد عدالت کو قاتل کے خلاف سخت غصہ ہوگا۔ لیکن عدالت کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ قاتل کے خاندان کے چار پانچ افراد کو اسی طرح قتل کر دے۔ یہ '' اسراف فی القتل '' ہوگا۔

نہ ہی آیت کے اس ٹکڑے (فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا) کے یہ معنی ہیں کہ مقتول کے وارث کو اس کا اختیار ہے کہ وہ جا کر قاتل کو خود قتل کر دے۔ بالکل نہیں۔ قصاص کا حکم معاشرہ کے لئے ہے۔ افراد متعلقہ کے لئے نہیں۔ قتل کا جُرم، معاشرہ (نظام حکومت) کے خلاف جرم ہے۔ انفرادی جرم نہیں۔ مقتول کے وارثوں کی حیثیت (زیادہ سے زیادہ) استغاثہ کے گواہوں کی ہوگی۔ مستغیث کی نہیں ہوگی۔ مستغیث خود حکومت ہوگی۔ لہذا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ کا حکم بھی معاشرہ (عدالت) کے لئے ہے۔

اس آیت سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔

۱۔ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا سے واضح ہے کہ یہاں قتل عمد کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ قتل خطا میں، قاتل کو ظالم اور مقتول کو مظلوم نہیں کہا جائے گا۔ جس شخص سے محض سہواً، نادانستہ، بھول چوک میں، غلطی سے کسی کا قتل ہو جائے وہ ظالم نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنے کئے پر خود نادم ہوتا ہے۔ لہذا مقتول اسی صورت میں مظلوم کہلائے گا جب اسے کسی نے عمداً قتل کیا ہو۔

۲۔ معاشرہ کے طاقتور لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اپنی قوت کے بل بوتے پر جسے چاہیں قتل کر ڈالیں۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ معاشرہ کا پورا غلبہ و اقتدار (سلطان) مقتول کے وارث کا پشت پناہ ہوگا، اور اس طرح قاتل سے بدلہ لینے میں اس کا حامی و مددگار بنے گا۔

۳۔ قتل عمد کی سزا قتل (موت) ہے۔ لیکن اس میں حد سے نہیں بڑھا جائے گا۔

اس آیت کو جب سورہ نساء کی آیت فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ سے ملا کر پڑھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہاں جہنم کی سزا سے مراد سزائے موت ہے۔ اور '' اللہ کا غضب و لعنت اورعذاب عظیم '' وغیرہ اس کے ساتھ، یا اس سے الگ، یا اس سے نچلے درجہ پر، دوسری سزائیں ہیں جن کی نوعیت معاشرہ خود متعین کرے گا۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

(i) قتل کا جرم انسانیت کے خلاف سنگین جرم ہے۔

(ii) جرم قتل، افراد کے خلاف جرم نہیں خود معاشرہ کے خلاف جرم ہے۔ لہذا، مجرم کا پیچھا کرکے اسے سزا دینا، مقتول کے وارثوں کا کام نہیں بلکہ نظام حکومت کا فریضہ ہے۔

(iii) اس بات کا فیصلہ عدالت کرے گی کہ قتل بلا ارادہ (خطا) تھا یا قتل عمد۔

(iv) قتل خطا کی صورت میں سزا خون بہا (دیت) ہوگی۔ اس کے لئے مقتول کے وارثوں کو اختیار ہوگا کہ وہ مجرم کو بالکلیہ معاف کر دیں یا خون بہا کی رقم میں سے کچھ کم کر دیں۔

(v) قتل عمد کی سزا دیت نہیں اس لئے اس میں مقتول کے وارثوں کا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اس کی سزا عدالت کی طرف سے مقرر ہوگی جو سزائے موت (یا جرم کی نوعیت اور حالات کے پیش نظر) اس سے کم درجہ کی سزا (قید وغیرہ) ہوگی۔

(vi) یہ جو کہا گیا ہے کہ "کسی مومن کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کر دے۔ مگر غلطی سے"۔ تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مومن غیر مومنوں کو یونہی قتل کرتا پھرے۔ اس کی اسے کھلی چھٹی ہے۔ قطعاً نہیں۔ مومن و غیر مومن، کسے باشد، ہر ایک کی زندگی قرآن کریم کی رو سے یکساں قیمتی ہے (۳۲/۵)۔ اس آیت میں مومنین کی اس خصوصیت کا ذکر ہے کہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ایک بھائی کو یہ زیب ہی نہیں دیتا کہ وہ دوسرے بھائی کو قتل کر دے۔ ہاں ایسا غلطی سے ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اسے خون بہا ادا کرنا ہوگا تاکہ آئندہ ایسی غلطی سے محتاط رہے۔ لیکن اگر کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو عمداً قتل کر دے تو اس کی سزا سخت ہوگی۔

(vii) قرآن کریم نے انسانی زندگی کی اس قدر و قیمت اور اہمیت بتانے کے باوجود اسے تسلیم کیا ہے کہ بالحق زندگی لی جا سکتی ہے۔ یعنی جہاں حق و انصاف کا تقاضا ہو، یعنی بے گناہ کے قتل عمد کی سزا کے طور پر، یا دشمن سے جنگ میں، یا نظام اسلامی کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو فساد سے روکنے کے لئے، وغیرہ۔ لیکن اس کا فیصلہ بھی معاشرہ کرے گا (نہ کہ

افراد از خود) کہ بالحق کسے قتل کیا جا سکتا ہے ۔ لہذا مقتول مظلوم کے وارثوں کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ از خود قاتل کو قتل کر دیں ۔ یہ ہے وہ قِصَاص جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس میں تمہاری اجتماعی زندگی کا راز پوشیدہ ہے (۲/۱۷۹)

ق ص ف

قَصَفَ یَقْصِفُ ۔ قَصْفًا ۔ کسی چیز کو توڑنا ۔ رَعْدٌ قَاصِفٌ ۔ سخت آواز والی گرج ۔ اَلْقَصِیْفُ ۔ درخت کے خشک ہو کر ٹوٹ جانے والے ٹکڑے ۔ نیز ہر وہ چیز جو آدھوں آدھ سے دو حصوں میں ٹوٹ گئی ہو ۔ عَصَفَتِ الرِّیْحُ فَقَصَفَتِ السَّفِیْنَةَ ۔ تیز آندھی چلی اور اس نے کشتی کو توڑ دیا * ۔ قرآن کریم میں قَاصِفًا مِنَ الرِّیْحِ (۱۷/۶۹) انہی معنوں میں آیا ہے ۔ یعنی ایسی تیز ہوا جو (کشتی کو) توڑ ڈالے ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ اَلْعَوَاصِفُ وہ ہوائیں ہیں جو میدانوں اور صحراؤں میں طوفان برپا کر دیں اور اَلْقَوَاصِفُ وہ ہوائیں جو سمندروں میں تلاطم پیدا کر دیں ۔

ق ص م

قَصَمَ یَقْصِمُ قَصْمًا ۔ کسی چیز کو توڑ دینا (ابن فارس) ، خواہ وہ ٹوٹ کر الگ ہو جائے یا نہ ہو** ۔ ھُوَ اَقْصَمُ الثَّنِیَّةِ ۔ اس کا سامنے کا دانت آدھا ٹوٹا ہوا ہے ۔ سَیْفٌ قَصِیْمٌ ۔ وہ تلوار جس کی دھار ٹوٹی ہوئی ہو** ۔ اسی سے کہتے ہیں قَصَمَهُ اللّٰهُ ۔ خدا اسے ذلیل کرے** ۔ سورۂ انبیاء میں ہے وَ کَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْیَةٍ (۲۱/۱۱) ۔ کتنی بستیاں تھیں جنہیں ہم نے ذلیل و خوار کر دیا ۔ یعنی انہیں ہم نے تباہ و برباد کر دیا ۔ ان کا شیرازہ بکھیر دیا (ان کے جرائم کی پاداش میں) ۔

ق ص و

قَصَا عَنْهُ ۔ وہ اس سے دور ہوا ۔ قَصَا الْمَکَانُ ۔ جگہ دور ہو گئی (ابن فارس) ۔ قَصِیٌّ ۔ دور ، بعید ۔ جمع اَقْصَاءٌ ۔ اَلْقُصْوٰی ۔ آخری حد تک دور ۔ انتہائی بعید*** ۔ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰی (۸/۴۲) ۔ دور کے کنارے پر ۔ مَکَانًا قَصِیًّا (۱۹/۲۲) ۔ دور جگہ*** ۔ اَلْمَسْجِدِ الْاَقْصَا (۱۷/۱) بہت دور کی مسجد ۔ عام طور پر اس سے مراد بیت المقدس لیا جاتا ہے ۔ لیکن ہمارے نزدیک اس سے مراد

* تاج ۔ **تاج و محیط و راغب ۔ ***تاج و کتاب الاشتقاق ۔

مدینہ منورہ ہے جو مکہ سے قریب تین سو میل دور ہے، اور جس کی طرف نبی اکرم ؐ رات کے وقت ہجرت کر کے تشریف لے گئے تھے اور جسے اب اس جماعت کی سجدہ گاہ بننا تھا ۔ یعنی ان کے نظام اطاعت و فرماں پذیری کا مرکزی مقام ۔

ق ض ب

قَضَبَہٗ ۔ اس نے اسے کاٹ دیا ۔ فَانْقَضَبَ ۔ چنانچہ وہ کٹ گیا ۔ قُضَابَۃُ الشَّیْءِ ۔ جو حصہ کسی چیز سے کاٹ دیا جائے ۔ جو کچھ درخت کی شاخوں سے کٹ کر گرے ۔ اَلْقَضْبُ ۔ وہ شاخیں جو کسی درخت سے تیر اور کمان بنانے کے لئے کاٹی جائیں ۔ یا ایک درخت جس کی لکڑی تیر کمان بنانے کے کام آتی ہے ۔ یا ہر لمبا اور پھیلا ہوا درخت * ۔ لیکن راغب نے لکھا ہے کہ درخت کی شاخوں کو تَضِیْبٌ اور سبزیوں ترکاریوں کی شاخوں کو قَضْبٌ کہا جاتا ہے ** ۔ چنانچہ قرآن کریم میں عِنَبًا وَّقَضْبًا (۲۸/۸۰) آیا ہے ، تو اس کے معنی ترکاریوں کے ہیں ۔ فراء نے کہا ہے کہ اہل مکہ ایک چارہ (قَتٌّ) کو قَضْبٌ کہتے تھے * ۔

ق ض ض

قَضٌّ یَقُضُّ ۔ قَضًّا ۔ کسی چیز کو کوٹنا اس میں سوراخ کرنا ۔ قَضَّ الْوَتِدَ ۔ اس نے میخ کو اکھاڑ لیا ۔ اَلْقَضَّۃُ ۔ چھوٹی کنکریاں ۔ کنکریوں میں سے جو کچھ ٹوٹ کر گرتا ہے ۔ اِنْقَضَّ الْجِدَارُ ۔ دیوار میں شگاف آگیا مگر وہ ابھی تک گری نہیں *** ۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے اور خود تاج میں بھی ہے کہ اس کے معنی ہیں دیوار گر گئی ۔ قرآن کریم میں ہے جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ (۱۸/۷۷) دیوار جو گرا ہی چاہتی تھی ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی تین ہیں ۔ (۱) کسی چیز کا نیچے کی طرف گرنا ۔ (۲) چیز میں کھردرا پن اور ناہمواری ہونا ۔ (۳) چیز میں سوراخ کرنا ۔ جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے سورہ کہف میں یہ لفظ گرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔

ق ض ی

اَلْقَضَاءُ کے مختلف معنی آتے ہیں ۔ لیکن ان تمام معانی کی اصل کسی چیز کا منقطع ہونا ، ختم ہو جانا ، اور مکمل ہو جانا ہے * ۔ ابن فارس نے کہا ہے

*تاج **راغب ۔ ***تاج و محیط و راغب ۔

کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو محکم اور مضبوط کرنا اور اسے اُس کی جہت پر نافذ کرنا ہیں - یعنی جس طرف اسے جانا چاہئیے اُدھر لے جانا - راغب نے القضاء کے معنے جدا کرنا اور قطع کرنا لکھے ہیں - قَدْ قَضٰی دَیْنَہٗ کے معنے ہیں اس نے اپنے قرض کو پورا پورا چکا دیا اور اس طرح قرض خواہ کا جو معاملہ اس کے ساتھ تھا اسے ختم کر دیا - اسی لئے اس کے معنے حتمی اور آخری فیصلہ کے آتے ہیں - چنانچہ اَلْقَضِیُّ موت کو کہتے ہیں - قَضٰی اِلَیْہِ کے معنی ہیں معاملہ کو اس تک پہنچا دیا *۔

اَلْقَضَاءُ کے معنی کسی چیز کو پورے طور پر بنا دینا اور اس کا اندازہ مقرر کر دینا بھی ہیں - نیز اس کے معنی کسی بات کو بالکل واضح کر دینا بھی ہیں * -

اَلتَّقَاضِیْ کے معنی ، طلب کرنے کے ہیں * -

قرآن کریم میں خدا کے متعلق ہے - اِذَا قَضٰی اَمْرًا (۲/۱۱۷) - جب وہ کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے - سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ دربار فرعون کے ساحرین نے فرعون سے کہا کہ فَاقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ (۲۰/۷۲) جو کچھ تو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر دے۔

سورۂ قصص میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے قبطی کو مکا مارا - فَقَضٰی عَلَیْہِ (۲۸/۱۵) - اس کا کام تمام کر دیا - ذرا آگے ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے خسر سے کہا کہ اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ (۲۸/۲۸) - ان دونوں مدتوں میں سے جو مدت بھی میں پوری کر دوں - سورہ زخرف میں یہ لفظ مٰکِثُوْنَ کے مقابلہ میں آیا ہے جس کے معنی باقی رہنے کے ہیں - اس لئے یَقْضِ (۴۳/۷۷) کے معنی ختم کر دینے کے ہوں گے ۔

چونکہ انسانی دنیا کے متعلق خدا کے فیصلے انسانوں تک وحی کے ذریعے پہنچتے ہیں اس لئے وَقَضَیْنَا اِلَیْہِ (۱۵/۶۶) کے معنی ہیں ”ہم نے اس کی طرف وحی کی“ یا وحی کے ذریعے اپنا قطعی فیصلہ بتا دیا - اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل میں ہے - وَقَضَیْنَا اِلٰی بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْکِتٰبِ (۱۷/۴) ہم نے بنی اسرائیل کی طرف اس فیصلہ کو بذریعہ وحی ، کتاب میں بھیجدیا تھا - اسی طرح ذرا آگے چل کر ہے - وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ (۱۷/۲۳) تیرے رب نے وحی کے ذریعے اپنے اس حکم کو انسانوں تک پہنچا دیا کہ اس کے قانون کے علاوہ اور کسی کی اطاعت نہ کریں ۔

* تاج -

سورہٴ قصص میں ہے ۔ اِذْ قَضَیْنَآ اِلٰی مُوْسیٰ (۲۸/۴۴) ۔ جب ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی ۔

سورہٴ حٰمٓ سجدہ میں ہے فَقَضٰھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰاتٍ (۴۱/۱۲) ۔ "سو انہیں متعدد کرّے بنا دیا"۔ یہاں اس کے معنی ، بنانا ، مکمل کرنا ، اور اندازہ مقرر کرنا ہیں۔ سورۃ اَنْعَام میں ہے ۔ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰی اَجَلًا (۶/۲) ۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہاری تخلیق کی ابتداء مٹی سے کی اور پھر ایک میعاد ٹھہرا دی ۔ یعنی اس کا فیصلہ کر دیا کہ نوعِ انسان کو زمین پر ایک مدت تک رہنا ہے ۔ [وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ (۲/۳۶) ۔ تمہارے لئے زمین میں ایک مدت تک ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے] ۔

سورہٴ مومن میں ہے وَاللّٰہُ یَقْضِیْ بِالْحَقِّ (۴۰/۲۰) ۔ اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے ۔ سورۃ مریم میں ہے ۔ اَمْرًا مَّقْضِیًّا (۱۹/۲۱) فیصلہ شدہ بات طے شدہ معاملہ ۔ مقررہ قانون ۔

ق ط ر

اَلْقَطْرُ ۔ بوندیں ۔ قطرے (واحد قَطْرَۃٌ ہے) یا جو چیز قطرہ قطرہ جمع ہو کر بنے۔ بارش (کا پانی) ۔ سَحَابٌ قَطُوْرٌ ۔ بہت برسنے والا بادل ۔ اَلْقِطْرُ اَلْقَطِرُ ۔ پگھلا ہوا تانبہ ۔ یا تانبہ کی کوئی قسم * (۱۸/۹۶) ۔ اَلْقَطِرَانُ ۔ اَلْقَطْرَانُ ۔ رال ۔ ایک قسم کا چکنا سیال مادہ جو صنوبر وغیرہ کے پھلوں سے نچوڑے ہوئے رس کو پکا کر تیار کیا جاتا ہے* (۱۴/۵۰) ۔

اَلْقُطْرُ ۔ کنارہ ۔ جانب ، جمع اَقْطَارٌ (۳۳/۱۴) ۔ اطراف و جوانب ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس باب کے الفاظ کسی قاعدے کے ماتحت نہیں ہیں ۔

ق ط ط

اَلْقَطُّ ۔ کسی چیز کو چوڑائی میں کاٹنا (ابن فارس نے اس میں تیزی سے کاٹنے کا اضافہ کیا ہے) ۔ طول میں کاٹنے کو قَدٌّ کہتے ہیں ۔ اِنْقَطَّ الشَّیْئُ ۔ چیز کٹ گئی ۔ اَلْقِطُّ ۔ معین حصہ (کاٹ کر الگ کیا ہوا) ۔ صحیفہ جس پر کسی آدمی کو دیا جانے والا انعام لکھا ہو ۔ ہر لکھا ہوا صحیفہ ۔ بعض نے کہا ہے کہ کتابِ محاسبہ کو قِطٌّ کہتے ہیں** ۔

*تاج ۔ **تاج و راغب ۔

قرآن کریم میں ہے۔ رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا (۳۸/۱۶)۔ جہاں اس کے معنی حصہ یا حساب نامہ کے ہیں۔ یعنی "اے ہمارے نشو و نما دینے والے! ہمارا حساب چکا دے۔ یعنی ہمارا حصہ ہمیں جلدی سے دے دے۔ اس میں عجلت کردے"۔

ق ط ع

قَطَعَ الشَّیْءَ کے معنی ہیں اس چیز کو کاٹ دیا۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ لفظ ایسی چیزوں کے کاٹنے پر بھی بولا جاتا ہے جنہیں ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ جیسے قَطَعَ اللَّحْمَ۔ گوشت کاٹنا۔ اور ان چیزوں پر بھی جو معنوی طور پر کٹ جاتی ہیں، جیسے قَطَعَ السَّبِیْلَ۔ ڈاکہ مار کر راستہ کی آمد و رفت کاٹ دینا۔ قَطَعَ لِسَانَہٗ۔ کسی پر احسان کرکے اس کی زبان بند کر دینے* کو بھی کہتے ہیں**۔ قرآن کریم میں یَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ (۲/۲۷) میں، یہی معنوی انقطاع مراد ہے۔ یعنی انسانیت کے وہ رشتے جنہیں خدا نے ایک دوسرے کے ساتھ ملائے رکھنے کا حکم دیا تھا انہیں کاٹ کر الگ الگ کر دیتے ہیں۔ نوع انسان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔

قَطَعَ خَصْمَہٗ بِالْحُجَّةِ۔ اس نے دلائل و براہین سے فریق مقابل کو لا جواب کر دیا*۔ قَطَعَ رَحِمَہٗ قَطِیْعَةً۔ اس نے اپنے رشتہ داروں سے تعلقات منقطع کر لئے۔ چنانچہ اُقْطُوْعَةٌ اس چیز کو کہتے ہیں جو قطع تعلقات کی نشانی کے طور پر بھیجی جائے (ابن فارس)۔ قَطَعَ عُنُقَ دَابَّتِهٖ، کے (یہ معنی نہیں کہ اس نے اپنے جانور کا گلا کاٹ دیا۔ بلکہ مجازاً اس کے) معنی ہیں اس نے اپنے جانور کو فروخت کر دیا*۔ قُطِعَتْ لِسَانُہٗ کے معنی ہیں کہ وہ زبان جو پہلے قینچی کی طرح چلتی تھی اب اس میں وہ بات نہیں رہی*۔ قُطِعَتْ یَدُہٗ کے معنی ہیں اس کے ہاتھ میں کوئی ایسی بیماری ہو گئی کہ ہاتھ بیکار ہو گیا*۔ چنانچہ سورۃ یوسف میں جہاں ہے قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ (۱۲/۳۱) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر

---

*تاج۔ **غزوۂ حنین کا واقعہ ہے کہ حضورؐ نے مال غنیمت کی تقسیم کے وقت عباس بن مرداس کو چالیس اونٹ دئے۔ وہ بہت غصہ ہؤا اور ایک قصیدہ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا جاؤ اور جسطرح ہو میری طرف سے اس کی زبان کاٹ لو۔ صحابہؓ گئے اور وہ جتنے میں راضی ہؤا اُسے دیکر راضی کر لیا۔ یہ تھا مطلب قطع لسان کا۔ (بحوالہ اصح السیر عبدالرؤف دانا پوری۔ صفحہ ۲۹۶)۔

الگ کر کے پھینک دئیے ۔ اس کے معنی ہیں ان کے ہاتھ کام کرنے سے رک گئے ۔ (یا فرط حیرت میں انہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لئے ۔ ہمارے ہاں بھی ہاتھ کاٹ لینے سے مراد ہاتھ زخمی کر لینا ہوتا ہے) ۔ اسی طرح قُطَّاعُ الطَّرِيْقِ ۔ ڈاکوؤں کو کہتے ہیں جو راستہ روک کر راہزنی کرتے ہیں*۔ قرآن کریم نے (قوم لوط کے ضمن میں) اسے قَطْعُ السَّبِيْلِ کہا ہے (۲۹/۲۹) ۔ یا اس آیت میں تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ کے معنی ہیں خلاف وضع فطری سے افزائش نسل انسانی کے راستے بند کر دینا ۔ قُطِعَ بِہٖ کے معنی ہیں اس کے اور اس کی امیدوں کے درمیان کوئی چیز حائل ہو گئی ۔ وہ مایوس ہو گیا ۔

قِطْعٌ مِّنَ اللَّيْلِ سے مراد رات کا حصہ ہے جو شروع رات سے تہائی رات تک ہوتا ہے ۔ نیز آخری رات کو بھی کہتے ہیں* ۔ (دیکھئے ۸۱/۱۱) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی رات کا کوئی حصہ ہے ۔

قُطِعَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں آدمی نا امید ہو گیا اور عاجز رہ گیا** ۔ قَطَعَ الْاَمْرَ کے معنی ہیں کسی بات کا آخری فیصلہ کرنا ۔ اسی سے آیت (۳۲/۲۷) میں ہے مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا ۔ میں کسی معاملہ کا قطعی فیصلہ کرنے والی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سورۃ المائدہ میں چوری کی سزا کے متعلق ہے فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا (۳۸/۵) جس کے معنی عام طور پر یہ لئے جاتے ہیں کہ ان کے ہاتھ کاٹ کر الگ کر دو ۔ لیکن لفظ قَطْعٌ اور قَطْعُ يَدٍ کے مذکورہ صدر معانی کے پیش نظر اس کے یہ معانی بھی ہو سکتے ہیں کہ کوئی ایسا طریق اختیار کرو جس سے ان کے ہاتھ چوری سے رک جائیں ۔ اس مفہوم کی تائید آیت کے باقی ماندہ ٹکڑے سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے "جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ (۳۸/۵) ۔ یہ ان کے جرم کی سزا ہے قانون خداوندی کی طرف سے بطور ایک روک کے ۔ (نَكَالًا کے لئے دیکھئے عنوان ن ۔ ک ۔ ل) ۔ یعنی چوری کی سزا میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے چور کے ہاتھ چوری کرنے سے رک جائیں ۔ اس لئے کہ اس سے آگے ہے فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ (۳۸/۵) ۔ اور جو مجرم ارتکاب جرم کے بعد پشیمان ہو جائے اور اپنی اصلاح کرلے تو اسے قانون خداوندی کی رو سے معاف کر دینا چاہئے ۔ اب ظاہر ہے کہ اس کی یہ پشیمانی اور اصلاح سزا ملنے سے پہلے بھی ہو سکتی ہے اور سزا ملنے کے بعد بھی ۔ لیکن اگر سزا میں اس کے

*تاج ۔ **محیط ۔

ھاتھ کاٹ ڈالے جائیں تو اُسے معاف مل جانے سے کیا حاصل ہوگا؟ اور اگر آیْدِی کے معنی اختیار اور مقدرت کے لئے جائیں (دیکھئے عنوان ی ۔ د ۔ ی) تو قطع ید کے معنی ہونگے ان اختیارات کا سلب کر لینا یا اس مقدرت کا چھین لینا جس کی رو سے انسان چوری کرتا ہے ۔ اس میں چوری کے علاوہ ہرقسم کی خیانت بھی آ جاتی ہے ۔

اسی سورۃ مائدہ میں نظام مملکت کے خلاف بغاوت کرنے والوں* کے متعلق ہے آنْ یُّقَتَّلُوْا اَوْ یُصَلَّبُوْا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَ اَرْجُلُھُمْ مِنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (۵/۳۳) ۔ انہیں قتل کردو ۔ یا صلیب پر لٹکا دو ۔ یا ان کے ھاتھ اور پاؤں مخالف اطراف سے قطع کردو یا انہیں جلا وطن کر دو ۔ اس میں قتل کرنے ، صلیب دینے، اور جلا وطن کرنے کے علاوہ ایک سزا قَطْعِ اَیْدِی و اَرْجُل کی بھی ہے ۔ اس کے معنی الٹی ھتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر قید کر دینے کے بھی لئے جاسکتے ھیں ۔ یہی الفاظ ساحرینِ دربارِ فرعون کی سزا کے بارے میں آئے ھیں ۔ بناء بریں ، قطع ید کے معنی یہ بھی لئے جاسکتے ھیں کہ ایسا طریقہ اختیار کرو جس سے چور کے ھاتھ چوری کرنے سے رک جائیں ۔ ھماری زبان میں بھی بولتے ھیں کہ تم نے دستخط کرکے (یا فلاں بات کرکے) اپنے ھاتھ کٹوادئے ۔ یعنی تم بے بس ھوگئے ۔ یا اس کی خلاف ورزی کرنے سے رک گئے ۔ اور اگر قطع ید سے مراد سچ مچ ھاتھ کاٹ دینے کے ھیں تو یہ وہ انتہائی سزا ہے جو اُس وقت دی جاسکے گی جب یہ جرائم ایسے عام ھو جائیں کہ اس قسم کی عبرت انگیز سزا کے سوا ان کی روک تھام کی اور کوئی صورت نہ رہے ۔ جیسے کچھ عرصہ سے ھمارے ھاں (Smuggling) اسقدر عام ھوگیا ہے کہ اسکی روک تھام کے لئے انتہائی اقدامات ناگزیر ھوگئے ھیں ۔ اس مقصد کے لئے بارڈر پولیس کو اجازت ہے کہ وہ (Smuggler) کو موقعہ پر گولی مار کر ھلاک کر دے ، حالانکہ ظاھر ہے کہ عام حالات میں موت کی سزا ، قتل عمد یا بغاوت کے جرم میں دی جاسکتی ہے ، اور وہ بھی اس وقت جب پوری تحقیقات (اور مجرم کو اپنی مدافعت کا موقع دینے کے بعد) جرم ثابت ھوجائے ۔ لہذا ، ایسے حالات میں چوری کی سزا، قطع ید ناگزیر ھو جائیگی ۔

یا مثلاً جب ملک میں نظام خداوندی قائم ھو جائے جس میں ھر فرد کی ضروریات زندگی کے پورا کرنے کی ذمہ داری خود مملکت پر ھو تو ایسی صورت

---

*بعض کے نزدیک ان میں ڈاکو اور رھزن بھی شامل ھیں ۔

میں کسی کی چیز چرانا فی الواقعہ ایک سنگین جرم ہوگا جس کی انتہائی سزا دی جانی چاہئے ۔ قرآن کریم کا معاشی نظام قائم نہ کرنا اور فاقہ کش چوروں کو قطع ید کی سزا دینا ، کل کو چھوڑ کر صرف جزو پر عمل کرنے کے مترادف ہے ، جس کا نتیجہ (۲/۸۵) میں مذکور ہے ۔

ق ط ف

قَطَفَ ۔ کسی چیز کو (بالخصوص پھلوں کو) توڑ لینا یا کاٹ لینا ۔ (ابن فارس) ۔ اَلْقِطْفُ ۔ انگور کا خوشہ جو ابھی ابھی توڑا گیا ہو ۔ اسکی جمع قُطُوْفٌ ہے* ۔ قرآن کریم میں قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ (۶۹/۲۳) آیا ہے ۔ ان کے خوشے قریب ہیں ۔ اَلْمِقْطَفُ اس درانتی کو کہتے ہیں جس سے پھل کاٹتے ہیں* ۔

ق ط م ر

اَلْقِطْمِيْرُ ۔ کھجور کی گٹھلی میں جو شگاف ہوتا ہے اسے کہتے ہیں ۔ یا کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ایک نشان سا ہوتا ہے اسے کہتے ہیں ۔ یا اس باریک سی جھلی کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے اوپر ہوتی ہے ۔ اس لفظ کو تھوڑی سی چیز کے لئے بطور مثال بولتے ہیں** ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے ۔ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۔ (۳۵/۱۳) ۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ ذرہ بھر بھی اختیار نہیں رکھتے ۔ اتنا بھی نہیں جتنی گٹھلی پر سفیدی ۔

ق ع د

اَلْقُعُوْدُ ۔ بیٹھنا ۔ نیز یہ اَلْقَاعِدُ کی جمع ہے ۔ یعنی بیٹھنے والے ۔ اَلْمَقْعَدُ ۔ بیٹھنا نیز بیٹھنے کی جگہ ۔ اسکی جمع مَقَاعِدُ ہے ۔ قُعُوْدٌ اور جُلُوْسٌ ہم معنی الفاظ ہیں ۔ بعض نے کہا ہے کہ کھڑے سے بیٹھ جانے کو قُعُوْدٌ کہتے ہیں اور لیٹے سے بیٹھنے ، یا سجدہ سے اٹھ کر بیٹھنے کو جُلُوْسٌ کہتے ہیں ۔ بعض علماء لغت نے کہا ہے کہ قُعُوْدٌ ایسے بیٹھنے کو کہتے ہیں جس میں دیر اور ٹھہراؤ پایا جائے ۔ اسی لئے گھر کی بنیادوں کو قَوَاعِدُ الْبَيْتِ کہتے ہیں ، جَوَالِسُ الْبَيْتِ نہیں کہتے ۔ اَلْقَاعِدَةُ ۔ وہ جڑ جس پر عمارت کی بنیاد رکھی جاتی ہے ، اسکی جمع قَوَاعِدُ ہے ۔ زجاج نے کہا ہے کہ قَوَاعِدُ الْبَيْتِ ان ستونوں کو کہتے ہیں جن پر عمارت استوار کی جاتی ہے*** ۔ قرآن کریم میں (۲/۱۲۷) میں ، اَلْقَوَاعِدُ مِنَ الْبَيْتِ ہے ۔

---

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔ ***تاج ۔

أُقْعِدَ الرَّجُلُ - وہ صاحب فراش ہو گیا، اور بیماری کی وجہ سے اس میں اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کی طاقت ہی نہ رہی - قرآن کریم میں قَعَدَ، اِنْبِعَاثٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۹/۴۶) - قَعَدَ لِلْحَرْبِ کے معنی ہوتے ہیں اس نے جنگ میں لڑنے والے بہادروں کو تیار کیا*- سورہ بروج میں ہے - اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ (۸۵/۶)- جب وہ لوگ (جنگ کی آگ بھڑکانے کے لئے) بالکل تیار بیٹھے تھے - راغب نے کہا ہے کہ کسی کام میں سستی کرنے والے کو قَاعِدٌ کہا جاتا ہے **- سورہ النساء میں اَلْقَاعِدُوْنَ، اَلْمُجَاهِدُوْنَ کے مقابلہ میں انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے (۴/۹۵) -
اَلْقَعِيْدُ - وہ شخص جو تمہارے ساتھ بیٹھتا ہو - محافظ - نگران * - (۵۰/۱۷) میں یہ لفظ انہی معانی میں استعمال ہوا ہے -

اَلْقَاعِدُ (مِنَ النِّسَاءِ) اُس معمر عورت کو کہتے ہیں جو اولاد، حیض، اور شوہر سے مایوس ہو چکی ہو - اسکی جمع اَلْقَوَاعِدُ (مِنَ النِّسَاءِ) ہے (۲۴/۶۰) - مَقَاعِدُ - مرکزی مقامات (۳/۱۲۰) - سورہ قمر میں ہے فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ (۵۴/۵۵) - ایسا مقام جس میں زندگی کی تمام خوشگواریاں موجود ہوں - (دیکھئے عنوان ص - د - ق) - لیکن یہ مقام (جنت) محض بیٹھنے کی جگہ، یعنی تھوڑی دیر تک سستانے کا مقام ہے - آخری منزل نہیں -

سورہ جن میں کاہنوں اور نجومیوں کی رصد گاہوں کے لئے مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ (۷۲/۹) آیا ہے -

ق ع ر

اَلْقَعْرُ - کسی چیز کی انتہائی گہرائی - قَعْرُ الْبِئْرِ - کنوئیں کی تہ - قَعَرَ النَّخْلَةَ - اس نے کھجور کے درخت کو جڑ سے اکھاڑ دیا - فَانْقَعَرَتْ - پس وہ جڑ سے اکھڑ گئی***-

قوم عاد پر جو آندھی کا سخت طوفان آیا تھا اس کے متعلق ہے کہ وہ لوگوں کو اس طرح اپنے مقام سے اکھاڑتا چلا جاتا تھا، كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ (۵۴/۲۰) - گویا وہ اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں - اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ اس طرح اکھڑتے چلے جاتے تھے گویا وہ ایسی کھجوروں کے تنے تھے جو پہلے ہی جڑوں سے اکھڑی ہوئی پڑی تھیں - اور یہ بھی کہ وہ اسطرح اکھڑ رہے تھے جس طرح ایسی کھجوریں اکھڑیں جن کی جڑیں بڑی گہرائی تک زمین میں گئی ہوئی ہوں - یعنی وہ قوم اپنے

---

*تاج - **راغب - ***تاج و راغب -

آپ کو بڑی مستحکم سمجھتی تھی۔ وہ خیال کئے بیٹھی تھی کہ اس کی جڑیں بہت مضبوط ہیں اس لئے اسے کون اکھیڑ سکتا ہے۔ لیکن اسے ایک ہی آندھی کے طوفان نے اکھیڑ کر رکھ دیا۔ سورہ حاقۃ میں اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَۃٍ (۶۹/۷) کہا گیا ہے۔ یعنی کھوکھلی کھجوروں کے تنے۔

ق ف ل

قَفَلَ۔ یَقْفِلُ و یَقْفُلُ۔ قُفُوْلاً۔ کسی کا سفر سے واپس آجانا۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ قُفُوْلٌ جہاد اور جنگ سے فوج کے واپس آنے کو کہتے ہیں۔ اَقْفَلَ الْجَیْشُ۔ لشکر واپس آگیا۔ اَلْقَافِلَۃُ۔ وہ رفقائے سفر جو سفر سے واپس آرہے ہوں (ابن فارس)۔ لیکن سفر پر جانے والوں کو بھی کہتے ہیں، اس فالِ نیک کے اعتبار سے کہ۔ بہ سلامت روی و باز آئی۔ یعنی ان کی خیریت سے واپسی کی آرزو کے لحاظ سے انہیں جاتے وقت بھی اَلْقَافِلَۃُ ہی کہتے ہیں*۔ قَفَلَ الطَّعَامَ۔ اس نے کھانے کی چیزوں کا ذخیرہ کر لیا۔ قَفَلَ الشَّیْئَ۔ اس نے چیز کا اندازہ اور تخمینہ لگایا۔ اَقْفَلَ الْبَابَ۔ اس نے دروازہ کو بند کر لیا۔ اَلْقُفْلُ۔ تالا جس سے دروازہ بند کیا جاتا ہے*۔ قرآن کریم میں ہے۔ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُہَا (۴۷/۲۴)۔ کیا ان کے دلوں پر ان کے تالے پڑے ہوئے ہیں جو وہ قرآن کریم میں غور و خوض نہیں کرتے۔ اِسْتَقْفَلَ الرَّجُلُ۔ آدمی نے بخل کیا۔

ق ف و

اَلْقَفَا۔ اَلْقَافِیَۃُ۔ گُدّی۔ گردن کا پچھلا حصہ۔ اَلْقِفْوَۃُ۔ دم۔ اسی سے اس کے معنی تہمت کے بھی ہیں۔ قَفَوْتُہٗ قَفْوًا۔ میں اس کے پیچھے چلا۔ قَفَّیْتُہٗ زَیْدًا۔ و بِزَیْدٍ میں نے اس کے پیچھے پیچھے زید کو بھیجا۔ ھُوَ قَفِیُّھُمْ۔ وہ ان کا جانشین و پسماندہ ہے*۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے پیچھے پیچھے چلنے کے لکھے ہیں۔ اَلْقَفِیَّۃُ برتری کو بھی کہتے ہیں*۔

سورۃ حدید میں ہے ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰی آثَارِہِمْ بِرُسُلِنَا (۵۷/۲۷)۔ پھر ہم نے ان کے نقش قدم پر ان کے پیچھے اور رسول بھیجے۔ (نیز ۲/۸۷)۔

---

*تاج و راغب۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔ وَلَا تَقْفُ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ * اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶) - ''اور جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ (یاد رکھو) سماعت، بصارت اور قلب سب سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا'' - قرآن کریم نے اس آیت میں عظیم حقائق بیان کئے ہیں - پہلی بات تو یہ کہ محض قیاس و گمان کی بنا پر، تقلیداً اور رسماً کسی بات کے پیچھے نہیں لگ جانا چاہئے - اس کے متعلق خود تحقیق کرنا چاہئے - دوسرے یہ کہ قرآن کریم نے عِلْم* کی تعریف یہ بتائی ہے کہ اس میں سماعت و بصارت و قلب کی شہادت موجود ہونی چاہئے - سماعت و بصارت میں علم بذریعہ حواس (Per-ceptual Knowledge) آجاتا ہے، اور قلب (Mind) میں (Conceptual Knowledge) نیز یہ بھی کہ حواس کے ذریعے جو معلومات تم تک پہنچیں، ان سے نتیجہ مستنبط کرنے میں اپنے جذبات کو دخل مت دینے دو (اس لئے کہ فؤاد میں جذبات کا پہلو بھی شامل ہوتا ہے) - ہر معاملہ کے متعلق پوری پوری خارجی معلومات بہم پہنچاؤ اور پھر جذبات سے الگ ہو کر، اس سے نتیجہ نکالو۔

راغب نے بھی اس آیت کی شرح میں لکھا ہے کہ محض قیافہ اور گمان کی بنا پر کسی بات کا فیصلہ نہ کرو - وہ لکھتا ہے کہ قِیَافَۃ* دراصل اقْتِفَاء* کا مقلوب ہے۔

ق ل ب

قَلْب* کے بنیادی معنی ہیں الٹنا پلٹنا - لوٹ پوٹ کرنا - کسی چیز کو ادلتے بدلتے رہنا - چنانچہ قَلَبَ الشَّیْءَ یَقْلِبُهٗ کے معنی ہیں کسی شے کو الٹ پلٹ کر دینا - یعنی اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا اوپر کر دینا - قَلَّبَ کے بھی یہی معنی ہیں، لیکن مبالغہ کے ساتھ - تَقَلَّبَ کے معنی ہیں الٹ پلٹ ہونا، جیسے تیز گرم ریت پر سانپ لوٹ پوٹ ہوتا ہے - قَلَبَ الْخُبْزَ - اس وقت کہتے ہیں جب روٹی اوپر سے پک جائے اور اندر سے پکانے کے لئے اسے الٹ پلٹ کیا جائے - مِقْلَب* اس لوہے کو کہتے ہیں جس سے کسان کھیتی کرنے کے لئے زمین کی مٹی کو الٹ پلٹ کرتا ہے* -

چونکہ انسان کا دل کبھی ایک حالت پر نہیں رہتا بلکہ لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہتا ہے اس لئے اسے بھی قَلْب* کہتے ہیں - اور (چونکہ عقل و بصیرت

*تاج -

کا کام یہ ھے کہ وہ اشیاء اور اس کے خواص کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھے اور پھر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچے اس لئے) عقل کو بھی قَلْبٌ کہہ دیتے ھیں* ۔

ابن ھشام نے قَلْبٌ کے معانی میں سے چار بیان کئے ھیں (۱) دل (۲) عقل (۳) ھر چیز کا خلاصہ اور (۴) ھر چیز کا بہترین حصہ ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ میں دو بنیادی معنی ھیں (۱) کسی چیز کا خالص اور گراں قدر حصہ (۲) کسی چیز کو ایک رخ سے دوسرے رخ پر پھیرنا ۔ چنانچہ اھل عرب کہتے ھیں ۔ ھٰذَا عَرَبِیٌّ قَلْبٌ ۔ یہ شخص خالص عرب ھے ۔ کھجور کے درخت میں ایک سفید سا مغز (گابھا) ھوتا ھے جو اس کا بہترین حصہ ھوتا ھے ۔ اسے قَلْبُ النَّخْلَۃِ کہتے ھیں* ۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ھے کہ ھر خالص شے کو قَلْبٌ کہتے ھیں ۔

قرآن کریم میں قَلْبٌ اور فُؤَادٌ دو لفظ آئے ھیں (فُؤَادٌ ۔ فَأَدَ سے ھے جس کے معنی بھوننے کے ھیں ، یعنی تپش و خلش ۔ سوز و گداز ۔ درد و داغ) ان دونوں لفظوں میں ایک موٹا سا امتیازی خط کھینچنا ھو تو یوں کہہ سکتے ھیں کہ قَلْبٌ فہم و بصیرت اور عقل و فکر کا سرچشمہ ھے اور فُؤَادٌ جذباتِ سوز و گداز کا منبع ۔ چنانچہ سورۃ اعراف میں اھل جہنم کے متعلق ھے کہ یہ وہ لوگ ھیں ۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا (۷/۱۷۹) ۔ قلب تو رکھتے ھیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے ۔ سورۃ کہف میں ھے ۔ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ (۱۸/۵۷) یعنی ان کے دلوں پر پردے پڑ جاتے ھیں جس کا نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ھی نہیں رھتی ۔ اسی طرح سورۃ حج میں بتایا گیا ھے کہ قَلْبٌ سے عقل و فکر کا کام لیا جاتا ھے ۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَعْقِلُوْنَ بِهَا (۲۲/۴۶) ۔ سورۃ النحل میں ھے قُلُوْبُهُمْ مُنْكِرَةٌ (۱۶/۲۲) ۔ فریب کار یا بے باک عقلیں ۔ (دیکھئے عنوان ن ۔ ک ۔ ر) نیز قلب کے سرچشمۂ عقل و فکر ھونے کے لئے (س ۔ م ۔ ع) اور (ب ۔ ص ۔ ر) کے عنوانات بھی دیکھئے ۔

سورۃ بقرہ میں منافقین کے ضمن میں ھے فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (۲/۱۰) ۔ اس سے ان کی نفسیاتی کیفیت کی طرف بھی اشارہ ھے اور ذھنی کیفیت کی طرف بھی ۔ اس لئے کہ اس سے پہلے ان کے متعلق کہا ھے وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۲/۹) ۔ ''وہ اپنے آپ کے سوا اور کسی کو

---

* تاج ۔ ** دیکھئے ف ۔ أ ۔ د ۔

دھوکا نہیں دیتے لیکن اسے سمجھتے نہیں"۔ اس میں دونوں (نفسیاتی اور ذہنی) کیفیات کے بگاڑ کا ذکر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے قَلْبٌ کا لفظ عقل اور جذبات دونوں کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ اس اعتبار سے انگریزی زبان کا لفظ (Mind) قَلْبٌ اور فُؤَادٌ دونوں کے لئے بولا جاسکتا ہے۔ نیز قرآن کریم میں بھی قَلْبٌ اور فُؤَادٌ کو مرادف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے (نیز دیکھئے عنوان ف۔ ا۔ د)۔

تَقَلُّبٌ۔ جد و جہد کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ (۱۶/۴۶ ; ۴۰/۴)۔ سورۂ شعراء میں ہے اَلَّذِیْ یَرٰىکَ حِیْنَ تَقُوْمُ وَ تَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیْنَ (۲۶/۲۱۸-۲۱۹)۔ "تو جب ان لوگوں میں جو قوانین خداوندی کے سامنے جھکتے ہیں، کھڑا ہوتا ہے یا مصروفِ تگ و تاز ہوتا ہے، تو خدا تجھے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ سورۂ بقرۃ میں ہے قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِکَ فِی السَّمَآءِ (۲/۱۴۴)۔ جب تو بار بار بے تابانہ اپنی نظریں آسمان کیطرف اٹھاتا تھا تو ہم تیرے اضطراب کو دیکھ رہے تھے"۔ لہذا تَقَلُّبٌ میں جسمانی اور قلبی دونوں قسم کی جد و جہد آ جائیگی۔ مُنْقَلَبٌ کے معنی ہیں لوٹنے کی جگہ (۲۶/۲۲۷)۔ مُنْقَلِبٌ۔ پلٹا کھانے والا۔ سورۂ توبہ میں ہے وَ قَلَّبُوْا لَکَ الْاُمُوْرَ (۹/۴۸)۔ یہ لوگ تیرے لئے الٹ پھیر کی تدبیریں کرتے رہے۔ یہ لوگ سوچ بچار کرتے رہے کہ کس طرح تیرے معاملات میں بگاڑ پیدا کیا جاسکتا ہے (انہیں الٹایا جاسکتا ہے)۔ سورۂ کہف میں ہے یُقَلِّبُ کَفَّیْهِ (۱۸/۴۲)۔ وہ اپنے ہاتھ ملتا رہ گیا۔ سورۂ محمد میں مُتَقَلَّبَکُمْ (۴۷/۱۹) آیا ہے۔ یعنی معاملات میں سرگرداں رہنے کی جگہ یا وقت۔

ق ل د

قَلَدَ الْحَبْلَ۔ رسّی کو بٹ دیا۔ اَلْاِقْلِیْدُ۔ اونٹنی کی ناک کی نتھنی جس میں نکیل کی رسی ڈالی جاتی ہے۔ اَلْمِقْلَادُ (جمع مَقَالِیْدُ)۔ کنجی۔ نیز خزانہ *۔ قرآن کریم میں ہے کہ۔ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳۹/۶۳)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے خزانے سب خدا کے لئے ہیں۔ اَلْقِلَادَةُ۔ ہار جو گردن میں ڈالا جائے (اس کی جمع اَلْقَلَائِدُ آتی ہے)*۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا الْهَدْیَ وَلَا الْقَلَائِدَ (۵/۲)۔ راغب نے لکھا ہے کہ قِلَادَةٌ کے معنی بٹی ہوئی ڈور یا چاندی وغیرہ کا تار ہیں جو گلے میں ڈالا جائے لیکن بعد میں ہر اس چیز کو کہنے لگے جسے گلے میں پہنا جائے یا جو کسی چیز کا احاطہ کرلے۔ اُسے اپنے گھیرے میں لے لے**۔

*تاج و محیط۔ **راغب۔

اس سے تَقْلِیْدٌ کے معنے سمجھ میں آ سکتے ہیں ۔ یعنی نکیل کی نتھنی جیسے ناک میں ، یا پٹا جیسے اپنے گلے میں ، ڈال لیا جائے اور رسی دوسرے کے ہاتھ میں دے دی جائے، اور پھر اس کے پیچھے انسان جانور کی طرح چلتا جائے ۔ چنانچہ اسی نہج سے کہتے ہیں تَقْلِیْدُ الْوُلَاۃِ الْاَعْمَالَ ۔ یعنی والیوں کا ملازموں کو مختلف کاموں پر تعینات کرنا * ۔ صاحبِ محیط نے لکھا ہے کہ اَلتَّقْلِیْدُ ۔ یہود اور نصاریٰ کے نزدیک ان عقائد اور شعائر کو کہتے ہیں جو ان کی کتابوں میں کہیں مدون نہیں لیکن جنہیں انہوں نے اپنے اسلاف سے زبانی حاصل کیا ہے اور یہ سلسلہ اس طرح متوارث چلا آ رہا ہے** ۔

قرآن کریم اس لئے آیا تھا کہ نوع انسانی کے گلے سے وہ تمام زنجیریں اتار دے جو اس نے اشخاص پرستی کی رو سے پہن رکھی تھیں اور جن میں وہ غلاموں کی طرح جکڑے چلی آرہی تھی (۷/۱۵۶) ۔ چنانچہ نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کے ذریعے ان تمام زنجیروں کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا لیکن مسلمانوں نے ان ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے اپنی مژگانِ عقیدت سے اکٹھا کیا ، اور پہلے سے بھی زیادہ کڑی زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑ لیا ۔ اسی کو تقلید کہتے ہیں جس سے انسانیت کا جوہرِ حریتِ فکر و عمل جل کر راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے ۔ قرآن کریم ، قانونِ خداوندی کی اطاعت اور ساری کائنات پر حکومت کا سبق دیتا ہے، نہ کہ انسانوں کی غلامی کا سبق ۔ تقلید ، غلامی کی بد ترین شکل ہے ۔ اس لئے کہ غلامی میں انسان کا صرف جسم مقید ہوتا ہے، لیکن تقلید میں اس کی عقل و فکر ماؤف ہوجاتی ہے ۔ قرآن کریم ، قدم قدم پر تدبر و تفکر کا حکم دیتا ہے اور اسلاف کی اندھی تقلید کو منکرین کا شیوہ بتاتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ جب بھی کسی رسول نے خدا کی طرف دعوت دی تو یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی گئی کہ تمہاری یہ دعوت اُس مسلک کے خلاف ہے جو ہمارے ہاں وراثۃً آبا و اجداد سے آ رہا ہے ۔ حضرت نوحؑ کو یہی جواب ملا (۲۳/۲۴) ۔ یہی جواب حضرت صالحؑ کو ملا (۱۱/۶۲) ۔ یہی حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا (۲۱/۵۳) ۔ یہی حضرت شعیبؑ سے (۱۱/۸۷) ۔ اور حضرت موسیٰؑ سے (۱۰/۷۸) ۔ یہی رسول اللہؐ سے کہا گیا (۳۸/۷) ۔ غرضیکہ ہر رسول کی مخالفت یہی کہہ کر کی گئی (۴۳/۲۲، ۲۳) ۔ قرآن کریم کی دعوت کے خلاف کوئی دلیل اور برہان نہیں لائی گئی ۔ محض یہ کہہ کر اسے ٹھکرا دیا گیا کہ یہ ہمارے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے (۲/۱۷۰؛ ۵/۱۰۴) ۔ قرآن کریم کہتا ہے

*تاج و محیط ۔ **محیط ۔

کہ یہ روش ، انسانی سطح زندگی کی نہیں ، حیوانی سطح کی ہے ۔ لہذا جہنم کی زندگی (۴۷/۱۲) ۔ اس میں انسان کی آنکھیں پیچھے کی طرف رہتی ہیں (۳۳/۶۶) ۔ وہ سامنے کا راستہ دیکھ ہی نہیں سکتا (۳۶/۸-۹) ۔ یعنی اس مسلک کی رو سے اُس قوم کو اپنا ماضی تو درخشندہ نظر آتا ہے لیکن مستقبل تاریک ۔

غور کیجئے کہ کیا آج ہماری بھی بعینہٖ یہی حالت نہیں! کیا قرآن کریم کی دعوت کی ہر جگہ یہی کہکر مخالفت نہیں ہوتی کہ یہ آواز اُس مسلک کے خلاف ہے جو ہمارے ہاں وراثةً چلا آرہا ہے؟ ہمارے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ جو کچھ ہمارے ہاں اسلاف سے چلا آ رہا ہے اسے اٹھا کر پھینک دینا چاہئے ۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں جو کچھ ان سے ورثہ میں ملا ہے اسے قرآن کریم کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لینا چاہئیے ۔ جو کچھ اس کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھنا چاہئیے ۔ جو اس کے خلاف ہو اسے غلط ۔ یہ دلیل کہ اُن بزرگوں نے جو کچھ کہا تھا قرآن کو سمجھ کر ہی کہا تھا ، بڑی کمزور ، بلکہ باطل ہے ۔ قرآن کریم کو قیامت تک کے لئے محفوظ اسی لئے رکھا گیا تھا ، اور ہر نسل کو اس پر غور و تدبر کا حکم اسی لئے دیا گیا تھا کہ وہ ہر بات کو خود قرآن کریم کے آئینے میں دیکھے ۔ یاد رکھئے ، ہم قرآن کریم پر ایمان لانے کے مکلف ہیں ، اس لئے ہمارے لئے حق و باطل کی سند صرف خدا کی کتاب ہے ۔ اسلاف کا احترام بجا اور درست ۔ لیکن وہ ہمارے لئے سند نہیں قرار پا سکتے ۔

ق ل ع

قَلَعَ قَلَّعَ اِقْتَلَعَ ۔ کسی چیز کو اس کی بنیاد سے اکھیڑ دینا اور اسے اسکی جگہ سے ہٹا دینا ۔ اَلْمَقْلُوْعُ ۔ معزول شدہ امیر ۔ اَلْقَلْعُ ۔ وہ محفوظ جگہ جہاں چرواہا اپنا سامان رکھتا ہے ۔ اَلْقَلْعَةُ ۔ کھجور کا وہ پودا جسے کھجور کے درخت کی جڑ سے اکھیڑ لیا جائے ۔ اَلْاِقْلَاعُ عَنِ الْاَمْرِ ۔ کسی کام سے رک جانا * ۔ قرآن کریم میں حضرت نوحؑ کے طوفان کے ذکر کے بعد ہے ۔ یٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ (۱۱/۴۴) ۔ بارش سے کہا گیا کہ تو رک جا ۔ تھم جا ۔

ق ل ل

اَلْقِلَّةُ ۔ تھوڑا ۔ قلیل ۔ اَلْقَلِیْلَةُ ۔ کثرت کی ضد ہے ۔ کمی ۔ قَلَّ ۔ یَقِلُّ ۔ کم ہونا ۔ قَلِیْلٌ ۔ کم ۔ اَقَلَّهٗ قَلَّلَهٗ ۔ اسکو کم کر دیا ۔ اَلْاَقَلُّ ۔ بہت کم ** ۔

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔

اَلْقُلَّةُ ۔ سر یا کوھان یا پہاڑ کا بالائی حصہ ۔ جماعت * ۔ اَلْقِلَّةُ ۔ غصہ یا طمع کی وجہ سے جو کپکپی سی آتی ہے * ۔ اِسْتَقَلَّ الرَّجُلُ ۔ وہ آدمی فرط غضب میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا ۔ اِسْتَقَلَّهٗ ۔ اسکو اٹھا لیا ، بلند کر دیا ۔ اِسْتَقَلَّتِ السَّمَآءُ ۔ آسمان بلند ہوگیا ۔ اَلْاِسْتِقْلَالُ ۔ بلند ہو جانا ۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جانا ۔ کسی چیز کو اپنے لئے خاص کرلینا ۔ هُوَ لَا يَسْتَقِلُّ بِهٰذَا ۔ اسے اسکی قدرت حاصل نہیں ۔ وہ اسے اٹھا نہیں سکتا * ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) کسی چیز کا کم ہونا ، اور (۲) ایک جگہ نہ ٹھہرنا لکھے ہیں ۔

قَلَّ ۔ تھوڑا ہونا ۔ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ (۳/۱۹۶) ۔ قَلَّلَ ۔ تھوڑا کرنا ۔ کم کرنا (۸/۴۴) ۔ اَقَلَّ ۔ اٹھا لینا * (۷/۵۷) ۔ یعنی اسے ہلکا سا سمجھ کر اٹھا لینا ۔

ق ل م

قَلَمٌ ۔ کسی چیز کو چھیل کر اور درست کرکے ہموار کر دینا ۔ (ابن فارس) ۔ اَلْقَلَمُ ۔ قلم جس سے لکھا جاتا ہے ۔ قینچی ۔ بے پھل اور بے پر کا تیر ۔ تیروں میں وہ بھی شامل ہیں جن سے جوا کھیلا جاتا تھا ۔ (اسکی جمع اَقْلَامٌ ہے) * ۔ سورہ آل عمران میں ہے کہ ھیکل کے پجاری حضرت مریمؑ کی کفالت کے لئے قرعہ اندازی کرتے تھے ۔ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ (۳/۴۴) ۔ اس میں اَقْلَام کے یہی معنی ہیں ۔ دوسرے مقامات پر قَلَمٌ سے مراد وہ قلم ہے جس سے لکھا جاتا ہے ۔ مثلاً نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (۶۸/۱) یا اَلَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۹۶/۴) ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ قَلَمٌ کو قلم صرف اس وقت کہتے ہیں جب اسے تراش کر لکھنے کے قابل بنا لیا جائے ، ورنہ اس سے پہلے کلک کو يَرَاعَةٌ یا قَصَبَةٌ کہتے ہیں ** ۔ یہ الفاظ خود اس پر شاھد ہیں کہ اُس زمانہ میں عربوں میں لکھنے کا رواج تھا ۔ خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے تاکید کی ہے کہ عام لین دین کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو ۔ (۲/۲۸۲)

سورہ العلق کی اس آیت پر غور کیجئے جس میں کہا گیا ہے کہ اَلَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۹۶/۴) "اللہ وہ ہے جس نے قلم کے ذریعے انسان کو سکھایا" ۔ اس میں ایک تو تحریری علم کی اہمیت واضح ہے ۔ دوسرے یہ کہ خدا ، انسان کو براہ راست قلم سے لکھنا نہیں سکھاتا ۔ اس لئے اس آیت (اور اس

*تاج ۔ **محیط ۔

قسم کی دیگر آیات) سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا نے انسان کے اندر اس طرح علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھدی ہے ۔ اس نقطہ کو پیش نظر رکھنے سے قرآن کریم کے بہت سے مقامات واضح ہو جائینگے۔

ق ل ی

اَلْقِلَیٰ ۔ شدت بغض کو کہتے ہیں ۔ ابن فارس نے اس کے معنے کسی چیز سے دور ہٹنا اور اسکے پاس سے چلا جانا لکھے ہیں ۔ قَلٰی یَقْلِیْ ۔ کسی سے بغض رکھنا اور انتہائی ناپسندیدگی ظاہر کرنا اور اسے چھوڑ دینا ۔ بعض نے کہا ہے کہ قَلٰی یَقْلِیْ چھوڑ دینے کے معنوں میں آتا ہے اور قَلِیَہٗ یَقْلاہُ ۔ بغض رکھنے کے معنوں میں ۔ اصل میں قَلْیٌ کے معنی ہوتے ہیں گوشت وغیرہ کو بھوننا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ھلکا ہونے اور تیز ہونے کے ہیں ۔ قَلاہُ اس نے اسے کڑھائی میں بھونا یا تلا ۔ اَلْقَلَّاءُ ۔ کڑھائیاں بنانے والا ۔ اَلْمِقْلٰی ۔ اَلْمِقْلاۃُ ۔ پیتل یا مٹی کی بنی ہوئی کڑھائی جسمیں گوشت وغیرہ تلا جائے* ۔

قرآن کریم میں نبی اکرم کے متعلق ہے مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی (۹۳/۳) ۔ تیرے رب نے نہ تجھے چھوڑا ہے اور نہ ہی وہ تجھ سے ناراض ہے ۔ سورہ شعراء میں حضرت لوط کا یہ قول مذکور ہے کہ اِنِّیْ لِعَمَلِکُمْ مِنَ الْقَالِیْنَ (۲۶/۱۶۸) ۔ میں تمہارے ان کرتوتوں سے سخت بیزار ہوں ۔ میں تم سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا ۔

ق م ح

قَمَحَ الْبَعِیْرُ قُمُوْحاً ۔ اونٹ نے حوض پر سر اونچا کر لیا اور پانی پینے سے باز رہا ۔ قَامَحَتْ اِبِلُکَ ۔ تمہارے اونٹوں نے حوض پر آنے کے باوجود پانی نہیں پیا اور وہ سر اٹھائے کھڑے رہے ۔ اَقْمَحَ الرَّجُلُ ۔ آدمی نے اپنا سر اٹھایا اور آنکھیں نیچی کر لیں ۔ اَقْمَحَ الْغُلُّ الْاَسِیْرَ ۔ بیڑیوں نے تنگ ہونے کی وجہ سے قیدی کے سر کو اٹھا ہوا رہنے دیا* ۔ اس زمانہ میں بیڑیوں کے ساتھ گردن میں طوق ڈالے جاتے تھے جو اگر سخت یا تنگ ہوتے تو سر اونچے کا اونچا اٹھا رہ جاتا ۔ قرآن کریم میں انہی کے متعلق ہے ۔ فَهُمْ مُقْمَحُوْنَ (۳۶/۸) ۔ ان کے سر کھنچے ہوئے اور اوپر اٹھے ہوئے ہیں ۔

---

*تاج ۔ محیط و راغب ۔

دراصل قَمْح* گیہوں کو کہتے ہیں اور جو ستو اس گیہوں سے بنایا جاتا ہے اسے قَمِيْحَة* کہتے ہیں۔ ستو پھانکنے کے لئے سر کو اوپر اٹھایا جاتا ہے۔ اسے اَلْقَمْحُ کہتے ہیں۔ اسکے بعد محض سر اٹھانے کو (خواہ کسی وجہ سے ہو) قَمْح* کہنے لگے*۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ لفظ (گیہوں کے معنوں میں) خلاف قیاس استعمال ہوتا ہے۔

ق م ر

اَلْقَمَرُ۔ ہر مہینے کی تیسری رات سے چھبیس کی رات تک کا چاند۔ پہلی دوسری اور چھبیس ستائیس تاریخ کے چاند کو ھِلَال* کہتے ہیں**۔ تَقَمَّرَ الْمَرْأَةَ۔ عورت سے شادی کرلی اور اسے لے گیا۔ نیز چاند رات میں شبِ زفاف بسر کرنے کو بھی کہتے ہیں**۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے یہ معنی قَمْرَة سے ماخوذ ہیں جس کے معنے غالب آجانے کے ہیں۔ لہذا چاند کو قَمَر* اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی روشنی دوسرے ستاروں پر غالب آجاتی ہے***۔ قَمَرْتُ فُلَانًا۔ میں نے فلاں آدمی کو دھوکا دے دیا***۔ (چاند کے ساتھ جنون کا تعلق قدیمی تصور ہے۔ انگریزی زبان میں Lunatic کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے)۔ اسی سے اَلْقِمَارُ جوئے کو کہتے ہیں۔ اَلْقَمِيْرُ۔ مُقَامِرٌ۔ جوا کھیلنے والا****۔

صاحب غریب القرآن نے لکھا ہے کہ ایام جاہلیت میں عربوں کا قومی نشان قَمَر* تھا۔ جیسے ایرانیوں کا قومی نشان شَمْس* تھا۔ اس اعتبار سے جہاں قرآن کریم نے کہا ہے۔ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ (۵۴/۱)۔ تو اس میں بتایا گیا ہے کہ جماعت مومنین اور قریش میں آخری تصادم کا وقت قریب آ رہا ہے۔ (دیکھئے عنوان س۔ و۔ ع)۔ اس وقت عرب جاہلیت کا تمام اقتدار ختم ہو جائے گا اور اسلام کا پرچم بلند ہو جائے گا۔ (دیکھئے عنوان ش۔ ق۔ ق)۔ وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ (۷۵/۹) میں عربوں اور ایرانیوں کے اکٹھے ہونے کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کے ایران فتح کرلینے کے بعد ہوا۔

لیکن اگر ان آیات میں شَمْس* اور قَمَر* کے حقیقی معنی سورج اور چاند کے لئے جائیں تو ان میں طبعی کائنات کے بعض ہونے والے تغیرات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے متعلق ہم اس وقت متعین طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔

---

*تاج و محیط و راغب۔ **تاج۔ ***راغب۔ ****محیط۔

ق م ص

قَمَصَ الْفَرَسُ يَقْمُصُ و يَقْمِصُ قَمْصًا وَ قِمَاصًا ۔ گھوڑے کا اپنے دونوں ھاتھوں کو یکبارگی اٹھانا اور پھر ان کو ایک ساتھ زمین پر پٹک دینا۔ اَلْقِمَاصُ ۔ اچھلنا ۔ کودنا ۔ نیز قلق و اضطراب کو بھی کہتے ھیں ۔ اَلْقَمُوْصُ ۔ وہ جانور جو اپنے سوار کو لے کر کودنے لگے ۔ اَلْقَمِيْصُ ۔ بہت اچھلنے کودنے والا خچر* ۔

ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دو ھوتے ھیں ۔ ایک تو کسی چیز کو پہننا اور اس میں لپٹ جانا ۔ اور دوسرے کسی چیز کا اچھلنا اور ھلنا ۔ قَمَصَ الْبَحْرُ بِالسَّفِيْنَةِ ۔ دریا نے موج کے ذریعے کشتی کو اچھالا** ۔

اَلْقَمِيْصُ کرتے کو کہتے ھیں جو پہنا جاتا ھے ۔ عربی میں یہ لفظ مذکر استعمال ھوتا ھے اگرچہ کبھی کبھی مؤنث بھی استعمال کرلیا جاتا ھے ۔ اس کی جمع قُمُصٌ ۔ اَقْمِصَةٌ اور قُمْصَانٌ آتی ھے ۔ ابن الجزری نے کہا ھے کہ اَلْقَمِيْصُ اس سلے ھوئے کپڑے کو کہتے ھیں جس میں دو آستینیں ھوتی ھیں اور نیچے سے کھلا ھوا نہیں ھوتا ۔ یہ کپڑا روئی یا کتان کا ھونا چاھئے ۔ اگر یہ کپڑا اون کا ھو تو پھر اسے قَمِيْصٌ نہیں کہتے ۔ لیکن ابن حجر مکی نے کہا ھے کہ اس کا مطلب یہ ھے کہ یہ کپڑا زیادہ تر اون کا نہیں ھوتا۔ یہ مطلب نہیں کہ اون کا ھو ھی نہیں سکتا ۔ اَلْقَمِيْصُ ۔ غلاف قلب کو بھی کہتے ھیں* ۔ قرآن کریم میں قصہ حضرت یوسف[ع] کے ضمن میں ھے ۔ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا (۱۲/۹۳) ۔ (حضرت یوسف[ع] نے کہا) میرے اس کرتہ کو لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے سامنے رکھ دو ۔ اس پر ساری بات کھل جائے گی ۔ اس زمانے میں (اور آج بھی) ان لوگوں کا لباس امتیازی نشان رکھتا تھا جو بلند مناصب پر فائز ھوں ۔ حضرت یوسف[ع] کی قمیص ان کے جاہ و مرتبت کا نشان تھی ۔ اس لئے انہوں نے اپنی قمیص کو باپ کے پاس بھیجدیا تاکہ وہ اس سے ان کے مقام بلند کا اندازہ کرکے سمجھ لیں کہ ان کا بیٹا (یوسف) کہاں پہنچ چکا ھے ۔ لیکن اس آیت کا ایک اور مفہوم بھی ھوسکتا ھے اس سے پہلے (۱۲/۸۴ میں) کہا گیا ھے وَ ابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ یوسف[ع] کے غم سے یعقوب[ع] کی بینائی کم ھوگئی ، غم و حزن کا یہ نتیجہ ھو جایا کرتا ھے کہ انسان کے اعصاب کمزور ھو جاتے ھیں ۔ اسکے بعد جب حضرت یعقوب[ع] کے سامنے حضرت یوسف[ع] کی قمیص آئی تو فرطِ مسرت سے ایسا نفسیاتی اثر ھوا کہ انکے اعصاب میں

*تاج ۔ **مقاییس اللغۃ ۔

تقویت آگئی اور کمزور بینائی پھر سے اپنی اصلی حالت پر آگئی - فوری خوشخبری سے ایسی کیفیت عام طور پر پیدا ہو جایا کرتی ہے -

داستان حضرت یوسف ؑ میں پہلے آپ کی قمیص کا ذکر اس وقت آتا ہے جب آپ کے بھائی اسے "جھوٹے خون" میں لت پت کرکے باپ کے پاس لے آئے تھے (۱۲/۱۸) - دوسری دفعہ آپکی قمیص آپکی پاکدامنی کی شہادت بنکر سامنے آتی ہے (۱۲/۲۶، ۲۷)- اوراب تیسری مرتبہ انکی زندگی اور جاہ و منصب کی خوشخبری بن کر -

قَمَّصَهٗ قَمِیْصًا فَتَقَمَّصَ - اس نے اسے کرتہ پہنایا اور اس نے وہ کرتہ پہن لیا- بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ اگر کرتہ کا گریبان سینہ پرھو تو اسے دِرْع ؔ کہتے ہیں اور اگر گریبان مونڈھے پر ھو تو اسے قَمِیْص ؔ کہتے ہیں* -

اَلْقُمَاصُ - اونٹ کی ایک بیماری کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک جگہ پر کھڑا نہیں رہ سکتا بلکہ بے چین و بے قرار رہتا ہے** -

ق م ط ر

اَلْقِمَطْرُ - اس لکڑی کی بیڑی کو کہتے ہیں جو مجرموں کے پاؤں میں ڈال دی جاتی تھی تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں***- اس سے انہیں چلنے پھرنے میں سخت اذیت پہنچتی تھی- پھر اس سے یہ لفظ تکلیف ، پریشانی، سختی اور اذیت کے معنوں میں استعمال ہونے لگا - سختی کی وجہ سے آنکھوں اور ابروؤں پر جو شکنیں پڑجاتی ھیں، انہیں بھی قَمْطَرِیْرٌ کہتے ھیں - اِقْمَطَرَّ الْیَوْمُ - دن سخت ھوگیا ، شَرٌّ مُقْمَطِرٌّ کے معنی ھیں ، شدید شر*** -

قرآن کریم میں ظہور نتائج کے دن کو یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا (۷۶/۱۰) کہا گیا ہے - بڑی سختی اور پریشانی کا زمانہ - ابن فارس نے بھی اس کے یہی بنیادی معنے دئے ھیں -

ق م ع

اَلْمِقْمَعَةُ - لوہے کا گرز- یا آنکس جس سے ھاتھی کو مارا جاتا ہے - اس کی جمع مَقَامِعُ آتی ہے*** - قرآن کریم میں اھل جہنم کے متعلق ہے - وَلَهُمْ مَقَامِعُ مِنْ حَدِیْدٍ (۲۲/۲۱) - ان کے لئے لوہے (حدید) کے گرز ھونگے - یہ وھی حدید (فولاد) ہے جسے اللہ نے نظام عدل قائم رکھنے کے لئے پیدا کیا ہے - (۵۷/۲۵) - یعنی قانون اور اس کے ساتھ تنفیذی قوت - قَمَعَهٗ قَمْعًا - وہ اس پر غالب آگیا اور اس نے اسے ذلیل کردیا - قَمَعَ فُلَانًا - اس نے فلاں آدمی کو اسکے ارادہ سے روک دیا - اَلْمَقْمُوْعُ - ذلیل - مردود مقہور*** - لہذا مَقَامِعُ (۲۲/۲۱) اس قوت کا نام ہے جس سے کسی سرکش کو

---

*محیط - **راغب - ***تاج و محیط و راغب -

اس کی سرکشی سے روک دیا جائے۔ مستبد اور ظالم کو مغلوب کرکے اسے بے بس بنا دیا جائے اور اس طرح مظلوموں کو اس کے ظلم سے محفوظ کر دیا جائے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ کسی کو ذلیل اور مغلوب کرنا اس مادہ کے بنیادی معنوں میں سے ہے۔

ق م ل

اَلْقَمْلُ جوں۔ اَلْقُمَّلُ (۷/۱۳۳)۔ چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں۔ چیچڑی۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ ایک کیڑا ہے جو فصل میں لگ جاتا ہے اور اسے بالکل خراب کر دیتا ہے*۔ کشاف میں اسکے معنے پسّو اور گھُن بھی دیئے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ چھوٹی مکھیاں ہوتی ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ سے چند الفاظ آتے ہیں جو حقارت اور ذلت پر دلالت کرتے ہیں۔

ق ن ت

قَنَتَ کے معنی ہیں کھڑا ہونا اور بات کرنے سے رک جانا۔ چنانچہ زجاج نے کہا ہے کہ قَائِمٌ بِاَمْرِ اللّٰهِ کو قَانِتٌ کہتے ہیں۔ یعنی قوانین خداوندی کو قائم کرنے والا۔ احکام خداوندی کو لیکر کھڑا ہو جانے والا*۔ اور سِقَاءٌ قَنِيْتٌ اس مشکیزے کو کہتے ہیں جو پانی کو اسطرح روک لے کہ اس میں سے ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہو*۔ لہذا اس کا صحیح مفہوم ہے اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھنا اور صرف قانون خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ اس قسم کی اطاعت کو اَلْقُنُوْتُ کہتے ہیں*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلْقُنُوْتُ سے مراد ہوتا ہے کسی کام کو دوام اور التزام سے کرنا اور استقامت رکھنا***۔

قرآن کریم میں اشیائے کائنات کے متعلق ہے کُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ (۲/۱۱۶)۔ ان میں سے کوئی چیز بھی اپنی قوتوں کو ضائع نہیں کرتی اور صرف قانون خداوندی کے مطابق صَرْف کرتی ہے۔ سب خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ تمام کی تمام نظام کائنات کو قائم رکھنے کے لئے کھڑی ہیں۔ یہی خصوصیت مومن مردوں اور عورتوں کی ہوتی ہے۔ اَلْقَانِتِيْنَ وَ الْقَانِتٰتِ (۳۳/۳۵)۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے۔ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ (۱۶/۱۲۰)۔ وہ ایک فرد نہیں تھا بلکہ اس کی ذات میں پوری امت سموئی ہوئی تھی۔

---

*تاج۔ **راغب۔ ***محیط۔

ایسی امت جو دعوت خداوندی کو لیکر کھڑی ہو اور اپنی تمام قوتوں کو اسی مصرف میں لانے کے لئے روکے ہوئے ہو۔ کامل اطاعت گذار اور فرمان پذیر امت۔ چنانچہ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی اطاعت کے دئے ہیں۔
اس مضمون کے لئے دیکھئے تتمہ میں مادہ "ام م"۔

ق ن ط

اَلْقَنْطُ۔ روکنا۔ قَنَطَ مَاءً عَنَّا۔ اس نے ہم سے پانی روک لیا۔ اسی سے اَلْقُنُوْطُ کے معنی ہیں بھلائی سے ناامید ہو جانا۔ قَنَطَ يَقْنِطُ۔ (نیز قَنَطَ يَقْنُطُ۔ اور قَنِطَ يَقْنَطُ) سخت مایوس ہو جانا۔ قَانِطٌ۔ مایوس ہو جانے والا *۔ ($\frac{۱۵}{۵۵ \cdot ۵۶}$)۔

سورۂ حٰم سجدہ میں يَئُوْسٌ قَنُوْطٌ ($\frac{۴۱}{۴۹}$) اکٹھا آیا ہے۔ سورۂ زمر میں ہے قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا۔ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ($\frac{۳۹}{۵۳}$)۔ (اے رسول) میرے ان بندوں سے جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کر لی ہے کہدو کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ (کا یہ قانون کہ حسنات، سیئات کو بہا لے جاتی ہیں) تمہاری تمام لغزشوں کے تخریبی اثرات سے تمہاری حفاظت کریگا۔ یقیناً وہ حفاظت اور رحمت کا مالک ہے۔ مسلمانوں نے اس آیت کو گناہوں کے لئے لائسنس سمجھ رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گناہ کرو اور خوب گناہ کرو۔ خدا کی رحمت ان سب کو معاف کر دیگی۔ جو شخص گناہ کرکے سمجھتا ہے کہ خدا اسے معاف نہیں کریگا وہ خدا کی رحمت سے مایوس ہے۔ اور خدا کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔

یہ تصور قرآن کریم کی کھلی ہوئی تعلیم اور دین کی اساس و بنیاد (یعنی قانون مکافات عمل) کے جسقدر خلاف ہے اسکی تشریح کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم نے اس آیت ($\frac{۳۹}{۵۳}$) میں عیسائیت کے اس غلط عقیدہ کی تردید کی ہے جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ آدم نے جو گناہ کیا تھا اسکی رو سے ہر انسانی بچہ گناہ گار پیدا ہوتا ہے اور یہ گناہ مٹ ہی نہیں سکتا۔ اسکی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ انسان حضرت مسیح[ؑ] کے کفارہ پر ایمان رکھے۔ اسی طرح ہندو دھرم میں بھی یہ عقیدہ ہے کہ انسان سے جو گناہ ایک دفعہ سرزد ہو جائے، کوئی عمل اس کا ازالہ نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے انسان کو تناسخ کے چکر میں مبتلا رہنا پڑتا ہے۔ یہودیوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ ہے کہ ان کے اسلاف نے (گوسالہ پرستی کا) جو گناہ کیا تھا اس کی

---

*تاج۔

پاداش میں انہیں کچھ دنوں کے لئے جہنم میں رہنا ہوگا۔ قرآن کریم نے پہلے تو اس غلط عقیدہ کی تردید کی کہ انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ۔ یا سابقہ جنم کے گناہوں کا بوجھ لیکر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس نے یہ کہا کہ اگر انسان سے کبھی لغزش ہو جائے تو اس سے انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ نہیں ہو جاتا۔ اس کے لئے باز آفرینی کے مواقع ساری عمر موجود رہتے ہیں۔ اس لئے جو خدا کی رحمت سے ہم کنار ہونا چاہتا ہے اسے کبھی یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس پر رحمت کے سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ رحمت کے دروازے کھلتے کس طرح ہیں؟ اسکا جواب خود قرآن کریم نے دوسری جگہ دیدیا ہے کہ وَمَنْ يَقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّوْنَ (۱۵/۵۶)۔ رحمت کے دروازے ان پر بند رہتے ہیں جو خدا کی راہ نمائی کو چھوڑ کر غلط راہوں پر چلتے رہتے ہیں۔ لہذا اسکی رحمت کا مستحق وہ ہوگا جو اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلے گا۔ اس کے سوا رحمت خداوندی سے بہرہ‌یاب ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ جتنی اور صورتیں ہم نے اپنے ذہن سے تراش رکھی ہیں وہ فریب نفس کے سوا کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱/۱۱۴) برائیوں کے اثرات زائل کرنے کے لئے بھلائی کے کام کرو۔ بھلائیوں کا زندگی بخش نتیجہ، لغزشوں کے تخریبی اثر کو زائل کر دیگا۔ (مزید تفصیل کے لئے عنوان ر-ح-م دیکھئے)۔

سورہ روم میں قَنِطَ۔ فَرِحَ کے مقابلہ میں آیا ہے (۳۰/۳۶)۔ صاحب لطائف اللغة نے کہا ہے کہ یَاْسٌ عمومی معنوں میں آتا ہے اور قُنُوْطٌ خصوصی معنوں میں۔ یعنی یہ، یاس سے زیادہ خصوصیت رکھتا ہے۔

ق ن ط ر

اَلْقَنْطَرَةُ۔ پل یا بلند عمارت۔ قَنْطَرَ عَلَيْنَا۔ وہ ہمارے پاس طویل عرصہ تک جم کر مقیم رہا*۔ لہذا اس لفظ میں کثرت کا تصور نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے۔ اسی لئے راغب نے لکھا ہے کہ اَلْقَنْطَرَةُ مِنَ الْمَالِ۔ مال کی اس مقدار غیر متعین کو کہتے ہیں جو کسی کے لئے کافی ہو**۔ (اسکی جمع اَلْقَنَاطِيْرُ آتی ہے)۔ اَلْقَنَاطِيْرُ الْمُقَنْطَرَةُ۔ (۳/۱۳) وہ مال جو قنطار قنطار کرکے جمع کیا گیا ہو**۔ اس میں مبالغہ پایا جاتا ہے***۔ یعنی بہت زیادہ۔

*تاج۔ **راغب۔ ***محیط۔

اس آیت (۳/۱۴) میں باقی چیزوں کے علاوہ ، مال و دولت کو انسان کے لئے وجہ جاذبیت بتایا گیا ہے ۔ قرآن کریم ، دولت سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا ۔ وہ ہر فرد سے کہتا ہے کہ وہ اکتساب دولت میں پوری کوشش کرے۔ لیکن اپنی کمائی ہوئی دولت کو اپنی ذات کے لئے محبوس نہ کر لے۔ اس میں سے اپنی ضروریات کے مطابق لے اور باقی سب نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا چھوڑ دے ۔ چنانچہ اسی آیت کے تسلسل میں (۳/۱۶) مومنین کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اَلْمُنْفِقِیْنَ ہوتے ہیں ۔ یعنی اپنی دولت کو کھلا رکھنے والے ۔ یہ ہے قرآن کریم کی رو سے سونے چاندی کے ڈھیر (۳/۱۴) کا مقصد ۔ یعنی اسے نوع انسان کی پرورش کے لئے عام رکھا جائے ۔ جو ایسا نہیں کرتے ان کے لئے دردناک عذاب کی وعید ہے (۹/۳۴)۔ یعنی اسطرح سے (Hoard) کی ہوئی دولت ، جہنم کی آگ بن جاتی ہے ۔

ق ن ع

قِنَاع* ۔ اس اوڑھنی کو کہتے ہیں جس سے عورتیں اپنا سر ڈھانپتی ہیں* ۔ راغب نے کہا ہے کہ جس چیز سے سر ڈھانکا جائے وہ قِنَاع* ہے ۔ اس سے قَنَّعَ کے معنی ہیں اس شخص نے اپنے فقر کو چھپانے کے لئے سر پر کچھ اوڑھ لیا** ۔ لہذا قَانِع* وہ شخص ہوگا جو اپنی احتیاج کو دوسروں پر ظاہر نہ ہونے دے ۔ اور اَلْقَنَاعَۃ* اخفائے حاجت کا نام ہوگا ۔ اس کے ساتھ ہی راغب نے لکھا ہے کہ قَنَّعَ کے معنی ہیں اس نے اپنی اوڑھنی کو اٹھا دیا اور اپنا سر کھول دیا ۔ یعنی اپنی احتیاج کو لوگوں پر ظاہر کردیا*۔ لیکن قَنُوْع* اسے بھی کہتے ہیں کہ انسان اپنے حصے پر راضی رہے اور تھوڑی سی بخشش پر خوش ہوجائے*۔ چنانچہ اَلْقَانِع* اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کے ساتھ رہے ، اس کا بچا کھچا کھا کر گذارہ کرے ، اور اس سے زیادہ کچھ نہ مانگے۔ اس سے قَنَاعَۃ* کے معنی تھوڑی سی چیز پر راضی ہوجانے کے ہونگے* ۔ قَانِع* اس سائل کو بھی کہتے ہیں جو باصرار نہ مانگے اور جو کچھ مل جائے اس پر راضی ہوجائے** (۲۲/۳۶) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی اپنی ضرورت کے لئے کسی دوسرے کی طرف متوجہ ہونا ہیں ۔

سر سے کپڑا اٹھانے کی جہت سے سر کو اٹھا کر چلنے کو بھی اِقْنَاع* کہتے ہیں ۔ چنانچہ اَقْنَعَ رَاْسَہٗ کے معنی ہیں اس نے اپنے سر کو اونچا کیا ۔ لیکن یہ اضداد میں سے بھی ہے ۔ یعنی اس کے معنی نیچا کرنا بھی ہیں ۔

*تاج ۔ **راغب ۔

أَقْنَعْتُ الْإِنَاءَ فِي النَّهْرِ کے معنی ہیں میں نے اپنے برتن کے منہ کو ندی کے بہاؤ کی طرف کرکے رکھدیا (ٹیڑھا کر دیا) تاکہ اس میں پانی بھر جائے۔ اس اعتبار سے کسی کی طرف مائل ہونے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ قَنِعَتِ الْإِبِلُ کے معنی ہیں اونٹ اپنی چراگاہ، یا باڑے کی طرف مائل ہوگئے*۔

سورۃ ابراہیم میں قرآن کریم نے اس بد حواسی کا نقشہ کھینچا ہے جو جنگ میں شکست خوردہ قوم پر چھاجاتی ہے اور اس سے اس میں افرا تفری پھیل جاتی ہے۔ اس ضمن میں کہا ہے کہ اُس وقت ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُؤُسِهِمْ (۱۴/۴۳)۔ مُهْطِعِيْنَ کے معنی ہیں بد حواس بھاگے جانا (دیکھئے ھ۔ ط۔ ع)۔ مُقْنِعِيْ رُؤُسِهِمْ کے معنی بعض نے کئے ہیں سر اٹھا کر بھاگے جانا۔

ق ن و

اَلْقِنْوَةُ۔ اَلْقُنْوَةُ۔ کمائی۔ قَنَوْتُهٗ۔ میں نے اسے کمایا، حاصل کیا اور اپنے لئے جمع کیا۔ اِقْتِنَاءُ الْمَالِ۔ مال حاصل کرنا اور جمع کرنا۔ اَلْقَنَاةُ۔ ڈنڈا۔ قَنَاءُ الْحَائِطِ۔ دیوار کی وہ جانب جس پر سایہ آجاتا ہو۔ نیز قَنَاةٌ اُس کظیمہ (نالی) کو کہتے ہیں جس سے پانی نکلتا ہے**۔ اَلْقِنْوُ و القُنْوُ۔ خوشہ (کھجور کا)۔ جمع اَلْقِنْوَانُ و القُنْوَانُ۔ قرآن کریم میں قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ (۶/۹۹) قریب جھکے ہوئے خوشوں کے لئے آیا ہے۔

ق ن ی

اَلْقِنْيَةُ۔ اَلْقُنْيَةُ۔ جو کچھ آدمی کما کر حاصل کرے۔ نیز جمع کیا ہوا مال۔ قَنَى الْمَالَ يَقْنِيْ۔ وہ مال کماتا ہے۔ اَقْنَاهُ اللّٰهُ۔ خدا نے اسے وہ چیزیں دیدیں جن کے حاصل ہوجانے کے بعد اسے سکون اور اطمینان نصیب ہوگیا۔ ان سے اس کی فوری ضروریات بھی پوری ہوگئیں اور وہ انہیں جمع کرکے بھی رکھ سکا۔ اَرْضٌ مَقْنَاةٌ اس زمین کو کہتے ہیں جو اترنے والے کے لئے بالکل موافق ہو جائے۔ جس میں اُسے سب کچھ مل جائے اور اس طرح وہ اس سے راضی ہو جائے۔ اسی اعتبار سے اَقْنٰى کے معنی راضی کرنے کے بھی آتے ہیں**۔

---

*تاج۔ **تاج و راغب۔

قرآن کریم میں ہے۔ وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَ اَقْنٰى (۵۳/۴۸)۔ خدا ہی غنی کرتا ہے اور وہ کچھ دیتا ہے جس سے انسان کو سکون اور اطمینان حاصل ہوجائے اور اسطرح وہ راضی ہو جائے۔

ق ہ ر

اَلْقَاهِرَةُ۔ ہر چیز کے اوپر کے حصے کو کہتے ہیں ، جیسے ہنسلی اور سینہ وغیرہ۔ اسی سے اس کے معنی بلندی کے آتے ہیں۔ جیسے جِبَالٌ قَوَاهِرُ۔ بلند پہاڑ۔ اور غلبہ کے معنی بھی۔ اَلْقَهْرُ۔ کسی کو مغلوب کرنے کےلئے اوپر سے پکڑ لینا۔ لہذا اس کے معنی تسلط۔ اقتدار۔ غلبہ۔ گرفت کے ہیں۔ قَهَرَهٗ۔ وہ اس پر غالب آگیا۔ نیز اس کے معنی تابع کرنے کےبھی آتے ہیں۔ لَحْمٌ مُقْهَوْرٌ۔ وہ گوشت جسے بھوننے کے لئے آگ پر رکھا جائے اور اس میں سے ہنوز پانی رس رہا ہو*۔

قرآن کریم میں خدا کی ایک صفت اَلْقَهَّارُ بھی آتی ہے۔ (۱۲/۳۹)۔ جَبَّارٌ کے معنی پہلے لکھے جا چکے ہیں (عنوان ج۔ ب۔ ر)۔ یعنی جو ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو قانون کے شکنجے میں کسکر جوڑ دے۔ اور اَلْقَهَّارُ کے معنی ہونگے وہ جس کا قانون سب پر غالب ہو۔ جسے کوئی شکست نہ دے سکے۔ جسے کوئی مغلوب نہ کرسکے۔ سورۃ انعام میں ہے۔ وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (۶/۱۸)۔ وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔ یہ قہاریت خدا کے تو شایان شان ہے کیونکہ ساری کائنات پر اسی کا غلبہ و اقتدار ہے۔ لیکن جب کوئی انسان اس قہاریت کا دعویٰ کرے تو اس کا نام فرعونیت ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے فرعون کا یہ قول نقل کیا ہےکہ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُوْنَ (۷/۱۲۷)۔ ''اور ہم ان (بنی اسرائیل) پر غالب ہیں''۔ یہ خالص استبداد ہے جس سے قرآن کریم نے منع کیا ہے جب کہا ہے کہ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ (۹۳/۹)۔ جو معاشرہ میں اکیلا رہ جائے ، اسے بے یار و مددگار سمجھ کر اس پر سختی نہ کرو۔ نہ ہی اسے ذلیل سمجھو۔ یتیموں پر سختی نہ کرو۔ اس ضمن میں یہ سمجھ لینا ضروری ہےکہ اشیائے کائنات کو اپنے تابع تسخیر کرنا تو بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن کسی انسان کا دوسرے انسان پر استبداد کرنا یا اسے ذلیل سمجھنا ٹھیک نہیں ہے۔ مگر ظلم کی قوتوں پر غلبہ حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ ان معنوں میں یہ صفت جماعت مومنین کےلئے محمود صفت ہوگی اور صفت خداوندی کا عکس۔ یاد رکھئے۔ قوت فی ذاتہٖ شر نہیں ہے۔

---

*تاج۔ **راغب۔

(خدا کی کوئی صفت بھی ، معاذ اللہ ، شر نہیں) ۔ اس کا استعمال اس کے خیر یا شر ہونے کا فیصلہ کرتا ہے ۔ اگر اسے کسی کمزور پر ظلم کرنے کے لئے استعمال کرو تو وہ شر ہے ۔ اور اگر اسے ظالم کا ظلم روکنے کے لئے صرف کرو تو عین خیر ۔ خدا چونکہ خیر ھی خیر ہے ، اس لئے اس کی ہر قوت ، حسن اور تعمیر کے لئے ہوتی ہے ۔ یہی صورت جماعت مومنین کی ہوتی ہے ۔

ق و ب

قَابٌ ۔ کمان کے درمیانی حصے (دستے) اور ایک کنارے کا درمیانی فاصلہ ۔ نیز مقدار* ۔

قرآن کریم میں مقام نبوت کے متعلق ہے ۔ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۔ (۵۳/۹) ایام جاہلیت میں عربوں کا قاعدہ تھا کہ جب وہ ایک دوسرے سے محکم عہد باندھتے تو وہ دو کمانیں لیتے ۔ ایک کو دوسری کے ساتھ ملا دیتے اور اسطرح ان دونوں کا قابٌ ایک کر دیتے ۔ پھر ان دونوں کمانوں کو اکٹھا کھینچکر ایک تیر چلاتے ۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا کہ ہم ایک جان دو قالب ہیں ۔ ایک کی رضامندی دوسرے کی رضامندی ہے ۔ جو ایک چاہتا ہے وہی دوسرا چاہتا ہے ۔ ہم دونوں ہم آہنگ زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے ہیں** ۔ قرآن کریم نے نبی کے متعلق بتایا کہ وہ احکام الٰہیہ کا اس قدر متبع ہوتا ہے اور اپنی زندگی کو قوانین خداوندی کے ساتھ اس درجہ ہم آہنگ کر دیتا ہے کہ اس کا اور خدا کا تعلق گویا ان ساتھیوں کا سا تعلق ہو جاتا ہے جنہوں نے قَابَ قَوْسَيْنِ والا عہد کیا ہو ۔ اَوْ اَدْنٰى ۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ قریب تر تعلق ۔ یہی وجہ ہے کہ حق کا استحکام جو نبی کی قوت بازو سے ہوتا ہے اسے خود خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے ۔ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸/۱۷) ۔ بدر کے میدان میں مخالفین حق کو تم نے قتل نہیں کیا اللہ نے قتل کیا تھا ۔ تم نے ان پر تیر نہیں چلائے تھے ، اللہ نے چلائے تھے ۔ نبی اور خدا کا تعلق اسی قسم کی رفاقت اور ہم آہنگی کا تعلق ہے ۔ غالب کے الفاظ میں ۔

تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق است
اما کشاد آں ز کمان محمدؐ است

یہ مقام نبی کو حاصل ہوتا ہے ۔ اور نبی پھر اس مقصد کے لئے اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت تیار کرتا ہے ۔ اسطرح انسانی دنیا میں خدا کے پروگرام

*تاج و راغب ۔ **بحوالہ روح المعانی ۔

اس جماعت کے ہاتھوں سے تکمیل تک پہنچتے ہیں جو نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے وجود میں آتی ہے ۔ حق کا علَم انہی کے ہاتھوں سے بلند ہوتا ہے ۔ یہ اپنے آپ کو وحی خداوندی کے ساتھ اس درجہ ہم آہنگ کر دیتے ہیں کہ ان کے فیصلے اور عمل دنیا میں خیر و شر کا معیار بن جاتے ہیں ، اور ان کی ''تیر اندازی'' خود خدا کی تیر افگنی ہو جاتی ہے ۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ، خدا اور بندے کا تعلق باہمی رفاقت کا ہے ۔ نبی اکرمؐ کے ارشاد گرامی کے مطابق ، جو حضورؐ نے اپنی حیات ارضی کے آخری سانس میں فرمایا تھا ، خدا رفیق اعلیٰ ہے ۔ انسان کا فریضہ ہے کہ خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل رہے ۔ خدا کے ساتھ اسی عہد کا نام ایمان ، اور اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ ''خدا کا قرب اور رضا جوئی'' ہے ۔ یعنی خدا کے پروگرام سے ہم آہنگ ہوجانا ۔

ق و ت

اَلْقُوْتُ (جمع اَقْوَاتٌ) ۔ اتنی خوراک جس سے انسان زندہ رہ سکے* ۔ قرآن کریم میں ارض کے متعلق ہے ۔ وَ قَدَّرَ فِيْهَا اَقْوَاتَهَا (۴۱/۱۰) ۔ اس میں خوراک پیدا کرنے کے پیمانے مقرر کر دیئے ۔ ایسا قانون بنا دیا جس کی رو سے وہ مختلف موسموں میں خوراک پیدا کرتی چلی جائے ۔

اَلْمُقِيْتُ ۔ محافظ ۔ نگران ۔ وہ جو ہر شخص کو اس کی روزی یا ضرورت کی اشیاء پہنچاتا ہے ۔ وہ جو مخلوقات کو ان کا رزق دیتا ہے* ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جو کسی چیز کی نگرانی وحفاظت کرے اور اس کی خوراک کا بند و بست کرے** ۔ قرآن کریم میں ہے وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا (۴/۸۵) ۔ اس کے معنی ہوں گے کائنات کی ہر شے کو اسباب زیست بہم پہنچانے والا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی محافظ اور قادر کے بھی ہیں ۔

ق و س

اَلْقَوْسُ ۔ کمان*** قرآن کریم میں قَابَ قَوْسَيْنِ (۵۳/۹) آیا ہے ۔ اس کے مفہوم کے لئے عنوان (ق ۔ و ۔ ب) دیکھئے ۔

قَاسَ الشَّيْءَ بِغَيْرِهٖ ۔ کسی چیز کا کسی دوسری چیز سے اندازہ کرنا* (نیز ابن فارس) ۔ زیا اس قَاسَ يَقُوْسُ کسو قَاسَ يَقِيْسُ پر قیاس کرلیا

*تاج ۔ **راغب ۔ ***تاج و راغب

جائے گا۔ دونوں ہم معنی ہیں۔ اَلْمِقْوَسُ۔ وہ جگہ جہاں سے گھوڑے گھوڑ دوڑ کے لئے چھوڑتے ہیں۔ اس کی اصل یہ ہے کہ وہاں ایک رسی کمان کی شکل کی باندھ دی جاتی ہے اور اس رسی کے پیچھے سے گھوڑوں کو چھوڑا جاتا ہے*۔

نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ (ق - و - س) کا خاصہ شدت اور اجتماع ہے۔ قَوْسٌ (کمان) میں سختی بھی پائی جاتی ہے اور اس کے دونوں سروں کے ملے ہوئے ہونے کے اعتبار سے اجتماعیت بھی**۔

ق و ل

قَوْلٌ۔ زبان سے کچھ کہنا، خواہ وہ مفرد ہو یا جملہ ہو۔ جو بات ابھی ذہن میں ہو اور زبان تک نہ لائی گئی ہو اسے بھی قَوْلٌ کہتے ہیں۔ نیز عقیدے، خیال اور رائے کو بھی۔ جیسے فُلَانٌ يَقُوْلُ بِقَوْلِ الشَّافِعِيِّ وغیرہ***۔

اس کے مجازی معنی بہت سے آتے ہیں۔ مثلاً مارنا۔ غالب آنا۔ مر جانا۔ راحت پانا۔ متوجہ ہونا۔ وغیرہ***۔

تَقَوَّلَ عَلَيْهِ قَوْلًا کے معنی ہیں اپنی طرف سے بات بنا کر دوسرے کی طرف منسوب کرنا (۶۹/۴۴)۔

دل میں خیال کرنے کے لئے قرآن کریم میں ہے وَيَقُوْلُوْنَ فِىْ اَنْفُسِهِمْ (۵۸/۸)۔ قَوْلٌ کی جمع اَقْوَالٌ اور اس کی جمع اَقَاوِيْلُ ہے (۶۹/۴۴)۔ قِيْلٌ۔ کہنا۔ بات چیت۔ دل کی پکار (۴۳/۸۸)۔

نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ (ق - و - ل) کا خاصہ حرکت کرنا اور پھڑ پھڑانا ہے۔ قَوْلٌ میں زبان یا ہونٹوں کی حرکت موجود ہوتی ہے**۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ اس کے ابتدائی اور حقیقی معنی ہیں۔ مجازی طور پر تو دل کے عقیدہ پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم میں یہ مادہ بے شمار مقامات میں آیا ہے۔ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن ہر مقام پر اس کا مفہوم آسانی سے متعین ہو جائے گا۔ اس لئے ہمیں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

---

*تاج و راغب۔ **العلم الخفاق۔ ***تاج۔

ق و م

قَامَ ۔ قِیَاماً ۔ کھڑا ہونا ۔ متوازن ہونا ۔ کسی معاملہ کا اعتدال اور توازن پر ہونا ۔ محکم اور استوار ہونا ۔ ثابت اور دائم رہنا ۔ کسی کام کو ہمیشہ کرتے رہنا ۔ رک جانا ۔ کسی جگہ ٹھہر جانا ۔ بارونق ہونا* ۔ اَقَامَ ۔ درست اور سیدھا کیا ۔ کھڑا کیا * ۔

قَامَ الرَّجُلُ الْمَرْاَۃَ وَقَامَ عَلَیْھَا ۔ مرد نے عورت کی کفالت کی ، اسکی ضروریات کو پورا کیا اور ان کا ذمہ دار ہوا ۔ اس کے لئے رسد لایا ۔ قَوَّامٌ ۔ سامان رزق مہیا کرنے والا ، کیونکہ رزق سے معاشرتی زندگی کا توازن قائم رہتا ہے * ۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (۴/۳۴) کے یہی معنی ہیں ۔ یعنی تقسیم کار کی رو سے مردوں کے ذمہ یہ ہے کہ وہ عورتوں کی ضروریات زندگی کے کفیل ہوں کیونکہ انہیں بچوں کی پرورش اور تربیت میں مصروف رہنا پڑتا ہے ۔ اس کے معنی حاکم یا داروغہ نہیں ہیں ۔ نیز قَوَّمَ الشَّیْءَ کے معنی ہیں کسی چیز کو صحیح طور پر برابر اور ہموار کر دینا یا درست کر دینا* ۔

قَوَامٌ ۔ عدل و توازن ۔ وہ سامان جس کے ذریعے زندگی گذاری جائے ۔ اتنا کچھ جس سے صرف ضروریات زندگی پوری ہو سکیں ۔

قِوَامٌ ۔ وہ چیز جس پر کسی معاملہ کا دارو مدار ہو ۔ وہ جس کے سہارے کوئی معاملہ کھڑا رہ سکے ۔ اتنی روزی جو انسان کو کھڑا رکھ سکے ۔ چنانچہ فُلَانٌ قِوَامُ اَھْلِ بَیْتِہٖ کے معنی ہیں فلاں شخص اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کرنے والا ہے * ۔

قَامَۃٌ ۔ آدمی کا قد ۔ قد کا متوازن طول ۔ حسن قامت * ۔ قِیْمَۃٌ ۔ کسی چیز کا بدل * ۔ جب ایک چیز کی جگہ دوسری چیز رکھدی جائے اور وہ اسکے برابر تصور کر لی جائے ، تو وہ اسکی قِیْمَۃٌ ہو جائیگی ۔ اِسْتَقَامَ الْاَمْرُ ۔ کسی معاملہ کا معتدل و متوازن ہو جانا * ۔ مُسْتَقِیْمٌ ۔ معتدل و متوازن ۔ ٹھیک ٹھیک توازن و تناسب لئے ہوئے * ۔ تَقْوِیْمٌ ۔ عدل و توازن برقرار کرنا * ۔ (تَقْوِیْمُ الْبُلْدَانِ ۔ جغرافیہ کے نقشہ کو کہتے ہیں ۔ اور آجکل تَقْوِیْمٌ کا لفظ کیلنڈر ، جنتری ، کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے)** ۔

مَقَامٌ ۔ کھڑے ہونے کی جگہ * ۔ قَیُّوْمٌ ۔ وَقَیَّامٌ ۔ اپنی مخلوق کے معاملات کی اسطرح تدبیر کرنے والا کہ انکی پیدائش ، اور روزی بہم پہنچانے کا بندوبست کرے اور ان کے رہنے کے مقامات کا علم رکھے ۔ جو ہر چیز

---

*تاج ۔ **محیط ۔

پر نگران ہو۔ نیز قَیُّوْمٌ کے معنے قائم بالذات بھی ہیں۔ یعنی جو اپنے قیام کے لئے کسی کا محتاج نہ ہو، لیکن اس کے بغیر کسی چیز کے قیام کا تصور بھی نہ کیا جا سکے۔ (۲۵۵؍۲ ؛ ۱۱۱؍۲۰) ***۔ اَمْرٌ قَیِّمٌ کے معنی ہیں مستقیم و مستوی امر: معتدل و متوازن کام *۔ خُلُقٌ قَیِّمٌ۔ متوازن اخلاق۔ دِیْنٌ قَیِّمٌ۔ ایسا دین جس میں ہر شے متوازن و متناسب ہو۔ کُتُبٌ قَیِّمَةٌ۔ وہ مستقیم و متوازن قوانین جو حق کو باطل سے واضح کر دیں *۔ قَوْمٌ۔ مردوں اور عورتوں کی جماعت۔ یا صرف مردوں کی جماعت جس میں عورتیں نہ ہوں *۔

مفردات امام راغب میں ہے کہ قِیَامٌ لِلشَّیْءِ سے کسی چیز کی رعایت اور حفاظت مقصود ہوتی ہے اور کبھی قِیَامٌ عزم اور پختہ ارادے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور قِیَامٌ اور قِوَامٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کوئی چیز مضبوط اور مستحکم رہ سکے۔ قَیُّوْمٌ۔ ہر چیز کا نگران۔ نیز اسے استحکام و توازن بخشنے، حفاظت کرنے اور وہ تمام چیزیں مہیا کرنے والا جو اسکی بقا و استحکام کے لئے ضروری ہیں۔

قِیَامَةٌ کا اصلی مفہوم ہے انسان کا یکبارگی اٹھ کھڑے ہونا۔ یہ لفظ قِیَامٌ کے آخر میں "ۃ" کے اضافہ سے بنا ہے جس سے مطلب ہے یکبارگی ہونا۔ القِیَامَةُ سے مراد اس خاص گھڑی کا واقع ہو جانا ہے جس میں انسان اسطرح یکبارگی کھڑا ہو جائے۔

اِقَامَةُ الشَّیْءِ۔ کسی چیز کا پورا پورا حق ادا کر دینا۔ نیز الاِقَامَةُ فِی الْمَكَانِ کسی جگہ جم کر رہنے کے معنوں میں آتا ہے **۔ اس سے مُقِیْمٌ، ہمیشہ رہنے والے کے لئے آتا ہے۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنی توازن قائم رکھنے کے ہیں۔ لہذا اس مادہ سے جتنے الفاظ آئیں گے ان میں یہ بنیادی مفہوم ضرور موجود رہے گا۔ خواہ یہ توازن جسمانی ہیئت و پیکر کا ہو، یا معاشرتی اور تمدنی توازن، یا نفسیاتی توازن۔ جس چیز کا توازن بگڑ جائے وہ قائم (کھڑی) نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ قصہ حضرت موسیٰ کے ضمن میں یتیم بچوں کی دیوار کے متعلق ہے۔ جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ (۷۷؍۱۸) وہ دیوار گرا چاہتی تھی تو اس نے اسے قائم (کھڑا) کر دیا۔ اسی سورہ (کہف) کے شروع میں قَیِّمًا کے پہلے لَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا (۲،۱؍۱۸) سے واضح کر دیا کہ قَیِّمٌ وہی چیز ہو سکتی ہے جس میں کسی قسم کی کجی نہ ہو۔ اسی سے دِیْنُ الْقَیِّمَةِ (۵؍۹۸) اور کُتُبٌ قَیِّمَةٌ۔ (۳؍۹۸) کے معنی واضح ہیں۔ خود قرآن کریم کے متعلق ہے کہ وہ ایسی راہ بتاتا ہے جو

*تاج۔ **راغب۔ ***تاج و لطائف اللغه

آقْوَمُ (۱۷/۹) ھے - یعنی سب سے زیادہ سیدھی اور معتدل - اور انسان کے متعلق ھے کہ اسے آحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (۹۵/۴) میں پیدا کیا گیا ھے - یعنی بہترین توازن کا حامل - آلْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ (۱۷/۳۵) "سیدھی ترازو" سے مُسْتَقِیْم* کے معنی واضح ھیں - یعنی سیدھی راہ ھی نہیں بلکہ اس کے ساتھ اسقدر متوازن کہ ذرا سی افراط و تفریط بھی اس کا توازن بگاڑ دے - جسطرح سورہ فرقان میں افراط و تفریط کی دو راھوں کے درمیان ، اعتدال کی روش کو کَانَ بَیْنَ ذَالِکَ قَوَاماً (۲۵/۶۷) کہا گیا ھے -

سورہ بقرہ میں مَشْیٌ* کے مقابلہ میں قَامَ لاکر (۲/۲۰) بتا دیا ھے کہ اس کے معنی رک جانے اور ٹھہرجانے کے ھیں- نیز ظَعْنٌ* (کوچ) کے مقابلہ میں اِقَامَۃٌ* سے اس کا مفہوم واضح کر دیا ھے (۱۶/۸۰) - اسی طرح سورہ ھود میں اجڑی ھوئی بستیوں (حَصِیْدٌ*) کے مقابلہ میں قَائِمٌ* (۱۱/۱۰۰) لاکر یہ واضح کر دیا ھے کہ اسکے معنی آباد اور پر رونق کے ھیں - نیز سَبِیْلٍ مُقِیْمٍ (۱۵/۷۶) کے معنی بھی بارونق اور چلتے ھوئے راستے کے ھیں - سورہ تکویر میں لِمَنْ شَاءَ مِنْکُمْ اَنْ یَسْتَقِیْمَ (۸۱/۲۸) سے صِرَاطٌ* مُسْتَقِیْمٌ* (۱/۵) پر چلنے کی وضاحت ھو جاتی ھے -

قِیَامَۃٌ* کا لفظ قرآن کریم کی ان بنیادی اصطلاحات میں سے ھے جن کا مفہوم بڑا جامع ھوتا ھے - جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ھے ، (امام راغب کے قول کے مطابق) اس کا مفہوم ھے ایسا قیام جو یکبارگی واقع ھو جائے - اس دنیا میں قِیَامَۃٌ* کسی قوم کی وہ نشاۃِ ثانیہ (حیات جدید) ھے جو انقلاب کی رو سے ظہور میں آئے - یعنی وہ قوم یکبارگی اٹھ کھڑی ھو - اور مرنے کے بعد دوسری زندگی تو ھے ھی ایک انقلابی ظہور - قیامت ، آخرت ، ساعت ، بعث ، وغیرہ الفاظ کا مفہوم قرآن کریم کے مختلف مقامات میں سامنے آجاتا ھے - ان مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ھوگا کہ متن کے اعتبار سے متعلقہ لفظ کے معنی اس دنیا میں انقلاب اور نشاۃِ ثانیہ ھیں یا اخروی زندگی کا بعث و قیام - [شاہ ولی اللہ - حجۃ اللہ البالغہ - کتابُ الفِتَن میں لکھتے ھیں کہ "زبانِ شریعت میں حشر کے دو معنی ھیں - ایک ملک شام میں لوگوں کا جمع ھونا - قیامت سے پیشتر یہ واقعہ اسوقت ھوگا جب زمین پر لوگوں کی قلت ھو جائیگی تو بعض لوگ مختلف تقریبوں کی وجہ سے اور بعض لوگ آگ (جنگ) کی وجہ سے وھاں جمع ھونگے* - دوسرے حشر کے معنی ھیں موت کے بعد اکٹھا

---

* غالباً مغلوں کے شام پر حملہ کیطرف اشارہ ھے جو تیمور کی زیر سر کردگی ھوا تھا - خود شاہ صاحب نے اس کا ذکر چند سطور آگے چل کر کیا ھے -

ہونا "۔] اسی طرح قیامت کا لفظ بھی اس دنیا میں قیام اور موت کے بعد کے قیام کےلئے بولا جائیگا۔

قوم ۔ قومیت ۔ جب انسان نے انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر تمدنی اور اجتماعی زندگی شروع کی تو اس کا آغاز لامحالہ خاندان اور قبیلہ سے ہونا تھا ۔ چنانچہ ایک خاندان (اور خاندان سے آگے بڑھ کر ایک قبیلہ) کے افراد ایک وحدت قرار پا گئے جن میں وجہ جامعیت خون کا رشتہ (یا نسبی تعلق) تھا ۔ جب مختلف گروہوں میں باہمی مفاد کا تصادم ہوا تو ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن بن گیا ۔ اسطرح ایک قبیلہ کے افراد میں باہمی عصبیت اور دوسرے قبیلہ کے افراد کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات بیدار ہوگئے ۔ اور یوں انسانی وحدت (مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر) پارہ پارہ ہو گئی ۔ یہ سلسلہ آجتک جاری ہے ۔ دور حاضر کی سیاسی اصطلاح میں اسے قومیت یا نیشنلزم کہتے ہیں ، جس نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے ۔ اس میں صرف اسقدر اضافہ ہوا ہے کہ بعض ممالک میں (ایک نسل کے بجائے) ایک وطن کی چار دیواری میں رہنے والے افراد کو ایک قوم قرار دیدیا جاتا ہے ۔

اسلام نے انسانوں کی تقسیم کا یہ اصول بدل دیا اور کہدیا کہ ایک نظریۂ زندگی کے ماننے والے انسان (بلا لحاظ نسل ۔ زبان ۔ وطن) ایک برادری کے افراد ہیں اور اس کے برعکس نظریہ کے قائل ، دوسری برادری کے افراد ۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں اسے ایمان اور کفر کی تفریق ، اور دور حاضر کی اصطلاح میں آئیڈیالوجی کی تمیز کہتے ہیں ۔ لہذا ، قرآن کریم کی رو سے دنیا میں قومیں دو ہی ہیں ۔ ایک وہ جو قرآنی ضابطۂ حیات کو صحیح مانتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس کے خلاف کسی اور مسلک حیات کے قائل ہیں (۶۴/۳) ۔ جب حضرت نوحؑ سے کہا گیا تھا کہ خود تیرا بیٹا بھی تیرے اپنوں میں سے نہیں (۱۱/۴۶) کیونکہ وہ ایمان نہیں لایا تھا ، تو وہ اسی اصول کا اعلان تھا ۔ اسی طرح جب حضرت لوطؑ سے کہا تھا کہ تیری بیوی بھی تیرے اپنوں میں سے نہیں کیونکہ وہ ان کی جماعت میں داخل نہیں ہوئی تھی ، تو وہ بھی اسی اصول کی بنا پر تھا ۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے پہلے اپنے باپ اور پھر ساری قوم سے کہدیا تھا کہ تم میرے اپنے نہیں ہوسکتے جب تک تم خدا پر ایمان نہ لاؤ ، تو وہ بھی اسی حقیقت کا اظہار تھا (۶۰/۴) ۔ اس کے برعکس انہوں نے اس اصل عظیم کا اعلان کیا تھا کہ میرے اپنے وہ ہیں جو میرا اتباع کرتے ہیں (۱۴/۳۶) ۔ اسی معیار کے مطابق ، خدا کے آخری نبیؐ نے ایک عالمگیر برادری کی تشکیل کی جب کہا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۴۹/۱۰) "سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں" خواہ ان کا رنگ ، نسل ، زبان ، وطن ، کوئی بھی ہو ۔

یہ ہے صحیح قومیت کا معیار جس کی رو سے قرآن کریم، انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل کرنا چاہتا ہے۔ اب دنیا، قومیت کے غلط اصول سے تنگ آکر خود اس حقیقت کی معترف ہو رہی ہے کہ انسانوں کے لئے صحیح وجہ جامعیت ہم آہنگی فکر و نظر (آئیڈیالوجی کی یکسانیت) ہے، نہ کہ اشتراک رنگ و وطن۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک دنیا قرآنی اصول زندگی کو اختیار نہیں کرتی عالم انسانیت میں کبھی امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اسی سے وہ عالمگیر برادری وجود میں آسکتی ہے جو انسانوں کی خود ساختہ حدود و قیود سے بلند ہو کر، وحدت انسانیت کے اصول کی حامل ہوگی۔ یہی قرآنی معاشرہ کا مقصود و منتہیٰ ہے۔

قرآن کریم نے جماعت مومنین کے مسلک اور روش زندگی کو ''صراط مستقیم'' سے تعبیر کیا ہے (۵/۱)۔ یعنی سیدھی اور متوازن ہموار راہ۔ یہ چیز ایک عظیم حقیقت کیطرف دلالت کرتی ہے۔ قرآن کریم سے پہلے، ارباب فکر اور اہل مذاہب، زندگی کی حرکت کو دوری (Cyclic) تسلیم کرتے تھے۔ حکمائے یونان نے جب دیکھا کہ آسمان کے مختلف کرے گول ہیں تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ مقصود فطرت ''دائرہ'' ہے، سیدھا چلنا نہیں۔ اس اعتبار سے انہوں نے سب سے پہلے یہ نظریہ ایجاد کیا کہ کائنات کی حرکت دوری ہے۔ یعنی وہ ایک متعین دائرے میں گردش کر رہی ہے، آگے نہیں بڑھ رہی۔ اسی سے فیثا غورث نے تناسخ کا نظریہ قائم کیا۔ یعنی یہ نظریہ کہ انسانی روح، جون بدل بدل کر، بار بار اس دنیا میں، مختلف قالبوں میں آتی ہے۔ روح کو اس چکر سے نجات مل جانا، مقصود حیات ہے۔ یہی تصور ہندوؤں کے فلسفہ کی بنیاد ہے اور اسی پر ان کے تصوف (یوگ) کی عمارت بھی استوار ہوتی ہے۔ یعنی انسانی روح درحقیقت خدا کی روح (پرم آتما) کا ایک جزو ہے جو اپنی اصل سے الگ ہو کر، زندگی کے چکر میں پھنس چکی ہے۔ اس کا ان چکروں سے آزادی حاصل کر لینا اور پھر سے اپنے کل سے جا ملنا، مقصود زندگی ہے۔ یہی تصور مجوسیوں کے ہاں پایا جاتا ہے اور اسی سے ''وحدت الوجود'' کا نظریہ مستعار لیا گیا ہے جو ہمارے تصوف کی بنیاد ہے۔ یہی ''چکر'' عیسائیت اور یہودیت میں ملتا ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر بچہ اپنے اولین ماں باپ (آدم و حوا) کا گناہ، پیدائشی طور پر اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اگر وہ حضرت مسیح ؑ کے کفارہ پر ایمان لے آتا ہے تو وہ گناہ اس سے دھل جاتا ہے اور وہ جنت میں چلا جاتا ہے۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے اسلاف سے جو چند دنوں کے لئے (گوسالہ پرستی کی) غلطی ہوگئی تھی اس کی پاداش میں انہیں چند دنوں کے لئے جہنم میں جانا پڑے گا۔

آپ نے دیکھا کہ ان تمام نظریات کا ماحصل یہ ہے کہ انسانی زندگی کا منتہیٰ اور مقصود وہ کچھ ہو جانا ہے جو وہ پہلے تھی۔ یعنی اس میں آگے بڑھنے یا ترقی کرنے کا سوال نہیں - (As you were) ہوجانا مقصودِ حیات ہے - دوری حرکت (Cyclic Movement) سے بھی مراد ہے - یعنی ایک دائرے میں گردش کرتے ہوئے جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ جانا -

قرآن کریم نے اربابِ فکر اور اہلِ مذاہب کے اس غلط نظریہ کی تردید کی اور کہا کہ زندگی کولھو کے بیل کی طرح ، ایک دائرے میں گردش کرنے کا نام نہیں - آگے بڑھنے اور بلند ہونے کا نام ہے - خدا ، کائنات کو صراط مستقیم پر لئے جارہا ہے - اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۱۱/۵۶)- اس میں نت نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں - یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ (۳۵/۱) - اورانسان کو بھی صراط مستقیم پر چلنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے - اس میں زندگی کی ممکنات (Possibilities) ودیعت کر دی گئی ہیں اور جد و جہد کا وسیع میدان دے دیا گیا ہے - جو شخص ، قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گا ، اس کی ممکنات ، مشہود ہوتی جائیں گی اور وہ سفر زندگی میں آگے بڑھتا جائیگا - اس طرح اس کا سفر ، ایک دائرے میں نہیں ، بلکہ سیدھے اور متوازن راستے پر ہوگا - اس سے اس کی زندگی کی سطح بلند ہوتی جائے گی اور وہ ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا جائیگا - لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴/۱۹) ”تم ضرور منزل بہ منزل - درجہ بہ درجہ - بلند ہوتے چلے جاؤ گے“ - اس لئے ، خدا صرف صراط مستقیم (سیدھی اور توازن بدوش) راہ ہی کا مالک نہیں- وہ ذِی الْمَعَارِجِ (۷۰/۳) بھی ہے - یعنی ”سیڑھیوں والا“- بلندیوں کی طرف لےجانے والا - اس لئے قرآن کریم کی رو سے ، زندگی کا منتہیٰ (As you were) ہو جانا نہیں - بلکہ ارتقائی منازل طے کرکے آگے بڑھتے چلے جانا ہے - کائنات میں خدا کا قانونِ ارتقاء کار فرما ہے -

زندگی کی دوری حرکت کا تصور ، عہد کہن کے انسانی ذہن ہی کا مغالطہ نہیں تھا - اس زمانے میں بھی جہاں انسانی فکر نے وحی سے روشنی نہیں لی ، وہ اسی چکر میں پھنس گیا ہے - جرمنی کے مشہور فلاسفر نیٹشے کا ”تکرارِ ازلی“ (Eternal Recurrence) کا نظریہ اسی مغالطہ کا رھین منت ہے- ہیگل کا نظریۂ اضداد بھی اسی کا مظہر ہے - وہ کہتا ہے کہ دنیا میں ایک تصور (Idea) پیدا ہوتا ہے- پروان چڑھتا ہے- جب وہ اپنے شباب پر پہنچتا ہے تو اس میں سے اس کی ضد دوسرا نظریہ پیدا ہو جاتا ہے جو پہلے نظریہ کو ختم کر دیتا ہے - پھر جب یہ دوسرا نظریہ پروان چڑھتا ہے تو اس میں سے اس

کی ضد پیدا ہوتی ہے ۔ تصورات (Ideas) کا یہی چکر ہے جو کائنات میں کارفرما ہے ۔ ہیگل (Hegel) کے متبع مارکس (Marx) نے کہا کہ یہ چکر تصورات میں نہیں بلکہ نظامہائے زندگی (Social Orders) میں کار فرما ہے ۔ دنیا میں ایک معاشی نظام قائم ہوتا ہے ۔ پروان چڑھتا ہے ۔ پھر اس میں سے اس کی ضد دوسرا نظام پیدا ہوتا ہے جو پہلے نظام کے لئے پیغام مرگ بن جاتا ہے ۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری ہے ۔ پہلے نظام سرمایہ داری کا دور دورہ تھا ۔ جب وہ نظام شباب تک پہنچ گیا تو اس میں سے اس کی ضد، نظام اشتراکیت پیدا ہوگیا ۔ اب اس کی باری ہے ۔

آپ نے غور کیا کہ تنہا عقل انسانی نے جب بھی زندگی کے متعلق کوئی تصور قائم کرنا چاہا ہے تو اس نے اس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں ۔ یہ صرف وحی کی روشنی ہے جو انسان کو صحیح نظریہ زندگی عطا کر سکتی ہے ۔ اور وہ نظریۂ زندگی ہے ''صراطِ مستقیم'' پر چلنا ۔ یعنی نہ ایک مقام پر کھڑے رہ کر جامد اور متصلب (Static) ہو جانا ، اور نہ ہی دائرے میں گردش کرتے رہنا ۔ بلکہ زندگی کے سیدھے اور ہموار راستے پر چلتے جانا اور اسطرح آگے بڑھتے چلے جانا ۔ ''حرکت اور ارتقاء'' یہ ہے قرآنی نظریۂ زندگی کا ماحصل جسے اس نے ''صراط مستقیم'' سے تعبیر کیا ہے ۔

ق و ی

قُوَّۃٌ* ۔ دراصل رسی کے ایک بٹ کو کہتے ہیں** ۔ (جس کی جمع اَلْقُوَی ہے)۔ حَبْلٌ قَوٍ ۔ مختلف بٹوں والی رسی ۔ یہیں سے اَلْقُوَّۃُ کے معنی قدرت کے ہیں ۔ یہ ضُعْفٌ کی ضد ہے ، خواہ جسمانی ہو یا عقلی : اسکی جمع قِوًی اور قُوًی ہے ۔ اَلْقَوِیُّ طاقتور اور قوت والے کو کہتے ہیں ۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے ، اس لئے کہ کمالِ قوت اور ہر قسم کی طاقت کا وہی تنہا مالک ہے (۱۱/۶۶) ۔ فَرَسٌ مُقْوٍ ۔ طاقتور گھوڑا* ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے ایک بنیادی معنی تو سختی، قوت اور زور کے ہیں لیکن دوسرے بنیادی معنی قلت خیر ۔ یعنی مال و دولت اور عمدہ چیزوں کی کمی کے ہیں ۔ اس اعتبار سے اَلْقَوَاءُ ویران زمین کو کہتے ہیں اور اَلْقَوَی بھوک کو کہتے ہیں ۔ اصل میں اس کے معنی خالی ہونے کے ہیں۔

*تاج و محیط ۔ **بٹ کے معنے بھی سمجھ لینے چاہئیں ۔ مثلاً تین باریک رسیوں کو بل دیکر ایک موٹی رسی بنائی جائے ۔ تو ان تین رسیوں میں سے ہر ایک کو اس موٹی رسی کا بٹ کہینگے ۔

اَقْوَتِ الدَّارُ۔ گھر خالی ھوگیا۔ اس اعتبار سے چٹیل میدان کو بھی اَلْقَوَاءُ کہتے ھیں جو سبزی سے خالی ھو چکا ھو۔ اَلْقَاوِیَۃُ۔ انڈے کے خالی چھلکے کو کہتے ھیں جس سے بچہ نکل چکا ھو۔ اَلسَّنَۃُ الْقَاوِیَۃُ۔ اُس سال کو کہتے ھیں جس میں بارش بہت کم ھوئی ھو۔ اَقْوَی الرَّجُلُ۔ بے آب و گیاہ زمین میں اس کا توشہ ختم ھوا۔ وہ بھوکا اور نادار ھوا۔ اس کے پاس کھانے کو کچھ نہ رھا، خواہ وہ ایسی ناداری کی حالت میں اپنے گھر اور اپنی قوم کے درمیان ھی کیوں نہ ھو*۔

قرآن کریم نے زمین کی پیداوار کے متعلق کہا ھے کہ وہ مَتَاعًا لِلْمُقْوِیْنَ (۵۶/۷۳) ھے۔ اس کے معنی یہ ھیں کہ وہ معاشرہ کے ان افراد کے لئے ھے جن کے پاس کھانے کو کچھ نہ ھو۔ یعنی زمین کی پیداوار انسانی پرورش کے لئے ھے نہ کہ ذاتی املاک بنا لینے کے لئے۔ صاحب محیط نے مُقْوِیْنَ کے معنی لکھے ھیں وہ جن کے پیٹ یا توشہ دان کھانے سے خالی ھوں**۔ یا وہ لوگ جو بے برگ و گیاہ میدان میں اتریں جہاں کھانے کو کچھ نہ ھو۔ مفہوم دونوں کا ایک ھے۔ یعنی معاشرہ کے ضرورت مند افراد۔ اسی کو دوسری جگہ سَوَاءً لِلسَّائِلِیْنَ (۴۱/۱۰) کہا گیا ھے۔ یعنی زمین کو تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رھنا چاھئے۔

قُوَّۃٌ۔ کے لئے قرآن کریم میں ھے۔ خُذِ الْکِتَابَ بِقُوَّۃٍ (۱۹/۱۲)۔ اس ضابطۂ خداوندی کو نہایت مضبوطی سے پکڑو۔ پختہ عزم کرو کہ اس کی تعمیل کرو گے۔ ذُوْ الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنِ (۵۱/۵۸)۔ زبردست قوت والا۔ خدا۔ شَدِیْدُ الْقُوٰی (۵۳/۵)۔

لہذا، مومن بھی (حد بشریت کے اندر) صاحب قوت ھوتا ھے۔ کمزور اور ناتواں نہیں ھوتا۔ جو قوم کمزور اور ناتواں ھو اسے سمجھ لینا چاھئے کہ وہ قرآنی معیار کے مطابق جماعت مومنین نہیں ھے۔ لیکن ان کی قوت دنیا میں نظام عدل و مساوات قائم کرنے کے لئے ھوگی، نہ کہ کمزوروں کو لوٹنے کھسوٹنے اور ناتوانوں کا گلا گھونٹنے کے لئے۔ قوت جب ظالم کا ظلم روکنے کے لئے صرف کی جائے تو خیر ھوگی اور جب مظلوم کو لوٹنے کے لئے استعمال کی جائے تو شر ھوجائیگی۔

ق ی ض

اَلْقَیْضُ۔ انڈے کے اوپر کا خشک اور سخت چھلکا۔ قَیَّضَ۔ کسی کو کسی دوسری چیز کے ساتھ اسطرح لگا دینا کہ وہ اس کے ساتھ چپکی بھی رھے

*تاج و محیط۔ **ابن قتیبہ نے بھی یہی معنی لکھے ھیں (القرطین۔ ج/۲ صفحہ ۱۵۵)

اور اس پر غالب بھی رہے ، جسطرح انڈے کا چھلکا اس کی زردی و سفیدی پر مستولی رہتا ہے* ۔ قرآن کریم میں ہے وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ (۴۱/۲۵) ۔ اور ہم نے ان کے لئے ان کے ساتھی لازم کر رکھے ہیں جو ان پر مستولی رہتے ہیں ۔

ق ی ع (ق و ع)

اَلْقَاعُ ۔ ہموار نشیبی زمین جو وسیع ہو اور اس میں نشیب و فراز نہ ہو ۔ نہ اس میں کنکریاں ہوں نہ پتھر اور نہ ہی اس میں درخت پیدا ہوئے ہوں ۔ صاف چٹیل میدان جس میں ٹیلے اور پہاڑ نہ ہوں ۔ قَاعَةُ الدَّارِ ۔ گھر کا صحن یا میدان ۔ صاغانی نے کہا ہے کہ ق ۔ و ۔ ع کی ترکیب کسی جگہ میں پھیلنے پر دلالت کرتی ہے* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جگہ میں کشادگی کے ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے قَاعًا صَفْصَفًا (۲۰/۱۰۶) ۔ صاف چٹیل میدان جسکی تمام اونچ نیچ ختم ہو جائے ۔ اس کی جمع قِيْعَةٌ آتی ہے ۔ ویسے قِيْعَةٌ قَاعٌ کے ہم معنی بھی ہے ۔ سورۃ نور میں ہے ۔ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ (۲۴/۳۹) ۔ چٹیل میدان میں سراب کی طرح ۔

ق ی ل

قَالَ ۔ يَقِيْلُ ۔ قَيْلاً ۔ قَيْلُوْلَةً ۔ دوپہر کو سونا ۔ یا دوپہر کے وقت محض استراحت کے لئے لیٹنا ، خواہ اس میں سو یا نہ جائے ۔ اَلْقَيْلُ ۔ دودھ جو دوپہر کو پیا جائے ۔ یا دوپہر میں کوئی چیز پینا ۔ اَلْمَقِيْلُ ۔ قیلولہ کرنے کی جگہ** ۔ (۲۵/۲۴) ۔ قرآن کریم میں ہے اَوْ هُمْ قَائِلُوْنَ (۷/۴) ۔ یا جبکہ وہ دوپہر کو آرام کررہے ہوں ۔

---

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔

ک

کَ (حرف)

کَ - حرف جر ہے - حسب ذیل معنوں کے لئے آتا ہے -

(۱) تشبیہ کے لئے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ (۷/۱۷۹)- وہ مویشیوں کی طرح ہیں - ان کی مثل - ان جیسے -

(۲) سبب یا مقصد (تعلیل) کے لئے بھی آتا ہے - وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ (۲/۱۹۸)- تم اسے یاد کرو (اس کے قوانین کو سامنے رکھو) اس لئے کہ اس نے تمہیں راہ نمائی دی ہے (یہ معانی مرزا ابوالفضل نے اخفش کے حوالہ سے لکھے ہیں) - اگرچہ اس کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ تم اسے یاد کرو جسطرح اس نے تمہیں ہدایت دی ہے -

(۳) کبھی یہ زائد ہوتا ہے - مثلاً لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۴۲/۱۱) -

کَ (ضمیر)

کَ - ضمیر منصوب متصل ہے - واحد مذکر حاضر کے لئے آتی ہے - ضَرَبَكَ - اس نے تجھے مارا -

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل بھی ہے - غُلَامُكَ - تیرا غلام -

قرآن کریم میں ہے اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ (۲/۱۸۶) - ''جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں'' - دوسری جگہ ہے اُسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ (۲/۳۵) ''تو اور تیری بیوی جنت میں رہو'' -

کِ (ضمیر)

کِ - ضمیر منصوب متصل ہے - واحد مؤنث حاضر کے لئے استعمال ہوتی ہے - قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کے متعلق ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ (۳/۴۲)- ''اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاک کیا'' -

(۲) نیز بہ ضمیر مجرور متصل بھی ہے۔ مثلاً لِیَذَنْبِکَ (۱۲/۲۹)۔ "اپنے قصور کے لئے"۔

ک ا س

اَلْکَأْسُ۔ پینے کا برتن جبکہ اس میں پینے کی چیز موجود ہو۔ اگر پینے کی چیز موجود نہیں تو اسے کَأْسٌ نہیں کہا جائے گا قَدَحٌ کہا جائے گا*۔ صاحب لطائف اللغۃ نے کہا ہے کہ خالی پیالے کو زُجَاجَۃٌ کہا جائیگا۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ خالی پیالہ یا صرف شراب (پینے کی چیز) کو بھی کَأْسٌ کہدیا جاتا ہے**۔ خود تاج نے بھی اسکی تائید کی ہے۔ قرآن کریم میں کَأْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ (۳۷/۴۵) آیا ہے۔ آب رواں سے بھرا ہوا پیالہ۔

کَأَنَّ ۔ (حرف)

کَ (تشبیہ) + اَنَّ (تاکید) سے مرکب ہے۔ اس کا استعمال اس موقع پر ہوتا ہے جہاں تشبیہ بہت قوی ہو۔ قَالَتْ کَاَنَّهٗ هُوَ (۲۷/۴۲)۔ اس نے کہا کہ یہ تو بالکل ویسا ہی ہے۔ گویا وہی ہے۔ کبھی اس کی تشدید (شد) کو دور بھی کر دیتے ہیں۔ جیسے کَاَنْ لَّمْ یَدْعُنَا (۱۰/۱۲) گویا ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔ محیط نے لکھا ہے کہ اگر کَاَنَّ کی خبر اسم جامد نہ ہو تو اس کے معنے ظن کے ہوتے ہیں۔

کَأَیِّنْ

کَاَیِّنْ۔ کتنے ہی۔ یہ زیادہ تر تعداد میں ابہام اور کثرت ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے۔ وَ کَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ (۳/۱۴۵)۔ کتنے ہی نبی ایسے گزرے ہیں۔ یعنی تعداد متعین تو نہیں لیکن کم بھی نہیں۔

ک ب ب

کَبَّهٗ، یَکُبُّهٗ، کَبًّا۔ اس نے اسے اوندھا کر دیا۔ کَبَّهٗ لِوَجْهِهٖ فَانْکَبَّ۔ اس نے اسے منہ کے بل گرا دیا تو وہ منہ کے بل گر گیا۔ کَبْکَبَ الشَّیْءَ۔ اس نے اس چیز کو اوپر سے نیچے کی طرف گڑھے میں پھینک دیا۔ کَبْکَبَهٗ۔ اسے الٹا اور پچھاڑ دیا۔ اہل لغت نے

---

*تاج۔ **راغب۔

کہا ہے کہ کَبْکَبَ میں بار بار اوندھا ہونے کا تصور پایا جاتا ہے۔ یعنی جس چیز کو پھینکا جائے وہ بار بار اوندھی ہو کر نیچے کی جگہ قرار گیر ہو جائے *۔ اس " قرار گیر ہونے " کا مفہوم اس سے پیدا ہوتا ہے کہ ابن فارس کے نزدیک اس مادہ کے بنیادی معنی اکٹھا کرنے کے ہیں۔ [کَبْکَبَ رباعی ہے اس لئے اسے الگ لکھنا چاہئے تھا لیکن چونکہ بعض ائمہ لغت نے اسے کبب کے تحت لکھا ہے اس لئے ہم نے بھی یہیں لکھنا مناسب سمجھا ہے]۔

اَلْمُکِبُّ وہ آدمی جس کا سر جھکا ہو اور اس لئے اسکی نگاہیں زمین کیطرف رہیں۔ اَکَبَّ الرَّجُلُ۔ وہ منہ کے بل گر گیا۔ اَکَبَّ الرَّجُلُ عَلٰی عَمَلٍ۔ وہ کسی کام میں لگ گیا *۔

قرآن کریم میں اہل جہنم کے متعلق ہے۔ فَکُبْکِبُوْا فِیْھَا (۲۶/۹۴)۔ انہیں اس میں اوندھے منہ ڈالا جائے گا۔ (خاسر و نامراد اور ذلیل و خوار)۔ سورہ نمل میں ہے۔ فَکُبَّتْ وُجُوْھُھُمْ فِی النَّارِ۔ (۲۷/۹۰) انہیں اوندھا کرکے داخل جہنم کر دیا گیا۔ سورہ ملک میں مَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْھِہٖ، کے مقابل میں ہے، مَنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۶۷/۲۲)۔ اس سے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس غلط روش پر چلنے والے جو تباہیوں اور بربادیوں کی طرف لے جائے۔ اوندھی کھوپڑی کے لوگ جو ذرا عقل و بصیرت سے کام نہ لیں اور سر نیچا کئے، بلا سوچے سمجھے، غلط راستے پر چلتے جائیں۔ ان کے مقابلہ میں وہ لوگ ہیں جو صحیح، سالم سیدھے متوازن راستے پر چلے جائیں۔

ک ب ت

کَبْتٌ۔ کے اصلی معنی کَبٌّ کے آتے ہیں۔ یعنی منہ کے بل گرا دینا۔ رسوا اور ذلیل کر دینا۔ شکست دیکر لوٹا دینا۔ ازہری نے کہا ہے کہ کَبْتٌ کی اصل کَبْدٌ ہے۔ (دال کو تاء سے بدل دیا گیا ہے) جس کے معنی جگر ہیں جو غیظ و غضب کا مخزن ہے۔ لہذا اس کے معنی ہیں دشمن کو اسکے غیظ و غضب سمیت لوٹا دینا**۔ راغب نے لکھا ہے کہ اسکے معنی کسی کو تشدد اور تذلیل کے ساتھ واپس کر دینے کے ہیں***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ذلیل کرنے اور کسی چیز سے ہٹا دینے اور پھیر دینے کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے اَوْ یَکْبِتَھُمْ (۳/۱۲۶) یا انہیں ذلیل کر دے گا۔

*تاج۔ راغب۔ محیط۔ **تاج۔ ***راغب۔

سورہ مجادلہ میں ہے - کُبِتُوْا کَمَا کُبِتَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۵۸/۵) جسطرح ان سے پہلے لوگ جو حق کی مخالفت کیا کرتے تھے ، ذلیل و خوار ہوئے تھے ، اسی طرح یہ بھی ذلیل و رسوا کئے جائیں گے -

ک ب د

اَلْکَبْدُ - وَالْکِبْدُ وَالْکَبِدُ - جگر - اَلْکُبَادُ - دردِ جگر - اَلْکَبَدُ - مشقت - سختی - ٹیلہ یا آسمان کا وسط - نیز اس کے معنی استقامت اور اعتدال کے آتے ہیں * - راغب نے کَبَدٌ بمعنی کُبَادٌ یعنی درد جگر بھی لکھا ہے ** - قرآن کریم میں ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ (۹۰/۴) فراء نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے انسان کو ایسا پیدا کیا ہے کہ اس میں پورا پورا اعتدال اور تناسب ہے - بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے انسان کو ایسا پیدا کیا ہے کہ وہ تمام مشکلات اور موانع کا مقابلہ کر سکتا ہے * - اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے انسان کو اسطرح پیدا کیا ہے کہ اس کی ذات کی نمود اور نشوو نما سختیوں سے تصادم میں ہوتی ہے - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں شدت اور قوت کے بتائے ہیں -

ک ب ر

کِبَرٌ اور کِبْرٌ کے معنی ہیں بڑا ہونا - صِغَرٌ کی ضد ہے - اَلْکَابِرُ اور اَلْکَبِیْرُ - بڑا - واضح رہے کہ کِبَرَ کے معنی ہیں بڑا ہونا (مرتبہ یا جسامت وغیرہ میں) اور کَبِرَ کے معنی ہیں معمر ہونا - اَلْکِبْرُ - کسی چیز کا بڑا حصہ - وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَهٗ مِنْهُمْ (۲۴/۱۱) - ان میں سے جس نے اس معاملہ کا بڑا حصہ اپنے سر لیا - یعنی جس شخص پر اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے - کِبْرِیَاءٌ کے معنی حکومت اور مملکت کے ہیں - اس کا مفہوم ، آج کی اصطلاح میں ، حاکمیتِ اعلیٰ (Sovereignty) ہے - قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ وَلَهُ الْکِبْرِیَاءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ - وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۴۵/۳۷) "ارض و سما (جملہ کائنات) میں اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کا ہے - وہ (بڑے) غلبہ والا ، حکمت والا ہے" - وہ اَحْکَمُ الْحَاکِمِیْنَ ہے (۹۵/۸) - یہی مفہوم لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ہے - یہی اقتدار خدا کے علاوہ کسی اور کا نہیں -

---

*تاج و محیط - **راغب -

جب حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو حق کی دعوت دی تو اس نے (اسکی قوم نے) کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ تمہارا منشاء کیا ہے۔ تم (دونوں بھائی) چاہتے ہو کہ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ فِى الْاَرْضِ (١٠/٧٨)۔ "ملک میں اقتدار اعلیٰ تم دونوں کا ہو جائے"۔

تَكَبَّرَ اور اِسْتَكْبَرَ کے معنی ہیں بڑا بننا۔ سرکشی اختیار کرنا۔ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ (٢/٣٤)۔ كَبُرَ عَلَيْهِ الْاَمْرُ۔ معاملہ اس پر شاق گذرا۔ گراں گزرنے کے معنوں میں (٦/٣٥ و ١٠/٧١ و ٤٢/١٣) میں آیا ہے۔ اَلْكَبِيْرُ۔ سردار۔ نیز معلم اور استاد کو بھی کہتے ہیں۔ اَكْبَرَتِ الْمَرْاَةُ۔ اس وقت کہتے ہیں جب عورت کو حیض آجائے۔ اور اَكْبَرَ الرَّجُلُ جب مرد کو "مادۂ مردمیت" آنے لگے۔ چنانچہ اول الذکر معانی کی رو سے مجاہد نے کہا ہے کہ سورۃ یوسف میں جو ہے کہ جب عورتوں نے یوسف کو دیکھا۔ اَكْبَرْنَهٗ (١٢/٣١)۔ تو اس کے معنی ہیں انہیں حیض آگیا (یا مادہ خارج ہوگیا)۔ یعنی اَكْبَرْنَ کے معنی ہیں حِضْنَ۔ اور ھاء وقف کیلئے ہے*۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ مفہوم بے معنی اور رکیک ہے۔ اس کے معنی صاف ہیں کہ جب ان عورتوں نے حضرت یوسفؑ کو دیکھا تو انہیں بہت بڑا پایا۔

قرآن کریم میں اِسْتَكْبَرَ، سجدہ اور اطاعت کے مقابلہ میں آیا ہے۔ (٢/٣٤ و ١٦/٤٩)۔ اور ضعیف اور کمزور لوگوں کے مقابلہ میں بھی لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا (٧/٧٥) آیا ہے۔ اَدْنٰى کے مقابلہ میں اَكْبَرُ (٣٢/٢١) میں آیا ہے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا۔ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِىْ صُدُوْرِكُمْ (١٧/٥١)۔ یا کوئی اور ایسی مخلوق جس کے متعلق تم خیال کرتے ہو کہ اس کا زندہ ہونا بہت ہی مشکل ہے۔

اَلْمُتَكَبِّرُ (٥٩/٢٣)۔ خدا کی صفت ہے۔ تمام عظمتوں اور بڑائیوں کا مالک۔ اور چونکہ خدا کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرنا مومن کی اصل زندگی ہے اس لئے اس معنی میں مُتَكَبِّر ہونا مستحسن ہے۔ (معیوب نہیں) یعنی —

مومنے بالائے ہر بالا ترے غیرت او بر نتابد ہمسرے

اسی کو قرآن کریم نے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (٣/١٣٨) کہا ہے۔ تکبر وہ برا ہے جس کی رو سے انسان یہ چاہے کہ بغیر تعمیری نتائج پیدا کئے لوگوں

---

*تاج۔

سے اپنی بڑائی منوائے۔ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ (۷/۱۴۶)۔ یہ استبداد ہے۔

لیکن اگر اس کا مفہوم اقتدار اعلیٰ لیا جائے تو پھر ”تکبر“ کسی انسان کے لئے جائز نہیں ہوگا۔ صرف خدا کے لئے مختص ہوگا۔ اس اعتبار سے آیت (۷/۱۴۶) کے معنی یہ ہونگے کہ تکبر (اقتدار اعلیٰ) صرف اَلْحَقّ کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ یعنی اقتدار اعلیٰ صرف قوانین خداوندی کو حاصل ہوسکتا ہے۔ کسی انسان کو نہیں۔ کِبْرٌ کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسی کے نیچے نہ رہنا۔ یہ بھی انسان کے لئے جائز نہیں کیونکہ اسے قوانین خداوندی کے تابع رہنا چاہئے۔

کُبَّارٌ۔ بہت ہی بڑا (۷۱/۲۲)۔ اَلْکُبَرُ۔ بہت بڑی مصیبتوں۔ (۷۴/۳۵)۔ سورۃ مدثر میں ہے کہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ قُمْ فَاَنْذِرْ (۷۴/۲) اٹھ، اور لوگوں کو ان کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کردے۔ اس کے بعد ہے۔ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ (۷۴/۳)۔ پہلا حصہ (یعنی لوگوں کو ان کی غلط روش سے باز رکھنا) تخریبی یا تمہیدی تھا۔ یہ دوسرا حصہ مثبت یا تعمیری ہے۔ یعنی ایسا نظام قائم کردے، ایسی صورتِ حالات پیدا کر دے، ایسا نقشہ جمادے، ایسا معاشرہ متشکل کردے، کہ جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ فی الحقیقت خدا کا قانون اور اس کا نظام تمام قوانین و نظام ہائے عالم سے بلند و برتر ہے۔ نظری اعتبار سے تو دنیا کی ہر قوم بھی کہتی ہے کہ ہمارا نظام (یا مذہب) سب سے اونچا ہے۔ لیکن تم ایسا کرکے دکھا دو جس سے ہر شخص بے ساختہ پکار اٹھے کہ بے شک ہر قسم کی عظمتیں اور بڑائیاں قانون خداوندی کے لئے ہیں۔ اسی کو وَکَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا کہا گیا ہے (۱۷/۱۱۱)۔ اور وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ (۲۹/۴۵)۔ اذان اور صلوٰۃ میں اللّٰہُ اَکْبَرُ* اسی حقیقت کا اعلان ہے کہ دنیا میں سب سے اونچا، بڑا، اور غالب نظام صرف خدا کا نظام ہے جس کے قیام اور استحکام کے لئے ہم اٹھے ہیں۔ یہی وہ اعلان (تَکْبِیْرٌ) تھا جس سے، نبی اکرمؐ کی مدنی زندگی کے دس سالہ دور میں، اسلامی مملکت میں قریب پونے تین سو مربع میل یومیہ کے حساب سے وسعت ہوتی گئی تھی۔ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کا رقبہ قریب بائیس لاکھ مربع میل تک پھیل گیا تھا۔ اور قرآنی نظام، ایرانی

*یہ لفظ (اکبر) خدا کے لئے قرآن کریم میں نہیں آیا۔ لیکن اس کے اکبر ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اکبر ہے ہی وہی۔

اور رومی نظاموں پر غالب آ گیا تھا - غور کیجئے کہ کس قدر عظیم القدر تھا یہ اعلان اور عزم جو آج ایک بے روح رسم بن کر رہ گیا ہے - اقبال نے کسقدر صحیح کہا ہے کہ

ملا کی اذاں اور مجاھد کی اذاں اور

ک ت ب

کَتَبَ - عرب اپنی اعلیٰ نسل کی اونٹنیوں کی شرمگاہ میں لوہے کا چھلہ سا ڈال دیتے تھے تاکہ وہ ھر قسم کے اونٹوں سے حاملہ نہ ھونے پائیں - اسے کَتَبَ النَّاقَةَ کہتے تھے - ابن فارس نے بھی اس معنی کی تائید کی ہے - ھمارے ھاں گھوڑیوں کے ساتھ ایسا کرتے ھیں - اسی طرح جب وہ اونٹنی کے نتھنوں کو چمڑے کے باریک تسمہ سے سی کر بند کر دیتے تھے تاکہ وہ اپنے بچہ کو سونگھ نہ سکے تو اسے بھی کَتَبَ کہتے تھے* - اسی سے مشکیزہ یا بوری کے منہ کو سی کر بند کر دینے کے لئے بھی کَتَبَ کہتے تھے - یہیں سے لفظ کِتَابٌ ہے ، جس سے مراد منتشر اوراق کی حلقہ بندی کر کے انہیں اس طرح مجتمع اور یک جا کر دینا تھا جس طرح بوری میں سامان بند کر کے اسے اوپر سے سی دیا جاتا ہے - ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ھیں - اس سے کِتَابٌ کا مفہوم واضح ھو جاتا ہے -

اس سے ظاھر ہے کہ جب قرآن کریم نے اپنے آپ کو کِتَابٌ کہا ہے تو قرآن کریم منتشر اوراق یا کھجوروں کے پتوں یا ھڈیوں کے ٹکڑوں پر بکھرا ھوا نہیں تھا ، بلکہ ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب و مدون تھا - منتشر حالت میں اسے کِتَابٌ کہا ھی نہیں جاسکتا تھا -

کَتَبَ - چونکہ منتشر خیالات کو لکھ کر ایک جگہ محفوظ کیا جاتا ہے اسلئے کَتَبَ کے معنی ''اس نے لکھا'' ھو گئے - اور اِکْتَتَبَ کے معنی ھیں اس نے خود لکھا یا کسی سے لکھوایا یا کسی سے کہا کہ وہ بولتا جائے اور یہ لکھتا جائے (۲۵/۵) - راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی گھڑلینے کے ھیں -

کِتَابٌ کے معنی فیصلہ اور حکم کے بھی آتے ھیں* - قرآن کریم میں کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ (۲/۱۷۸) - یا کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (۲/۱۸۳) - فرض اور ضروری قرار دینے کے معنوں میں آیا ہے - یعنی جو کام قانوناً

لازم قرار دیا جائے۔ اسی لئے مجموعہ قوانین کو کِتَابٌ کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں گوناگوں احکام و اوامر جمع ہوتے ہیں۔ ابن فارس نیز صاحب لطائف اللغۃ نے بھی اَلْکِتَابُ کے معنی اَلْفَرْضُ اور اَلْحُکْمُ لکھے ہیں۔ لہذا، جب قرآن کریم کو کِتَابٌ کہا گیا ہے تو اس کے معنی ضابطہ قوانین کے ہیں۔

سورۃ نور میں ہے وَ الَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتٰبَ (۳۳/۲۴) یعنی (تمہارے غلاموں میں سے) جو آزادی حاصل کرنے کے لئے معاہدہ کرنا چاہئیں۔ تحریر مانگیں۔ (۲۳۵/۲) میں حَتّٰی یَبْلُغَ الْکِتَابُ اَجَلَہٗ کے معنی ہیں جب عدت کی حد جو از روئے قانون خداوندی مقرر ہو گئی ہے، اپنی آخری میعاد تک پہنچ جائے۔

سورۃ یونس میں ہے لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ (۴۹/۱۰)۔ "ہر قوم کے لئے ایک میعاد ہے"۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر قوم کے مقدر میں یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس نے اتنی مدت تک عروج حاصل کرنا ہے اور اس کے بعد ختم ہو جانا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ لِکُلِّ اَجَلٍ کِتٰبٌ (۳۸/۱۳) ہر میعاد کے لئے خدا کا ایک قانون ہے۔ یعنی قوموں کی موت اور حیات خدا کے قانون کے مطابق متعین ہوتی ہے۔ جو قوم چاہے اس قانون کے مطابق اپنی میعاد کو بڑھالے۔ جو چاہے اسے گھٹالے۔ خدا کی طرف سے صرف قانون مقرر ہے۔ اس قانون کے مطابق اپنی مدتِ حیات کو گھٹانا بڑھانا، ہر قوم کے اپنے اختیار میں ہے۔

اسی طرح سورۂ آلِ عمران میں ہے مَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (۱۴۴/۳)۔ کوئی شخص خدا کے قانون (طبعی) کے بغیر مر نہیں سکتا۔ یہی قانون اس کی میعاد کا تعین کرتا ہے۔ وَ مَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِہٖ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ (۱۱/۳۵)۔ عمر کا گھٹنا بڑھنا، خدا کے مقرر کردہ قانونِ طبعی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس قانون کا علم انسان کو دیدیا گیا ہے۔ سو جس کا جی چاہے اس کے مطابق اپنی عمر بڑھالے، جس کا جی چاہے اسے گھٹالے۔ (انسان جب جی چاہے خودکشی کر کے مر سکتا ہے۔ اور بد پرہیزی سے اپنی عمر کم کر سکتا ہے)۔ لیکن جب (اس قانون کے مطابق) کسی کی مدتِ عمر کا خاتمہ ہو جائے تو پھر اس کی موت میں تاخیر نہیں ہو سکتی (۱۱/۶۳)۔

تفسیر المنار میں ہے کہ کِتَابٌ بمعنی مَکْتُوْبٌ ہے۔ یہ اسم جنس ہے ان چیزوں کے لئے جو لکھی جائیں۔ اور ذٰلِکَ الْکِتَابُ (۲/۲) سے اشارہ کرنے میں

حکمت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے صرف قرآن کریم ہی لکھنے کا حکم فرمایا تھا * ۔ قرآن کریم کے علاوہ اور کچھ لکھنے کا حکم نہیں تھا ۔ لہذا مکتوب صورت میں صرف قرآن کریم ہی موجود تھا جسکی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔

قرآن کریم میں کِتَابٌ کا لفظ قانونِ خداوندی یا ضابطہٗ قوانینِ خداوندی کیلئے آیا ہے ۔ اور چونکہ قرآن کریم خود ضابطہٗ قوانین الٰہیہ ہے اسلئے یہ کتاب اللہ ہے ۔ یعنی قوانینِ خداوندی کا مجموعہ، مرتب اور محفوظ شکل میں ۔

قرآن کریم کی تعلیم کا بنیادی نقطہ قانونِ مکافاتِ عمل ہے ۔ یعنی یہ قانون کہ انسان کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا ۔ قرآن کریم میں اس نکتہ کی وضاحت مختلف انداز سے کی گئی ہے ۔ سورۂ انفطار میں ہے وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۔ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۔ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ($\frac{82}{10-12}$) تم پر (خدا کی طرف سے) ایسی قوتیں مسلط ہیں جو تمہیں ہر طرح اپنی نگرانی میں لئے ہیں ۔ وہ "معزز لکھنے والے" ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ تم کیا کرتے ہو ۔ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ کی تفسیر يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ نے کردی ۔ یعنی علم رکھنے والے ۔ جاننے والے ۔ ان معنوں میں یہ لفظ (كَتَبَ) اور جگہ بھی آیا ہے ۔ مثلاً سورۃ طور میں ہے اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ($\frac{52}{41}$) ۔ یہاں يَكْتُبُوْنَ کا مفہوم "جاننا" ہے ۔ یا سورۃ انبیاء میں ہے وَ اِنَّا لَهٗ كَاتِبُوْنَ ($\frac{21}{94}$) ۔ سورۃ نمل ($\frac{27}{28}$) میں كِتَابٌ کا لفظ خط کے لئے آیا ہے ۔ یہی وہ کتاب (چٹھی) ہے جس کے علم کا ذکر ($\frac{27}{40}$) میں آیا ہے ۔

قرآن کریم میں كِتَابٌ اور حِكْمَتٌ آیا ہے ۔ اور دونوں کو منزل من اللہ کہا گیا ہے ۔ (دیکھئے عنوان ح ۔ ک ۔ م) ۔ كِتَابٌ کے معنی ہیں قانون ۔ اور حِكْمَتٌ کے معنی ہیں اُس قانون کی غرض ، غایت ، مقصد ، نتیجہ ۔ (The why of it) ۔ مثلاً كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ کے بعد ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ($\frac{2}{183}$) ۔ تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں (یہ كِتَابٌ یا قانون ہے ۔ اور) لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ تاکہ تم تقویٰ شعار ہو جاؤ ۔ اس قانون کی حکمت ہے ۔ یعنی اس قانونِ خداوندی سے مقصد یہ ہے ۔ اس کی غایت یہ ہے ۔ اس کی علت یہ ہے ۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ تم ایسے ہو سکو ۔ قرآن کریم نے قانون کے ساتھ اس کی حکمت (یعنی نتیجہ) کو بھی خود ہی بیان کر دیا تاکہ ہم ہر وقت دیکھتے رہیں کہ قانون کا منشاء پورا ہو رہا ہے یا نہیں ۔ اگر قانون پر عمل پیرا ہونے سے وہ نتیجہ

*تفسیر المنار ج/۱ ۔ صفحہ ۱۲۳ ۔

مرتب ہو رہا ہے جیسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس قانون پر صحیح معنوں میں عمل ہو رہا ہے۔ لیکن اگر اس سے وہ نتائج مرتب نہیں ہو رہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ اس قانون کی محض رسم پوری ہو رہی ہے، فی الحقیقت اس پر عمل نہیں ہو رہا۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت تھی جسے قرآن کریم نے بیان کیا تھا۔ اسی کے نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے کہ ہماری نمازیں اور روزے اس طرح بے نتیجہ رہ گئے ہیں۔ اور ہم انہیں اسی طرح ادا کئے جا رہے ہیں، اور مطمئن ہیں کہ اگر ان کے نتائج یہاں مرتب نہیں ہوتے تو نہ سہی، ان کا پھل آخرت میں جا کر ملے گا۔ حالانکہ قرآن کریم نے ان کے نتائج اسی دنیا میں مرتب ہونے کا بھی کہا ہے اور آخرت میں بھی۔ اگر ان کے نتائج (قرآن کریم کے بیان کے مطابق) اس دنیا میں مرتب نہیں ہورہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ان پر ٹھیک ٹھیک عمل نہیں ہورہا۔ لہذا ان کے نتائج آخرت میں بھی مرتب نہیں ہونگے۔

کِتَابٌ اور حِکْمَتٌ (قانون اور اس کے نتائج) دین کا بنیادی نقطہ ہے۔ یعنی قرآن کریم اور اس پر عمل پیرا ہونے کے درخشندہ نتائج جو اس دنیا میں سامنے آ جاتے ہیں اور جن کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اس لئے جہاں قرآن کریم سے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ فلاں معاملہ میں خدا کا حکم (قانون) کیا ہے وہاں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس حکم (قانون) پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔ اگر قرآن کریم سے یہ معلوم اور متعین کرلیا جائے اور پھر ہم اس کے مطابق اپنا (انفرادی اور اجتماعی) محاسبہ کرتے جائیں تو ہمیں ہر وقت معلوم ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم پر ٹھیک ٹھیک عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو نفس کا جھوٹا اطمینان غلط عمل کو بھی صحیح بنا کر دکھا سکتا ہے۔

ک ت م

کَتْمٌ کے معنی ہیں چھپانا۔ رَجُلٌ کَتُوْمٌ۔ راز کو چھپانے والا آدمی۔ سِرٌّ کَاتِمٌ۔ پوشیدہ اور چھپا ہوا راز*۔ قرآن کریم میں کَتْمٌ۔ بمقابلہ اِبْدَاءٌ آیا ہے ($\frac{۲}{۳۳}$)۔ نیز اِخْرَاجٌ (باہر نکالنے) کے مقابلہ میں۔ ($\frac{۲}{۷۲}$)۔ نیز بَیِّنْ (ظاہر کرنے) کے مقابلہ میں ($\frac{۳}{۱۸۶}$ ؛ $\frac{۲}{۱۵۹}$)۔ اور جَهْرٌ کے مقابلہ میں بھی ($\frac{۲۱}{۱۱۰}$)۔ اس سے کَتْمٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ کَتْمٌ معانی کے پوشیدہ رکھنے کو کہتے ہیں اور سَتْرٌ محسوس اشیاء کے پوشیدہ رکھنے کو۔

*تاج۔

سورہ آل عمران میں ہے لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ (۳/۷۰) ۔ تم حق کو باطل کے ساتھ ملاتے کیوں ہو۔ اور حق کو چھپاتے کیوں ہو؟ یعنی حق کی باطل کے ساتھ آمیزش بھی جرم ہے اور حق کو چھپانا بھی جرم ۔ حق کو ہمیشہ بلا آمیزش رکھنا چاہئے اور اسے ظاہر کرتے رہنا چاہئے ۔ قرآن کریم حق بلا آمیزش ہے ۔ لہذا قرآن کریم کے ساتھ کسی اور چیز کو نہیں ملانا چاہئے ۔ اور اسے نکھار اور ابھار کر سامنے لانا چاہئے۔

ک ث ب

اَلْكَثْبُ ۔ کسی چیز کو اکٹھا کرنا اور ڈھیر بنا دینا ۔ پانی وغیرہ کو اوپر سے گرا دینا ۔ اِنْكَثَبَ الرَّمْلُ ۔ ریت اکٹھی اور مجتمع ہو گئی ** ۔ اَلْكَثِيْبُ ۔ ریت کا ٹیلہ ۔ اَلْكُثْبَاءُ ۔ مٹی * ۔ قرآن کریم میں ہے کہ انقلاب عظیم کے وقت یہ بڑے بڑے سرداران قوم (جِبَالُ) كَثِيْبًا مَّهِيْلًا (۷۳/۱۴) ہو جائیں گے ۔ یعنی ایسے ریت کے تودے جو نیچے سے سرکتے ہوئے چلے جائیں اور اس طرح رفتہ رفتہ اپنا مقام چھوڑ کر نیچے گر جائیں ۔ اَكْثَبَ الصَّيْدُ کے معنی ہیں شکار، شکاری کے ہتھے چڑھ آگیا ۔ (ابن فارس و راغب)

ک ث ر

كَثْرَةٌ ۔ قِلَّت کی ضد ہے ۔ اسکے معنی ہیں زیادہ ہونا ، فراوانی ، بہتات ۔ اَكْثَرَ الرَّجُلُ ۔ آدمی بہت مالدار ہو گیا ۔ اِسْتَكْثَرَ مِنَ الشَّيْءِ ۔ کسی چیز میں سے زیادہ لینے کی رغبت کرنا * ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۷۴/۶) ۔ زیادہ لینے کی نیت سے کسی پر احسان نہ کر ۔ اَلْكَوْثَرُ ۔ ہر چیز جو کثیر ہو ۔ خیر کثیر ۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنی تفسیر المقام المحمود میں لکھا ہے کہ الکوثر سے مراد خود قرآن کریم ہے ، کیونکہ حکمت کو خدا نے خیر کثیر کہا ہے اور قرآن کریم سرتاپا حکمت ہے ۔ چنانچہ جب نبی اکرم اور آپ کی جماعت پر مخالفین کی طرف سے دنیا تنگ کی جارہی تھی اور حالات سخت نامساعد ہو رہے تھے ، حتکہ نظر آتا تھا کہ آپ کو اپنا وطن تک بھی چھوڑنا پڑیگا ، توعین اس عسرت کے زمانہ میں آپ سے کہا گیا کہ آپ اطمینان رکھیں ، نظام خداوندی کی تشکیل

*تاج ۔ **محیط ۔

کا ابتدائی دور عنقریب ختم ہوا چاہتا ہے ۔ اس کے بعد اس کے نتائج مرتب ہونے شروع ہو جائیں گے اور تمہیں زندگی کی خوش گواریاں بڑی افراط سے ملینگی ۔ اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ (۱۰۸/۱) ۔ چنانچہ ہجرت کے بعد کی زندگی میں یہ وعدہ حقیقت ثابتہ بنکر سامنے آگیا ۔

یہ خیال بھی ہے کہ عبرانی زبان میں کوشر حلال ذبیحہ کو کہتے ہیں ۔ (چنانچہ یہودیوں کا ذبیحہ اب بھی کوشر کہلاتا ہے) اور کوثر اسی سے معرب ہے ۔ اس اعتبار سے اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ (۱۰۸/۱) کے معنی ہونگے "ہم نے تجھے (اونٹ) بطور حلال ذبیحے کے عطا کیا"۔ (اس کی وضاحت کے لئے دیکھئے عنوان ، ن ۔ ح ۔ ر) لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس کے معنی خیر کثیر زیادہ موزوں ہیں ۔

کَثُرَ ۔ بہت ہونا۔ زیادہ ہونا (۴/۷) ۔ کَثَّرَ ۔ بڑھانا ۔ زیادہ کر دینا ۔ (۷/۸۶) ۔ اَکْثَرَ ۔ زیادہ کرنا ۔ (۱۱/۳۲) ۔ تَکَاثُرٌ ۔ ایک دوسرے سے مال و دولت میں بڑھنے کی کوشش کرنا (۱۰۲/۱) ۔ اِسْتَکْثَرَ ۔ بہت زیادہ حاصل کر لینا (۷/۱۸۸) ۔ بہت فائدہ اٹھا لینا (۶/۱۲۹) ۔

قرآن کریم میں ہے اَلْهٰکُمُ التَّکَاثُرُ (۱۰۲/۱) ۔ ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی ہوس تمہیں زندگی کے مقصد سے غافل کر دیتی ہے ۔ قرآن کریم کی رو سے مال و دولت زندگی کی زینت کا باعث ہیں (۳/۱۴) اس لئے ان کے حصول کی خواہش کوئی بری بات نہیں ۔ لیکن زندگی کا مقصد یہ قرار دے لینا کہ ہم زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹتے چلے جائیں تا کہ ہم دوسروں سے بڑھ جائیں اور ان کے مقابلہ میں فخر کر سکیں (۵۷/۲۰) بڑی پست سطح کی ذہنیت ہے ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جب انسان میں اس قسم کی خواہش پیدا ہو جائے تو کوئی مقام ایسا نہیں آتا جہاں پہنچکر اس کی ہوس کی تسکین ہو جائے ۔ انسان ساری عمر اس میں آگے ہی بڑھتا جاتا ہے ۔ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲/۲) حتکہ یہ قبر تک پہنچ جاتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ بھی معیوب نہیں لیکن اس کا میدان اور ہے ۔ تم ایک دوسرے سے بڑھنا چاہتے ہو تو ذاتی جوہر اور نوع انسان کی عالمگیر بھلائیوں کے کام میں بڑھنے کی کوشش کرو جس کا نتیجہ جنت کی زندگی ہے (۸۳/۲۶) ۔ مال ، مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے ۔ مقصود بالذات نہیں ۔ حتکہ انسان کی پوری طبیعی زندگی ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ (Means) ہے ۔

*تاج ۔

بجائے خویش مقصد (End) نہیں - مال (یا طبیعی زندگی) کو مقصود بالذات اور زندگی کا منتہٰی سمجھ لینا بڑی غلطی ہے - مقصود، انسانی ذات کا نشوونما ہے جو عالمگیر انسانیت کی ربوبیت سے ہوتی ہے - مال کو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ رہنا چاہیئے -

ک د ح

اَلْکَدْحُ - سعی و مشقت - کوشش - سعی پیہم، مسلسل جدوجہد - کَدَحَ رَأْسَهٗ بِالْمُشْطِ - اس نے کنگھے سے اپنے بالوں کو سلجھایا - کَدَحَ لِعِیَالِہٖ - اس نے بڑی دوڑ دھوپ سے اپنے اہل و عیال کے لئے کمایا* - اس میں دراصل ایسی مشقت کا پہلو ہوتا ہے جو جگر پاش ہو - کیونکہ "بِہٖ کَدْحٌ" کے معنی ہوتے ہیں اس پر ذرا گہرا زخم لگا ہوا ہے* -

قرآن کریم میں ہے یَاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰی رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ (۸۴/۶) - اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ "جس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب آسان ہوجائیگا اور وہ اپنے ساتھیوں کی طرف خوش و خرم واپس آجائیگا - لیکن جس کا نامۂ اعمال اس کی پیٹھ پیچھے سے دیا جائیگا وہ ہلاکت کو پکاریگا" -

اس آیت (۸۴/۶) کا مفہوم دو طرح پر لیا جاسکتا ہے - تاج اور محیط میں ہے کہ کَدَحَ لِنَفْسِہٖ کے معنی ہیں "اس نے اپنے لئے اچھے یا برے کام کئے" - اس اعتبار سے آیۂ زیر نظر کا مفہوم یہ ہوگا کہ انسان خواہ اچھے کام کرے خواہ برے، ان کے نتائج اس کے سامنے آکر رہینگے - "خدا کی ملاقات" کے معنی اس کے قانونِ مکافات کا سامنا کرنا ہیں -

لیکن اگر آیت کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ "اے انسان! تجھے اپنے رب کی طرف جانے کے لئے مشقتیں اٹھاتی ہوں گی - انہیں برداشت کر کے پھر اپنے رب کے سامنے جا سکیگا" - تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ انسان کو بہرحال اس منزل تک پہنچنا ہے جو اس کے رب نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے - لیکن اسکے لئے اسے مشقتیں اٹھانی پڑینگی - اگر اس نے وحی کا اتباع کیا تو مخالفین کی طرف سے اسے تکلیفیں پہنچیں گی - لیکن یہ راستہ مقابلۃً آسان ہوگا - اور اگر اس نے وحی کا اتباع نہ کیا اور عقل کا تجرباتی طریقہ اختیار کیا تو اس سے اسے بڑی جگر پاش مشقتوں اور زخموں اور جراحتوں

---

* تاج و راغب نیز ابن فارس -

کے بعد وہاں تک پہنچنا نصیب ہوگا۔ اس کی مفاد پرستیاں اس کا رخ پیچھے کی طرف موڑینگی اور زمانے کے تقاضے اسے آگے کی طرف کھینچیں گے۔ انسانیت کی تاریخ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے۔ انسان رفتہ رفتہ اسی منزل کی طرف آ رہا ہے لیکن چونکہ اس نے وحی کے بجائے عقل کا تجرباتی طریق اختیار کر رکھا ہے اس لئے اسے اس کے لئے خون کے دریا پیرنے اور آگ کی خندقیں پھاندنی پڑ رہی ہیں۔ غور کیجئے! کسقدر کشت و خون کے بعد اس کا ایک قدم صحیح منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ اگر یہ وحی کی سمت اختیار کرتا تو اس کا راستہ مقابلۃً آسان ہوجاتا۔

ک د ر

اَلْکُدْرَۃُ مِنَ الْاَلْوَانِ۔ گدلا پن (خواہ کسی رنگ میں ہو) رنگ کا صاف نہ ہونا۔ بعض نے کہا ہے کہ کُدْرَۃٌ کا استعمال خصوصیت کے ساتھ رنگ میں ہوتا ہے اور کُدُوْرَۃٌ کا استعمال پانی اور چشمہ میں۔ اور کَدَرٌ کا استعمال ہر چیز میں۔ کَدِرٌ کَدِیْرٌ۔ گدلی اور میلی چیز جو صاف نہ ہو۔ اَلْکَدَرَۃُ مِنَ الْحَوْضِ۔ تالاب کی تہ نشیں مٹی یا اس پر چڑھ جانے والی کائی۔ اَلْکَدَرَۃُ۔ مٹی کا بڑا سا ڈھیلا یا بڑا پتھر جسے زمین سے اکھیڑ کر الگ کر لیا گیا ہو۔ اِنْکَدَرَ۔ وہ تیزی سے نیچے کی طرف جھپٹا۔ اَلْاِنْکِدَارُ۔ کسی چیز کے بکھر جانے سے جو تغیر واقع ہوتا ہے اسے کہتے ہیں**۔ اِنْکَدَرَ عَلَیْہِ الْقَوْمُ۔ قوم گروہ گروہ ہو کر اس پر ٹوٹ پڑی*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) گدلا پن، صفائی کی ضد اور (۲) حرکت کے ہیں۔ نیز اِنْکَدَرَ کے معنی ہیں تیز رفتار ہوا۔

قرآن کریم میں ہے وَاِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ (۸۱/۲)۔ اس کے لفظی معنی ہیں جب ستارے گدلے ہو جائیں گے۔ یعنی ان کی روشنی مدھم پڑ جائے گی۔ یا جب وہ بکھر جائینگے۔ اگر ''نجوم'' کے مجازی معنی لئے جائیں تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب چھوٹی چھوٹی ریاستیں ختم ہوجائینگی۔ ان کی قوت ماند پڑ جائے گی۔ کیونکہ اگر اَلْقَمَرُ سے مراد عربوں کی ریاست اور اَلشَّمْسُ سے ایران کی سلطنت لی جائے (دیکھئے عنوان ق۔م۔ر اور ش۔م۔س) تو اَلنُّجُوْمُ سے مراد چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہوں گی۔ لیکن اگر اس سے مراد کائنات کا طبعی انقلاب ہے تو پھر ان الفاظ کے حقیقی معنی لئے جائیں گے۔

---

* تاج۔ ** راغب۔

ک د ی

اَلْکُدْیَۃُ ۔ سخت زمین ۔ بڑی سخت چٹان ۔ اَکْدَی الرَّجُلُ ۔ اس نے بخل کیا۔ اَکْدَی الْحَافِرُ ۔ زمین کو کھودنے والا اس مقام پر جا پہنچا جہاں سخت زمین یا چٹان آگئی اور وہ مزید کھدائی سے رک گیا۔ اَکْدَی الْمَطَرُ ۔ بارش کم ہو گئی***۔ قرآن کریم میں ہے اَعْطٰی قَلِیْلًا وَّ اَکْدٰی (۵۳/۳۴) ۔ وہ تھوڑا سا دیتا ہے اور پھر پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے ۔ پھر ہاتھ روک لیتا ہے (ابن فارس)۔ مومن کی روش زندگی تو یہ ہے کہ وہ صرف اپنی ضروریات کے لئے رکھتا ہے اور باقی سب کچھ نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے لئے دے دیتا ہے ۔ لیکن جو شخص اس نظام پر دل سے یقین نہیں رکھتا، صرف مصلحتاً اس جماعت کے ساتھ رہتا ہے ، اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ گریز کی راہیں نکالتا رہتا ہے ۔ (تَوَلّٰی - ۵۳/۳۳) - یعنی تھوڑا سا دیدیا اور اس کے بعد پھر ہاتھ روک لیا اور بہانہ سازیاں شروع کر دیں ۔

ک ذ ب

اَلْکَذِبُ کے معنی ہیں جانتے بوجھتے کسی چیز کے متعلق خلاف حقیقت خبر دینا ۔ لیکن بعض کا خیال ہے کہ عمداً ہو یا سہواً ، دونوں صورتوں میں کَذِبٌ* کا لفظ بولا جائیگا* ۔ اَکْذَبَ الرَّجُلُ اس وقت کہتے ہیں جب کسی آدمی کو پکارا جائے اور وہ سوتے ہوئے کی طرح چپ سادھ لے۔ کَذَّابَۃٌ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو مختلف رنگوں میں رنگا یا چھاپا جائے** ۔ کَذَبَ فِیْ سَیْرِہٖ کے معنی ہیں اونٹ سست رفتار ہو گیا ۔ یعنی جس رفتار سے وہ چل سکتا تھا اس رفتار پر نہیں چلا یا وہ بری چال چلا*** ۔ بعض اوقات کَذَبَ کے معنی واجب ہونے کے بھی آتے ہیں***۔

قرآن کریم نے سورۃ منافقون میں کہا ہے کہ (اے رسول) جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ تو خدا کا رسول ہے ۔ اس کے بعد ہے کہ خدا کو اس کا علم ہے کہ تو واقعی اس کا رسول ہے لیکن وہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ (۶۳/۱) ۔ یہ منافق یقیناً کاذب ہیں ۔ یہاں سے کِذْبٌ کے معنی واضح ہو گئے ۔ یعنی کسی کی کوئی بات اگرچہ خارجی واقعہ کے عین مطابق ہو لیکن اگر اس میں اس کے دل اور زبان کی ہم آہنگی نہیں تو وہ کِذْبٌ

*محیط ۔ **اقرب الموارد ۔ ***تاج ۔

ہے ۔ اور اگر کسی معاملہ میں دل اور زبان ہم آہنگ ہیں لیکن وہ بات واقعہ کے خلاف ہے تو اسے کِذْبٌ نہیں کہینگے۔ وہ بات اس کے عدمِ علم پر محمول کی جائیگی ۔ یعنی یہ کہینگے کہ اسے صحیح واقعہ کا علم نہیں ۔ یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کریم نے اس کی بھی سخت تاکید کی ہے کہ جس بات کا علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگ جایا کرو (۱۷/۳۶) ۔ اس لئے وہی بات زبان سے نکالنی چاہئے جس کے متعلق تحقیق کرلی جائے۔

سورۃ یوسف میں ہے بِدَمٍ کَذِبٍ (۱۲/۱۸) ۔ جھوٹ موٹ کا خون یعنی ایسا خون جو اس کا نہ تھا جس کا وہ بتایا گیا تھا ۔ کَاذِبٌ ۔ جھوٹا (۱۱/۹۳) ۔ کَذَّابٌ ۔ بہت بڑا جھوٹا (۴۰/۲۸) ۔ مَکْذُوْبٌ ۔ جھوٹ کہا ہوا (۱۱/۶۵) ۔ کَذَّبَ ۔ جھٹلایا (۲۳/۲۵) ۔ تَکْذِیْبٌ ۔ جھٹلانا (۸۵/۱۹) ۔ مُکَذِّبٌ ۔ وہ جو جھٹلائے جائے اور کبھی نہ مانے (۵۶/۵۱) ۔

وحی (قرآن کریم) اپنے ہر دعویٰ کو علم و بصیرت کی بنیادوں پر پیش کرتا ہے اور دلیل و برہان سے اس کی تائید کرتا ہے ۔ وہ اپنے مخالفین سے بھی یہی کہتا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو ۔ (۲/۱۱۱)۔ یہ ہے حقیقت تک پہنچنے کا صحیح طریقہ ۔ لیکن اگر کوئی شخص پہلے ہی سے یہ فیصلہ کرلے کہ مجھے فریقِ مقابل کے دعویٰ کو بہر حال جھٹلانا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ کبھی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا ۔ یہ ہے وہ تَکْذِیْبٌ جسے قرآن کریم نے سخت جرم قرار دیا ہے ۔ علم و بصیرت کی بارگاہ میں اس سے بڑا جرم اور کونسا ہوگا؟

نیز تکذیب یہ بھی ہے کہ انسان جس بات کی صداقت کا قائل ہو اور اس پر ایمان کا مدعی ، اس کا عمل اس کے اس ایمان کی شہادت نہ دے ۔ سورۃ الماعون میں دیکھئے ، کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ (۱۰۷/۱) ۔ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟ اس کے بعد بتایا کہ یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا ۔ یہ وہ نمازی ہیں جو صلٰوۃ کی غرض و غایت کو فراموش کئے ہوئے ہیں۔ جو اس کے ظاہری ارکان و حرکات ہی کو اصلِ صلٰوۃ سمجھے ہوئے ہیں ، اور رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک کے لئے کھلا رہنا چاہئے تھا ، بند لگا کر روک لیتے ہیں (۱۰۷/۲-۷) ۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ قرآن کریم کی رو سے "تکذیب دین" کون کرتا ہے ۔ اور یہ بھی کہ خود ہمارا شمار کن لوگوں میں ہے؟

ک ر ب

اَلْکَرْبُ - شدید غم کو کہتے ہیں - اس کی اصل کَرْبُ الْاَرْضِ سے ہے۔ جس کے معنی زمین میں ہل چلانے کے ہیں - یا یہ کَرَبَتِ الشَّمْسُ سے ماخوذ ہے - جس کے معنے ہیں سورج غروب ہونے کے قریب ہوگیا۔ اَلْکَرْبُ - رسی بٹنے کو بھی کہتے ہیں ، نیز بیڑی کو تنگ کرکے سختی سے باندھنے کے لئے بھی - کَرَبٌ - اُس رسی کو بھی کہتے ہیں جو ڈول کے ساتھ بندھی رہتی ہے اور ہر مرتبہ پانی میں ڈوبتی ، بھیگتی اور اس طرح جلد گل سڑجاتی ہے۔ کَرَبَ النَّاقَۃَ - اس نے اونٹنی پر بوجھ لاد دیا - اَلْکَرِیْبُ - وہ زمین جس پر کبھی کاشت نہ کی گئی ہو* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی شدت اور قوت کے ہوتے ہیں -

ان معانی سے اَلْکَرْبُ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - یعنی شدید غم ، جس سے انسان بری طرح جکڑا جائے - گرانبار ہو جائے ، اس کے آسرے ٹوٹ جائیں - اس کا قلب الٹ پلٹ ہوجائے۔ یہ ہے وہ کَرْبٌ جس کے متعلق کہا ہے کہ اس سے نجات کا ذریعہ صرف ایک ہے اور وہ ہے قانونِ خداوندی کی اطاعت - قُلِ اللّٰہُ یُنَجِّیْکُمْ مِنْھَا وَ مِنْ کُلِّ کَرْبٍ (۶/۶۴) - اسی طریق سے خدا کے بندوں کو کرب سے نجات ملتی ہے (۲۱/۷۶) -

اَلْکَرُوْبِیُّوْنَ - عبرانی زبان کا لفظ کَرُوْبِیْم ہے - جس سے مراد مقرب فرشتے ہیں** - (قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا) -

ک ر ر

اَلْکَرُّ - کسی چیز کو پلٹانا ، موڑ دینا ، لوٹا دینا ، پھیر دینا - موٹی رسی یا رسی کو کَرٌّ کہتے ہیں** - اَلتَّکْرِیْرُ - و اَلتَّکْرَارُ - کسی چیز کو بار بار دہرانا - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنے اکٹھا کرنا اور پلٹانا بتائے ہیں - تکرار اور تاکید میں فرق یہ ہے کہ تاکید اسے کہتے ہیں کہ ایک بات کہی جائے اور اس کے ساتھ ہی اس پر زور دیا جائے نیز تاکید تین بار سے زیادہ نہیں کی جاتی - لیکن تکرار میں یہ دونوں باتیں ضروری نہیں*** -

قرآن کریم میں کفار کی اس حسرت کو متعدد مقامات پر دہرایا گیا ہے کہ لَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً (۲/۱۶۷) - اگر ایک مرتبہ زندگی کو پیچھے کی طرف لوٹا کر پھر وہی حالات پیدا کر دئیے جائیں تو ہم یہ کریں اور وہ کریں -

---

*تاج و راغب - **محیط - ***تاج -

لیکن اسکی نفی کی گئی ہے (۳۹/۵۸۔۵۹) ۔ اسلئے کہ زندگی جوئے رواں ہے ۔ اسکا جو پانی ایک مرتبہ آگے نکل گیا وہ پھر واپس نہیں آسکتا ۔ اسی طرح دنیا کی اس اسٹیج پر کوئی فرد دوبارہ نہیں آسکے گا ۔ اس لئے تناسخ (آواگون ۔ دنیا میں بار بار آنے) کا تصور قرآن کریم کے خلاف ہے ۔ قانونِ ارتقاء میں اعادہ اور تکرار نہیں ۔ یا آگے بڑھنا ہے (جسے جنت کہتے ہیں) یا ایک مقام پر رک جانا (جسے جہنم کہتے ہیں) ۔

سورۂ النّٰزعٰت میں ہے ۔ تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ (۷۹/۱۲) ۔ یہ مر کر پھر زندہ ہونا تو بہت نقصان دہ ہوگا ۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے ۔ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ (۱۷/۶) ۔ پھر ہم نے حالات کو ایسا پلٹا دیا کہ وہ تمہارے حق میں ہو گئے اور تمہارے دشمنوں کے خلاف ۔

ک ر س

اَلْكِرْسُ ۔ اصل و بنیاد* ۔ اَلْكُرْسِيُّ ۔ کرسی جس پر بیٹھتے ہیں ۔ اَلْكُرْسِيُّ وَالْكِرْسِيُّ ۔ حکومت و اقتدار ۔ یا علم ۔ چنانچہ اس صحیفہ کو جس میں علم ہوتا ہے كُرَّاسَةٌ کہتے ہیں ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ كُرَّاسَةٌ ان اوراق کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے سے ملا دئے گئے ہوں ۔ کیونکہ اَلتَّكْرِيْسُ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کے ایک حصے کو دوسرے حصے سے ملا دینا* ۔ آج کل کاپی کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے اوپر تلے جم جانا یا اکٹھا ہو جانا بتائے ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (۲/۲۵۵) ۔ خدا کی ''کرسی'' تمام کائنات کو محیط ہے ۔ اس میں كُرْسِيُّهُ کے معنی باعتبار لغت بھی اور صاحب المنار کے نزدیک بھی ، علمِ خداوندی ہیں ۔ اگرچہ اسی کے معنے حکومت و اقتدار بھی ہوسکتے ہیں ۔ ''علم'' کا مفہوم اس لئے قابلِ ترجیح ہے کہ اس سے پہلے یہ آیا ہے وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۔ '' وہ اس کے علم میں سے کسی چیز پر احاطہ نہیں کرسکتے مگر اس کے قانونِ مشیت کے مطابق'' ۔

سورۃ صٓ میں حضرت سلیمانؑ کے تختِ حکومت کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے (۳۸/۳۴) ۔ اس میں بھی كُرْسِيِّهٖ کے معنے تخت یا ''بیٹھنے کی جگہ'' کے نہیں ، بلکہ اقتدارِ حکومت ہے ۔ ''تخت'' ۔ ''کرسی'' وغیرہ الفاظ ، اقتدار اور منصب کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں ۔

---

*تاج و محیط و راغب ۔

ک ر م

اَلْکَرَمُ اس صفت کو کہتے ہیں جو کمینگی کے خلاف ہو۔ عربوں میں کمینگی بد ترین خصلت تھی، اس لئے کَرَمٌ بہترین صفت تھی۔ دراصل اس کے معنی تھے کسی ایسے بوجھ کو اٹھا لینا جس سے قوم کے خون اور اس کی جان کی حفاظت ہوتی ہو۔ یعنی بڑے گرانقدر اجتماعی امور اور رفاہ عامہ کے لئے خرچ کرنا یا سعی و کوشش کرنا۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ کَرَمٌ کسی کو بغیر ذاتی غرض و منفعت کے بقدر ضرورت فائدہ پہنچانا ہے۔ اس کے معنی خلوص کے بھی ہیں۔ اَلْاِکْرَامُ وَ اَلتَّکْرِیْمُ۔ کسی کو اسطرح نفع پہنچانا کہ اس میں اس کی کسی طرح کی سبکی یا ذلت نہ ہو، ساتھ ہی یہ کہ جو نفع پہنچایا جائے وہ بلند اور با شرف ہو*۔ اس اعتبار سے عربوں کے ہاں اَلْکَرِیْمُ ایک ایسی جامع صفت ہے جس میں ہر قسم کی بھلائیاں، فضیلتیں اور شرف شامل ہیں۔ چنانچہ یہ ایسے شخص کے لئے بولا جاتا ہے جس میں کسی قسم کی مذموم صفت نہ پائی جاتی ہو۔ نیز الکَرِیْمُ کے معنے ہیں آزاد اور شریف۔ نجیب۔ سخی۔ خوش نہاد۔ جو اپنے آپ کو احکام خداوندی کی خلاف ورزی سے محفوظ رکھے، نرم خو، خلیق، وسیع الظرف، عمدہ حسب و نسب والا، پسندیدہ صفات کا مالک، با عزت۔ وہ گھوڑا جس پر جہاد کیا جائے۔ وہ اونٹ جس پر پانی لاد کرلایا جائے۔ نیز ہر پسندیدہ اور منتخب چیز*۔ کثیر بارش کو بھی کَرِیْمٌ کہتے ہیں۔ اَرْضٌ مَکْرَمَۃٌ۔ ایسی زمین جسے جوت کر، کھاد وغیرہ ڈال کر اچھی طرح تیار کر لیا جائے۔ نیز وہ عمدہ زمین جس میں بہت اچھی پیداوار ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ کَرُمَتْ اَرْضُہُ الْعَامَ۔ کھاد ڈالنے کی وجہ سے اس سال اس کی زمین بڑی زرخیز ہوئی اور اس میں بہت فصل ہوئی۔ کَرَّمَ السَّحَابُ تَکْرِیْمًا۔ بادل خوب اچھی طرح برسا*۔ راغب نے کہا ہے کہ کسی شخص کو اس وقت تک کَرِیْمٌ نہیں کہا جاسکتا جب تک اس سے کَرَمٌ کا ظہور نہ ہو چکا ہو**۔

قرآن کریم نے جہنم کے دخانی سایہ کے متعلق کہا ہے۔ لَابَارِدٍ وَّلَا کَرِیْمٍ (۵۶/۴۴)۔ جس میں نہ ٹھنڈ ہے نہ خوشگواری یا نفع بخشی۔ مومنین کی صفات میں ہے۔ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا (۲۵/۷۲)۔ جب کسی لایعنی اور لغو بات سے ان کا گذر ہو جائے تو وہ نہایت شریفانہ انداز سے گذر جاتے ہیں۔

---

*تاج۔ **راغب۔

سورۃ علق میں خدا کو اَلْاَکْرَمُ (۹۶/۳) کہا گیا ہے۔ اسی کو ذُوْالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ (۵۵/۲۷) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کَرَّمْتَ (۱۷/۶۲) اور اَکْرَمَ (۸۹/۱۵) کے معنی عزت و تکریم عطا کرنا۔ بمقابلہ اَھَانَ (۸۹/۱۶)۔ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ (۲۱/۲۶)۔ معزز بندے۔

مُکْرِمٌ (۲۲/۱۸) عزت دینے والا۔ رِزْقٌ کَرِیْمٌ (۸/۴)۔ رزقِ باشرف۔ عزت کی روزی۔ جنتی معاشرہ کے خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ وہاں رزق کریم ملے گا۔ یعنی سامانِ زیست بکثرت اور فراواں بھی اور عزت و توقیر کے ساتھ بھی۔ کیسی خوش بخت ہے وہ قوم جسے رزق کریم میسر ہو۔ لیکن یہ نظامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے ہی سے مل سکتا ہے۔ (اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد بھی)۔

قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)۔ ہم نے تمام فرزندان آدم کو صاحب کرم بنایا ہے۔ یعنی خدا نے ہر فرزندِ آدم کو محض آدمی ہونے کی جہت سے واجب التکریم بنایا ہے۔ تکریم آدمیت کا یہ اعلان عظیم سب سے پہلے قرآن کریم ہی کی طرف سے ہوا۔ یعنی ہر انسان بہ حیثیت انسان ہونے کے قابل احترام ہے۔ ہر فرد کو عزت و شرف کا یہ بنیادی حق (Fundamental Right) قرآن کریم کی بارگاہ سے عطا ہوا۔ یہ انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اس کے بعد اس عزت و تکریم کے مدارج، جو ہر ذاتی اور اعمال کریمانہ کے اعتبار سے قائم ہوتے ہیں۔ جو جتنا زیادہ قوانین الٰہیہ کی نگہداشت کرتا ہے اتنا ہی زیادہ واجب التکریم ہوجاتا ہے۔ حتیٰ کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۴۹/۱۳) جو سب سے زیادہ ان قوانین کی نگہداشت کرتا ہے وہ سب سے زیادہ عزت و تکریم کا مستحق ہو جاتا ہے۔ غور کیجئے۔ قرآن کریم نے کس طرح عزت و شرف کے پرانے معیاروں (حسب و نسب۔ مال و دولت وغیرہ) کو بدل کر ان کی جگہ احترام و تکریم کے نئے پیمانے دے دئے، جن کی رو سے ہر انسان، بحیثیت انسان ہونے کے، واجب الاحترام ہے اور جو جس قدر زیادہ قانونِ خداوندی کی پابندی کرتا ہے وہ اسی قدر زیادہ واجب التکریم ہوتا جاتا ہے، یعنی عزت کا معیار جوہرِ ذاتی قرار پا گیا، نہ کہ اضافی نسبتیں۔ اسی ایک معیار سے بادشاہت، برھمنیت، پیشوائیت، سرمایہ داری کے تمام نظام کہن حرف غلط کیطرح مٹ جاتے ہیں۔ یعنی ہر انسانی بچہ، خواہ وہ بادشاہ کے گھر میں پیدا ہو یا فقیر کے۔ برھمن کا بیٹا ہو یا چمار کا۔ انسان ہونے کی جہت سے یکساں تکریم کا مستحق ہے۔ اور باپ کی وجاہت یا عزت اسے دوسرے بچوں سے ممتاز نہیں کر سکتی۔ دوسروں کے مقابلہ میں اس کا زیادہ باعزت ہونا اس کے ذاتی جوہر اور عمل کی بنا پر ہوگا۔

ک ر ہ

اَلْکَرْہُ ۔ اَلْکُرْہُ ۔ سخت نا پسندیدگی ۔ مشقت ۔ بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ جس کام پر خود تمہارا نفس ناخواستہ طور پر تمہیں مجبور کرے ، وہ کُرْہٌ ہے اور جس پر کوئی دوسرا مجبور کرے وہ کَرْہٌ ہے ۔ راغب نے کہا ہے کہ جو تکلیف کسی انسان پر خارج سے پہنچے اور اس پر زبردستی لاد دی جائے تو وہ کَرْہٌ ہے اور جو اسے خود اپنے آپ سے پہنچے وہ کُرْہٌ ہے* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ کُرْہٌ تو مشقت کو کہتے ہیں اور کَرْہٌ یہ ہے کہ تم کو کسی بات کے کرنے کے لئے کہا جائے اور تم اسے بادل ناخواستہ کرو ۔ قرآن کریم میں طَوْعًا کے مقابلہ میں کَرْھًا آیا ہے ۔ (۳/۸۲) ۔ طَوْعًا کے معنی ہیں بہ طیب خاطر اور کَرْھًا کے معنی زبردستی ۔ سورۃ بقرہ میں ہے ۔ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَ ھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ (۲/۲۱۶) تم پر جنگ کو قانوناً ضروری قرار دیا گیا ہے حالانکہ تمہاری طبیعتیں اسے بادل ناخواستہ قبول کرتی ہیں ، یا حالانکہ وہ تمہاری طبیعتوں پر ناگوار گذرتی ہے ۔ سورۃ احقاف میں جنین کے متعلق ہے حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ کُرْھًا وَّ وَضَعَتْهُ کُرْھًا (۴۶/۱۵) ۔ اس کی ماں بڑی مشقت سے حمل کے دن گزارتی ہے اور وضع حمل میں بھی تکلیف اٹھاتی ہے ۔ سورۃ نحل میں اِکْرَاہٌ زبردستی کے معنوں میں آیا ہے ۔ یعنی جو کام دل کی مرضی سے نہ کیا جائے (۱۶/۱۰۶) ۔ سورۃ بقرۃ میں کَرِہَ کا لفظ اَحَبَّ کے مقابلہ میں آیا ہے (۲/۲۱۶) ۔ اسی طرح (۴۹/۷) میں کَرَّہَ حَبَّبَ کے مقابلہ میں ۔ کَارِھُوْنَ (۹/۴۸) نا پسند کرنے والے ۔ مَکْرُوْہٌ (۱۷/۳۸) ناپسندیدہ ۔

قرآن کریم جس جماعت کے ہاتھوں آسمانی انقلاب کو لاتا ہے اس کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس انقلاب اور نظام کو اپنے دل کی مرضی سے (بلا جبر و اکراہ) اپنی زندگی کا نصب العین بناتی ہے ۔ لہذا اس کا اعلان یہ ہے کہ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (۲/۲۵۶) ۔ اس سوسائیٹی کا ممبر بطیب خاطر بنا جاسکتا ہے ، کسی قسم کے جبر و اکراہ سے نہیں ۔ رسول اکرمؐ سے کہا گیا کہ اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (۱۰/۹۹) ۔ کیا تو لوگوں کو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایمان لے آئیں؟ اکراہ ، طبعی (Physical) بھی ہوتا ہے ۔ جیسے کسی کے گلے پر تلوار رکھکر اس سے بات منوا لی جائے ۔ اور ذہنی بھی ۔ جیسے کسی کو شعبدہ دکھا کر اس سے اپنی بات منوا لی جائے ۔

*تاج ۔

تیسری قسم کا اکراہ یہ ہے کہ معاشرہ میں جو روایات چلی آتی ہیں اور جو تصورات اور نظریات ، معتقدات و خیالات ، ہمیں اسلاف سے وراثتاً ملتے ہیں ، انہیں ہماری تعلیم و تربیت کا جزو بنا کر دلوں میں راسخ کر دیا جائے ، عام اس کے کہ انہیں خدا کی کتاب کی سند حاصل ہے یا نہیں - یا وہ علم و بصیرت اور عقل و فکر کے معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں - یہ اکراہ کی سنگین ترین شکل ہے - غلط تعلیم و تربیت سے بڑھ کر شدید اکراہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ قرآنی جماعت میں داخل کرنے کے لئے کسی قسم کے اکراہ کی بھی اجازت نہیں - وہ ہر بات کو دلائل و براہین سے پیش کرتا اور دل و دماغ کے کامل اطمینان کے بعد منواتا ہے - اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس جماعت میں داخل ہونے پر کسی قسم کا جور و اکراہ روا نہیں رکھا جا سکتا ، اس میں سے نکلنے کے لئے بھی پوری آزادی ہونی چاہئیے - اگر آپ اس سے نکلنے کی راہیں بند کر دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کو جور و اکراہ سے اس کے اندر رکھتے ہیں - لہذا ہمارے ہاں جو سمجھا جاتا ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے تو یہ چیز قرآن کریم کے خلاف ہے - قرآن کریم نہ کسی کو زبردستی مسلمان بناتا ہے اور نہ ہی اس شخص کو مسلمان رہنے پر مجبور کرتا ہے جس کا دل اسلام پر مطمئن نہ ہو - ایمان نام ہی دل و دماغ کے کامل اطمینان اور رضامندی کا ہے -

سورۃ نحل میں ہے مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ - وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ($\frac{16}{106}$) - جو شخص اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس سے انکار کرتا ہے - تو یہ ان لوگوں میں سے ہے جن پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے سخت عذاب ہے - لیکن ان میں وہ شخص شامل نہیں جس کا دل ایمان پر مطمئن ہو لیکن اسے کفر (انکار) پر مجبور کر دیا جائے - کفر اُس کا کفر ہے جو اپنے سینے کی کشاد (دل کی پوری رضامندی) سے کفر اختیار کرے - اب ظاہر ہے کہ اگر جور و اکراہ سے کسی سے کفر کا اقرار کرا لینا اُسے کافر نہیں بنا دیتا ، تو جور و اکراہ سے کسی سے ایمان کا اقرار لے لینا ، یا اسے اس مسلک پر رہنے پر مجبور کر دینا ، اُسے کس طرح مومن بنا سکتا ہے - مومن وہی ہے جو بطیب خاطر قرآن کریم کی صداقتوں کا اقرار کرے اور پھر دل کی پوری رضامندی سے اس مسلک پر قائم رہے - جہاں ذرا سا بھی جور و اکراہ آیا ، وہاں ایمان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - قرآن کریم تو ان لوگوں کو بھی مومن قرار

نہیں دیتا جو اسلامی مملکت کی شان و شوکت کو دیکھکر (خود عہد نبوی میں) اسلام لے آئے تھے - وہ ان سے کہتا ہے کہ تم یوں کہو کہ ہم اس جدید نظام کے تابع فرمان ہو گئے ہیں (اَسۡلَمۡنَا) - یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں ، کیونکہ ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں جا گزیں نہیں ہوا - (۴۹/۱۴) - وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ جب ان کے سامنے (اور تو اور) خود آیات خداوندی پیش کی جاتی ہیں ، لَمۡ یَخِرُّوۡا عَلَیۡهَا صُمًّا وَّ عُمۡیَانًا (۲۵/۷۳) - تو ان پر بہرے اور اندھے بنکر نہیں گر پڑتے - یعنی انہیں بھی آنکھیں کھول کر قبول کرتے ہیں -

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی شخص کو اسلامی نظام میں مجبوراً داخل نہیں کیا جا سکتا - لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کوئی شخص اس نظام میں بطیب خاطر داخل ہو گیا ہے ، تو اس کے بعد اسے اس کے احکام و قوانین کی اطاعت پر بھی مجبور نہیں کیا جا سکتا - وہ جب تک اس نظام کا ممبر رہیگا ، اس کے قواعد و ضوابط کی پابندی اس پر لازمی ہوگی - اگر وہ ان کی پابندی نہیں کرنا چاہتا تو وہ اس نظام کے دائرے سے باہر نکل جائے - لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کسی نظام یا سوسائٹی کا ممبر بھی رہے اور اس کے قواعد و ضوابط میں سے جسے چاہے تسلیم کرے اور جسے چاہے مسترد کر دے -

ک س ب

کَسۡبٌ کے اصلی معنی جمع کرنا ہیں - اس کے بعد اس کے معنی تلاش معاش کے بھی آتے ہیں - اور کسی چیز کو حاصل کر لینے اور اسے پا لینے کے بھی * -

وَیۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا یَکۡسِبُوۡنَ (۲/۷۹) انہوں نے جس چیز کو (یعنی دین میں تحریف کو) اپنے لئے وجہ معاش بنا رکھا ہے وہ ان کے لئے تباہی اور بربادی کا موجب ہے - اس سے ذرا آگے ہے - مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَةً (۲/۸۱) - جس نے ناہمواریاں پیدا کیں - یہاں کَسَبَ کے معنی "کرنے" کے ہیں - یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے اپنے لئے ناہمواریوں کو اکٹھا کر لیا -

قرآن کریم میں آتا ہے - لَهَا مَا کَسَبَتۡ وَعَلَیۡهَا مَا اکۡتَسَبَتۡ (۲/۲۸۶) - اس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ جس نے اچھے کام کئے ان کا فائدہ

*تاج - نیز ابن فارس -

اس کے لئے ہے (لَہَا) اور جس نے برے کام کئے اس کا نقصان بھی اسی کے لئے ہے (عَلَیْہَا) ۔ لیکن یہاں '' نیک اعمال ،، اور ان کے فائدوں کے لئے کَسَبَ آیا ہے اور '' برے کام ،، اور ان کے نقصانات کے لئے اِکْتَسَبَ ۔ راغب نے لکھا ہے کہ کَسْبٌ ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جسے انسان اپنی ذات کے فائدے کے لئے اور اس کے ساتھ ہی دوسروں کے فائدے کے لئے کرے۔ اور اِکْتِسَابٌ ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جس میں انسان صرف اپنے مفاد کو پیش نظر رکھے ۔ راغب کے اس مفہوم کے اعتبار سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ نفع مند صرف وہی کام ہو سکتے ہیں جن میں اپنا اور دوسروں کا (سب کا) فائدہ مد نظر ہو ۔ لیکن جن کاموں میں صرف اپنا ذاتی مفاد ہی پیش نظر ہو ان سے انسان کی ذات کی نشو و نما نہیں ہوتی ۔ وہ اس کے لئے موجب نقصان ہوتے ہیں (عَلَیْہَا کے یہی معنی ہیں) ۔ یہ چیز قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے عین مطابق ہے جس کی رو سے اس نے کہا ہے کہ وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) ۔ بقاء صرف ان کاموں کے لئے ہے جو تمام نوع انسان کے لئے نفع بخش ہوں ۔

صاحب لطائف اللغۃ نے بھی کہا ہے کہ کَسَبَ ، خیر کے لئے آتا ہے اور اِکْتَسَبَ ، شر کے لئے ۔

لیکن راغب یا صاحب لطائف اللغۃ نے کسب اور اکتساب کے معنوں میں جو فرق بتایا ہے وہ کلیہ نہیں ۔ قرآن کریم میں ان شکلوں کا استعمال اس کے خلاف بھی ہوا ہے ۔

ک س د

کَسَدَ ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے اسقدر معمولی ، گھٹیا ، اور بے قدر ہونے کے ہیں کہ کوئی اسکی طرف رغبت نہ کرے۔ تہذیب میں ہے کہ کَسَادٌ کے اصلی معنی خراب ہو جانے اور بگڑ جانے کے ہیں ۔ پھر اس کا استعمال ، سامان اور بازار کے چالو نہ رہنے کے معنوں میں ہونے لگ گیا ۔ کَسَدَ الْمَتَاعُ ۔ بازار میں اس سامان کا چلن نہیں رہا ۔ کَسَدَتِ السُّوْقُ ۔ بازار سرد پڑ گیا ۔ اَلْکَسِیْدُ ۔ گھٹیا ۔ کم درجہ ۔ کمینہ * ۔ قرآن کریم میں (سورۂ توبہ) میں ہے وَ تِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا (۹/۲۴) ۔ وہ تجارت جس کی کساد بازاری (مندا پڑ جانے) سے تم ڈرتے ہو۔

*تاج و محیط ۔

ک س ف

اَلْکِسْفَۃُ ۔ چیز کا ٹکڑا۔ جمع کِسَفٌ وکِسْفٌ (۴۴/۹۲ ; ۳۰/۴۸)*۔ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں ایسی خرابی آجانے کے ہوتے ہیں جو پسندیدہ نہ ہو۔ نیز ایک چیز کو دوسری چیز سے کاٹ دینا اور الگ کر دینا ۔ سورۂ الطور میں ہے ۔ اِنْ یَّرَوْا کِسْفًا مِنَ السَّمَآءِ (۵۲/۴۴) ۔ اور سورۃ شعراء میں ہے فَاَسْقِطْ عَلَیْنَا کِسَفًا مِنَ السَّمَآءِ (۲۶/۱۸۷) ۔ اس کے معنی عذاب ناگہانی یا تباہی و بربادی کے ہیں ۔ کَسَفَ الثَّوْبَ کے معنی ہیں اس نے کپڑے کو کاٹا ۔ کَسَفَتِ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۔ سورج اور چاند گہن میں آگئے ۔ کَسَفَتْ حَالُہٗ ۔ اس کا حال خراب ہو گیا ۔ رَجُلٌ کَاسِفُ الْبَالِ ۔ بد حال آدمی ۔ یَوْمٌ کَاسِفٌ ۔ نہایت ہولناک اور شدت کی تکلیف کا دن * ۔ جس دن آسمان پھٹ پڑے ۔

ک س ل

اَلْکَسَلُ ۔ کسی ایسے کام میں واماندگی اور گرانباری کا اظہار کرنا جس میں گرانباری اور تکان کا اظہار کرنا نہیں چاہئیے ۔ اَلْکِسْلُ ۔ روئی دھننے کی کمان کی تانت جو کمان سے الگ کر دی گئی ہو** ۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت کمان اور تانت دونوں موجود ہوتی ہیں لیکن ان میں باہمی رابطہ نہ رہنے سے روئی نہیں دھنی جا سکتی ۔ دونوں بیکار ہوتی ہیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی کام کے کرنے سے گرانباری محسوس کرنا اور اس کی تکمیل سے ، یا اسے کرنے سے جی چرانا ۔

اس مفہوم کو سامنے رکھئیے اور پھر اس آیت پر غور کیجئے جس میں منافقت برتنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ۔ اِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی (۴/۱۴۲) ۔ نیز (۹/۵۴) ۔ یہ نظامِ صلٰوۃ میں شریک تو ہوتے ہیں لیکن اس انداز سے کہ کمان الگ ہے اور تانت الگ ۔ یعنی ظاہری طور پر سب کچھ ہو رہا ہے لیکن نتیجہ کچھ مرتب نہیں ہوتا ۔

یہ نقشہ ، جسے ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں کہ یہ "رسول اللہؐ کے زمانے کے منافقین" کی حالت کا بیان ہے، درحقیقت ہماری

---

* تاج و راغب ۔ ** تاج و محیط ۔

ہی حالت کا نقشہ ہے ۔ غور کیجئے کہ کیا ہماری نمازیں بے تانت کی کمان نہیں ۔ [نیز دیکھئے سَاهُوْنَ (۱۰۷/۵) عنوان س ۔ ہ ۔ و]

ک س و

اَلْكِسْوَةُ ۔ اَلْكُسْوَةُ ۔ لباس ، کپڑا جو پہنایا جائے* ۔ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ (۲/۲۳۳) ۔ ان کا کھانا اور کپڑا ۔ كَسَاهُ كَسْوًا ۔ اسے کپڑا پہنا دیا* ۔ فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ۔ (۲۳/۱۴) ہم (جنین کی) ہڈیوں کو گوشت کا پہناوا پہناتے ہیں ۔

ک ش ط

اَلْكَشْطُ ۔ کسی چیز پر سے اس پر چھائی ہوئی چیز اٹھا دینا ۔ كَشَطَ الْغِطَاءَ عَنِ الشَّيْءِ ۔ اس نے اس چیز سے ڈھکنا ہٹا دیا ۔ كَشَطَ الْجِلْدَ عَنِ الْجَزُوْرِ ۔ اس نے ذبح کردہ اونٹ سے کھال اتار دی ۔ اَلْكِشَاطُ ۔ اتاری ہوئی کھال ۔ كَشَطَهُ ۔ اس نے اسکو کھول دیا** ۔ اِنْكَشَطَ رَوْعُهُ ۔ اس کا خوف جاتا رہا*** ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ۔ (۸۱/۱۱) اس کے معنی ہیں جب "آسمان" سے پردہ اٹھا دیا جائیگا ۔ جب اس کا پوست اتار دیا جائیگا (اور اسطرح فضائے کائنات کے اندر کی چھپی ہوئی قوتیں بے نقاب ہوجائینگی) ۔

ک ش ف

اَلْكَشْفُ ۔ پردہ اٹھا دینا ۔ کسی بات کو ظاہر کر دینا** ۔ قرآن کریم میں ہے فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ (۵۰/۲۲) ۔ ہم نے (تیری آنکھوں سے) پردہ اٹھا دیا اور اسطرح حقائق تجھ پر منکشف ہو گئے ۔ نیز اسکے معنی ہٹا دینے ، دور کر دینے کے بھی ہیں ۔ سورہ اعراف میں ہے لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ (۷/۱۳۴) ۔ اگر تو ہم سے یہ عذاب دور کر دے ۔ كَشْفُ الضُّرِّ (۹۶/۱۰) تکلیف کا دور کر دینا ۔ كَاشِفٌ ۔ دور کر دینے والا (۶/۱۷) ۔

قرآن کریم میں ایک جگہ ملکہ سبا کے متعلق ہے وَكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا (۲۷/۴۴) ۔ اور دوسری جگہ سورہ قلم میں ہے يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ (۶۸/۴۲) ۔ یہ عربوں کا محاورہ تھا جسے وہ اسوقت بولتے تھے جب کوئی سخت مرحلہ سامنے آجائے* ۔ چنانچہ راغب نے لکھا ہے کہ اسکی اصل

---

* تاج و راغب ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔

قَامَتِ الْحَرْبُ عَلیٰ سَاقٍ ہے - جسکے لفظی معنے ہیں جنگ اپنی پنڈلی پر کھڑی ہو گئی مطلب یہ ہے کہ پورے زور و شور سے شروع ہو گئی - گھمسان کا رن پڑا - اسی سے سَاقٌ اس شدید کے لئے آتا ہے - بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اسکی اصل تَدْمِیْرُ النَّاقَةِ سے ہے جس سے مراد ہے آدمی کا اونٹنی کے رحم میں ہاتھ ڈال کر بچہ نکالنا - ایسے موقع پر کَشْفَ عَنِ السَّاقِ کہا جاتا ہے** - بہرحال ، اس کے معنی شدت کی سختی اور گھبراہٹ کے ہیں -

یہ جو ہمارے ہاں کشف و الہام کا عقیدہ ہے اسکی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی - ختم نبوت کے بعد یہ عقیدہ رکھنا کہ کوئی شخص خدا سے براہ راست ہمکلام ہو سکتا ہے اور براہ راست حقائق کا علم حاصل کر سکتا ہے ، ختم نبوت کی مہر کو توڑ دینا ہے - اب انسانوں کے لئے علم کے سر چشمے صرف دو ہیں - قرآن کریم (جو وحی پر مشتمل ہے) اور عقل انسانی (مزید تفصیل عنوان ل - ہ - م - میں دیکھئے)

ک ظ م

اَلْکَظْمُ - اَلْکَظَمُ - حلق - منہ - سانس کے باہر نکلنے کا راستہ - مخرج*** - اس اعتبار سے اسکے معنے کسی چیز کے باہر نکلنے کے ہیں - لیکن دوسری طرف اَلْکُظُوْمُ سانس کے رک جانے کو بھی کہتے ہیں** - کَظَمَ الْبَعِیْرُ کے معنی ہیں اونٹ کا جگالی نہ کرنا ، اور جو کھایا ہو اسے اندر روک لینا** - اس سے کَظَمَ الْبَابَ کے معنی ہیں دروازہ بند کر دینا*** - اسی سے اَلْکُظُوْمُ کے معنی خاموش ہو جانے کے آتے ہیں**** - اَلْکَاظِمُ اس اونٹ کو بھی کہتے ہیں جس کے پیٹ کا پانی خشک ہو گیا ہو اور وہ سخت پیاسا ہو* - لیکن کَظِیْمٌ اور مَکْظُوْمٌ کے معنی سخت غمگین و فکر مند اور مضطرب و بیقرار انسان کے ہیں- **** بے چینی اور بیقراری کے معنوں میں سورہ المومن میں ہے - اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَی الْحَنَاجِرِ کَاظِمِیْنَ ($\frac{۴۰}{۱۸}$) - جب قلوب اچھل کر گلے تک آجائیں گے اور وہ لوگ سخت مضطرب و بیقرار ہونگے - یا وہ اپنے قلوب کو دبا رہے ہونگے کہ کہیں وہ باہر ہی نہ نکل پڑیں - سورہ القلم میں ہے - وَهُوَ مَکْظُوْمٌ ($\frac{۶۸}{۴۹}$) - وہ بے چین اور بیقرار تھا - سورہ یوسف میں حضرت یعقوب کے متعلق ہے فَهُوَ کَظِیْمٌ ($\frac{۱۲}{۸۴}$) - وہ یوسف کی جدائی میں بیقرار تھا -

*تاج - **راغب - ***تاج و لطائف اللغة و راغب - ****محیط -

سورہ آل عمران میں مومنین کی صفت بتائی گئی ہے۔ کَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ (۱۳۴/۳)۔ عام طور پر اس کے معنی کئے جاتے ہیں غصہ کو دبانے والے۔ یہ مفہوم صحیح نہیں۔ قرآن کریم غصے کو دبانے (Suppression) کی تلقین نہیں کرتا۔ اس کے صحیح مفہوم کے لئے کِظَامَۃٌ کے معنی سمجھ لینے ضروری ہیں۔ جن زمینوں میں پانی کم ہو (جیسا کہ عرب کی سرزمین) وہاں ایک کنویں کے قریب ہی دوسرا کنواں کھود دیتے ہیں اور ان کنوؤں کے نیچے زمین دوز راستہ (Subterranean Channel) بنا دیتے ہیں جس سے ایک کنواں دوسرے کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اگر ایک کنویں میں پانی کم رہ جاتا ہے اور دوسرے میں زیادہ ہوتا ہے تو اس کا زائد پانی اس دوسرے کنویں کی طرف آجاتا ہے۔ اس زمین دوز نالی کو کِظَامَۃٌ کہتے ہیں*۔ لہذا اَلْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ کے معنی یہ ہیں کہ جب کسی وجہ سے ان (مومنین) کی مشتعل ہونے والی قوتیں بڑھ جاتی ہیں تو بجائے اس کے کہ یہ ان قوتوں کو وحشیوں کی طرح یونہی تخریب میں صرف کردیں وہ انہیں دوسری طرف منتقل کر دیتے ہیں اور اس طرح ان سے تعمیری کام لیتے ہیں۔ اسے کِظَامَۃٌ کہا جائیگا۔ اسی کو دور حاضر کے علم النفس (سائیکالوجی) کی اصطلاح میں (Sublimation) کہتے ہیں۔ یعنی زائد قوتوں کا دوسری طرف منتقل کرکے توازن قائم رکھنا۔ توازن کے اعتبار سے ترازو کے اس حلقے کو بھی اَلْکِظَامَۃٌ کہتے ہیں جس میں پلڑے کی رسیاں اکٹھی کرکے باندھی جاتی ہیں۔ نیز اس میخ کو بھی جس کے ساتھ ترازو کی زبان گھومتی ہے اور بتاتی ہے کہ دونوں پلڑوں میں سے کونسا بھاری اور کونسا ہلکا ہے۔ جب ان کا وزن برابر ہو جاتا ہے تو یہ زبان درمیان میں ٹھہر جاتی ہے*۔ نیز اَلْکَظِیْمَۃٌ۔ توشہ دان کو کہتے ہیں جسمیں زائد کھانا رکھ لیا جاتا ہے۔ لہذا کَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ کے معنی ہیں زائد توانائیوں کو اس طرف منتقل کرکے جہاں ان کی ضرورت ہو، اپنی ذات اور معاشرہ کے توازن کو قائم رکھنے والے۔ قرآنی معاشرہ کا کام یہ ہے کہ وہ مختلف افراد کی توانائیوں کا جائزہ لیتا رہے۔ جہاں جہاں ان کی ضرورت ہے انہیں اسطرف منتقل کرکے، کظامت کے ذریعے، معاشرہ کا توازن قائم رکھے اور معاملات میں درستگی پیدا کرتا رہے۔ اس طرح ایک فرد کی ذات میں بھی توازن قائم رہے گا اور سارے معاشرہ میں بھی۔ یوں جماعتِ مومنین اَلْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ ہو جائیگی۔ واضح رہے کہ جس چیز کو (Rational) کہا جاتا ہے اسکے معنی یہ ہیں کہ اسمیں صحیح (Ratio) ہوتی ہے۔ جماعت

*تاج۔ نیز ابن فارس۔

مومنین چونکہ اپنی ذات اور معاشرہ میں صحیح صحیح توازن رکھتی ہے اسلئے اسکی ہر بات (Rational) ہوتی ہے اور یہ (Ratio) کظامت کے ذریعے برقرار رکھی جاتی ہے۔ توازن یا تناسب (Ratio) کے صحیح ہونے کا نام حسن ہے۔ اسی سے قرآن کریم نے " نیکیوں اور بھلائیوں " کے لئے حسنات کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور صفات خداوندی کو الاسماء الحسنیٰ سے تعبیر کیا ہے۔ (تفصیل ان نکات کی ح - س - ن کے عنوان میں ملیگی)۔

ک ع ب

اَلْكَعْبُ۔ ہڈیوں کا ہر جوڑ۔ ابھری ہوئی ہڈی جو پاؤں کے اوپر یا پنڈلی اور پاؤں کے جوڑ پر ہوتی ہے۔ یا بالخصوص پاؤں کا ٹخنہ۔ سورۃ مائدہ میں کَعْبَیْنِ۔ دونوں ٹخنوں کے لئے آیا ہے (۵/۶)۔ اَلْكَعْبُ۔ اَلْكَعْبَةُ۔ مربع ہڈی (جس پر نشانات لگے ہوتے ہیں اور) جسے کھیلنے میں پھینکا جاتا ہے*۔ (عام طور پر ان سے جؤا کھیلا جاتا ہے۔ انہیں پانسہ کہتے ہیں) کَعْبَةٌ۔ اونچی اور مربع جگہ کو کہتے ہیں۔ ہر چوکور مکان کو**۔ لیکن اَلْكَعْبَةُ خانۂ کعبہ کےلئے مخصوص ہو گیا۔ اَلْكَعْبُ۔ شرف اور بزرگی کو بھی کہتے ہیں*۔ اَلْكَعْبُ۔ ابھرا ہوا پستان۔ اسی جہت سے اَلْكَاعِبُ۔ نوجوان لڑکی کو کہتے ہیں۔ جمع كَوَاعِبُ۔ سورۃ النبأ میں جنتی معاشرہ کی عورتوں کے لئے كَوَاعِبَ اَتْرَابًا آیا ہے (۷۸/۳۳)۔ انہی کو دوسری جگہ عُرُبًا اَتْرَابًا کہا گیا ہے (۵۶/۳۷)۔ اور اس کی تفسیر ذرا پہلے فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ کہکر کر دی گئی ہے (۵۶/۳۴)۔ یعنی عالی مرتبت، بلند پایہ خواتین۔ اس لئے كَوَاعِبُ میں جوانی کی تندرستی کے ساتھ ساتھ شرف و مجد (اَلْكَعْبُ) کی طرف بھی اشارہ ہے۔ (نیز دیکھئے ع - ر - ب اور ت - ر - ب) قرآن کریم کی رو سے کعبہ کا صحیح مقام کیا ہے، اس کے لئے عنوان، (ق - ب - ل)، میں لفظ قِبْلَة دیکھئے۔

ک ف أ

كَافَاَهٗ عَلَى الشَّيْءِ۔ مُكَافَاَةً۔ كِفَاءً۔ اس نے اس چیز پر اسے بدلہ دیا۔ كَافَاَهٗ۔ اس نے اس کی برابری کی۔ اس کا ہم پلہ ہؤا۔ تَكَافَاَ الشَّيْئَانِ۔ دونوں چیزیں برابر سرابر ہوگئیں۔ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں (ابن فارس)۔

---

*تاج۔ **لطائف اللغۃ۔

اسی لئے کُفْؤٌ و کُفُوٌ و کِفْؤٌ کے معنی اس کی مثل و نظیر اور اس کے ہم پلہ کے ہیں ۔ اَلْکَفَاءَۃُ فِی النِّکَاحِ۔ اسی سے ماخوذ ہے ۔ یعنی شوہر کا اپنی بیوی سے حسب ، نسب ، گھرانے وغیرہ میں برابر ہونا* ۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لئے ہے ۔ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ (۱۱۲/۴)۔ اس کے برابر، ہمسر ، ہم پلہ کوئی نہیں۔ یہ چیز ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیات میں سے ہے۔ ہر (Personality) منفرد (Individual) اور یگانہ (Unique) ہوتی ہے ۔ اور خدا کی ذات چونکہ مطلق اور مکمل ہے اس لئے اس کی انفرادیت بھی یکسر مکمل اور بے نظیر ہے ۔ سورۃ اخلاص بالخصوص ، ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیات (Characteristics) کی شارح ہے ۔ اس میں احدیت ، ذات کی یگانگت (Uniqueness) پر دلالت کرتی ہے ۔ صمدیت ، اس کی آزادی (Freedom) کی شہادت دیتی ہے ۔ عدم تولد ، یہ بتاتا ہے کہ ذات ، انسانی جسم کی طرح سلسلۂ توالد و تناسل کی رُو سے وجود میں نہیں آتی ۔ اور کفواً اس کی انفرادیت (Individuality) کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ (مزید تشریح متعلقہ عنوانات میں دیکھئے) ۔

ک ف ت

کَفَتَ الشَّیْیءَ اِلَیْہِ ۔ اس نے چیز کو اپنے اندر لے لیا ۔ کَفَتَ الشَّیْیءَ ۔ اس چیز پر قبضہ کر لیا** ۔ جمع کر لیا ** ۔ راغب نے لکھا ہے کہ کَفْتٌ تیز ہانکنے کو بھی کہتے ہیں ۔ کَفَتَ الطَّائِرُ ۔ پرندے نے اڑنے میں پر سمیٹے اور تیز اڑا ۔ اَلْکِفَاتُ ۔ وہ جگہ جہاں کسی چیز کو جمع کیا جائے ۔ چنانچہ عرب کِفَاتُ الْاَحْیَاءِ مکانوں کو اور کِفَاتُ الْاَمْوَاتِ قبروں کو کہتے تھے** ۔

قرآن کریم میں ہے اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ کِفَاتًا (۷۷/۲۵) ۔ کیا ہم نے زمین کو کِفَاتٌ نہیں بنایا ۔ یعنی اس میں ہر قسم کی چیزیں جمع کر دیں ۔ جمادات ۔ نباتات ۔ حیوانات ۔ پانی ۔ ہوا وغیرہ ۔ نیز جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ، کَفَتَ الطَّائِرُ کے معنی ہیں پرندے نے اڑنے میں تیزی کی (اڑنے میں پروں کو سمیٹا) ۔ فَرَسٌ کَفْتٌ ۔ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو یک بارگی اچھل پڑے اور سوار کا اس پر قابو پانا مشکل ہو جائے*** ۔ اس اعتبار سے زمین کے کِفَاتٌ سے مراد یہ ہوگی کہ یہ تیزی سے چل رہی ہے ۔ یا دونوں معانی کو یک جا کرنے سے مطلب یہ ہوگا کہ یہ تمام چیزوں کو اپنے اندر لئے ہوئے نہایت تیزی سے چل رہی ہے ۔

---

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔ ***راغب و ابن فارس

ک ف ر

كُفْرٌ کے معنی چھپانے اور ڈھانپنے کے آتے ہیں ۔ الرمانی نے اَخْفٰی ۔ سَتَرَ اور اَجَنَّ کو کَفَرَ کا مرادف لکھا ہے** ۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی چھپانے اور ڈھانپنے کے کئے ہیں ۔ چنانچہ اس شخص کو جو اس طرح ہتھیاروں میں ڈوب جائے کہ اس کا بدن نظر نہ آئے کَافِرٌ کہا جاتا ہے۔ رات کو بھی کَافِرٌ کہتے ہیں کیونکہ اس کی تاریکی تمام چیزوں پر پردہ ڈال دیتی ہے ۔ سیاہ بادل کو بھی کَافِرٌ کہتے ہیں ۔ نیز دریا اور سمندر کو بھی کیونکہ یہ اپنی اندرونی چیزوں کو چھپائے ہوتے ہیں ۔ کسان کو بھی کَافِرٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ بیج کو مٹی میں چھپا دیتا ہے* ۔ تاج، نیز صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ قبر کو بھی اَلْکَفْرُ کہتے ہیں ۔ ان معانی کے اعتبار سے مومن کے مقابل میں کَافِرٌ اُسے کہا جائے گا جو ٹھوس سچائیوں کو پس پردہ رکھنا چاہے ۔ جو خدا کے دئے ہوئے ابدی حقائق کو پوشیدہ رکھے اور انہیں ابھر کر سامنے نہ آنے دے ۔ یا جو اپنی یا دوسروں کی صلاحیتوں کو چھپائے اور انہیں بروئے کار نہ آنے دے ۔ ان کی نشو و نما نہ ہونے دے ۔

چھپانے کے مفہوم کی وجہ سے اس کے معنی انکار کرنے کے بھی ہو گئے۔ اِیْمَانٌ کے مقابل میں كُفْرٌ کے یہی معنی ہوتے ہیں ۔ یعنی قرآنی صداقتوں کا انکار کرنا ۔

كُفْرٌ بمقابلہ شُكْرٌ بھی آتا ہے ۔ اس لئے کہ شکر کے معنی ہیں کسی چیز کا ابھر کر سامنے آ جانا (دیکھئے ش ۔ ک ۔ ر) ۔ لہذا كُفرانِ نعمت کے معنی ہیں نعمتوں کا چھپا لینا ۔ انہیں نوع انسانی کے فائدے کے لئے کھلا نہ رکھنا ۔

كَفَّارَةٌ کو کفارہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ غلط کام کے ضرر رساں نتیجہ کو ڈھانپ لیتا ہے* ۔ کَفَرَ کے تین مصدر ہیں ۔ (۱) كُفْرَانٌ ۔ (۲) كُفْرٌ اور (۳) كُفُوْرٌ ۔ كُفْرَانٌ کا استعمال عام طور پر انکارِ نعمت کے لئے ہوتا ہے اور كُفْرٌ کا استعمال دینی معاملات کا انکار کرنے کے لئے ۔ اور كُفُوْرٌ ان دونوں میں استعمال ہوتا ہے* ۔ صاحب تاج نے البصائر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بیشتر كَافِرٌ (بمعنی کافر دین) کی جمع كُفَّارٌ آتی ہے ۔ ($\frac{۴۸}{۲۹}$) اور كَافِرٌ (بمعنی کافرِ نعمت) کی جمع كَفَرَةٌ* ۔ (مثلاً $\frac{۸۰}{۴۲}$ میں)۔ لیکن

*تاج ۔ **الالفاظ المترادفۃ ۔ ***راغب ۔

ہمارا خیال ہے کہ قرآن کریم میں کُفَّارٌ - کَفَرَةٌ اور کَافِرُوْنَ سب ہی جمعیں بلا تفریق، کافر دین کے لئے استعمال ہوئی ہیں - کَافُوْرٌ - ویسے تو اس خول کو کہتے ہیں جو شگوفہ کو اپنے آغوش میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے* لیکن یہ ایک مشہور خوشبودار دوائی کا بھی نام ہے جس کا اثر حدت کو کم کر دینا ہوتا ہے -

کَفُوْرٌ - بڑا ناشکرا ، بڑا منکر حق - اس میں کافر سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے (۳۱/۳۲) - اور کَفَّارٌ بھی کَفُوْرٌ کے ہم معنی ہے ، بلکہ اس میں کبھی کَفُوْرٌ سے بھی زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے (۵/۲۲)** -

قرآن کریم میں کُفْرٌ بمقابلہ اِیْمَانٌ متعدد مقامات پر آیا ہے (مثلاً ۲/۳ ; ۲/۹ میں) - اور شُکْرٌ کے مقابل بھی (۱۳/۷) - سورۂ انبیاء میں مومن کے متعلق کہا ہے کہ فَلَا کُفْرَانَ لِسَعْیِہٖ (۲۱/۹۴) - یعنی اسکی کوششوں کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا - وہ بے نتیجہ نہیں رہینگی (اس لئے کہ شُکْرٌ کے معنی ہیں کوششوں کے بھر پور نتائج مل جانا) - اسی طرح وَمَا یَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلَنْ یُّکْفَرُوْہُ (۳/۱۱۴) کے بھی یہی معنی ہیں - یعنی ان کا ہر عمل خیر پورا پورا نتیجہ مرتب کریگا -

سورۂ بقرہ میں اِیْمَانٌ بِاللّٰہِ کے مقابلہ میں کُفْرٌ بِالطَّاغُوْتِ کی تاکید آئی ہے (۲/۲۵۶) - اس کفر بالطاغوت کی تشریح دوسرے مقام پر وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (۱۶/۳۶) کہکر کر دی - یعنی غیر خدائی قوتوں سے اجتناب کرو - اس کی تفسیر سورۂ نساء میں ان الفاظ سے کر دی کہ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ (۴/۶۰) یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خدائی قوانین سے کرائیں حالانکہ ان سے کہدیا گیا ہے کہ وہ غیر خدائی قانون سے اجتناب کریں - اُن سے انکار کر دیں - کہدیں کہ ہم انہیں صحیح تسلیم نہیں کرتے -

لہذا اِیْمَانٌ بِاللّٰہِ (یا اللہ کی عبادت)*** کے معنی ہیں خدا کے قانون کے مطابق معاملات کے فیصلے کرنا اور کُفْرٌ بِالطَّاغُوْتِ کے معنی ہیں غیر خدائی قانون سے اجتناب کرنا - اس سے ظاہر ہے کہ ایمان اور کفر محض اعتقادی چیزیں نہیں جو انسان کے ذہن تک محدود ہوں - ان کا تعلق زندگی کے نظری اور عملی دونوں مسائل سے ہے - قرآن کریم کے قانون کی صداقت کو

---

*تاج - **راغب - ***وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (۱۶/۳۶) -

تسلیم کرنا اور پھر اس کے مطابق زندگی کے معاملات کا فیصلہ کرنا ایمان ہے اور اسکے خلاف فیصلہ کرنا کفر ہے۔ چنانچہ (۳۰/۴۴) میں کَفَرَ کے مقابلہ میں عَمِلَ صَالِحًا آیا ہے۔

انکار کے لحاظ سے اس کے معنی بری الذمہ ہونے کے بھی آتے ہیں۔ سورۂ ابراہیم میں ہے اِنِّیْ کَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَکْتُمُوْنِ (۱۴/۲۲)۔ تم نے جو مجھے شریک بنایا تو میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ کاشتکار کے معنوں میں کُفَّارٌ جو کَافِرٌ کی جمع ہے (۵۷/۲۰) میں آیا ہے۔ کَافِرَۃٌ کی جمع کَوَافِرُ (۶۰/۱۰) میں آئی ہے۔ کَفَّارَۃٌ (۵/۴۵)۔ وہ عمل یا شے جس سے کسی سابقہ لغزش کی تلافی ہو جائے۔

سورۂ دھر میں "جنت کی شراب" کا مزاج کَافُوْرًا بتایا گیا ہے (۷۶/۵)۔ یعنی جلد مشتعل ہو جانے والے جذبات میں سکون پیدا کرنے والی۔ لیکن یہ انسانی ذات کی اصلاح کا پہلا مرحلہ ہے۔ اس سے اگلا مرحلہ وہ ہے جس میں اس "شراب" کا مزاج زَنْجَبِیْلًا۔ (۷۶/۱۷) بتایا گیا ہے۔ یعنی مناسب قوت اور حدت پیدا کرنے والی۔ برودت اور حدت (ٹھنڈک اور گرمی) کے معتدلانہ امتزاج کا نام ہے، سیرتِ مومن۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

قرآن کریم کی رو سے کافر کا لفظ کوئی گالی نہیں بلکہ ایک حقیقت نفس الامری کا بیان (Statement of Fact) ہے۔ آپ ایک پارٹی بناتے ہیں۔ جو لوگ اس میں شامل ہوتے ہیں انہیں اس کا ممبر کہا جاتا ہے۔ جو اس میں شامل نہیں ہوتے وہ غیر ممبر (Non-Members) کہلاتے ہیں۔ یہی فرق مومن اور کافر کا ہے۔ اسلامی معاشرہ کے ممبروں کو مومن کہا جاتا ہے۔ اور جو اس معاشرہ میں داخل ہونے سے انکار کر دیتے ہیں وہ "نان ممبرز" (کافر) ہوتے ہیں۔

ان "غیر ممبروں" (کافروں) کے متعلق جس جس عذاب (تباہیوں) کا ذکر آیا ہے وہ ان کی غلط روش کے نتائج ہوتے ہیں جسے وہ صحیح راستہ کے انکار سے اختیار کرتے ہیں۔ یعنی صحیح راستہ کی پیروی چھوڑ کر (۲/۳۸) غلط راستہ اختیار کر لینا (۲/۳۹) اور اس طرح تباہیوں میں جا گرنا۔ (۲/۳۹)۔

کَفَّرَ عَنْہُ کے معنی ہیں دور کر دینا۔ (۲/۲۷۱)۔

اس حقیقت کو ایک بار پھر سامنے لے آئیے کہ قرآن کریم نے کفر کا لفظ عملِ صالح کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے (۳۰/۴۴)۔ لہذا ایمان اور کفر صرف نظری (Theoretical) اعتقاد نہیں بلکہ عمل اور بے عملی (یا صحیح

عمل اور غلط عمل) کا نام ہے ۔ یہیں سے سورۃ البقرہ کی اس آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جس کے مروجہ ترجمہ اور غلط مفہوم سے طرح طرح کے شکوک اور اعتراضات پیدا ہو جاتے ہیں ۔ سورۃ بقرۃ کے شروع میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے بچنے کی خواہش رکھتے ہیں ، انہیں قرآن کریم صحیح روش کی طرف راہ نمائی دیتا ہے ۔ اس سے اگلی آیت میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْہِمْ ءَاَنْذَرْتَہُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْہُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۲/۶) ۔ اس کا عام طور پر ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ "جو لوگ کافر ہوگئے ان کے لئے برابر ہے چاہے تو ان کو ڈرائے یا نہ ڈرائے ۔ وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے" ۔ "کافروں" سے مراد لئے جاتے ہیں "غیر مسلم" ۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے ۔ مسلمان نہیں ہوتے ۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر غیر مسلموں (کافروں) کو رسول کا انذار کچھ فائدہ نہیں دے سکتا تو پھر رسالت اور تبلیغ ہے کن لوگوں کے لئے؟ مومنین کو اس کی ضرورت نہیں رہتی اور کافروں کو یہ کچھ فائدہ نہیں دیتا! نیز جب نبی اکرمؐ نے انذار شروع کیا ہے تو اس وقت ساری دنیا "کافر" ہی تھی ۔ اگر حضورؐ کا انذار کفار کے لئے بے سود تھا تو حضورؐ کی بعثت کا مقصد ہی (معاذ اللہ) کچھ نہیں تھا ۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس آیت میں کفار سے مطلب سب غیرمسلم نہیں ۔ یہ غیر مسلموں کے ایک مخصوص گروہ کا نام ہے ۔ جہاں تک "غیر مسلموں" کا تعلق ہے ، افریقہ اور آسٹریلیا کے قدیم قبائلی باشندے ، یا قطب شمالی کے اسکیمو ، جنہوں نے ابھی تک اسلام یا قرآن کریم کا نام بھی نہیں سنا ، وہ بھی غیر مسلم ہیں ۔ لیکن ان کا شمار کفار کے زمرے میں نہیں ہوگا ۔ جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے ، کفر ، ایمان کے مقابلہ میں آتا ہے ۔ ایک شخص کے سامنے قرآن کریم کی صداقتیں پیش کی جاتی ہیں ۔ اسے ان کا مفہوم اور مطلب سمجھایا جاتا ہے ۔ وہ ان پر غور و فکر کرتا ہے اور اس کے بعد برضا و رغبت انہیں تسلیم کر لیتا ہے ۔ اسے ایمان کہتے ہیں ۔ اس کے برعکس دوسرا شخص ہے ۔ اس کے سامنے بھی اسی طرح قرآنی صداقتیں پیش کی جاتی ہیں ۔ لیکن وہ انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے ۔ اسے کافر کہینگے ۔ ان لوگوں کے انکار کی کئی وجوہات اور متعدد محرکات ہوتے ہیں ۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر ان کا ذکر کیا ہے ۔ نیز یہ بھی بتایا ہے کہ یہ لوگ حق کی مخالفت پر اتر آتے ہیں ۔ اس سے سرکشی برتتے ہیں ۔ خود بھی اس راستے سے رکتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی طرف آنے سے روکتے ہیں ۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ ہر غیرمسلم، کافر نہیں ہوتا - کافر وہی ہوتا ہے جس کے سامنے حق کو پیش کیا جائے لیکن وہ تمام دلائل و براہین کے باوجود، اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دے اور پھر لاکھ کوشش کرو، وہ اپنی ضد پر اڑا رہے - کفار کی اس ذہنیت، اور اس کے بعد حق کی مخالفت میں ان کی تگ و تاز کا ذکر، قرآن کریم نے متعدد مقامات میں کیا ہے - مثلاً

(۱) وہ اہل کتاب کے متعلق کہتا ہے فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (۲/۸۹) - "جب ان کے پاس وہ آیا جسے وہ پہچانتے تھے، تو انہوں نے اس سے انکار (کفر) کر دیا" - دوسری جگہ ہے کہ یہ اہل کتاب چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو، ان کے ایمان لانے کے بعد، پھر کفر کی طرف لوٹا دیں، مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ.... (۲/۱۰۹) "بعد اس کے کہ حق ابھر کر ان کے سامنے آگیا" - سورۃ محمد میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى (۴۷/۳۲) - "یقیناً جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں...... بعد اس کے کہ ہدایت ان کے سامنے ابھر کر آ چکی ہے..." - ان مقامات سے واضح ہے کہ، حق اور صداقت (ہدایت) کے واضح طور پر سامنے آجانے کے بعد، اس سے انکار کئے جانا، کفر کہلاتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے کفر اور ایمان کے امتیاز کا ذکر ہی حق کے سامنے آجانے کے بعد کیا ہے - سورۃ کہف میں ہے وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ - فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ... (۱۸/۲۹) - "اور (ان سے کہو کہ) حق تمہارے رب کی طرف سے آگیا ہے - اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کی راہ اختیار کر لے" - سورۃ دھر میں ہے اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (۷۶/۳) - "ہم نے (انسان کو) راستہ دکھا دیا ہے - اب اس کا جی چاہے تو اس کا قدردان بن جائے اور چاہے تو اس سے انکار کر دے" - سورۃ زخرف میں ہے وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ - قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۴۳/۳۰) - "اور جب حق ان کے پاس آیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ جھوٹ ہے اور ہم اس سے انکار کرتے ہیں" -

ان مقامات سے واضح ہے کہ حق کے واضح طور پر سامنے آجانے کے بعد اس سے انکار کرنا، کفر کہلاتا ہے - جن لوگوں کے سامنے حق آیا ہی نہیں وہ غلط راستے (ضلالت) پر تو ہیں لیکن انہیں کافر نہیں کہا جائے گا - ان کا شمار ضَآلِّيْنَ میں ہوگا - یعنی راہ گم کردہ - غلط راستے پر چلنے والے -

(۲) سورۃ توبہ میں ایمان والوں سے کہا گیا ہے کہ تم اپنے باپ اور بھائیوں کو بھی اپنا دوست نہ بناؤ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ (۹/۲۳) - اگر وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو پسند کریں - اس سے واضح ہے کہ کفر ، اس انکار کی راہ کا نام ہے جسے انسان اپنی پسندیدگی سے اختیار کرے - اسی طرح سورۃ النحل میں ہے کہ کفر اس کا ہے مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا (۱۶/۱۰۶) - ''جس کا سینہ کفر کے لئے کھل جائے'' - لہذا کفر وہ ہے جسے انسان اپنے اختیار و ارادہ (Choice) سے پسند کرے -

(۳) اس قسم کے انکار کے کئی محرکات ہوتے ہیں - مثلاً اھل کتاب کے متعلق ہے کہ وہ بَغْيًا ایسا کرتے ہیں (۲/۹۰) - یعنی ضد اور سرکشی کی بنا پر - یا حسدًا ایسا کرتے ہیں (۲/۱۰۹) - عام مخالفین حرب کے متعلق ہے کہ وہ اس دعوت سے انکار کرتے تھے اِسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَ مَكْرَ السَّيِّئِ (۳۵/۴۳) - ''تکبر کرتے ہوئے اور بری تدبیریں کرتے ہوئے'' - یعنی انہوں نے ظلم اور استبداد ، اور دجل و فریب سے جو قوت اور دولت حاصل کر رکھی تھی ، وہ اس کے نشے میں بدمست ہو کر اسلام کی مخالفت کرتے تھے کیونکہ اس سے ان کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی تھی - (نیز دیکھئے ۳۵/۴۳) - سورۃ نمل میں ہے کہ وَ جَحَدُوا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا (۲۷/۱۴) - ''انہوں نے محض ظلم اور سرکشی کی بنا پر ہماری آیات سے انکار کر دیا حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کرلیا تھا'' -

(۴) بعض اوقات انسان ، محض بات کی پچ میں حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا چلا جاتا ہے - یعنی اگر ایک دفعہ منہ سے نہ نکل گئی تو پھر (محض اپنی بات پر جمے رہنے کی خاطر) نہ کرتے چلے گئے - سورۃ اعراف میں انہی لوگوں کے متعلق ہے کہ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ - فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ (۷/۱۰۱)- ''اور یقیناً انکے پاس رسول واضح دلائل لیکر آئے - مگر وہ ایسے نہ تھے کہ جس بات کو انہوں نے پہلے جھٹلا دیا تھا ، اس پر ایمان لے آتے'' - اس ذھنیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں - كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ (۷/۱۰۱) -

(۵) یہ لوگ ، ضد - حسد - ہٹ دھرمی اور تکبر کی بنا پر حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے بعد ، دوسروں کو بھی روکتے ہیں کہ وہ اسے تسلیم نہ کر لیں - وَ هُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَ يَنْئَوْنَ عَنْهُ (۶/۲۶) - '' وہ دوسروں کو بھی اس سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور

رهتے هیں ''۔ دوسری جگه هے اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ .... (۴۷/۳۴) '' یقیناً وہ لوگ جنهوں نے خود کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو بهی اللہ کی راہ سے روکتے هیں '' (وہ اپنا هی نقصان کرتے هیں ، اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے) ۔ ان کی کیفیت یه هوتی هے که وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ ۔ وہ لوگوں کو تاکید کرتے رهتے هیں که اس قرآن کریم کو مت سنو ۔ وَالْغَوْا فِیْهِ ۔ اور (جہاں کہیں اس کا چرچا هوتا هو) اس میں شور مچاؤ ۔ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶)۔ شاید تم (اس طریق سے ان پر) غالب آسکو۔

یه هیں وہ لوگ که سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۲/۶) ۔ چاهے تو انہیں (ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے) آگاہ کرے یا نه کرے ، ان کے لئے برابر هے ۔ یه کبهی ایمان نہیں لائینگے ۔ اسلئے که ان کی اس روش کا نتیجه یه هوتا هے که ان میں سمجھنے ، سوچنے ، دیکھنے ، سننے کی صلاحیت هی باقی نہیں رهتی (۲/۷) ۔ یہی وہ لوگ هیں جن کے متعلق قرآن کریم کہتا هے که لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا ۔ وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا ۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا ۔ اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (۷/۱۷۹) ۔ ان کا ٹھکانه جہنم هے (۷/۱۷۹)۔ '' ان کے دل هیں لیکن وہ ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے ۔ اور ان کی آنکھیں هیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں ۔ اور ان کے کان هیں لیکن ان سے سنتے نہیں ۔ یه لوگ (یونہی شکل و صورت سے انسان نظر آتے هیں ورنه درحقیقت) حیوانات کی سطح پر زندگی بسر کرتے هیں ۔ بلکه ان سے بهی زیادہ راہ گم کردہ'' (کیونکه وہ کم از کم اپنی جبلت پر تو قائم رهتے هیں)

سوال یه هے که یه کفر کی زندگی هے کیا ؟ یه حقیقت متعدد مقامات پر سامنے لائی جا چکی هے که ایک تصور زندگی یه هے که انسانی زندگی بس یہی طبیعی زندگی هے ۔ کھایا ، پیا ، زندہ رهے ، بچے پیدا کئے اور مر گئے ۔ اس کے بعد ختم ۔ دوسرا تصور زندگی یه هے که انسان ، اسی طبیعی جسم کا نام نہیں جو موت کے ساتھ ختم هو جاتا هے ۔ اس میں ایک اور چیز بهی هے جسے انسانی ذات (Personality) کہا جاتا هے ۔ اس ذات کی نشوونما سے انسان حیات جاوید حاصل کر سکتا هے ۔ موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا ۔ حیوانات کو '' ذات'' نہیں دی گئی ۔ یه صرف انسانوں کا خاصه هے ۔

پہلا تصور زندگی ، کفر هے ۔ اس میں انسان ، حیوانات کی سطح پر رهتا هے ۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ ۔ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّهُمْ (۴۷/۱۲) ۔ '' جو لوگ کفر کی روش اختیار

کرتے ھیں ، وہ سامان زیست سے متمتع ہوتے ھیں ، اور حیوانات کی طرح کھا پی کر (مر جاتے ھیں)۔ جہنم ان کا ٹھکانہ ھے''۔ یہ زندگی کی بلند اقدار پر ایمان نہیں رکھتے (کیونکہ ان کی ضرورت تو صرف ذات کی نشوونما کے لئے ہوتی ھے)۔ وہ اپنی خواھشات کے پیچھے چلتے رھتے ھیں ، اور ان جذبات میں ایسے ڈوبتے ھیں کہ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ھی نہیں رھتی۔ سورہ الجاثیہ میں ھے اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَهٗ ھَوٰىهُ ۔ کیا تو نے اسکی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ھی کو اپنا اِلٰہ بنا لیا ؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ ۔ خدا کا قانون ، اس کے علم کے باوجود ، زندگی کی صحیح راہ اس کے سامنے نہیں لاتا ۔ وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۔ (جذبات میں بہ جانے سے اسکی حالت یہ ہو جاتی ھے کہ) اس کے کانوں پر اور دل پر مہریں لگ جاتی ھیں اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ھیں ۔ فَمَنْ یَّھْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۔ اور یہ ظاھر ھے کہ خدا کے قانون کے علاوہ کوئی اور قانون صحیح راستے کیطرف اسکی راہ نمائی نہیں کر سکتا ۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۔ کیا یہ لوگ اس سے نصیحت نہیں پکڑتے ؟ (۴۵/۲۳)

سوال یہ ھے کہ یہ لوگ اسطرح جذبات کے پیچھے کیوں بہ جاتے ھیں اور زندگی کی بلند اقدار کا اتباع کیوں نہیں کرتے ؟ اس لئے کہ وَقَالُوْا مَا ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا ۔ اور کہتے ھیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ھے ۔ نَمُوْتُ وَنَحْیَا ۔ ھم (طبیعی قوانین کے ماتحت) مرتے اور جیتے ھیں ۔ وَمَا یُھْلِکُنَا اِلَّا الدَّھْرُ ۔ وقت گزرنے سے ھمارے قویٰ مضمحل ہو جاتے ھیں اور ھم مر جاتے ھیں ۔

یہ ھے ان کا تصورِ زندگی ۔ قرآن کریم کہتا ھے کہ وَمَا لَھُمْ بِذٰلِکَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ (۴۵/۲۴) ۔ انہیں حقیقت کا کچھ علم نہیں ۔ یونہی اپنے قیاسات سے باتیں کرتے ھیں ۔ (نیز دیکھئے ۶/۳۰)

اسی کا نام کفر ھے ۔ یعنی انسان کا اپنی ذات سے انکار ۔ اس انکار کے بعد نہ خدا پر ایمان کی ضرورت رھتی ھے ، نہ وحی اور رسالت پر ۔ اور آخرت کی زندگی کا تو سوال ھی پیدا نہیں ہوتا ۔ لہذا ، کفر درحقیقت مادی تصورِ حیات کا دوسرا نام ھے ۔ یعنی (Materialistic Concept of Life) ۔ اس تصورِ زندگی کے ماتحت اپنے جذبات کی تسکین ، انسان کا منتہائے زندگی قرار پا جاتا ھے اور زندگی کی بلند اقدار یا غیر متبدل اصولوں کی پابندی کا سوال ھی پیدا نہیں ہوتا ۔

جب انسان اس تصور زندگی کو عین حقیقت سمجھ لے ، تو جن امور سے بلند انسانی زندگی کو نقصان پہنچتا ہے ، اسے ان سے آگاہ کرنا یا نہ کرنا برابر ہوتا ہے ۔ حیوان کو آپ کیا سمجھا سکتے ہیں کہ دیانتداری کی زندگی بہت بلند ہوتی ہے اور بددیانتی سے شرف انسانیت کا زیاں ہوجاتا ہے !

ک ف ف

اَلْکَفُّ ۔ (۱۳/۱۴) ۔ پہنچے تک ہاتھ کو کہتے ہیں ، کیونکہ اس کے ذریعے انسان اپنی مدافعت کرتا اور دوسرے انسان کو ایذا پہنچانے سے روکتا ہے ۔ کَفَفْتُهٗ عَنْهُ (۵/۱۱) ۔ میں نے اسے اس بات سے روک دیا ۔ ہٹا دیا ۔ موڑ دیا ۔ فَکَفَّ هُوَ ۔ پس وہ رک گیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پکڑنا اور سکڑنا ہیں ۔ ہاتھ کو کَفّ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ چیزوں کو پکڑ لیتا ہے ۔ اَلْکُفَّةُ ۔ کسی چیز کے آخری کنارے کو کہتے ہیں جس سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتی ۔ اسی کو کِفَافُ الشَّیْءِ بھی کہتے ہیں ۔ کِفَّةٌ ۔ ترازو کے ایک پلڑے یا بازو کو کہتے ہیں ۔ کَافَّةٌ اُس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو اُس کی انتہا تک لے جا کر روک دے ۔ اسی لئے قرآن کریم میں جو ہے وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَافَّةً (۹/۳۶) ۔ تو اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ " مشرکین سے ایسی جنگ کرو جو انہیں ظلم و ستم سے روک دے ۔ یا جو تمہیں ان کے اثرات سے روک دے ۔ " اس صورت میں کَافَّةً صفت ہوگی حَرْباً یا مقاتلةً کی جو مقدر ہے ۔ اسی کو حد آخر تک جنگ کرنا کہا جائیگا ۔ اور (جیسا کہ راغب نے آگے چل کر لکھا ہے) یہ بھی کہ مشرکین سے اجتماعی قوت سے (جماعةً) جنگ کرو ۔

عام لغت و تفسیر کی رو سے اس آیت میں کَافَّةً کے معنی ہیں " کل ۔ تمام کے تمام ۔ جمیع " ۔ لیکن قرآن کریم میں انہی مشرکین سے جنگ کرنے کا کہا گیا ہے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہوں ۔ یہ نہیں کہ جو مشرک جہاں بیٹھا ہو اس پر دھاوا بول دیا جائے ۔

اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَافَّةً (۲/۲۰۸) کے معنی ہیں ، تم اسلام میں وہاں تک پہنچ جاؤ جہاںتک اس کے شرائع کی آخری حدود ہیں * ۔ یعنی اس کی انتہا تک پہنچ جاؤ ۔ یونہی تھوڑا سا چل کر رک نہ جاؤ ۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ بعض نے اس کے معنی جَمَاعَةً بھی کئے ہیں ۔ یعنی اجتماعی طور پر** ۔ لیکن اس کے معنی روکنے یا حد آخر کے مفہوم سے

*تاج ۔ **راغب ۔

زیادہ واضح ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ خود راغب نے آیت وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَافَّۃً لِّلنَّاسِ ۔ (۳۴/۲۸) کے معنی کئے ہیں ہم نے تمہیں معاصی سے روکنے والا بنا کر بھیجا ہے***۔

روکنے کے معنی میں یَکُفُّوْنَ (۲۱/۳۹) میں آیا ہے ۔ اور (۴۸/۲۴) میں بھی۔ نیز بَسْطٌ کے مقابلہ میں (۵/۱۱) میں ۔ اَلْکَفَافُ مِنَ الرِّزْقِ ۔ رزق کی اتنی مقدار جو انسان کو دوسرے انسانوں کا محتاج بننے سے روک دے*۔ اسی لئے اَلْکَفُّ کے معنی نعمت کے ہیں*۔

ک ف ل

اَلْکَفَلُ ۔ کھولھے یا کولھے کے نچلے حصے کو کہتے ہیں*۔ اِکْتَفَلَ بِہٖ ۔ اسے پیچھے کر دیا*۔ اسی سے اَلْکَافِلُ اور اَلْکَفِیْلُ کے معنی ذمہ دار اور ضامن کے آتے ہیں ۔ کَفَّلَہٗ ۔ اسکی خبر گیری کی ۔ اس پر خرچ کیا ۔ اسکا انتظام کیا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے دوسری چیز کے اندر شامل ہو جانے اور متضمن ہو جانے کے ہیں ۔

سورہ قصص میں ہے یَکْفُلُوْنَہٗ (۲۸/۱۲)۔ جو اسے پالیں ۔ اسکی پرورش اور نگہ پرداخت کریں ۔ سورہ نحل میں ہے ۔ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰہَ عَلَیْکُمْ کَفِیْلًا (۱۶/۹۱) ۔ تم اللہ کو اپنا ضامن قرار دے چکے ہو ۔ سورہ صٓ میں ہے اَکْفِلْنِیْہَا (۳۸/۲۳) ۔ اس (دنبی) کو میری کفالت میں دیدے ۔ میرے سپرد کر دے ۔ میری ملکیت بنا دے ۔ سورہ آل عمران میں ہے ۔ وَکَفَّلَہَا زَکَرِیَّا (۳/۳۶) ۔ مریم کو زکریا کی کفالت میں دیدیا ۔

اَلْکِفْلُ ۔ حصہ ۔ نصیب ۔ یہ اسوقت بولتے ہیں جب کسی کے ساتھ دوسرے کو بھی اتنا ہی حصہ دیا جائے*۔(۴/۸۵) ۔ کِفْلَیْنِ ۔ دو حصے ۔ دوگونہ حصے (۵۷/۲۸) ۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہاں کِفْلَیْنِ سے مراد دو عدد نہیں بلکہ تواتر و تسلسل نعمت مراد ہے اور اس میں حسب ضرورت کا مفہوم بھی ہے***۔

سورہ انبیاء میں ذَاالْکِفْلِ (۲۱/۸۵) کا نام زمرہ انبیاء میں آیا ہے ۔ بعض کا خیال ہے کہ شاید یہ حزقیل نبی ہیں جن کا ذکر توریت میں آتا ہے****۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ذوالکفل سے مراد کپل و ستو والا (یعنی گوتم بدھ) ہیں ۔

چونکہ قرآن کریم نے ان کے احوال و کوائف بیان نہیں کئے اس لئے اگر متعین طور پر نہ بھی کہا جاسکے کہ یہ کون تھے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا - نیز دیکھئے عنوان ذَا الْکِفْل -

ک ف ی

اَلْکِفَایَۃُ - وہ چیز جس سے ضرورت پوری ہو جائے اور مقصود حاصل ہو جائے *- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا اتنی مقدار میں ہونا کہ وہ ضرورت کو پورا کر دے اور اس سے زیادہ کی ضرورت نہ ہو - کَفَاکَ الشَّیْءُ یَکْفِیْکَ - تجھے وہ چیز کافی ہے - اَلْکُفْیَۃُ - غذا جو زندگی کے لئے کافی ہو - کَفَاہُ مَؤُنَتَہٗ - فلاں آدمی نے اس کے پرمشقت کام کو اپنے سر لے لیا اور اسے اس سے بچا دیا**- کَفَیْتُہٗ شَرَّعَدُوِّہٖ، میں نے اسے اسکے دشمن کے شر سے محفوظ رکھا اور بچا لیا ***- رَجُلٌ کَافٍ وَکَفِیٌّ - جو تمہارے لئے کافی ہو اور اسکے بعد تمہیں کسی کی ضرورت نہ ہو - کَافَاہُ مُکَافَاۃً - وہ اسکو کافی ہو گیا *** - اَلْکَفِیُّ - بارش**- کَفٰی عَنْہُ الشَّیْءَ - اس چیز کو اس سے ہٹا دیا یا پھیر دیا**-

قرآن کریم میں ہے - اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَہْزِءِیْنَ (۱۵/۹۵) - یہ لوگ جو تیرے خلاف شرارتیں کرکے خوش ہوتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں ہم ان کی مخالفت سے تیری مدافعت کرنے کے لئے کافی ہیں - ہمارا قانون جس پر تو چل رہا ہے ان کے مقابلہ میں تیری حفاظت بھی کریگا اور تیرا مقصود بھی حاصل ہو جائیگا - (کَفٰی میں دونوں باتیں شامل ہیں) - انہی معنی میں ہے فَسَیَکْفِیْکَہُمُ اللّٰہُ (۲/۱۳۷) - سورہ زمر میں ہے اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ (۳۹/۳۶) - خدا کے احکام کی اطاعت کرنے والے (عَبْدٌ) کو خدا کا قانون مکافات تمام تخریبی عناصر سے محفوظ بھی رکھتا ہے اور اسے اسکی منزل مقصود تک بھی پہنچا دیتا ہے - اسکی تشریح اس سے اگلے ٹکڑے نے یہ کہکر کر دی کہ وَیُخَوِّفُوْنَکَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖ (۳۹/۳۶)- یہ لوگ تجھے غیر خدائی قوتوں سے ڈراتے ہیں - ان سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں -

یہ ہے قوانین خداوندی کے اتباع کی بنیادی خصوصیت - سورہ رعد میں ہے - کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا (۱۳/۴۳) - شہادت (یا نگرانی) کے لئے خدا کافی ہے -

---

*راغب - **تاج - ***محیط -

انسان کے لئے کسقدر اطمینان اور سکون کا موجب ہے یہ بات کہ اسے ایسا ضابطۂ زندگی مل جائے جو اسے تمام تخریبی عناصر سے محفوظ بھی رکھے اور اسے اسکی منزل مقصود تک بھی پہنچا دے۔ اور اسطرح اسے دنیا کی ہر آستان سے مستغنی کر دے۔

ک ل أ

کَلَأَ۔ یَکْلَأُ۔ کَلْأً۔ وَ کِلَاءً وکِلَاءَۃً۔ حفاظت کرنا۔ چوکیداری کرنا۔ نگرانی کرنا*۔ اَلْمُکَـلَّأُ۔ نہر کا کنارا۔ ساحل۔ بندرگاہ۔ ہر وہ مقام جہاں ہوا سے پناہ لی جائے**۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنوں میں دیکھ بھال کرنا اور چوکیداری کرنا لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے ۔مَنْ یَّکْلَؤُکُمْ (۲۱/۴۲)۔ تمہاری حفاظت کون کرتا ہے ؟ کون تمہارا نگران ہوتا ہے ؟

ک ل ب

اَلْکَلْبُ ۔ ہر چیر پھاڑ کرنے والے جانور (درندے) کو کہتے ہیں ۔ لیکن اس کے بعد یہ لفظ کتے کے لئے ہی استعمال ہونے لگا (۷/۱۷۶) ۔ ویسے شیر کو بھی کہتے ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ سختی سے لٹک جانا ہیں ۔ چنانچہ اَلْکَلْبُ آنکڑے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ سامان لٹکایا جاتا ہے ۔ اَلْکُلْبَۃُ مِنَ الْعَیْشِ ۔ روزی کی تنگی* ۔ اَلْمُکَلِّبُ ۔ کتوں کو شکار کے لئے سدھانے والا* ۔ پھر یہ عام شکاری جانوروں (اَلْجَوَارِحُ) کو سدھانے کے لئے استعمال ہونے لگا ۔ سورۃ المائدہ میں ہے وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُکَلِّبِیْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰهُ . . . . (۵/۴) ۔ اور (تمہارے لئے حلال کیا گیا ہے) جو تم شکاری جانوروں کو شکار کی تعلیم دیتے ہوئے سکھاؤ ۔ تم ان کو سکھاتے ہو اس (علم) کی رو سے جو تمہیں اللہ نے سکھایا ہے ۔

(ضمناً) اس آیت میں ایک چیز اور بھی غور طلب ہے ۔ اس میں کہا گیا ہے کہ تم شکاری جانوروں کو جو شکار کرنا سکھاتے ہو تو یہ اس علم کی رو سے ہے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے ۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ نے یہ علم ، شکاریوں کو خود نہیں سکھایا ۔ اس نے اس کے سیکھنے کی استعداد انسان کے اندر رکھ دی ہے ۔ اب جو انسان چاہے اس علم کو سیکھ لے ۔ اللہ نے اس کی نسبت اپنی

---

*تاج ۔ **محیط ۔

طرف اس لئے کی ہے کہ اس علم کی تحصیل کی استعداد انسان کو اس نے دی ہے۔ لہذا ، انسان جو کچھ اللہ کے مقرر کردہ قانون اور قاعدے کی رُو سے کرتا ہے، اسے اللہ اپنی طرف بھی منسوب کرلیتا ہے۔ اس نکتہ کے سمجھ لینے سے قرآن کریم کے بہت سے مقامات واضح ہو جاتے ہیں۔ (مثلاً دیکھئے ٢/٢٢٢)۔

ک ل ح

کَلَحَ یَکْلَحُ۔ کُلُوْحًا و کُلَاحًا۔ ترش روئی کے ساتھ ہونٹوں کا اوپر کو اُٹھ جانا اور دانتوں کا نظر آنے لگنا ، بُرا منہ بنانا۔ بڑی شدت سے منہ بگاڑنا۔ اَلْکَلُوْلَحُ۔ بد نما آدمی۔ اَلْکُلَاحُ۔ قحط سالی کو کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی ترشروئی اور چہرے کے بد نما ہونے کے لکھے ہیں۔

سورۃ مومنون میں ہے هُمْ فِیْهَا کَالِحُوْنَ (٢٣/١٠٤)۔ وہ اس میں بُرا منہ بنا رہے ہونگے۔

ک ل ف

اَلْکَلَفُ۔ سیاہی مائل زردی۔ اَلْکُلْفَةُ۔ سیاہی مائل زرد۔ مشقت کے باوجود جس کام کو برداشت کیا جائے۔ ہر مصیبت یا حق جسے بدقت و صعوبت برداشت کیا جائے۔ اَلْکَلُوْفُ۔ امرِ شاق۔ اَلتَّکْلِیْفُ۔ ایسے کام کا پابند کرنا جو کسی پر گراں گزرے۔ تَکَلَّفَ الْاَمْرَ۔ اس نے ایسے کام کو باوجود مشقت و تنگی برداشت کرلیا جس کا کرنا اس پر گراں گزرتا تھا**۔ تَکَلَّفَ الشَّیْئَ۔ کسی کام کو اظہار شیفتگی کے ساتھ کرنا اگرچہ اس کے کرنے میں اسے مشقت پیش آئے۔ اسی لئے عرف عام میں کُلْفَةٌ مشقت کو کہتے ہیں اور تَکَلُّفْ اس کام کے کرنے کو جو مشقت ، تصنع یا اوپرے جی سے دکھاوے کے لئے کیا جائے۔ چنانچہ سورۃ ص میں جو ہے کہ وَمَا اَنَا مِنَ الْمُتَکَلِّفِیْنَ (٣٨/٨٦) تو اس کے معنی یہی ہیں کہ میں دکھاوے کے لئے یہ کچھ نہیں کر رہا۔

قرآن کریم میں کئی ایک مقامات میں آیا ہے۔ لَا یُکَلِّفُ اللهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (٢/٢٨٦)۔ اس کے عام معنی یہ ہیں کہ اللہ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کا پابند نہیں کرتا۔ اس میں یہ سمجھ لینا ضروری ہوگا کہ ایک فرد کی وسعت کی حد وہ ہوگی جس تک وہ اپنی انتہائی کوشش اور محنت کے بعد

---

*تاج و راغب۔ **تاج و محیط۔ **راغب۔

پہنچے ۔ یہ نہیں کہ انسان کسی حکم کی تعمیل میں پوری پوری کوشش نہ کرے اور یہ کہکر اپنے آپ کو اطمینان دے لے کہ مجھے اللہ اس سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتا ۔ لیکن راغب نے لکھا ہے کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا ، انسان پر جو پابندیاں عائد کرتا ہے تو وہ اس لئے ہوتی ہیں کہ ان سے انسانی ذات میں وسعت اور کشاد پیدا ہو۔ یعنی وہ پابندیاں اس کی آزادی سلب کرنے کے لئے نہیں ہوتیں ، بلکہ اس کی ذات کی قوتوں اور صلاحیتوں میں وسعتیں پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہیں، جس طرح نہر کی ٹھوکر (Fall) اس کے پانی کی رفتار میں مزید تیزی پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہے ۔

قرآن کریم کے مختلف مقامات میں سیاق و سباق سے دیکھ لینا چاہئے کہ کس مقام پر کون سے معانی زیادہ موزوں ہیں ۔

ک ل ل

اَلْکُلُّ ۔ کسی چیز کے تمام اجزاء ۔ سب کا سب ۔ مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ کبھی کبھی اس کا استعمال بَعْضٌ کے معنوں میں بھی ہوتا ہے*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنوں میں سے ایک معنی کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے گھیر لینا بتائے ہیں ۔

کَلٌّ کے معنی وکیل ۔ بت ۔ نو پیدا مصیبت ۔ یتیم بچہ ۔ صاحب عیال آدمی کے بھی آتے ہیں ۔ نیز ایسا نکما شخص جو دوسرے پر بوجھ ہی بوجھ ہو اور اس میں کوئی بھی خوبی نہ ہو*۔ هُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلَاهُ ($\frac{16}{76}$) ۔ وہ اپنے آقا پر سراسر بوجھ ہے ۔

کَلَّ ۔ کَلَالٌ ۔ کَلَالَةٌ کے معنی ہیں عاجز آ جانا ، تھک جانا*۔

اَلْکَلَالَةُ ۔ قرآن کریم میں احکامِ وراثت کے ضمن میں اَلْکَلَالَةُ کا ذکر دو جگہ آیا ہے ۔ ایک ($\frac{4}{12}$) میں اور دوسرا ($\frac{4}{176}$) میں ۔ مفسرین نے اس باب میں بڑی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں کہ کلالہ کسے کہتے ہیں ۔ (چونکہ احکامِ وراثت ایک فنی موضوع ہے اور ہم اس مقام پر اس کے متعلق تفصیلی گفتگو نہیں کر رہے اس لئے ہم ان بحثوں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے ۔ مختصراً یہ سمجھ لینا کافی ہوگا کہ ان میں سے) ایک گروہ کا خیال ہے (اور اکثریت اسی خیال کی حامل ہے) کہ کلالہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کے نہ ماں باپ ہوں نہ اولاد ۔ ابن قتیبہ نے ابو عبیدہ کے حوالہ سے لکھا ہے

*تاج ۔

کہ یہ مصدر ہے تَکَلَّلَہُ النَّسَبُ سے ، جس کے معنی ہیں ''نسب اس کے اطراف تک پہنچ گیا'' ۔ باپ اور اولاد آدمی کی دونوں طرفین ہوتی ہیں ۔ جب آدمی مر جائے اور نہ باپ چھوڑے اور نہ اولاد تو وہ اسطرح مرگیا کہ اس کی دونوں طرفیں چلی گئیں ۔ اسے کلالہ کہتے ہیں* ۔

المغرب (لغت کی مشہور کتاب) جلد ۲ ۔ صفحہ ۱۰۹ میں ہے کہ والد اور ولد کے سوا جو وارث بھی ہو وہ کلالہ ہے ۔ اور اس کا اطلاق وارث اور موروث دونوں پر ہوتا ہے ، اس قرابت (نسبی) کے اعتبار سے جو والد اور ولد کی حیثیت سے نہ ہو ۔ لسان العرب میں (اخفش اور فراء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ) کلالہ ، قرابت (نسبی) کی رو سے ہر وہ قرابت مند ہے جو والد اور ولد کے سوا ہو ۔ یہ تو رہی لغت کی بحث ۔ قرآن کریم نے چار لفظوں میں اس کی وضاحت کردی ہے کہ کَلَالَۃٌ کسے کہتے ہیں ۔ سورۃ نساء میں ہے اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَّ لَهُ اُخْتٌ فَلَهَا ..... ($\frac{۴}{۱۷۷}$) ۔ ''اگر کوئی شخص مرجائے ۔ اس کی اولاد کوئی نہ ہو ۔ اور اس کی بہن ہو تو (اس کا حصہ یوں ہوگا) ۔ اسی سورت کے شروع میں ہے ..... وَّ لَهُ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ ..... ($\frac{۴}{۱۲}$) ۔ ''اور اس کا بھائی یا بہن ہوں تو'' ۔ یعنی کلالہ ہونے کے لئے دو شرطیں ہیں ۔ ایک یہ کہ اس کی اولاد نہ ہو اور دوسرے یہ کہ اس کا بھائی یا بہن ہو ۔ والدین کے ہونے یا نہ ہونے کی کوئی شرط نہیں ۔ اگر اس کے ماں باپ ہونگے تو ($\frac{۴}{۱۲}$) کے مطابق ترکہ کی تقسیم اور طرح ہوگی ۔ اور اگر وہ نہ ہونگے تو ($\frac{۴}{۱۷۶}$) کے مطابق تقسیم اور ہوگی ۔

اَلْاِکْلِیْلُ ۔ تاج** ۔ اور اَلْکَلَالُ ۔ حالت ۔ کیفیت** ۔

اوپر کہا گیا ہے کہ کُلٌّ کے معنی سب کے سب ہیں لیکن کبھی کبھی اس کا استعمال بَعْضٌ کے معنوں میں بھی ہوتا ہے ۔ مثلاً قرآن کریم میں حضرت ابراهیمؑ کے قصہ میں ہے کہ ان سے کہا کہ چار پرندے لو اور انہیں سدھاؤ ۔ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ ($\frac{۲}{۲۶۰}$) ۔ اس میں كُلِّ جَبَلٍ سے مراد بعض پہاڑ ہیں ۔ لیکن یہاں كُلِّ کے معنے سب بھی ہوسکتے ہیں ،اس لئے کہ كُلِّ اضافی اسم ہے اور جب کسی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد اس کے حلقہ میں جس قدر ہوں وہی کل ہو جاتے ہیں ۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ جس مقام کا یہ ذکر ہے وہاں پہاڑ ہی دو چار ہوں ۔ اس اعتبار سے كُلٌّ کے معنی کل ہی ہونگے ۔ دوسری طرف سورۃ کہف میں ذوالقرنین کے متعلق ہے ۔ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ($\frac{۱۸}{۸۴}$) ۔ ہم نے اسے ہر

*القرطین ۔ جلد اول ۔ صفحہ ۱۱۶ ۔ **تاج

قسم کا سامان دے رکھا تھا ۔ اس میں "کُلِّ شَیْءٍ" سے مراد دنیا کی تمام چیزیں نہیں ، بلکہ مقصد یہ ہے کہ استحکام مملکت وغیرہ کے تمام ضروری سامان دے رکھے تھے اور ان ضروری سامانوں میں سے بھی ہر ایک سامان کا کچھ حصہ ۔ لفظ مِنْ کا مطلب "کچھ حصہ" ہے ۔

"کُلّ" کے پہلے اِنْ نافیہ اور بعد میں اِلَّا آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں "کوئی بھی ایسا نہیں تھا" ۔ اِنْ کُلٌّ اِلَّا کَذَّبَ الرُّسُلَ (۳۸/۱۴) ۔ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے رسولوں کو نہ جھٹلایا ۔ سب نے جھٹلایا ۔

"کُلَّمَا ۔ جب کبھی ۔ کُلَّمَا اَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيْهِ (۲/۲۰) ۔ جب کبھی وہ انہیں روشنی دیتی ہے تو وہ اس میں چلنے لگتے ہیں ۔

کَلَّا اور کِلَا ۔ دو جداگانہ الفاظ ہیں ۔ انہیں الگ عنوانات میں دیکھئے ۔

کَلَّا (حرف)

کَلَّا ۔ (۱) یہ عام طور پر ان معنوں میں آتا ہے جن معنوں میں ہم اپنے ہاں کہتے ہیں " نہیں بات یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ " ۔ کَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (۸۹/۱۷) ۔ ہر گز ایسا نہیں ۔ بلکہ بات یہ ہے کہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے تھے ۔ (اس میں جھڑکنے ، تنبیہ کرنے ۔ یا باز رکھنے ۔ یا مذمت کرنے کا پہلو ہوتا ہے) ۔

(۲) "حقیقت یہ ہے" ۔ "واقعہ یہ ہے" ۔ کَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى (۹۶/۶) ۔ حقیقت یہ ہے (یہ امر واقعہ ہے) کہ انسان سرکشی اختیار کرتا ہے ۔

(۳) میرزا ابوالفضل نے نضربن شمیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے معنی نَعَمْ (ہاں) کے بھی ہوتے ہیں ۔ سورہ تکاثر میں تین بار کَلَّا آیا ہے (کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۔ ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۔ کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۔ (۱۰۲/۳-۵) ۔ ان آیات سے کَلَّا کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے ۔ یعنی خلاف حقیقت تصور کی تردید اور حقیقت کے متعلق حتم و یقین ۔

کِلَا

کِلَا (مذکر) ۔ کِلْتَا (مونث) ۔ "دونوں" کے معنوں میں آتا ہے ۔ کِلَاهُمَا ۔ (۱۷/۲۳) دونوں (ماں اور باپ) ۔ کِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ (۱۸/۳۳) ۔ یہ دونوں باغ ۔

ک ل م

کَلِمَةٌ کے معنی ہیں ایک لفظ ۔ ایک بات ۔ ایک جملہ یا ایک قصیدہ ۔ یا ایک خطبہ ۔ کَلِمَةٌ یا کِلْمَةٌ یا کَلْمَةٌ ۔ تینوں طرح آتا ہے ۔ کَلَامٌ کے معنی ہیں بات *۔ کَلِمٰتٌ (کَلِمَةٌ کی جمع) کے معنی امور کے بھی آتے ہیں ۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے ۔ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ (۲/۱۲۴) ۔ جب ابراهیمؑ کو اس کے نشو و نما دینے والے نے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں نمود ذات کے مواقع بہم پہنچائے ۔ یعنی اسکے سامنے مختلف امور آئے ۔ وہ مختلف حوادث سے دو چار ہوا ۔ مختلف قسم کی باتوں سے اس کا واسطہ پڑا ۔ مختلف امور اس کے ذمہ لگائے ۔ مختلف معاملات اسکے سپرد کئے ۔ کَلِمٰتٌ میں یہ تمام معنی پوشیدہ ہیں ۔

اَلْكَلْمُ کے معنی ہیں زخمی کرنا *۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی (۱) بات کرنا اور (۲) زخمی کرنا لکھے ہیں ۔ سورہ نمل میں ہے ۔ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ (۲۷/۸۲) ۔ یہاں تُكَلِّمُ کے معنی زخمی کرنے کے بھی ہو سکتے ہیں اور بات کرنے کے بھی ۔ (آیت کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان د ۔ ب ۔ ب) نواب صدیق حسن خان نے کہا ہے کہ ک ۔ ل ۔ م کی خاصیت شدت اور قوت ہے ۔ اس کی مثال اَلْكَلْمُ ہے ۔ اَلْكَلَامُ سخت زمین کو بھی کہتے ہیں** ۔

آج کل کی اصطلاح میں جس چیز کو نظریہ زندگی ۔ تصور حیات ۔ یا آئیڈیالوجی (Ideology) کہا جاتا ہے اسے کَلِمَةٌ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ جیسے سورہ ابراهیم میں ہے ۔ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (۱۴/۲۴) ۔ خوش گوار اور ثمر بار نظریہ زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے ایک سرسبز و شاداب درخت جسکی جڑیں مستحکم ہوں اور جسکی شاخیں فضا کی پہنائیوں میں جھوم رہی ہوں ۔

كَلَّمَ ۔ کسی سے بات کرنا (۲/۱۹) ۔ تَكَلَّمَ ۔ کسی سے بات کرنا (۱۹/۲۳) ۔ تَكْلِيْمٌ کسی سے بات کرنا (۴/۱۶۴) ۔ نیز یہ شبہ کے اظہار کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ جیسے مجھے اس میں کلام ہے ۔ یا یہ روایت متکلم فیہ ہے ۔

سورہ آل عمران میں ہے ۔ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ (۳/۴۴) (اے مریم) خدا تمہیں اپنی طرف سے ایک بات کی خوش خبری دیتا ہے ۔

---

* تاج و محیط ۔ **العلم الخفاق ۔

(اس سے آگے ہے کہ جس کے متعلق خوش خبری دی تھی اس کا نام عیسیٰؑ تھا) ۔ عیسائیت میں کَلِمَۃ (Word) یا (Logos) ایک خاص اصطلاح ہے جس کے گرد (حضرت) عیسیٰؑ کی ابنیت اور الوہیت کا تمام فلسفہ گردش کرتا ہے ۔ لیکن قرآن کریم اس قسم کی دور ازکار فلسفیانہ بحثوں میں نہیں الجھتا ۔

سورہ یونس میں (نیز دیگر مقامات میں) ہے وَكَذَالِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ (۱۰/۳۳) ۔ اسطرح تیرے رب کی بات ان پر صادق آگئی ۔ ان مقامات میں خدا کے کَلِمَۃ کے سیدھے سادے معنی "خدا کی بات" ھی ھیں ۔ لیکن ظاھر ہے کہ خدا کی بات سے مراد خدا کا قانون ہے ۔ چنانچہ یہ لفظ "قانونِ خداوندی" کے معنوں میں عام طور پر استعمال ھوا ہے ۔ قوانین خداوندی کا ایک حصہ خارجی کائنات میں نافذ العمل ہے ۔ انہیں (Laws of Nature) کہا جاتا ہے ۔ اور دوسرا حصہ وہ ہے جو انسانی دنیا سے متعلق ہے ۔ یہ قوانین وحی کے ذریعے ملتے ھیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ھیں ۔ خود قرآن کریم کے متعلق ہے وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (۶/۱۱۶) ۔ قوانین خداوندی صدق و عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئے ۔ اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶) ۔ اس سے ختم نبوت لازم آتی ہے ۔ یعنی جب ضابطہ خداوندی کی تکمیل ھو گئی اور اس کے بعد اس میں کوئی تبدیلی نہیں ھو سکتی تو کسی نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رھتی ۔ نیز اس سے یہ بھی واضح ھوجاتا ہے کہ مومن فرد یا جماعت جن حدود و قیود (خدا کے قوانین واصول) کے اندر رھتے ھوئے زندگی بسر کرنے پر مکلف ہے ، ان حدود کو کوئی نہیں بدل سکتا ۔ یہی حدود اسلامی مملکت کی آزادی اور پابندی بھی متعین کرتی ھیں ۔ انہیں مملکت بھی نہیں بدل سکتی ۔ لیکن ان کی چار دیواری کے اندر رھتی ھوئی وہ آزاد ھوتی ہے کہ اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ، اپنے معاملات ، باھمی مشاورت سے طے کرے ۔

کَمْ

کَمْ ۔ (۱) کتنی (مقدار) (۲) کتنی (تعداد) (۳) کتنی (دیر) ۔ کَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۳/۱۱۲) ۔ تم کتنی مدت تک زمین میں رہے ھو ۔ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً (۲/۲۴۹) ۔ کتنی ھی چھوٹی چھوٹی جماعتیں تھیں جو بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں ۔ ("کئی" یا "بہتیری" سے بھی مفہوم واضح ھو جاتا ہے)

کُمْ (ضمیر)

کُمْ - ضمیر منصوب متصل ہے - جمع مذکر حاضر کیلئے آتی ہے - ضَرَبَکُمْ اس نے تم سب کو مارا - وَعَدَکُمُ اللّٰہُ - اللہ نے تم سے وعدہ کیا (۴۸/۲۱) -

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل کے طور پر بھی آتی ہے - غُلَامُکُمْ - تم سب کا غلام - سورہ آل عمران میں ہے مِنْ رَبِّکُمْ (۳/۵۰) تمہارے رب کی طرف سے -

کُمَا (ضمیر)

کُمَا ضمیر منصوب متصل ہے - تثنیہ حاضر کیلئے آتی ہے - اور مذکر و مؤنث دونوں کیلئے استعمال ہوتی ہے - ضَرَبَکُمَا - اس نے تم دونوں (مردوں یا عورتوں) کو مارا - یَا تِیَنْکُمَا (۴/۱۶) -

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل ہے - غُلَامُکُمَا - تم دونوں کا غلام - (مذکر و مؤنث دونوں کیلئے) - سورہ طٰہٰ میں ہے اِنَّنِیْ مَعَکُمَا ... (۲۰/۴۶) "میں تم دونوں کے ساتھ ہوں" - اس سے ذرا آگے ہے فَمَنْ رَّبُّکُمَا یٰمُوْسٰی (۲۰/۴۹) - "اے موسیٰ - تم دونوں (بھائیوں) کا رب کون ہے"؟

ک م ل

اَلْکَمَالُ - پورا ہونا - اَلتَّمَامُ کے معنی بھی پورا ہونا ہوتے ہیں - (ان دونوں میں جو باریک فرق ہے اس کے لئے عنوان - ت - م - م دیکھئے) -

کَمُلَ - کامل ہونا - پورا ہونا - اَکْمَلَہٗ - وَکَمَّلَہٗ - اسے پورا کر دیا اور خوش نما بنا دیا - اَعْطَاہُ الْمَالَ کَمَلًا - اسے پورا پورا مال دے دیا* - راغب نے کہا ہے کہ جب کہا جاتا ہے کَمُلَ ذَالِکَ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو کچھ اس سے غرض تھی وہ حاصل ہو گئی** -

روزوں کی گنتی پورا کرنے کے لئے کہا ہے - لِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ - (۲/۱۸۵) - سورۃ المائدہ میں ہے اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (۵/۳) - اس کے دونوں معنی ہوسکتے ہیں - ایک تو یہ کہ تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل

*تاج - **راغب - ** العلم الخفاق فی علم الاشتقاق -

کر دیا۔ اس سے اسلام کے آخری اور مکمل دین (ضابطۂ حیات) ہونے کی شہادت ملتی ہے ۔ اور دوسرے یہ کہ ''اب تمہیں مخالفین پر پورا پورا غالب کردیا ۔ تمہارے غلبہ کو مکمل کردیا'' ۔ یہ اُس وقت کی جماعت مومنین کے متعلق ہے ۔ اسی لئے ، اس کے بعد کہا گیا ہے کہ تمہارے مخالف اب بالکل مایوس ہو چکے ہیں (۵/۳) ۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ ک ۔ م ۔ ل کا خاصہ شدت اور قوت ہے ۔ کسی شے کے کمال میں اس کی قوت کا راز پوشیدہ ہوتا ہے** ۔

ک م م

اَلْکِمُّ ۔ آستین ۔ اَلْکِمّ ۔ وہ غلاف یا خول جس سے پھول یا کلی ڈھکی ہوتی ہے ۔ اسکی جمع اَکْمَام* ہے ۔ (۵۵/۱۱ و ۴۱/۴۷) ۔ کُمَّتِ النَّخْلَۃُ ۔ کھجور میں بند کلیاں لگ گئیں ۔ ایسا درخت مَکْمُوْم* کہلائیگا۔ اَلْکِمَامُ ۔ اونٹ کے منہ پر جو غلاف (یا چھینکا) چڑھا دیا جاتا ہے تاکہ وہ کسی کو کاٹے نہیں ۔ اَلْکُمَّۃُ ۔ گول ٹوپی* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ڈھانپنے والی چیز کے ہوتے ہیں ۔

ک م ہ

اَلْکَمَہُ ۔ پیدائشی اندھا پن ۔ ایسے اندھے کو اَلْاَکْمَہُ کہینگے ۔ لیکن بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ پیدائشی اور غیر پیدائشی دونوں کے لئے آتا ہے ۔ کَمِہَ النَّھَارُ ۔ آفتاب پر غبار چھا گیا اور دن اندھیرا ہوگیا ۔ کَمِہَ فُلَانٌ ۔ فلاں آدمی کی عقل جاتی رہی ۔ (یعنی بصیرت گم ہوگئی) ۔ اَلْکَامِہُ ۔ وہ شخص جو اٹھ کر ، جدھر اس کے جی میں آئے چل دے* ۔

سورۃ آل عمران میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا ''وَ اُبْرِئُ الْاَکْمَہَ (۳/۴۸) ۔ میں اندھوں کو نگاہ عطا کروں گا ۔ جس کی بصیرت گم ہو چکی ہے میں اُسے واپس لا دونگا ۔ جو بغیر راستہ معلوم کئے یونہی چلے جا رہے ہیں میں انہیں راستہ دکھا دوں گا ۔ میں ان کے لئے منزل متعین کرونگا ۔ رسول کا یہی کام ہے جسے وہ وحی کے ذریعے سر انجام دیتا ہے ۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر راہ گم کردہ لوگوں کو اندھے اور صحیح راستے پر چلنے والوں کو آنکھوں والے کہا ہے ۔

*تاج و راغب و محیط ۔ **العلم الخفاق

ک ن د

کَنَدَ الشَّیْءَ یَکْنُدُہٗ ۔ اس نے اس چیز کو کاٹ دیا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ کَنَدَ النِّعْمَۃَ ۔ اس نے کفران نعمت کیا ۔ اَلْکَنُوْدُ اُس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو تنہا خور ہو۔ لوگوں کی مدد نہ کرے اور غلاموں کو مار پیٹ کرتا رہے ۔ یا وہ جو مصیبتوں کو گنتا رہے اور بخششوں کو بھلا دے* ۔ یعنی ناقدرا ۔ نیز وہ زمین جہاں کچھ پیداوار نہ ہوتی ہو** ۔ اَلْکِنْدَۃُ پہاڑ کے ٹکڑے کو کہتے ہیں* ۔

قرآن کریم میں ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوْدٌ (۱۰۰/۶) ۔ یعنی انسان کو اگر عَلٰی حَالِہٖ چھوڑ دیا جائے تو وہ اس شخص کے مانند ہوجاتا ہے جو تنہا خور ہو اور اپنے نشو و نما دینے والے کے عطا کردہ سامانِ رزق میں کسی اور کو شریک نہ کرنا چاہے ۔ وہ ایسی سنگلاخ زمین بن جاتا ہے جس سے ربوبیت عامہ کی کونپلیں نہیں پھوٹتیں ۔ یہ ہے ''رب کی ناقدر شناسی'' ۔

ک ن ز

اَلْکَنْزُ ۔ زمین کے نیچے مدفون مال ۔ (جمع کُنُوْزٌ)۔ یہ اس کے اصلی معنی ہیں ۔ کَنَزَ ۔ یَکْنِزُ ۔ دولت جمع کرنا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں اکٹھا ہونے کے ہیں ۔ وَ الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ .... ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ ..... مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ (۹/۳۴-۳۵) میں مال و دولت جمع کرنے ہی کے معنی ہیں ۔ قرآن کریم کی رو سے افراد کے لئے ، مفاد خویش کی خاطر ، دولت جمع کرنا جہنم تیار کرنا ہے ۔ قرآنی نظام معیشت میں افراد کے پاس فاضلہ دولت (Surplus Money) کی گنجائش ہی نہیں ہوتی ۔ اس میں ہر فرد پوری محنت کرتا ہے ۔ اس کے ماحصل سے اپنی ضروریات کے مطابق لیتا ہے اور باقی سب نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے نظام معاشرہ کے حوالے کر دیتا ہے ۔ یہ نظام عند الضرورت اس کی اور اس کی اولاد کی تمام بنیادی ضروریات زندگی کی ضمانت دیتا ہے ۔ لہذا اس نظام میں دولت جمع کرنے یا جائدادیں بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ واضح رہے کہ جائداد بھی منجمد شکل میں جمع شدہ دولت ہی ہوتی ہے ۔

سورۃ کہف میں ہے ۔ کَنْزٌ لَّھُمَا (۱۸/۸۲) ۔ ان کی مدفون دولت ۔ دبا ہوا خزانہ ۔ سورۃ قصص میں کُنُوْزٌ اور مَفَاتِحُ ایک ہی معنوں میں

*تاج و محیط ۔ **محیط و راغب ۔

استعمال ہوئے ہیں (۲۸/۹) - یعنی خزانے۔ اَلْکَنِیْزُ - وہ کھجوریں جو ٹوکروں یا برتنوں میں بھر کر سردی کے لئے محفوظ کرلی جائیں* -

ک ن س

کَنَسَ الظَّبْیُ یَکْنِسُ - ہرن اپنے چھپنے کی جگہ (جھاڑیوں میں) چھپ گیا - اَلْکِنَاسُ - گھنے درخت جہاں جنگلی جانور پناہ لیتے ہیں -

اَلْکُنَاسَةُ - گھورا، جہاں کوڑا کرکٹ ڈال دیا جاتا ہے - نیز خود اس کوڑے کو بھی کہتے ہیں**۔ (غالباً اس لحاظ سے کہ ایسے مقامات کو ڈھانپ کر، یا نظروں سے اوجھل رکھا جاتا ہے) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے دو بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کے بالائی حصہ سے کسی چیز کو ہٹا دینا اور (۲) چھپا دینا -

قرآن کریم میں اَلْجَوَارِ الْکُنَّسِ (۸۱/۱۶) آیا ہے - ایسے ستارے جو چلتے چلتے غروب ہو جائیں - چھپ جائیں - (نیز دیکھئے عنوان خ - ن - س)-

اَلْکَنِیْسَةُ - یہودیوں یا نصرانیوں کی عبادت گاہ****- (نیز خوبصورت عورت کو بھی کہتے ہیں)**- صاحبِ محیط نے کہا ہے کہ یہ لفظ اُکلیسیا کا معرب ہے جو یونانی الاصل ہے اور جس کے معنی جماعت کے ہوتے ہیں***-

ک ن ن

اَلْکِنُّ - اَلْکِنَّةُ - اَلْکِنَانُ - ہر چیز کا غلاف اور پردہ - اَلْکِنُّ - وہ جگہ جہاں کسی چیز کو محفوظ رکھا جائے**- اَلْکِنُّ کی جمع اَکْنَانٌ اور اَلْکِنَانُ کی جمع اَکِنَّةٌ آتی ہے - (۱۸/۵۷ ; ۱۶/۸۱ ; ۶/۲۵) - حفاظت کی جگہ (۱۶/۸۱) -

کَنَّهٗ - اَکَنَّهٗ - اُسے چھپا دیا** - (۲۷/۷۴) میں یہ لفظ بمقابلہ یُعْلِنُوْنَ آیا ہے - (اِنَّ رَبَّکَ لَیَعْلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا یُعْلِنُوْنَ) "یقیناً تمہارا رب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں" - یعنی اسکے معنی مخفی رکھنے کے ہیں-

مَکْنُوْنٌ - حفاظت سے رکھا ہوا - محفوظ (۳۷/۴۹) - قرآن کریم کو کِتَابٌ مَکْنُوْنٌ کہا گیا ہے (۵۶/۷۸) - یعنی محفوظ کتاب - اس کے لئے فِیْ لَوْحٍ مَحْفُوْظٍ بھی کہا گیا ہے (۸۵/۲۲) -

*تاج و محیط - **تاج - ***محیط - ****لطائف اللغۃ -

کُنَّ (ضمیر)

کُنَّ ۔ ضمیر منصوب متصل ہے ۔ جمع مؤنث حاضر کیلئے آتی ہے ۔ ضَرَبَکُنَّ ۔ اس نے تم سب عورتوں کو مارا ۔ قرآن کریم میں ہے طَلَّقَکُنَّ (۶۶/۵) ۔ وہ تمہیں طلاق دیدے۔

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل کے طور پر بھی آتی ہے ۔ سورۂ یوسف میں ہے اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ (۱۲/۲۸) ۔ "یقیناً تم عورتوں کی خفیہ سازش (مکر) بہت بڑی ہوتی ہے"۔

ک ھ ف

اَلْکَھْفُ ۔ پہاڑ میں بڑا غار ۔ چھوٹے کو غَارٌ کہتے ہیں ۔ یا پہاڑ میں کھود کر جو گھر جیسا بنا لیا جائے ۔ جائے پناہ ۔ تَکَھَّفَ ۔ اِکْتَھَفَ ۔ وہ غار میں داخل ہو گیا یا کہف میں رہا *۔

قرآن کریم میں اَصْحَابُ الْکَھْفِ (۱۸/۹) ان نوجوانوں کے لئے آیا ہے جنہوں نے آبادی سے باہر غار میں جاکر پناہ لی تھی ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ر ۔ ق ۔ م وَاَصْحَابُ الْکَھْفِ وَالرَّقِیْمِ)

ک ھ ل

اَلْکَھْلُ ۔ ادھیڑ عمر کو کہتے ہیں ۔ تیس سال کی عمر یا تینتیس سے پچاس سال تک کی عمر ۔ ازھری نے کہا ہے کہ اس عمر والے کو کَھْلٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں انسان انتہائے شباب اور اپنی بھرپور صلاحیتوں پر پہنچ جاتا ہے اور اس کے بعد اس پر انحطاط شروع ہوجاتا ہے ۔ نَعْجَۃٌ مُکْتَھِلَۃٌ ۔ بھیڑ جو پوری عمر کی ہو چکی ہو**۔ نَبْتٌ کَھْلٌ ۔ وہ پودا یا درخت جو اپنے بڑھنے پھولنے کی آخری عمر تک پہنچ چکا ہو***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ کَھْلٌ کے بنیادی معنی کسی چیز میں قوت پیدا ہونے اور اس کی ساخت کے محکم و مجتمع ہونے کے ہیں ۔ اَلْمُکَاھَلَۃُ ۔ شادی کر لینا***۔ سورہ آل عمران میں حضرت عیسٰیؑ کے متعلق ہے وَیُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَھْدِ وَکَھْلًا (۳/۴۵) ۔ کم عمری میں بھی اور پوری عمر کو پہنچ کر لوگوں سے باتیں کریگا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ نے ابتدائی عمر ہی سے معاشرہ کی خرابیوں کے خلاف باتیں کرنا شروع

---

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

کر دی تھیں - ویسے بھی (تاریخ بتاتی ہے کہ) انہیں نبوت مقابلۃً کم عمر میں مل گئی تھی (یعنی قریب تیس سال کی عمر میں) لیکن قرآن کریم نے اس کا ذکر نہیں کیا - کَهْلاً کہکر قرآن کریم نے اسطرف اشارہ کیا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ انہیں (۳۱/۳۲) برس کی عمر میں صلیب دی گئی اور وہ (یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق) صلیب پر وفات پا گئے یا (عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق) آسمان پر چلے گئے، تو یہ صحیح نہیں - وہ ادھیڑ عمر تک لوگوں کے درمیان رہے اور ان سے باتیں کرتے رہے -

ک ہ ن

اَلْکَاهِنُ - وہ شخص جو کائنات میں رونما ہونے والے واقعات کی خبریں دیتا اور معرفت اسرار کا مدعی ہوتا تھا * - لیکن راغب کا کہنا ہے کہ کَاهِن اس شخص کو کہتے تھے جو ماضی کی خفیہ باتوں کے متعلق بتاتا تھا - اور عَرَّاف اُسے جو آئندہ کے متعلق خبریں دیتا تھا ** - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور دیگر اقوام میں کَاهِن اس شخص کو کہتے تھے جو پجاریوں کی طرف سے قربانیاں دیتا اور جانوروں کو قربان گاہ میں پیش کرتا تھا - اور عربوں کے ہاں کَاهِن اسے کہتے تھے جو "کنکریاں پھینک کر" غیب کی خبریں بتایا کرتا تھا *** -

چونکہ عرب، مقام نبوت کا صحیح صحیح علم نہیں رکھتے تھے اس لئے وہ رسول اکرمؐ کو کَاهِن - شاعر - اور مَجْنُوْن کہا کرتے تھے - قرآن کریم نے اس کی تردید کی اور کہا کہ فَمَا اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ (۵۲/۲۹) - تو خدا کے فضل و احسان سے کاهن اور مجنون نہیں - (نبی کے معنی بھی پیش گوئیاں کرنے والا نہیں بلکہ ایسا شخص ہے جو بلند مقام پر کھڑا ہو - تفصیل متعلقہ عنوان میں ملیگی) - لیکن اب ہمارے ہاں پیش گوئیاں کرنے والوں کو مقربین بارگاہ خداوندی سمجھا جاتا ہے - کسقدر غیر قرآنی ہیں ہمارے نظریات و معتقدات؟

ک و ب

اَلْكُوْبُ - پیالہ جس کا دستہ نہ ہو **** - اسکی جمع اَكْوَاب ہے - قرآن کریم میں اَكْوَاب (۴۳/۷۱) اسی قسم کے پیالوں کے لئے آیا ہے -

---

*تاج - **راغب - ***محیط - ****تاج و راغب -

ک و د

کَادَ (کَوَ دَ) کا استعمال بطور فعل مقارب کے ہوتا ہے اور اس سے صرف ماضی اور مضارع کے فعل آتے ہیں ؛ دوسرے نہیں آتے ۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''وہ کسی کام کے کرنے کے قریب ہو گیا''۔ (اسی لئے اسے فعل مقارب کہتے ہیں) ۔ کَادَ یَفْعَلُ ۔ قریب تھا کہ وہ اس کام کو کر گزرتا ۔ وہ اسے کرنے والا ہی تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے معنی رکنے کے بھی ہوتے ہیں ۔ یعنی وہ ایسا کرنے والا ہی تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اس سے رک گیا* ۔ کَادَ زَیْدٌ یَفْعَلُ ۔ قریب تھا کہ زید ایسا کام کر بیٹھتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے لَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنٰکَ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْھِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا (۱۷/۷۴) ۔ ''اگر ہم تجھے ثابت قدم نہ رکھتے تو ہوسکتا تھا کہ تو ان کی طرف تھوڑا بہت جھک جاتا ۔ لیکن تو نے ایسا نہیں کیا''۔

نیز اس کے معنے ارادہ کرنے کے بھی آتے ہیں ۔ وَ اِنْ کَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَکَ مِنَ الْاَرْضِ لِیُخْرِجُوْکَ مِنْھَا (۱۷/۷۶) ۔ ''انہوں نے اس کا ارادہ کرلیا تھا کہ تمہارے پاؤں اکھاڑ کر تمہیں ملک سے نکال باہر کرتے''۔

سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو فرعون کی طرف جانے اور اس کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا تو اس سلسلہ میں فرمایا اِنَّ السَّاعَۃَ آتِیَۃٌ اَکَادُ اُخْفِیْھَا لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی (۲۰/۱۵) ۔ اس میں اَکَادُ اُخْفِیْھَا کا ٹکڑا غور طلب ہے ۔ کَادَ کے عام مفہوم کے اعتبار سے اس کے معنی یہ ہونگے کہ میں نے اسے مخفی رکھنا چاہا تھا لیکن ایسا نہ ہوسکا ۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس بات کی نسبت اپنی طرف کی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ظہورِ نتائج کے وقت (اَلسَّاعَۃُ) کو اس انداز سے رکھا ہے کہ وہ عام طور پر، اور عام لوگوں کی نگاہوں سے مخفی رہتا ہے ۔ لیکن جو لوگ علم و بصیرت سے کام لیں وہ اس آنے والی گھڑی کا پہلے سے اندازہ کر سکتے ہیں۔ نیز خدا کے کائناتی قانون کی رو سے ایسے حالات بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے یہ گھڑی بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے ۔ اَکَادُ اُخْفِیْھَا کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے اسے اس اندازہ سے رکھا ہے کہ وہ مخفی بھی ہے اور مشہود بھی ہے ۔

---

* تاج و محیط

ک و ر

کَوْرُ العِمَامَۃِ ۔ صافے کو گھمانا اور لپیٹنا ۔ اس کے لئے تَکْوِیْرُ العِمَامَۃِ بھی آتا ہے*۔ کسی چیز کو اوپر چڑھانے اور چھا دینے کے لئے بھی یہ فعل استعمال ہوتا ہے ۔ اِکْتَارَ الرَّجُلُ ۔ آدمی نے عمامہ باندھ لیا۔ اَلْمِکْوَارُ ۔ عمامہ کو کہتے ہیں ۔ اور اَلْکَوْرُ ۔ عمامہ کی ایک لپیٹن کو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی گھومنے اور اکٹھا ہونے کے ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے یُکَوِّرُ اللَّیْلَ عَلَی النَّھَارِ وَ یُکَوِّرُ النَّھَارَ عَلَی اللَّیْلِ (۳۹/۵) ۔ وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر لپیٹتا رہتا ہے ۔ زمین کی گردش کے اعتبار سے دن اور رات کے پھیر کو تَکْوِیْرٌ کہنا کتنی بڑی بلاغت اور کیسی عظیم حقیقت ہے ۔ گویا دن اور رات زمانہ کی پگڑی ہے جسے وہ لپیٹتا چلا جا رہا ہے ۔

کَوَّرَہٗ تَکْوِیْرًا کے معنی پچھاڑ دینے کے بھی آتے ہیں ۔ کَوَّرَ الرَّجُلَ تَکْوِیْرًا ۔ اس نے اس آدمی کو نیچے گرا دیا ۔ کَوَّرْتُہٗ فَتَکَوَّرَ ۔ میں نے اسے گرایا پس وہ گر گیا*۔ قرآن کریم میں ہے اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ (۸۱/۱) ۔ اس کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ جب "شمس" کو لپیٹ لیا جائے گا اور یہ بھی کہ جب اسے گرا دیا جائے گا۔ دونوں معانی کے اعتبار سے مفہوم ایک ہی ہے ۔ یعنی (مسلمانوں کے ہاتھوں) ایران کی سلطنت کا خاتمہ ۔ اُس سلطنت کے جھنڈے کا (جس کا نشان شمس، سورج تھا) لپیٹ دیا جانا ۔ یا اس کا گر جانا ۔ (دیکھئے عنوان ش ۔ م ۔ س) ۔ اور اگر اَلشَّمْسُ کے حقیقی معنی (سورج) لئے جائیں تو اس میں کسی آنے والے کائناتی تغیر کی طرف اشارہ ہے ۔

ک و ک ب

اَلْکَوْکَبُ ۔ ستارہ*۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ ظاہر اور نمودار ہونے والے ستارہ کے لئے بولا جاتا ہے** (۶/۷۶) ۔ جمع کَوَاکِبُ ۔ اَلْکَوْکَبَۃُ زہرہ ستارہ ۔ اَلْکَوْکَبُ ۔ مجازی طور پر بہت سے معانی میں استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً آنکھ میں پڑجانے والی پھلی ۔ لمبے لمبے درخت ۔ قوم کا سردار یا شہ سوار۔ گرمی کی شدت ۔ تلوار۔ پانی ۔ پہاڑ ۔ مسلح مرد ۔ کنوئیں کا چشمہ ۔ وغیرہ* ۔ اَلْکَوْکَبَۃُ ۔ جماعت کو بھی کہتے ہیں*** ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔

ک و ن

کَانَ - یہ فعل ناقص ہے - ذیل کے معنوں میں آتا ہے :—

(۱) ''ہے'' کے معنوں میں - کَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۳۳/۵۱) - اللہ علیم و حکیم ہے -

(۲) ''تھا'' کے معنوں میں - اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ (۱۶/۱۲۰) - یقیناً ابراھیم (ایک فرد نہیں بلکہ) پوری کی پوری فرماں بردار امت تھا -

(۳) ''ہوگا'' کے معنوں میں - كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا (۷۶/۷) - جس کا فتنہ اڑکر لگنے والا ہوگا - (یہاں اس کے معنی ''ہے'' بھی ہوسکتے ہیں) -

(۴) ''ہوگیا'' کے معنوں میں - اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ (۲/۳۴) - اس نے انکار کیا - سرکشی اختیار کی - اور اس طرح نہ ماننے والوں میں سے ہوگیا -

(۵) ''سزاوار''- مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ . . . . . . (۳/۷۸) - کسی انسان کے لئے یہ سزاوار نہیں کہ اللہ اسے کتاب و حکومت و نبوت دے اور وہ . . . .

(۶) تاکید کے لئے بھی آتا ہے - اور کبھی زائد بھی ہوتا ہے - وَ مَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲۶/۱۱۳) - مجھے کیا علم ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں - یہاں كَانُوْا زائد ہے - صرف بِمَا يَعْمَلُوْنَ کے بھی یہی معنی ہیں - لیکن اگر اس کے معنی ہوں ''جو کچھ یہ لوگ کرتے رہے تھے'' تو پھر كَانُوْا زائد نہیں ہوگا -

كُنَّ - جمع مؤنث غائب - اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ (۲/۲۲۸) اگر وہ خدا پر ایمان رکھتی ہیں -

اَكُ - واحد متکلم - وَ لَمْ اَكُ بَغِيًّا (۱۹/۲۰) - میں قانون شکن نہیں ہوں - اس میں نون گر گیا ہے دراصل اَكُنْ تھا -

تَكُ - مذکر حاضر اور مؤنث غائب دونوں کے لئے آتا ہے - فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ (۱۱/۱۰۹) - تو شک میں نہ رہ (دراصل تَكُنْ تھا)

يَكُ - واحد مذکر غائب - لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا (۸/۵۳)- وہ نعمت کو بدلنے والا نہیں ہوتا - (دراصل يَكُنْ تھا)

نَکُ ۔ جمع متکلم۔ لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ (۷۴/۴۳)۔ ہم مصلین نہیں تھے۔

یہ تو ہؤا کَانَ (فعل ناقص)۔ لیکن یہ فعل تام بھی ہوتا ہے۔ اس کی بحث آگے آتی ہے۔

کَانَ ۔ کسی چیز کا پیدا ہو جانا۔ واقع ہو جانا۔ کَوْنٌ اُس چیز کو کہتے ہیں جو یکبارگی اور دفعتاً واقع ہو جائے۔ لیکن جب کوئی چیز بتدریج پیدا ہو تو اسے حَرَکَت کہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ کَوْنٌ کے معنی ہیں کسی چیز کا مادی صورت اختیار کر لینا۔ راغب نے کہا ہے کہ کَوْنٌ کا لفظ اسوقت استعمال کرتے ہیں جب کوئی جوہر اپنے سے بلند تر جوہر میں تبدیل ہو جائے۔ لیکن اگر اپنے سے پست جوہر میں تبدیل ہو جائے تو اسے فَسَادٌ کہتے ہیں۔ کَوَّنَ اللّٰہُ الْاَشْیَاءَ کے معنی ہیں خدا نے اشیاء کو ایجاد کیا۔ اَلْکَائِنَۃُ کے معنی ہیں حادثہ۔ یعنی دفعتاً نمودار ہو جانا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی واقعہ کی خبر دینے کے ہیں۔ خواہ وہ ماضی میں ہؤا ہو یا حال میں۔

قرآن کریم میں ہے بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲/۱۱۷)۔ یعنی خدا وہ ہے جو اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ (اِبْدَاعٌ۔ کسی چیز کو ایجاد کرنا۔ پہلی مرتبہ وجود میں لانا)۔ یہ کسطرح ہوا؟ اسے اس آیت کے اگلے ٹکڑے میں بیان کر دیا۔ وَاِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (۲/۱۱۷)۔ یعنی جب وہ ایک اَمْرٌ کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے (اس اَمْرٌ سے) کہتا ہے (یَقُوْلُ لَہٗ) کُنْ۔ (ہو جا)۔ تو وہ ہو جاتا ہے (فَیَکُوْنُ)۔ یعنی "امر" کی حالت وہ ہے جس میں اشیاء نے ہنوز صورت اختیار نہیں کی ہوتی۔ جب وہ اَمْرٌ (خدا کے پروگرام کے مطابق) متشکل ہو جاتا ہے (صورت اختیار کر لیتا ہے) تو وہ شَیْءٌ بن جاتا ہے۔ ہم کسی شے کا تصور بغیر اسکی صورت (Form) کے کر ہی نہیں سکتے۔ خدا کے "عالم امر" کی کیا کیفیت ہے، ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اسلئے کہ وہاں صورت ((Form) نہیں ہوتی۔ خدا اس (Formless) اَمْرٌ کو صورت (Form) عطا کرتا ہے۔ (اسی لئے اسے اَلْمُصَوِّرُ کہا گیا ہے (۵۹/۲۴)۔ اور وہ امر شے بنکر ہمارے حیطۂ ادراک میں آجاتا ہے۔ یہاں سے کَوْنٌ کے معنی ہیں اشیاء کا پہلی مرتبہ صورت اختیار کرنا۔ یہ سب خدا کے اس قانون کے مطابق ہوتا ہے جو اس نے اشیاء کے پیدا کرنے کے لئے مقرر کر رکھا ہے۔

---

*تاج و محیط۔

اَلْمَکَانُ - جگہ - مقام - بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ اسی مادہ سے مشتق ہے - اور بعض م - ک - ن سے بتاتے ہیں - اس سے تَمَکَّنَ وغیرہ افعال بنا لئے گئے ہیں * - (ہم نے م - ک - ن کا عنوان الگ لکھا ہے - اس کے تحت ان الفاظ کو دیکھئے)

اَلْاِسْتِکَانَۃُ کے معنی ہیں خشوع و خضوع کرنا * - یا عاجزی کا اظہار کرنا (۳/۱۴۵) - (بعض کے نزدیک یہ لفظ سَکَنَ سے ہے - اس لئے ہم نے اسے اس عنوان کے تحت بھی لکھا ہے -) اَلْمُکَاوَنَۃُ - جنگ و جدال کو کہتے ہیں * -

ک و ی

کَوَاہُ یَکْوِیْہِ کَیًّا - اسے گرم لوہے وغیرہ سے داغ دیا - اَلْمِکْوَاۃُ - داغ دینے کا آلہ ** - ابن فارس نے ان معانی کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ کَوَاہُ بِعَیْنِہٖ کے معنی ہیں اس نے اسکی طرف گھور کر دیکھا -

قرآن کریم میں ہے کہ جو لوگ مال و دولت جمع کرتے ہیں (اور اسے نوع انسانی کی پرورش کے لئے کھلا نہیں رکھتے) ان کے اس مال کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا - فَتُکْوٰی بِھَا .... (۹/۳۵) - اور اس سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو داغا جائیگا - (جسطرح اُس زمانے میں بڑے بڑے مجرمین کو داغا جاتا تھا) تا کہ ان کی دور ہی سے پہچان ہو جائے اور لوگ انکی تباہ کاریوں سے محفوظ رہیں - قرآن کریم کی رو سے سرمایہ داری سنگین جرم ہے اور ایسا کرنے والے معاشرہ کے بدترین مجرم -

کَیْ - (حرف)

کَیْ - سبب ظاہر کرنے کے لئے (تا کہ - کے معنوں میں) - کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ (۵۹/۷) - تا کہ مال تم میں سے دولتمندوں کے اندر ہی گردش نہ کرتا رہے -

لِکَیْلَا - لِ + کَیْ + لَا - تا کہ ایسا نہ ہو - (۵۷/۲۳)

ک ی د

کَیْدٌ - حیلہ اور تدبیر کو کہتے ہیں * - محیط نے تعریفات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے معنے خفیہ طریقہ سے کسی دوسرے کو نقصان

*تاج - ** تاج و محیط -

پہنچانے کا ارادہ کرنا ہیں **۔ نیز یہ لفظ کوشش اور جد و جہد کے معنوں میں بھی آتا ہے ۔ بعض علمائے لغت نے کَیْدٌ اور مَکْرٌ کو ہم معنی قرار دیا ہے ۔ بعض کا خیال ہے کہ کَیْدٌ ضرر رسانی، اور مَکْرٌ خفیہ تدبیر اور ضرر رسانی کو کہتے ہیں ۔ بعض کا خیال ہے کہ کَیْدٌ کے معنی خفیہ طور پر گرفت کرنا ہیں لیکن اس میں یہ شرط نہیں کہ ایسی تدبیر کرنے والا بظاہر اس کے خلاف کرے جو وہ بہ باطن چاہتا ہے ۔ مگر یہ شرط مَکْرٌ میں ضروری ہے *۔ (لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں)۔ راغب نے کہا ہے کہ کَیْدٌ ایک قسم کی چارہ سازی اور حیلہ جوئی کو کہتے ہیں یہ اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور برے معنوں میں بھی ۔ اور بالعموم برے معنوں میں آتا ہے***۔

کَادَ کے معنی ارادہ کرنے کے بھی آتے ہیں * ۔ جنگ کرنے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے *۔

قرآن کریم میں دشمنوں کی خفیہ یا عام تدبیر کو کَیْدٌ کہا گیا ہے ۔ لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا (۳/۱۱۹) ۔ ان کی سازشیں یا تدبیریں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکینگی ۔ ساحرین فرعون کی شعبدہ بازی کو بھی کَیْدٌ کہا گیا ہے ۔ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ (۲۰/۶۹) جو کچھ انہوں نے بنایا ہے وہ سحر (باطل) کی شعبدہ بازی ہے ، اور بس ۔ سورہ یوسف میں عزیز مصر نے اپنی بیوی سے کہا ہے کہ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۔ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ (۱۲/۲۸) ۔ یہ محض تمہاری سازش ہے ۔ اور تم عورتوں کی سازشیں بڑی ہی گہری ہوتی ہیں ۔

دوسری طرف خدا نے خود اپنی تدبیر کو بھی کَیْدٌ کہا ہے ۔ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَّاَكِيْدُ كَيْدًا (۸۶/۱۵-۱۶) ۔ یہ بھی ایک تدبیر میں لگے ہوئے ہیں اور میں بھی ایک تدبیر کر رہا ہوں ۔ سورہ یوسف میں ہے كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ (۱۲/۷۶) ۔ اس طرح ہم نے ایک عمدہ تدبیر پیدا کر دی جس میں یوسف کا فائدہ تھا ۔ یا وہ اس کے حسب منشا تھی ۔

سورہ انبیاء میں ہے کہ حضرت ابراھیم ؑ نے اپنی قوم سے کہا وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ (۲۱/۵۷) بخدا! میں تمہارے بتوں کو نقصان پہنچانے کی تدبیر کرکے رہونگا ۔

سورہ طور میں مَکِیْدُوْنَ آیا ہے ۔ (۵۲/۴۲) ۔ یعنی وہ جو سازش (یا تدبیر) کا شکار ہو جائیں ۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

كَيْفَ (حرف)

كَيْفَ - کیسے - کیونکر - کسطرح کے معنوں میں - كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ (۲/۲۸) - تم اللہ کا کسطرح انکار کر سکتے ہو - دوسری جگہ ہے - كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ (۱۰۵/۱) - تیرے رب نے کیونکر کیا؟ (ان سے) کیسا معاملہ کیا؟

ک ی ل

كَالَ الطَّعَامَ - يَكِيْلُهُ - كَيْلاً - غلے کو ناپا* - اِذَا كَالُوْهُمْ (۸۳/۳) - جب انہیں ماپ کر دیتے ہیں - اِكْتَالَ (عَلٰى) - کسی سے ماپ کر لینا (۸۳/۲) - تاج نے كَالَ اور اِكْتَالَ دونوں ہم معنے بتا کر فرق یہ کیا ہے کہ كَالَ کے معنے ہیں، خود ناپ کر دوسرے کو دینا اور اِكْتَالَ کے معنے ہیں اپنے لئے خود ناپ کر لینا* - راغب نے كِلْتُ لَهُ الطَّعَامَ کے معنے بتائے ہیں میں نے اس کے لئے غلہ ناپا، اور كِلْتُهُ الطَّعَامَ کے معنے، میں نے اسے غلہ (ناپ کر) دیا، اور اِكْتَلْتُ عَلَيْهِ - میں نے اس سے ناپ کر لیا** - ابن فارس نے اس کی تائید کی ہے - كَيْلٌ - مِكْيَالٌ - پیمانہ جس سے غلہ وغیرہ کو ماپا جائے - (۶/۱۵۳) خود (اس طرح ماپے ہوئے) غلہ کو بھی کہتے ہیں (۱۲/۵۹) - كَيْلَ بَعِيْرٍ (۱۲/۶۵) - ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر غلہ -

قرآن کریم میں بڑی تاکید سے حکم ہے کہ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ (۱۱/۸۴) - اس میں اگرچہ ترازو اور پیمانے کا ذکر ہے (کہ ماپ اور تول میں کمی نہ کرو) لیکن اصولاً اس میں معاشی عدل کا بنیادی قانون آگیا ہے - معاشی عدل کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو اس کے حق سے کم نہ دیا جائے، اور نہ ہی اپنے حق سے زیادہ لیا جائے۔ اس اصول کے ماتحت، سرمایہ داری کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ (مثلاً) اگر ایک زمیندار یا کارخانہ دار کام کرنے والے کو وہ سب کچھ دے دے جو اس نے پیدا کیا ہے تو اس سے اسے خود کچھ نہیں ملتا - یہی قرآن کریم کا منشأ ہے - یعنی معاوضہ محنت کا ملیگا - روپے کا نہیں - کام کرنے والے کی محنت کے ماحصل سے کچھ رکھ لینے والے مُخْسِرِيْنَ ہیں (۲۶/۱۸۱) -

جلد سوم ختم شدہ

*تاج - **راغب -

اس لغات میں

آپ نے مختلف مقامات پر یہ پڑھا ہوگا کہ ''اس نکتہ کی وضاحت آپ کو پرویز صاحب کی فلاں کتاب میں ملیگی'' ۔ چونکہ قرآنی تعلیم سے متعلق یہ مباحث بڑے اہم ہیں اس لئے پرویز صاحب کی ان تصانیف کا مطالعہ بڑا ضروری ہے ۔ بالخصوص حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ ۔

انسان نے کیا سوچا ؟ گذشتہ اڑھائی ہزار سال میں ، دنیا کے مختلف مفکرین ، مدبرین ، مؤرخین اور سائنسدانوں نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متعلق جو کچھ سوچا اور کہا ہے ، اسے نہایت دلنشیں پیرایہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اسکی روشنی میں قرآنی حقائق کی عظمت خود بخود سامنے آ جاتی ہے ۔

سلیم کے نام خطوط ۔ ہمارے نوجوان ، تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں ، اسلام کے متعلق جس قدر شکوک اور سوالات پیدا ہوتے ہیں ، ان کا نہایت اطمینان بخش جواب ۔ انداز بیان دلچسپ ، سلیس اور نہایت شگفتہ ۔ کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے ۔

ابلیس و آدم ۔ اس میں ، انسانی تخلیق اور نظریہ ارتقاء ۔ قصہ آدم ۔ ملائکہ ۔ ابلیس ۔ شیطان ۔ جنات ۔ وحی ۔ نبوت ۔ رسالت ۔ عقل اور وحی کے دوائر عمل جیسے اہم موضوعات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے ۔

جوئے نور ۔ قرآنی تعلیم کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے انبیائے سابقہ کے احوال و کوائف اور اقوام گذشتہ کے وقائع و حوادث کا جاننا ضروری ہے ۔ یہ کتاب اسی سلسلہ زریں کی پہلی کڑی ہے جس میں حضرت نوحؑ سے لیکر حضرت موسیٰؑ سے پہلے تک کے انبیاء کرامؑ کے حالات آگئے ہیں ۔

(مسلسل)

برقِ طور - اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جس میں بنی اسرائیل کی پوری داستان اور ان کے انبیائے کرامؑ کے احوال و کوائف شرح و بسط سے بیان کئے گئے ہیں - یہ در حقیقت قوموں کے عروج و زوال کے متعلق قرآنی اصول و قوانین کا بصیرت افروز مرقع ہے -

شعلۂ مستور - اس سلسلہ کی اگلی کڑی ہے جس میں آسمانی انقلاب کے عظیم داعی، حضرت عیسیٰؑ کی حیات طیبہ کے وہ گوشے سامنے لائے گئے ہیں جو اس سے پہلے عام طور پر نگاہوں سے اوجھل تھے - حضرت مریمؑ کا "جرم" - جناب مسیحؑ کی پیدائش - معجزات - کشمکش - واقعہ صلیب اور رفع الی السماء - نزولِ مسیحؑ سے متعلق تمام مباحث آگئے ہیں -

معراجِ انسانیت - یہ عظیم کتاب نبی اکرمؐ کی اس سیرتِ مقدسہ پر مشتمل ہے جو قرآن کریم کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے - اس میں قرآنی فکر و نظام کے تمام گوشے نہایت حسین و جمیل انداز میں سامنے آگئے ہیں - اعلیٰ درجہ کے ولایتی کاغذ پر بڑے سائز کے قریب نو سو صفحات پر جگمگاتی ہوئی کتاب ہے -

ان کے علاوہ

پرویز صاحب کی دیگر تصانیف اور ماھنامہ طلوع اسلام

کیلئے ایک کارڈ لکھ کر تفاصیل معلوم کریں -